PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

TEXT CUT WITHIN
THE BOOK ONLY



قیمت عمر

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات ... اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے قیمت علاوہ محصول عا

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عا

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ کمال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت حیات صحت بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانۂ حسن و عشق کی تمام نشاط بخش کیفیات اسکے ایک ایک لفظ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے اسکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے اسمیں نظر آتے ہیں قیمت علاوہ محصول عہ

صحابیات
جس میں عہد سعادت کی ... خواتین کے مستند حالات بیان کیے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عا

نقاب اُٹھ جانے کے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں۔ زبان و بلاغت انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کرکے ختم کئے بغیر چھوڑنا ناممکن ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۲۱ر علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ مادئین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ
مصطفیٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت ۴ علاوہ محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبد الباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زیادہ اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت ... محصول عا

مثنوی لالہ رخ
طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت ... محصول عہ

مثنوی زہر عشق
مرثیہ مجنوں گورکھپوری جسمیں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ... تصویر رنگین ہے۔ عہ

فراست التحریر مکمل
یعنی اسعد اور ڈاکٹر فری ترجمہ اور تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ر علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ر تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (عہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین جنوری سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۸۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للعہ ــــ غیر مجلد للعہ ر ــــــــــ (علاوہ محصول)

خریداران نگار سے ــــــ ایک روپیہ کی رعایت ۵۵ لـ

فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جسمیں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالیگئی ہے اسمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہونگے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ ر کے مجلد کتاب صرف ۲ ر میں۔ اور غیر مجلد ۲ ر میں ملیگی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد للعہ میں اور غیر مجلد ۔ر میں علاوہ محصول ۸ ر کے ملے گی ــــــ اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ وی۔پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ــــــ

منیجر نگار لکھنؤ

لبوں کی داستان

تاریخی ، فنی ، نفسیاتی ، مذہبی اور ادبی
نقطۂ نظر سے

سید یامین ہاشمی ایم۔ اے، ال، ال، بی



بوس کی داستان

(تمہید)

آج جبکہ دُنیا انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو بطور فن مطالعہ کرنا چاہتی ہے، غالبًا بیجا نہ ہوگا اگر میں اس دلچسپ موضوع پر بحث کروں اور اس کو دُنیا کے سامنے فنی حیثیت سے پیش کردوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس بحث کا ایک پہلو عامیانہ ضرور ہے لیکن یہ سوقیانہ پہلو بحث کا فطری جزو نہیں ہے بلکہ یہ بھی "مئے ناب" کی طرح "صحبت ناداں" کی باعث "بدنام" ہے۔ علاوہ بریں انسان کی ضروریات زندگی جسقدر زیادہ انفرادی تعلقات سے وابستہ ہوں گی اُسی قدر مخفی رہیں گی۔ حیا و شرم کا یہ تقاضا ہے کہ ایک فرد اپنی مخصوص ذاتی ضرورتوں کی تکمیل بالاعلان نہ کرے، لیکن اگر وہی ضرورت عوام سے متعلق ہوگی تو اُس وقت اُس کی علانیہ تکمیل مطلق شرم آگیں نہیں ہوسکتی۔ مثلاً آپ کھانے کو لے لیں کہ عرب و انگلستان میں سڑکوں پر یا کھلی ہوئی جگہوں میں کھانا معیوب سمجھا جاتا ہے چنانچہ اسماء الرجال کا ایک اُصول ہے کہ اگر کوئی راوی کبھی بازار میں کھاتا ہوا دیکھا گیا تو اُس کی روایت ناقابل اعتبار قرار دی گئی۔ اسی طرح انسان کے دوسرے ذاتی حوائج بھی ہیں جن کو وہ در پردہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ بوسہ بھی اُنھیں ضروریات انسانی میں سے ہے اور چونکہ اُس کا اہم پہلو امتداد زمانہ کی باعث انسانی زندگی کے شہوانی پہلو سے وابستہ ہوگیا ہے اس لئے اسکی تکمیل بھی بالاعلان شرم و حیا کے منافی سمجھی جاتی ہے۔

مگر اس "اخفاء" کے یہ معنی نہیں کہ آپ اُسکا مطالعہ بطور فن کے نہ کریں یا اُس کے فلسفہ کو نظرانداز کردیں۔ میرا خیال ہے کہ اس فن کا عریاں پہلو اور زیادہ مقتضی ہے کہ ہم اسکی سوقیت کو نظرانداز کرکے اسے ایک اعلیٰ فن کی حیثیت سے دیکھیں۔ اس مضمون کی تکمیل میں مجھے تلاش و دقت نظر سے کام لینا پڑا۔ چونکہ اس فن میں کوئی مستقل کتاب مرے علم میں (جو کتاب کے نام سے موسوم ہوسکے) موجود نہیں ہے اسلئے دقت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اسکی تیاری میں مجھے تقریبًا سو مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ اس کی تکمیل میں مرے ایک مخلص دوست نے اپنے "تجربات عالیہ" سے مجھے نفع اُٹھانے کی مگر چونکہ نام کے اعلان کی اجازت نہیں ہے اس لئے مجبورًا اُن کا شکریہ معنًا ادا کرتا ہوں۔

مقدمہ

فی نفسہٖ دُنیا کا ہر فعل موزوں و مناسب ہے۔ یہ محض اُس کا غلط استعمال ہے جو اُس کی مذموم صورت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے بالکل یہی حالت اس فعل کی ہے جو ہمارا موضوع گفتگو ہے۔ محبت نے اس کے مقاصد عالیہ کچھ اور ہی رکھے تھے لیکن ایک طرف "ہر بوالہوس" کی "حسن پرستی" نے اسے بدنام کر دیا اور دوسری طرف شعراء کی شاعری نے "شیوۂ اہلِ نظر" کی رہی سہی آبرو بھی فنا کر دی۔ چنانچہ اب لفظ 'بوسہ' کے سنتے ہی خیالات ایک نامناسب شکل سامنے لاکر پیش کر دیتے ہیں ہماری یہ بد مذاقیاں خیالات کو اتنی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ فحش و عُریاں مناظر سے خالی الذہن ہو کر اُس موقع کو ذہن نشین کریں جب ایک دور افتادہ شوہر وطن واپس آتا ہے اور اپنی محبوب بیوی کو پیار کرتا ہے۔ یا ایک ماں اپنے بچہ کا بوسہ لیتی ہے یا ایک دوست اپنے محسن کے ہاتھوں کو چوم کر شکر و منت کا اظہار کرتا ہے۔

ماہرین فن کے لئے یہ ایک نہایت دشوار مسئلہ سمجھا گیا ہے کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی اور انسان ایسا کیوں کرتا ہے۔ ارباب فن نے مختلف رائیں پیش کی ہیں۔ ایک گروہ کا صنمیاتی خیال یہ ہے کہ جب آدم و حوا اسا لہا سال کی جدائی کے بعد ملے اُس وقت آدم نے جوشِ محبت میں حوا کے بوسے لے لئے۔ پلینی کا خیال ہے کہ ابتداءً خاندان کا ہر فرد ایک دوسرے کا بے تکلف بوسہ لیتا تھا۔ مرد اپنی بیٹیوں، عورتوں اور بہنوں کا بوسہ اس غرض سے لیتے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اُنھوں نے شراب تو نہیں پی۔ پریبنڈ کا بیان ہے کہ ٹرائے (Troy) کی بربادی کے بعد جب ٹروجن جہازوں میں سوار ہو کر چلے تو ہوا انھیں ٹسکنی میں لے گئی جو شہر روم کے قریب واقع تھا ——— سب مسافر اس شہر میں اُتر پڑے، تو عورتوں نے خوراک و طعام کا انتظام کیا اور مردوں نے شکار گاہ کا راستہ لیا۔ بعض اہلِ روما کے کہنے سے عورتوں نے جہاز میں آگ لگا دی اس لئے کہ وہ سفر سے عاجز آ چکی تھیں۔ جب مرد شکار سے واپس آئے تو اُن کی خفگی کی کوئی انتہا نہ تھی مگر ان عورتوں نے کچھ ایسے انداز و محبت سے اُن کے بوسے لئے کہ اُنھوں نے مجبوراً معاف کر دیا۔

غرض مختلف ممالک میں مختلف روایات مشہور ہیں جن سے اس کی ابتدار کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ان میں سے ایک قصہ بھی ایسا نہیں جو اس فعل کی نفسیاتی یا فلسفیانہ توجیہہ کرتا ہو۔ ہم کیوں لب سے بوسہ لیتے ہیں، اور کیوں لب کا بوسہ لیتے ہیں۔ یا یہ کہ ایسا کرتے ہی کیوں ہیں، آیا یہ فعل اضطراری ہے یا ارادی۔ یہ وہ سوالات ہیں جو گفتگو

کے مستحق ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ تمام سوالات آسانی سے حل ہو سکتے ہیں اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ انسان صرف اُسی کا بوسہ لیتا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔ کوئی اپنے دشمن کا بوسہ نہیں لیتا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ بوسہ اظہار محبت کا ایک طریقہ ہے۔ اب رہے دوسرے سوالات وہ بھی اس کے متعلق واقعات پر غور کرنے سے واضح ہو جائیں گے۔

انسان ایک حساس حیوان ہے اس کے جسم کا ہر عضو قوت حسیہ کا مالک ہے۔ سر سے پاؤں تک ہر حصہ بیرونی اثرات سے متاثر ہوتا ہے اور اثر پذیر ہونے کے بعد اظہار اثر کا خواہشمند ہوتا ہے۔ موجودہ تحقیقات نے دماغ کو مرکز حس قرار دیا ہے۔ دماغ حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اپنے ماتحت اعضاء سے کام لیتا ہے۔ اب دماغ ایک اندرونی عضو ہے اُس کا قریب ترین حصۂ جسم جمجمہ یا کاسۂ سر نہایت سخت ہے اس لئے اُس کی قوت حسیہ بھی کم ہے سر سے گردن تک جسقدر اعضاء ہیں اُن میں سب سے زیادہ ذکی الحس لب ہیں۔ اُس کے بعد آنکھیں۔ اُس کے بعد رُخسار۔ اُس کے بعد ناک اور کان۔

یہ تو طے ہو چکا کہ انسان جب اپنے دماغ پر کوئی اثر محسوس کرتا ہے تو سب سے پہلا حصۂ جسم جو ان خیالات سے متاثر ہوتا ہے وہ اُسکے لب ہوتے ہیں اور چونکہ مثل مثل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس لئے لب کو لب ہی پسند ہونگے دوسرا سبب یہ ہے کہ لب نہایت ذکی الحس حصۂ جسم ہے۔ اور اسی لئے سب سے پہلے لب لب ہی کو چومنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے اعضاء جسمانی کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔

لب کے اتصال کی توجیہہ تو ہو چکی، لیکن یہ سوال ابھی باقی رہجاتا ہے کہ آخر انسان اس فعل کا مرتکب کیوں ہوتا ہے۔ ایک مشہور تاریخی قصہ اس کا شافی جواب دیتا ہے۔ جولیس یازدہم کی حسین بیوی ملکہ مارگرٹ نے الین چارٹیر (Allen Chantier) کا بوسہ لے لیا۔ چارٹیر بہت بدصورت شخص تھا لیکن نہایت خوش گلو تھا۔ لوگوں نے حیرت سے اس کا سبب دریافت کیا تو ملکہ نے جواب دیا کہ "میں نے اس شخص کے بوسے نہیں لئے بلکہ اُس روح کے بوسے لئے جو اس کے لب و دہن کے ذریعہ سے بہترین نغمہ سُناتی ہے۔ اس واقعہ کی تائید ہماری زندگی میں روزمرہ ہوتی رہتی ہے۔ آپ سب سے پہلے انسان کی ظاہری شکل سے رائے قائم کرتے ہیں اولین نظر میں ایک شخص بہتر معلوم ہوتا ہے اور دوسرا بدتر، لیکن گفتگو اور تجربات کے بعد کبھی کبھی آپ کو اس کے خلاف رائے قایم کرنا پڑتی ہے اور وہی شخص جس کی صورت سے آپ کو نفرت معلوم ہوتی تھی، گفتگو کے بعد بہتر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 'بوسہ' ایک نوع کا 'اعتراف پسندیدگی' ہے اور آپ اپنے اس فعل سے دوسرے شخص کی خوبی کا اعتراف کرتے ہیں آپ در اصل اُسکے ظاہری جسم کا بوسہ نہیں لیتے

بلکہ اُس کے اُن اندرونی محاسن سے محبت کا اظہار کرتے ہیں جو آپ کی نظر میں اُس کے جسم کے اندر موجود ہیں چنانچہ عام محاورہ ہے کہ "فلاں نے ایسی اچھی تقریر کی کہ دل چاہتا تھا کہ اُس کا مُنھ چوم لے" "فلاں نے ایسی تصویر بنائی ہے کہ دل چاہتا ہے اُس کا ہاتھ چوم لے۔ فی الحقیقت دست بوسی یا لب بوسی اظہار پسندیدگی ہے جس سے آپ ایک شخص کے محاسن کا اعتراف کرتے ہیں۔

میرے اس نظریہ کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ بوسہ بازی کی رسم وحشی اقوام میں تقریباً مفقود ہے۔ اگر بوسہ کا کوئی تعلق انسان کی قوت شہوانیہ سے ہوتا تو وحشی قبائل میں (جن میں قوائے شہوانیہ بہت قوی ہوتے ہیں) یہ رواج ضرور رہتا۔ وحشی اقوام کی نظموں میں بھی کہیں آپ اس کا ذکر نہ پائیں گے۔

یہ واقعہ بھی کم قابلِ لحاظ نہیں کہ عُریانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے رواج میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ وحشی اقوام میں (جن کا ہر فرد عریاں ہوتا ہے) اس کا رواج مطلق نہیں۔ آج مہذب یورپ جسقدر زیادہ عریانی میں ترقی کررہا ہے، اُسی قدر اس کا رواج کم ہورہا ہے۔ یورپ و امریکہ کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اس کے خلاف آج عام نفرت نہ پھیل رہی ہو۔ بظاہر حفظان صحت کے وجوہ اس کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن دراصل واقعہ یہ ہے کہ دماغ غیر ارادی طور پر عریانیت سے متاثر ہو کر نفرت کررہا ہے۔ کسی چیز کی پردہ داری اُس کے اشتیاق کو بڑھاتی ہے لیکن جب وہ پردہ نہیں رہا تو اشتیاق کیسا، اور جب اشتیاق نہیں تو اُس کی جلوہ آرائیاں کیسی۔ جو جزو جسم نظروں سے مخفی ہے اُس کی پہلی دید ایک کشش رکھے گی لیکن "کثرت نظارہ" ایک ایسا پردہ حائل کردیتی ہے جو آنکھوں کو نہیں لیکن دماغ کو ضرور محسوس ہوتا ہے۔

نقشۂ ذیل سے آپ کو اس حقیقت کا علم ہوسکے گا کہ بوسہ کا رواج آہستہ آہستہ بڑھکر اب کسقدر کم ہورہا ہے۔ میں نے بطور مثال سرزمین انگلستان کو لے لیا ہے۔ اسوقت تاریخ انگلستان چھ بڑے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ یہ تقسیم دونوں لحاظ سے مناسب ہے اول تو اس سے اس رواج کا پتہ چلتا ہے، دوسرے اس سے لباس کی عریانی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حصہ اول یعنی زمانہ قبل از تاریخ میں نہ لباس تھا اور نہ رواج بوسہ، اگر ملک اپنی معمولی رفتار پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو شاید صدہا سال میں بھی وہ بات پیدا نہ ہوتی جو اہل روما کی حکومت نے برسوں میں پیدا کردی۔ اہل روما کی تہذیب اُس زمانہ میں اعلیٰ ترین سمجھی جاتی تھی وہی ملک میں بوسہ بازی کا رواج بھی لائے۔ اُن کا لباس تقریباً وہی تھا جیسا آج یورپ کا ہے دور سوم میں پردہ پوشی کا شوق بڑھا تو اُس کے ساتھ رواج بوسہ بازی میں بھی ترقی ہوئی۔ دور چہارم و پنجم میں بوسہ بازی کو مخصوص ترقی نصیب ہوئی۔ دور ششم میں عریانی کے ساتھ ساتھ بوسہ کے شوق میں بھی کمی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ آج یورپ کا کثیر حصہ اس رسم کا شدید مخالف ہے۔

یونتو عرصہ سے مخالفت کی آوازیں اِدھر اُدھر سے آتی رہیں لیکن باقاعدہ طور پر علم بغاوت کی بلندی کا سہرا روس کے سر ہے آج روس میں بوسہ لینا اور دینا جرم ہے۔ یورپ و امریکہ کے دیگر ممالک میں بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے جارہے ہیں ایسی صورت میں یہ بجاطور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیا یہ بالکل نیست و نابود ہوجائے گا اور کیا تعزیری قوانین ایک شوہر کو اپنی زوجہ کا بوسہ لینے سے روک سکیں گے۔ اور کیا ماں کو اس کی اجازت نہو گی کہ وہ اپنے ننھے معصوم بچہ کو پیار کرے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح حفظان صحت کے اُصول دیگر شعبہ جات حیات میں نظر انداز کئے جاتے ہیں اُسی طرح یہ بھی اطباء کے مواعظہ حسنہ کو پس پشت ڈالکر اس محبت خیز مشغلہ کو معدوم نہونے دے گا

تاریخی پہلو

کسی فن کے سمجھنے کے لئے، نہایت ضروری ہے کہ آپ اُس کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ انسان کی جتنی ضروریات زندگی ہیں، وہ ہمیشہ تدریجی ترقی کی محتاج ہیں، کسی نے اُن کو ایجاد کیا، ضروریات زمانہ نے اُن کی صورت وہیئت تبدیل کی، ملکی خصوصیات نے اُن میں ترمیم پیش کی اور وہ متعدد مدارج سے گزرتی ہوئی موجودہ صورت میں پیش ہوئیں۔ اسی طرح بوسہ کی بھی حالت تھی۔ گو آج یہ انسانی زندگی کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے لیکن چونکہ حوائج غیر ضروریہ میں شامل ہے اس لئے انسان کی پیدائش کے ساتھ اس کا وجود مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔

اہلِ چین اس لذت سے کلیتًا ناواقف ہیں۔ موجودہ روسی حکومت نے اس کو جرم قرار دیا ہے، ابھی چند دن ہوئے کہ انگلستان کی ایک عدالت میں ایک عورت نے صرف اس بنا پر خلع کی درخواست پیش کی کہ اُسکے شوہر نے ابتداء عقد سے جس کو بیس سال ہوئے آج تک اُس کا بوسہ نہیں لیا، یہ واقعات اس نظریہ کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں کہ بوسہ حوائج فطریہ میں شامل نہیں ہے بلکہ یہ اکتسابی لذت ہے جو تدریجی ترقی کے بعد موجودہ صورت میں ظاہر ہوئی۔

پروفیسر لامبراسو (Lombroso) اس نظریہ کے موئد ہیں کہ اس کی موجد مادرانہ شفقت ہے۔ ابتدائً انسان کے پاس پانی پینے کا کوئی پیالہ نہ تھا اور جب وہ پیاسا ہوتا تو چوپایوں کی طرح جھک کر اپنے لبوں کو پانی کے چشمہ میں تر کرتا اور اس طرح پانی پیتا۔ چھوٹے بچے اس طرح اپنی پیاس بجھانے سے معذور تھے اس لئے ماں پہلے اپنے منہ میں پانی لیتی اور اُس کے بعد بچہ کے لبوں کو اپنے دہن میں لیکر اُس کے منہ میں پانی ڈالدیتی۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ موجودہ بوسہ اُسی زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے۔

میں اس نظریہ کو غلط سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ یہ حرکت اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہے۔ بطور ثبوت آپ حیوانات کو دیکھیں۔ چوپایہ اور پرند دونوں بوسہ کی لذت سے واقف ہیں۔ پرندوں میں تو یہ بات روزمرہ دیکھی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی چونچ سے مس کرتے ہیں، گائے اپنے بچہ کو دودھ پلاتے وقت چاٹتی ہے۔ میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ لب کا لب سے مس ہونا اور لب کا کسی دوسرے جسم سے مس ہونا

ایک ہی شے ہے اور دونوں بوسہ کی حیثیت رکھتے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں فریقین کو مسرت حاصل ہوتی ہے اور موخر الذکر میں صاحب لب کو، میرا خیال ہے کہ جسم میں ذکاوت احساس سب سے زیادہ لب کو حاصل ہے علم الابدان کے ماہرین اس نکتہ کو سمجھتے ہیں کہ فطرت نے اس جزو جسم کو نرم صرف اسی لئے بنایا ہے، جس قدر اعضا موٹی جلد کے ہیں اُسیقدر بطی الحس ہیں اور چونکہ لب نہایت نرم ہے اس لئے بیحد سریع الحس ہے۔ ایک خاتون کے پاس شمپنزی (بندر) کا ایک جوڑا تھا، ان کا طریقۂ اختلاط بالکل انسانوں کی طرح تھا، کبھی کبھی وہ مالکہ کے ہاتھوں کو بھی بوسہ دیتا۔ یہ سب واقعات اس پر دال ہیں کہ بوسہ انسان کا فطری شوق ہے۔

ایک اور نظریہ قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ حیوان مطلق اپنے جذبات و خواہشات کا اظہار عموماً مُنھ سے کرتے ہیں، جو کام مُنھ سے نہیں ہوسکتا اُسے اپنے پنجوں سے انجام دیتے ہیں۔ کُتّا خوش ہوتا ہے تو اپنے لبوں کو پاؤں پر رگڑتا ہے، جب وہ غصہ ہوتا ہے تو اُسی مُنھ سے وہ کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم کی مکھیوں کو بھی مُنھ سے بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان میں یہی صورتیں باقیات الصالحات کی طور پر موجود ہیں۔ بچے جب آپس میں لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو دانت سے کاٹتے ہیں، آدمی جب غصہ کرتا ہے تو اُسکے لب سکڑ جاتے ہیں، جب وہ خوش ہوتا ہے تو اُس کے لب پھیل جاتے ہیں جسے ہنسی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب وہ رنجیدہ ہوتا ہے تو اُس کے لب لٹک جاتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ محبت کرتا ہے تو اپنے لبوں کو محبوب کے جسم سے مس کرتا ہے۔

لبوں کے ذریعہ سے چوسنا بھی اپنی تاریخ رکھتا ہے۔ چوپائے اور انسان دونوں کے بچے دودھ چوس کر پیتے ہیں۔ بچوں کو تھن یا ماں کے سینہ سے بیحد محبت ہوتی ہے اور وہ کسی دوسرے کی دست اندازی کو نہایت رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہی وہ بچپن کی عادت ہے جو جوانی میں اس صورت سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کبھی انسان جوش جذبات میں اُسی حرکت پارینہ کا اعادہ کرتا ہے۔

اس فن کے ماہرین کے دیگر نظریات بھی قابل لحاظ ہیں۔ مارجری میرس (Marjorie Mears) نے اخبار سڈنی سن (Sydney Son) میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ابتداءً اس کی حیثیت سلام و توقیر کی تھی، لیکن اس کے ثبوت میں جو مثالیں پیش کی جاتی ہیں اُس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہی وہ بوسۂ تعظیمی ہے جس نے زمانہ کے ہاتھوں بوسۂ محبت کی صورت اختیار کرلی، میرا خیال ہے کہ بوسۂ تعظیمی بھی اسکی ایک قسم ہے، اور اس کو اصل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ول رازیٹر (Will Rossiter) کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا مادری شفقت سے ہے

ہومر (Homer) کے زمانہ تک اس کو عشق سے کوئی سروکار نہ تھا چنانچہ ہومر نے جو لفظ (Kuneos) استعمال کیا ہے اُس کے معنی اُس بوسہ کے ہیں جو باپ اپنے بیٹے کا لیتا ہے یا مظلوم دوست نگر کسی ظالم و زبردست کا بوسہ لیتا ہے۔ وینس (Venus) اور مارس (Mars) یولیسس (Ulysses) اور سرسس (Circe) پیرس (Paris) اور ہیلن (Helen) کے قصص گو محبت پر مبنی ہیں لیکن آپ تمام قصوں میں ایک جگہ بھی بوسہ کا نام نہ پائیں گے۔ یہی حالت ہیرا (Hera) اور زیوس (Zeus) کے قصہ کی ہے، جس جگہ ہیکٹر (Hector) اینڈرامیشی (Andromache) کو تسکین دیتا ہے وہاں آپ اُس کو میشی کا محض ہاتھ سینہ سے لگاتے ہوئے پائیں گے۔ قدیم مصر میں جو لفظ بوسہ کے لئے ہے اُس کے معنی سینہ سے لگانے کے ہیں نہ کہ لب چومنے کے۔

متاخرین شعرائے سنسکرت نے بوسہ کی بارہ قسمیں کی ہیں، لیکن متقدمین میں سب کے لئے صرف ایک لفظ "کوسی انی" مستعمل تھا جس کے لفظی معنی بوسۂ مادری ہے۔ کیانفو (ڈرامائی) اپنے شوہر کے سوگ میں محض اُن ہاتھوں کو پیار کرتی ہے جو اُسے لپٹائے تھے، یہی حالت شاہ کمبوڈیا کی ملکہ کی ہے۔ گاریسیو۔ جلد ا صفحہ ۳۳۲ (Garrucio) میں ہم دیکھتے ہیں کہ ماں اپنے بچہ کو زبان سے چاٹتی ہے اور باپ اُسے کھلاتا ہے لیکن بوسۂ لب کا کہیں ذکر نہیں۔

تیسرا گروہ اُن ماہرین فن کا ہے جو بوسہ کی ابتدا مذہبی احترام سے سمجھتے ہیں۔ مسلمان حجر اسود کا بوسہ لیتے ہیں۔ جوڈا نے حضرت مسیح کے ہاتھ چومے، حضرت مسیح کا جواب یہ بتا رہا ہے کہ انھوں نے اس کو بوسۂ تعظیمی نہیں سمجھا بلکہ اُسے بوسۂ محبت سے تعبیر کیا "کیا تو بنی انسان کو بوسہ سے دغا دینا چاہتا ہے؟" یہودیوں میں یہ رسم عام تھی کہ وہ جب کسی سے ملتے تو اُس کا بوسہ لیتے لیکن یہ بوسہ محض ہاتھ، سر، اور بازو کا ہوتا اور جب کبھی وہ کسی کا مذہبی احترام کرتے تو اُس کا پاؤں چومتے اور کبھی اُس کے نقشِ قدم کا بوسہ لیتے۔ عموماً یہودیوں کے نزدیک بوسہ کی تین قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔

(۱) بوسۂ تعظیمی۔

(۲) بوسۂ استقبالی۔

(۳) بوسۂ رخصتی۔

متعدد مذاہب میں بوسہ، احترام و عزت کے اظہار کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ ہوسیا باب ۱۳-۱–۲ میں جہاں بُت پرستی کا ذکر ہے وہاں ہمیں یہ جملہ ملتا ہے "وہ لوگ جو گائے کے بچوں کی قربانیاں کرتے ہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ وہ جانور کا بوسہ لیں" غیر مطمئن نبی سے یہ بھی کہدیا جاتا ہے کہ "بُت پرست بنی اسرائیل میں بھی سات ہزار ایسے زانو ہیں جو

بال کے سامنے خم نہیں ہوئے اور متعدد لب ہیں جنھوں نے اُس کا بوسہ نہیں لیا"

جس طرح آج ہم پیران طریقت کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں اُسی طرح رومن کیتھولک مذہب کے پیرو راہب پادریوں کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ سینٹ اگسٹائن (St. Augustine) نے بوسہ کی چار قسمیں کی ہیں۔

(۱) بوسۂ اتصالی۔ جب دو دشمن دوست بننا چاہتے تھے تب وہ آپسمیں ایک دوسرے کا بوسہ لیتے۔

(۲) بوسۂ امن۔ گرجا کے اندر عیسائی مخصوص مراسم کے وقت ایک دوسرے کا بوسہ لیتے۔

(۳) بوسۂ محبت۔ جب دو محبت کرنے والے ملتے تو اس سے لطف اندوز ہوتے۔

(۴) بوسۂ استقبالی۔ مہمان کا استقبال بوسہ سے کیا جاتا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں گرجا کے اندر اس کی اتنی کثرت ہوئی کہ وہی بوسۂ امن' بوسۂ محبت بنگیا۔ ایک مورخ نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ ان کی آواز سے گرجا گونج اُٹھتا تھا۔

یہود و عیسائی کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے اس کی تاریخ پر مزید روشنی پڑتی ہے اور اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اناجیل میں اس کی آٹھ مختلف اقسام ملتی ہیں۔

(۱) استقبال

۱۔ داؤد نے اپنے چہرہ کو زمین پر رکھدیا اور تین بار جھکے اور دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا اور خوب گلے ملکر روئے یہانتک کہ داؤد سبقت لے گئے (1 Samuel XX, 41)

۲۔ اپنے تمام بھائیوں کا پاک بوسہ سے خیر مقدم کرو (1 Thess V, 26)

۳۔ ایک دوسرے کو پاک بوسہ سے سلام کرو (Romans XVI, 16)

(۲) وداع

خدا تمھیں امن عطا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو اپنے شوہر کے مکان میں خوش و خرم رکھے تب اُسنے اُن لوگوں کا بوسہ لیا، اور اُنھوں نے اپنی آواز بلند کی اور روے۔ (Ruth I, 9)

(۳) صلح۔

تب جاب، بادشاہ کے پاس آیا اور اُس سے کہا۔ اور جب اُس نے ابسالم کو بلایا تب وہ بھی بادشاہ کے پاس آیا اور جھک کر بادشاہ کے سامنے اپنے چہرہ کو زمین پر رکھدیا اور تب بادشاہ نے ابسالم کا بوسہ لیا (II Sam XIV, 33)

(۴) حکومت

لڑکے کا بوسہ لو شاید وہ ناراض نہو اور تو راستہ سے فنا ہو جائے۔ (Psalm II, 12)

(۵) پرستش
تمام وہ زانو جو بال کے سامنے خم نہیں ہوئے اور ہر وہ لب جنے اُسکا بوسہ نہیں لیا (1 King XIX, 18)

(۶) تحسین
ہر شخص اُس کے لب چومیگا جو صحیح جواب دے گا۔ (Pro XXIV, 26)

(۷) مکر
جس نے اُس کو مصیبت میں پھنسایا اُس نے اُن لوگوں سے یہ علامت بتائی تھی کہ میں جس کا بوسہ لوں وہ شخص وہی ہوگا، اُس کو مضبوط پکڑ لینا، وہ فوراً حضرت مسیح کے پاس آیا اور کہا:- میرے آقا خوش آمدید! یہ کہکر اُس نے مسیح کا بوسہ لے لیا (Math XXVI, 48, 49)

(۸) محبت
اور حضرت یوسف اپنے باپ کے چہرے سے لپٹ گئے، خوب روئے اور اُنکا بوسہ لے لیا (Gen L, 1)

شاعرانہ تخیل

یہانتک تو تاریخ کا واقعی پہلو تھا، اب اس کی وہ تاریخ بھی قابل لحاظ ہے جو شاعری نے پیش کی ہے یہ ہر چند واقعیت سے معرا ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں چونکہ بحث کا پہلو خود لطیف ہے اس لئے شاعر کی زبان سے اس کی تاریخ بھی زیادہ لطیف ہوگی۔

"حضرت آدم کی پیدایش دُنیائے محبت کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ اگر آدم کی پیدائش کا مقصود صرف طاعت تھا تو فرشتہ کیا کم تھے۔ خدا نے انسان کو صرف اس لئے خود سے جدا کیا تھا کہ

(چاہتا ہوں) وہ بھی سیکھے رمزِ آزادیِ زیست — دہر میں وہ بھی اُٹھالے حریت کا کچھ مزا
مبتلائے دردِ فرقت کرکے میں سمجھا تھا یہ — جذبِ خودداری کرے گا اُسمیں کچھ نشو ونما
اور وہ چاہیگا ہر لحظہ کہ میں دریا بنوں — اس طرح روحانیت میں اُسکی ہوگا ارتقا

ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں "یعبدون" کے معنی بھی یہی ہیں۔ بہتر بننے کی خواہش اور اُس کے مطابق سعیٔ عمل ہی کا نام عبادت ہے۔ عبادت کے معنی روزہ نماز، پوجا و پرستش کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہ محبت آگیں سعی حیات ہے جس میں انسان نقائص کو رفع کر کے اپنی ذات کو مستجمع الصفات بناتا ہے۔

اس لئے اس آخری منزل تک پہونچنے کے لئے کوئی شے ترغیب عمل کے لئے ہونی چاہئے تھی۔ یہی شے محبت ہے۔ یہی محبت ذریعہ ہے خدا تک پہونچنے کا۔ اور یہی الفت وہ آلہ ہے جس سے ہم نقائص کو رفع کر کے کامل بن سکتے ہیں۔

آدم کی تخلیق نے فرشتوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ کسی نے خونریزی کی پیشین گوئی کی۔ کسی نے کہا

خودگرے، خود شکنے۔ خودنگرے پیدا شد

شیطان کا جواب سب سے جدا تھا

نوری ناداں نیم - سجدہ بآدم برم!
او بہ نہاد است بت من بہ نژاد آذرم!

لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے آدم کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا اور چلا اُٹھے

حذر اے پردہ گیاں! پردہ درے پیدا شد

لیکن زندگی کی مسرت قابل دید تھی

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

آدم کو جنت میں قیام کا حکم ملا۔ جنت میں ہر شے اُن کے خواہش کے مطابق ملی۔ چندے تو وہ اس سے لطف اندوز رہے لیکن پھر طبیعت اُلجھنے لگی۔ آدم کی یہ پریشانی نہایت لطیف نکات رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کی سرشت میں محبت مخفی ہے۔ آدم کی جسمانی ساخت جذبۂ محبت کی مقتضی تھی اور چونکہ ذریعۂ اظہار مفقود تھا اس لئے طبیعت میں اُلجھن تھی۔ حوّا کی تخلیق نہ صرف آدم کے دل بہلانے کے لئے تھی بلکہ اس طرح خدا نے آدم کے لئے وہ ذریعہ محبت پیدا کیا جس کی تپش مرد کو جلا کر خدا کی محبت کے لائق بنا دیتی ہے۔ آدم کو جنت میں "سکون دوام" ضرور حاصل تھا۔ لیکن یہ سکون، سکون نہ تھا بلکہ جمود تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حوّا کی تخلیق کے بعد وہ دُنیا میں نہ آتے تو وہ لطفِ زندگی سے محروم رہتے۔ آدم کی جنتی زندگی نہ ناقص تھی اور نہ کامل وہ معلق تھی اس لئے اُس میں ترقی کا امکان نہ تھا۔ نقص محتاج کمال ہوتا ہے۔ دُنیا کی زندگی ایک گونہ تکمیل کا نوید تھا۔

آدم کی اس ضرورت کو خدا نے محسوس کیا اور حوّا کی تخلیق ہوئی۔ آدم غنودگی سے بیدار ہوئے تو اُنھیں ایک عجیب و غریب شئے نظر آئی۔ پہلے تو وہ سمجھے کہ یہ بھی کوئی فرشتہ ہے۔ وہ بائیں ہاتھ پر زور دیکر تھوڑا اُٹھے تھے کہ اُن کی آنکھیں حوّا سے دوچار ہوئیں۔ "اے، ہے! یہ کیا؟ ہم جنس و ہم شکل لیکن متضاد"۔ آدم کو اپنے نقایص یاد آئے، خیال آیا کہ کہیں ذریعہ تکمیل یہی تو نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک حوّا کو دیکھتے رہے۔ اس خیال سے کہ مبادا وہ کہیں غائب نہو جائے، آدم نے حوّا کو ہاتھ نہیں لگایا، آدم نے یہ محسوس کیا کہ حوّا کا خوبصورت جسم ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ ایک طرف اجنبیت اور یہ خوف کہ چھوتے ہی کہیں غائب نہو جائے آدم کو روک رہا تھا اور دوسری طرف استعجاب اور کشش ترغیب دے رہی تھی کہ اس عجیب و غریب شئے کو اچھی طرح دیکھا بھالا جائے۔ اس کشمکش میں آدم تھوڑی دیر تک مبتلا رہے۔ بالآخر جھک کر حوّا کے چہرہ کو بغور دیکھنے لگے۔ حوّا کے نتھنوں سے جو سانس برآمد ہوئی اُس کی خوشبو جنت کے بہترین پھولوں سے بھی زیادہ روح افزا تھی آدم پر ایک پرلطف مستی طاری تھی اور اُن کے جسم پر ایک ارتعاش خفی ساری تھا۔ جذبات سے بےخود ہوکر اُنھوں نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز لبوں تک آکر رہگئی۔ اب آدم کے لب تمام جذبات و محسوسات کے مرکز تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان لبوں کو حوّا کے جسم سے مس کریں۔ جگہ سمجھ میں نہیں آئی۔ حوّا کے جسم میں ایسے حصے بھی تھے جو آدم میں مفقود تھے لیکن یہی فقدان بجائے تجسس خوف کا باعث ہوا۔ مثل کو مثل سے رغبت ہوتی ہے۔ آدم نے اپنے لب حوّا کے لب سے مس کردئے

یہ تھا انسان کا بوسۂ اولیں

حوّا نے آنکھیں کھول دیں اور آدم کو سینہ سے لگا لیا۔ آدم نے اُسوقت وہ لذت محسوس کی جو ساری عمر اُن کو جنت میں نصیب نہ ہوئی تھی۔ "میرے پیارے شوہر"، حوّا نے یوں گفتگو شروع کی "میں تیری زوجہ اور ہمنشین ہوں۔ میری تخلیق کا مقصد تیرے نقائص کی تکمیل ہے۔ میں ہی جنت ہوں۔ یہ لہلہاتے ہوئے سبزے یہ صاف و شفاف نہریں، یہ چڑیوں کے ترنم ریز چہچہے، یہ سب کچھ بغیر میرے تیرے لئے بےسود تھے۔ میں تیرے جسم کا ایک حصہ ہوں اور اگر تو سمجھے تو بہتر حصہ ہوں، گو تو اشرف المخلوقات تھا لیکن اس تیرے شرف کی نمایش میری تخلیق پر منحصر تھی: میرے ذریعہ سے تم ایک مخصوص نوع مخلوق کے بانی ہوگے ......"

آدم یہ سُنکر بیحد گھبرائے، "یسفک الدماء" کی ہولناک پیشین گوئی یاد آگئی اور اُنھوں نے خود کو حوّا کی آغوش سے علیحدہ کرنا چاہا۔ حوّا بولیں:۔ "میں تمھارے خیالات کو سمجھ گئی، یہ پیشین گوئی صحیح ہوکر رہے گی لیکن یہ خونریزیاں کشمکش حیات کا وہ جزو ہیں جن کے بغیر زندگی کی تکمیل ناممکن ہے۔ جو پیام حیات لیکر آئے ہیں وہ آزادی و حریت کا طالب ہے۔ حریت و آزادی عطا نہیں ہوتی بلکہ حاصل کی جاتی ہے اور یہ تحصیل حریت بغیر "سفک دم"

ناممکن ہے۔ تم گھبراؤ نہیں، ہمارا پیام حیات، پیغام امن ہے۔ مگر زندگی متضاد عناصر کے تصادم سے پیدا ہوئی ہے اس لئے ہمارا پیام امن گو باطل کے خلاف نوید جنگ ہے، لیکن فتح باطل اس کا مقصود ہے۔ آدم پر اس تقریر کا بیحد اثر ہوا۔ اُنھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

حوّا نے کہا: میرے پیارے۔ اسوقت تم آیندہ کی اسدرجہ فکر نہ کرو، میں ایک خوشنما پھل ہوں جو صرف تمھارے لطف کے لئے پیدا ہوئی۔ یہ کہکر حوّا نے آدم کا مُنھ چوم لیا۔

یہ تھا انسان کا دوسرا بوسہ

ملٹن (Milton) مشہور انگریز شاعر نے "فردوس گمشدہ" (Paradise lost) میں آدم کے بوسہ کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی شاعرانہ نقطۂ نظر سے قابل لحاظ ہے۔ لکھتا ہے:۔

"حوّا کے مطیع و دلکش حُسن سے خوش ہو کر آدم مسکرائے۔ اس تبسم میں اعلیٰ محبت شامل تھی جسطرح جیوپٹر اپنی محبوبہ جونو کو دیکھکر مسکراتا ہے جب وہ اپنے دوش پر بادلوں کو لیکر چلتا ہے جو بہار کے پھول برساتے ہیں، آدم نے اُسی تبسم سے حوّا کے لب پر پاک بوسے دئے"

جانس اڈورڈ (Johannes Edward) مشہور امریکن شاعر نے اس کی ابتدا کا کچھ اور ہی واقعہ بتایا ہے لکھتا ہے:۔

"محبت کی ملکہ نے جب نوعمر اسیکنیس (Ascanius) کو سی تھی ریا (Cytheria)
"کے عالی شان باغ میں اُڑا کر پہونچایا تو اُس نے سوتے ہوئے لڑکے کو مسہری پر لٹا دیا۔
"یہ مسہری نورس گلِ بنفشہ سے معطر تھی اور مسرت بخش کنج چمن کے پھولوں سے لدا ہوا تھا
"اور فرحت افزا شمیم عطر بیزی میں مصروف تھی"
"جسوقت ملکہ روح افزا خیالات سے لطف اُٹھا رہی تھی"
"گمشدہ ایڈونس (Adonis) کی یاد نے یک بیک اسے اپنی طرف مایل کر لیا
"اکثر جب اُس کے حُسن کی یادیں آتی ملکہ کا دل بے اختیار خوابیدہ لڑکے کو گلے سے لگا لینے کے لئے مچلتا،
"کتنی بار اُس نے اُس کی ہر ادا کی تعریف کی" ایڈونس بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اُس کی صورت بالکل اس سے مشابہ تھی

اس خوف سے کہ مبادا نوعمر لڑکے کی نیند نہ خراب ہو ملکہ نے مسرت سے بیخود ہو کر ہر پھول کا بوسہ لیا
ہر ایک نوخیز کلی جو ابھی تک سپید تھی، دیکھتے ہی دیکھتے لالہ گوں ہوگئی

ٹرپ ٹولیمس (Trip tolemus) جب زمین پر "زرباری" کرتا ہے اُسوقت
"حسین سی تھرتھراتی ہوا میں اُڑی اور اُس نے زمین پر ہزارہا بوسے برسائے
بلندی سے وہ خوش ہوکر مسحور سرزمین کو دیکھ رہی تھی اور اُسکے لبوں سے تین بار سحر کے کلمات نکلے
ٹرپ ٹولیمس نے تو زمین کو قوت نمو دی
لیکن سی تھی ریانے وہ شیرینی عطا کی جو ہمارے درد کی دوا ہے۔

بوسۂ اولین

آج مغرب کی ترقی کا راز محض اُس کی "پردہ دری" ہے۔ وہ ہر شے کے راز کو دریافت کرنا چاہتا ہے اور اُس کی کامیابی صرف اس لئے قطعی ہے کہ "اہل راز" اُس کی اعانت کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ آج وہ اُن اُمور پر حاوی ہیں جو کبھی ہمارے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔ میں نے انگریزی کی معرکتہ الآرا تصنیف "عورتوں میں احساس شہوت کا فقدان" دیکھی ہے، مصنف نے کتاب مذکور طبی نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور اس مرض کے متعدد علاج بتائے ہیں، سب سے تعجب خیز امر جو اس کتاب میں مجھے نظر آیا وہ یہ تھا کہ ہزارہا عالی خاندان خاتونوں نے اپنے حالات بے کم وکاست ڈاکٹر سے بیان کردئے، جن کو پیش نظر رکھکر مصنف نے ایک عام اُصول مرض اور علاج ایجاد کیا ہے۔ مشرق میں اس تحقیق کا دروازہ صرف اس لئے بند ہے کہ ہم میں اخلاقی جرات مفقود ہے خواہ "پسِ پردہ" کچھ بھی کیوں نہ ہوتا ہو لیکن ظاہر پرستی کا زندگی میں ممتاز خصوصیت رکھنا ضروریات سے ہے۔

بوسہ کی لذت سے ہر شخص واقف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ "بوسۂ اولین" کس حد تک لذت بخش ہوتا ہے افسوس کہ اس کا جواب مجھے صرف علماء مغرب کی کتابوں میں نظر آیا۔ اگر ہمارے سامنے متعدد تجربات موجود ہوں تو ہم اُس حالت میں اس زبردست انسانی ادارہ کو قومی وملکی خصائل کے لحاظ سے معین ومرتب کرسکتے ہیں اور اُسوقت طب کی موجودہ جنگ جو بوسہ کے خلاف جاری ہے وہ بڑی حد تک کمزور ہوجائے گی۔

ایک مغربی دوشیزہ کا بیان ہے کہ وہ اس سے پہلے ناآشنا تھی اور جب پہلی مرتبہ اس کا تجربہ ہوا اُسوقت اُس پر ایک غشی سی طاری ہوگئی۔ اُس کا دم گھٹنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسے گھر میں بیٹھی ہوئی جس کے ہر چہار طرف گل بنفشہ پھول رہا ہے، لیکن اُس مکان کے حجرہ کے گلاب ولالہ سے بند کردئے گئے ہیں۔

ایک دوسری لڑکی کا بیان ہے کہ جب سب سے پہلے اس کا تجربہ ہوا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں "گلزارِ خلیل" میں ہوں۔ جسم جل رہا تھا لیکن قلب خوش تھا۔

ایک اور عورت کا بیان ہے کہ "سب سے پہلا بوسہ مری مرضی کے خلاف لیا گیا اور ایسے شخص نے لیا جس سے مجھے مطلق محبت نہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے مدتوں اس سے نفرت رہی، اب بھی جب کبھی بوسہ کا خیال آتا ہے تو وہی نفرت انگیز خیال دماغ پر مسلط ہوجاتا ہے جس سے طبیعت میں ایک طرح کی نفرت پیدا ہوجاتی ہے" ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شب عروسی کی طرح بوسۂ اولیں بھی تلخ و شیریں تجربات رکھتا ہے جس کا اگر علاج نہ کیا جائے تو یہ تمام عمر قایم رہتا ہے۔

ایک دوسری خاتون کا بیان ہے کہ:-

"میں اس عمل سے خائف تھی کیونکہ میں اُسے اپنی عصمت کے خلاف تصور کرتی تھی۔ میری ہمجولیاں اکثر اس مسرت کا بیان کیا کرتی تھیں لیکن مجھے ہمت نہ ہوتی۔ اُس نے بارہا اپنے لب میرے لب کے قریب رکھے لیکن میں ہمیشہ بچتی رہی۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ جب اُس کے حسین لب میرے لبوں کے قریب آتے تو اُن میں ایک قسم کی نہایت لطف انگیز خلش پیدا ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ میری ساری روح سمٹ کر لب پر آجانا چاہتی ہے۔ بالآخر ایک دن میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوگئی........

گو دسمبر کا مہینہ تھا لیکن مری پیشانی پر پسینے کے قطرے آگئے۔ قلب کو ایک تکلیف ہوئی، لیکن وہ تکلیف مسرت خیز تھی اس لئے کہ ابتک میں اُس لطف کو یاد کرکے اپنے لب چاٹ لیتی ہوں"۔

ایک شریف خاندان کی دوشیزہ کا بیان ہے کہ اُس نے بارہ سال تک جس معصوم فضا میں پرورش پائی وہ داستان عشق و محبت سے یکسر معرا تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کے لطف و مسرت سے بالکل ناآشنا تھی ایک دن اُس کے ہم سبق نے اجازت طلب کی۔ میں نے کہا یہ کیا چیز ہے اس نے اپنا مفہوم بتانے کی کوشش کی اور اُس کے پرلطف اثرات کو واضح کیا۔

میں نے کہا:- نہیں، نہیں۔ تم میرے لبوں کو دانتوں سے کاٹنا چاہتے ہو۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس میں تم کو یا مجھے کیا لذت ملے گی۔

اُس ہوشیار لڑکے نے ہفتوں اپنا اصرار جاری رکھا، اس درمیان میں میرے دل میں ایک موانست سی پیدا ہو رہی تھی اور میری آنکھیں اُس کی غیر موجودگی میں اُس کو تلاش کرتیں۔ ہفتوں کے اصرار کے بعد میں نے دست بوسی کی اجازت دی۔ میرے نرم و نازک ہاتھ اُس کے لبوں کی حرارت سے جل اُٹھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک ایک بجلی دوڑ گئی۔ میرے قلب کو جب اطمینان ہوا تب میں اپنی پریشانی پر نادم تھی،

اس لئے کہ وہ برق برق محبت تھی جو اپنا کام کر چکی تھی۔ دوسرے دن میری پیشانی چومی گئی، چوتھے دن میری آنکھیں، پانچویں روز میرے رخسار، آخر میری لب بھی اس سے نہ بچ سکے۔ "تدریجی ترقی" نے غیر معمولی فرق محسوس نہیں ہونے دیا لیکن ہاں میں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ بوسۂ لب انتہائی درجہ مسرت انگیز تھے۔

ایک مغربی نوجوان لڑکی کے تجربات اولین بھی لائق ملاحظہ ہیں لکھتی ہے:۔ "میرے جسم کی یہ حالت تھی گویا متعدد محبت کے فرشتے گاڑیوں پر بیٹھے ہوئے رگوں میں دوڑ رہے ہیں اور اُن کے ہمراہ کچھ لوگ ہیں جن کے پاؤں ہیرے کے ہیں۔ گاڑی پر قوس قزح اپنا سایہ کئے ہوئے ہے۔"

آخری بوسہ

بوسۂ اولین کے لطف و مسرت سے واقفیت کے بعد آخری بوسہ کا بھی علم ضروری ہے۔ ایک طرف طویل مفارقت کا خیال، دوسری طرف تلافی مافات کی کوشش غرض الوداعی بوسے دو متضاد جذبات کی کشمکش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخری بوسہ عموماً طویل ہوتا ہے، لب تجدید حلاوت کے لئے جدا ہوتے ہیں اور پھر ملتے ہیں، ملتے ہیں اور پھر جدا ہوتے ہیں، ایک عورت کا بیان ہے:۔

"خدا نہ کرے کہ وہ دن پھر آئے جب وہ مجھ سے جدا ہوں، اُنھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میرے لبوں پر اپنے لب رکھدئے، اُن کے لب کبھی کبھی تجدید لذت کے لئے جدا ہوتے تھے لیکن میں تو اُسکو دم لینے کا ضروری وقفہ سمجھتی ہوں، بوسۂ اولین کے لطف بھی میں نے اُٹھائے ہیں لیکن اُن میں وہ دردانگیز مسرت نہ تھی۔ میں تو دونوں میں صرف یہ فرق سمجھ سکی ہوں کہ بوسۂ اولین لطف دردآمیز تھا اور بوسۂ آخر رنج نشاط انگیز۔"

ایک مرد کے تجربات بھی دلچسپی سے خالی نہیں، مرد و عورت کے جذبات کا تقابل پرلطف ہے، عورت کے سامنے مفارقت کی تکلیفیں ہیں، برخلاف اُس کے مرد پر تلافی مافات کا خیال غالب ہے۔

رخصت سے قبل میں نے اُنھیں سینہ سے لگا لیا اور اُن کے لب چوم لئے، یہ خیال کہ دیکھئے اب یہ لطف کب میسر ہوتا ہے مجھے مجبور کر رہا تھا کہ آیندہ زمانۂ فرقت کی ساری کمی ابھی پوری کر لوں۔ آج یہ پہلا اتفاق تھا کہ میں نے اپنے لبوں سے اُن کے لبوں کو گرم پایا، میں پریشان تھا لیکن وہ متانت اور سنجیدگی کا ایک مجسمہ تھیں۔

اس رخصت میں تو پھر بھی اُمید ملاقات ہوتی ہے لیکن اُس بوسہ کی حسرت انگیزیاں نہ پوچھئے جو یہ سمجھ کر لیا جا رہا ہو کہ یہ زندگی کا آخری بوسہ ہے۔ ایک شخص اپنی ساری زندگی کی "کمائی" کو سپردِ خاک کرنے سے قبل اُس کا بوسہ لیتا ہے، بڈھے باپ نے بچپن سے جوانی تک اپنے بچہ کے ہزارہا بوسے لئے ہوں گے۔ کبھی ارادتاً، کبھی غیر ارادتاً، کبھی ازراہِ محبت، کبھی منانے کے لئے، کبھی سفر سے آکر اور کبھی سفر کو جاتے ہوئے لیکن اُنیں سے ایک بھی اس بوسۂ میت کے مقابل نہ تھا،

"ادارۂ موت" سے زیادہ حیرت انگیز دُنیا کی کوئی شے نہیں۔ اسدرجہ لازمی و یقینی پھر بھی اتنی غیر معین۔ نہ "ایک ساعت مقدم نہ ایک ساعت موخر" پھر بھی اسدرجہ غفلت خیز۔ موت کا پہلا اثر انسان کے قلب پر غم انگیز ہوتا ہے اور اُسے فوراً اپنی موت، یاد آجاتی ہے لیکن انسان کے جسم کی ترکیب کچھ ایسی تغافل خیز ہو کہ یہ اثر ایک لمحہ سے زیادہ قایم نہیں رہتا۔

بڈھا باپ (مگر اب اُسے 'باپ' کیوں کہئے اس لئے کہ اُس کی اکلوتی اولاد دُنیا سے چل بسی اور اُسی کے ساتھ یہ رشتہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا) چیخیں مار کر میت پر گر پڑتا ہے۔ قبر تیار ہے، لوگ مستعجل ہیں کہ میت جلد سپردِ خاک کر دی جائے اس لئے نہیں کہ اُس کا مستقر آغوش پھیلائے ہوئے منتظر ہے، یہ سب فریب نفس ہے اصلیت یہ ہے کہ یہ نعش وبالِ جان ہے،

لوگ 'محروم پسر' باپ کو سمجھاتے ہیں اور نعش سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آخری بوسہ کیلئے اپنے زندہ لبوں کو میت کے مردہ لبوں پر رکھدیتا ہے، جوشِ غم میں اُس کے دماغ سے یہ بات فوراً نکلجاتی ہو کہ وہ ایک نعش کا بوسہ لے رہا ہے۔ لبوں کو بحس و بے جان پاکر وہ گھبراہٹ میں میت کی پیشانی پر امتحانِ حرارت کے لئے ہاتھ رکھدیتا ہے۔ مستعجل اعزہ کی گفتگو اُسے پھر حقیقت واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہو اور وہ رونے لگتا ہو

"میرے دل کے ٹکڑے! آج سے قبل میں نے تمھارے لب مختلف جذبات سے متاثر ہو کر چوسے تھے،

لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ آج وہی "چار لب" آخری بوسہ کے لئے بھی کبھی متحد ہوں گے۔

میرے لختِ جگر! آج تم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہو، وہ دن دور نہیں جب ہم اور تم پھر ملینگے....

آخری جملہ نے ضعیف العمر باپ کے ذہن کو اپنی موت یاد دلادی۔ اُسوقت وہ میت کے سوگ سے بالکل خالی الذہن تھا۔ ایک لمحہ کے اندر نہایت سرعت و تیزی سے صدہا مربوط و غیر مربوط خیالات اُس کے دماغ میں آئے اور چلے گئے "میری علالت اور طویل علالت، اعزہ کی بے اعتنائی، کم مائگی کی باعث تیمارداری میں کوتاہی، افلاس، پریشانی، بالآخر تکلیف نزع اور موت، غسل، تجہیز و تکفین، (یہانتک تو آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے واقعات نے اُس کی مدد کی) ذہن کا رُکنا تھا کہ معاً اُسے یہ خیال آیا کہ موت کہیں متعدی

تو نہیں، اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے گھبرا کر نعش چھوڑ دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسوقت اُس کا ذہن خالی تھا۔
لوگوں نے نعش اُٹھائی اور سپردِ خاک کر دی۔

ایک گمنام امریکن شاعر نے ایک نظم بعنوان "تین بوسے" تحریر کی ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنے گذشتہ واقعات کو بیان کرتا ہے:۔

"میں نے اُس کے خوبصورت، شیریں اور پاک چہرہ کو ہاتھوں سے بلند کیا
"اُس کی آنکھیں جوشِ محبت سے سرشار تھیں
"میں اُس مرتعش بوسہ کو کبھی نہیں بھول سکتا
"جس نے ہم دونوں کے دل مسرت سے پر کر دئے۔

شاعر نے اس محبوبہ سے عقد کر لیا مگر افسوس کہ دونوں کی مسرت دس سال سے زیادہ قایم نہ رہ سکی اور بیوی کا انتقال ہوگیا۔ ایک دن وہ اپنی محبوبہ کی یاد میں رو رہا تھا کہ اُس کے لختِ جگر نے آکر اپنی باہیں باپ کے گلے میں ڈالدیں۔ باپ کا دل بھر آیا اور اُس نے اپنے لبوں کو جو آج تک محبوبہ کی یاد میں مست تھے بچّہ کے لبوں پر رکھدئے، لکھتا ہے:۔

"میں نے بے اختیار ہوکر بچّہ کو سینہ سے لگا لیا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے
"وحشت زدہ جذبات کی پریشانیوں میں اُمید کی ایک کرن نظر آئی

"پیارے لختِ جگر! تیری ماں کی روح اُسی ایک بوسہ میں شامل تھی
"مرد دنیاوی کشمکشِ حیات میں ایک مسرت محسوس کرتا ہے، لیکن
"بہت ممکن ہے کہ اس سے خالص تر محبت مرنے کے بعد نصیب ہو۔

ایک دوسری نظم "دو بوسے" کا حسبِ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"تمنے اپنا سر جھکا لیا، مجھے سینہ سے لگایا اور اپنے گرم لبوں کو میرے لبوں پر رکھدیا
"تمنے اپنے نازک ہاتھوں میں میرے بالوں کو لیکر کھیلنا شروع کیا۔
"میرا قلب خوشی سے اُچھل رہا تھا۔ اور میری روح پاک مسرت سے مملو تھی
"میں نے تمھاری روشن آنکھوں سے اپنی آنکھیں ملائیں جب سب سے پہلے تمنے شیریں بوسے دئے۔
"اس کے بعد ایامِ ہجر شروع ہوئے اور میں تمھاری غیر موجودگی سے پہلو میں درد محسوس کرتی تھی
"جبکہ سب سے پہلے تمنے مجھے شیریں بوسے دئے تھے اُس یاد میں میں تمھارے روئے تاباں کو دیکھ رہی ہوں۔

میں آج اُس قدیم گلی میں دوبارہ کھڑی ہوں لیکن اب ساری پتیاں زرد اور مرجھائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں
پردہ، دمحزوں دل سے میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تم کسی اور کا بوسہ لے رہے ہو۔

انسان کا جسم برقی رَو سے مملو ہے جو بوقت اتحاد ایک دوسرے میں سرایت کرتی ہے۔ انسان کے تمام جذبات ایک برقی قوت رکھتے ہیں جو بغیر اتحاد جسم بھی موثر ہوتے ہیں۔ آپ جب کسی سے آنکھیں ملاتے ہیں تو برق نظر کام کرتی ہے، چنانچہ فارسی میں "چشم مروت" کا یہی ماخذ ہے۔ اتحاد جسم کے بعد جذبۂ موجودہ اور زیادہ سریع الاثر ہوجاتا ہے۔ مغربی اقوام میں ہاتھ ملانے کی موجودہ رسم اسی اُصول پر مبنی ہے۔ ملاقات کے وقت بغلگیری کی رسم کے موجد اہلِ روما کہے جاتے ہیں بارھویں صدی عیسوی میں یہ رسم تمام یورپ میں جاری تھی۔ رسم بوسہ کی کمی کے ساتھ ساتھ اس رسم میں بھی کمی پیدا ہوتی گئی یہانتک کہ اب یہ دونوں رسمیں محض "شغل الفت" کے لئے مخصوص کردی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس رسم میں کمی کا سبب صرف انسان کی عموماً اور یورپ کی خصوصاً وہ ظاہر دارانہ طرز معاشرت ہے جس میں خلوص روز بروز مفقود ہوتا جارہا ہے۔

رسولِ عربی کے زمانہ میں بھی ہاتھ ملانے کی رسم جاری تھی اور معانقہ کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مسلمانوں کے اس اُصول ملاقات کی ایک مخصوص صورت یہ تھی کہ وہ صرف ملاقات کے وقت ہاتھ ملاتے اور بغلگیر ہوتے لیکن بوقت رخصت اس رسم پر عملدرآمد نہ ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اسلام نے "قضیہ زمین" کو ہمیشہ "برسر زمین" ختم کرنے کی کوشش کی اس لئے کہ مبادا شخصی تعلقات کے پس ماندہ اثرات ایک مسلمان کو اُس اعلیٰ معیار حیات سے بے خبر نہ کردیں جہاں محض اخوت عامہ کا اُصول کارفرما ہے۔ عموماً معانقہ کفار سے ممنوع ہے۔ سیوا جی کا واقعہ اس اُصول کی مصلحت کو واضح کررہا ہے۔

ہندوؤں میں ہاتھ ملانے کی رسم نہیں پائی جاتی۔ معانقہ کی رسم قدیم ہندی تمدن کا جزو تھی اور ابتک تقریبوں میں یہ رسم جاری ہے۔ اس توضیح سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ نہ صرف اُصولِ عشق و محبت معانقہ کے مقتضی ہیں بلکہ یہ رسم عام انسانی زندگی میں بھی فائدہ کے ساتھ جاری رہ چکی ہے۔

بچوں سے اس کا تعلق

ابتدائی صفحات میں میں وہ نظریہ بیان کرچکا ہوں جس میں اس کی ابتداء کو بچوں سے منسوب کیا گیا ہے محبت کے گوناگوں لطائف نے اس کو بھی ایک فن بنادیا ہے مگر افسوس ہے کہ بچوں کے بوسہ کو ماہرینِ فن

نے نظر انداز کرکے اپنی تمام تر توجہ محبت جنسی ہی کیجانب مبذول کردی ہے۔

بچہ بوسہ سے بیحد خوش ہوتا ہے اُس کا معصوم قلب صرف اسی کو اظہار محبت کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ ایک عورت نے بوجہ مرض دہن کئی روز تک اپنے بچّہ کو پیار نہیں کیا، ایک دن بچہ نے رو کر پوچھا "امی! کیا تم مجھ سے ناخوش ہو؟"

ماں "نہیں بیٹا، یہ تمھیں کیونکر معلوم ہوا" لڑکے کا برجستہ جواب یہ تھا کہ تم نے کئی دن سے میرا منھ نہیں چوما"

اس واقعہ سے بچوں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بوسہ کو اظہار محبت کا واحد طریقہ سمجھتے ہیں۔

بچوں کے لبوں کا بوسہ عموماً متعدی امراض کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔ بچّوں کی پیشانی چومنا زیادہ مناسب ہے۔ بچّوں کے بوسہ میں اُن اُصول کی پابندی جو بوسۂ محبت میں ہوتی ہے مطلقاً نہیں ہونی چاہیئے۔ میں ایک چھ برس کی بچّی کو جانتا ہوں جو بوسہ کے جواب میں اس طرح بوسہ لیتی تھی جس طرح کہ نوجوان عورت جوشِ محبت میں لیا کرتی ہے۔ اس لئے وہی اُصول اگر بچّوں کے ساتھ برتے جائیں گے تو نہ صرف اُن کی اخلاق پر اس کا برا اثر پڑے گا بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ قبل از وقت بالغ ہوجائیں گے جو اُن کی صحت کے لئے بیحد مضر ہے۔

بچوں کا بوسہ لیجئے لیکن خود بچوں کو بوسہ کی تعلیم دینا نامناسب ہے۔ بچّوں کا بوسہ جوش وخروش سے بھی نہیں لینا چاہیئے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن کا طویل بوسہ اُن کے دم روک دیتا ہے اور وہ پریشان ہوکر تڑپنے لگتے ہیں۔ یکبارگی جھپٹ کر بھی بچّوں کا بوسہ نہیں لینا چاہیئے اس سے وہ خائف ہوجاتے ہیں اور پھر بوسہ لینے والے کی صورت دیکھکر روتے ہیں۔

مسٹر لیوس ای میک کاس (Lewis E Maccomas) ایک امریکن کانگرس مین (Congress man) اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے بچوں کے بوسہ لینے کے طریقہ کو فنی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے۔ لیوس، نے جو طریقہ بتایا ہے اُس سے میں مطلق متفق نہیں لیکن واقفیت کے لئے اُسکا تذکرہ بیجا نہوگا۔

سب سے پہلے وہ بچّہ کو ایک اونچی جگہ پر کھڑا کرتا ہے تاکہ اُس کا سر لیوس کے سر کی سطح کے برابر آجائے پھر اُس کے بعد وہ بچّہ کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے تھوڑی دیر دیکھتا ہے۔ جس طرح کہ ایک ماں اپنے گم شدہ بچہ کو دوڑ کر چھاتی سے لگالیتی ہے اُس طرح وہ یکبارگی اُس کو اپنے سینہ سے لگالیتا ہے۔ تھوڑی دیر تک سینہ سے لگائے رہنے کے بعد وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو بچّہ کی بغلوں میں ڈالکر اُٹھالیتا ہے اور تھوڑی دیر اُسی حالت میں رکھکر محبت آمیز نظروں سے دوبارہ دیکھتا ہے۔ پھر وہ بچّہ کو نیچے لاکر نہایت جوش وخروش سے اُس کے لب چومتا ہے۔

فلسفہ

آدم کے قصہ کے ساتھ میں یہ دکھا چکا ہوں کہ لب جسم انسانی کا نہایت ذکی الحس حصہ ہے، اسلئے جذبات اپنا مظہر اسی کو بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بوسہ اظہار محبت کا ایک خاموش طریقہ ہے۔ خیالات کے اظہار کا عام طریقہ گفتگو ہے اور گفتگو زبان و لب کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے لازماً بوسہ کا ذریعہ بھی لب ہی ہوسکتا ہے۔ جس طرح گفتگو میں لب ہلتے ہیں اُسی طرح بوسہ کے وقت بھی لب متحد ہوجاتے ہیں۔ میرے اس نظریہ کی تائید میں آپ یہ حقیقت دلچسپی سے سنیں گے کہ گونگوں میں بوسہ کی خواہش تقریباً مفقود ہوتی ہے چونکہ وہ نطق سے یکسر معرا ہوتے ہیں اس لئے بوسہ سے جو گفتگو کا ایک خاموش طریقہ ہے وہ ناواقف ہوتے ہیں۔

لب کے بعد احساس کی ذکاوت آنکھوں میں ہوتی ہے۔ موجودہ تحقیقات تو آنکھوں کو افضل ثابت کررہی ہے۔ لب تو تموج اثیری کے لئے حرکت کے محتاج ہیں لیکن آنکھیں اپنی خاموش بصارت سے اتنی قوی شعاعیں خارج کرتی ہیں جو صدہا میل تک جاسکتی ہیں۔ بااینہمہ جہاں تک اظہار محبت کا سوال ہے میں یہی کہوں گا کہ لب کے بعد احساس کی ذکاوت آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کے ثبوت میں ایک معمولی لیکن نہایت لطیف نکتہ عرض کردوں گا۔

آپ جس شئے سے محبت کرتے ہیں اُس کو آنکھوں سے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی "چشم مروت" کا ایک نازک پہلو ہے۔ یہ آنکھوں کا مس کرنا بھی ایک طرح کا بوسہ ہے۔ لیکن آپ کو تجربہ ہوگا کہ جس شئے سے آپ کو محبت ہوتی ہے، پہلے آپ اس کو اپنے لبوں سے مس کرتے ہیں اور بعد ازاں اُسے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ یہ تقدیم و تاخیر میرے اس دعویٰ کا کافی ثبوت ہے کہ لب کے بعد احساس کی ذکاوت آنکھوں میں ہوتی ہے۔

چونکہ اندھے آنکھوں سے معذور ہوتے ہیں اس لئے وہ آنکھوں سے بوسہ نہیں لے سکتے۔ میں نے متعدد اندھوں کو دیکھا ہے کہ وہ بچوں کا لب سے بوسہ لینے میں زیادہ ذوق و شوق سے کام لیتے ہیں اور اُس کے بعد وہ اپنی ناکوں کو مس کرتے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہوسکتے ہیں۔ باصرہ کا فقدان شامہ کو قوی کردیتا ہے اور وہ آنکھوں کا کام ناک سے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا ایک دوسرا سبب اور بھی ممکن ہے گو میں ابھی تک اس کی مکمل تحقیقات نہیں کرسکا ہوں لیکن جس حد تک میں نے اس پر غور کیا ہے اُس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ناک کا سرا تمام حواس انسانی کا مرکز ہے جو دماغ، ناک، آنکھ، کان اور دہن

سے متعلق ہیں۔ اس مرکز سے ایک ایثری شعاع نکلتی ہے جو مشق سے ترقی دی جا سکتی ہے۔

اگر آپ غور کریں گے تو انسان کا ہر جزو جسم ایک حس رکھتا ہے۔ جو عضو جتنا لطیف و نرم ہے اتنا ہی زیادہ ذکی الحس ہے، موٹی جلد کے اعضا میں نسبتاً احساس کی کمی ہوتی ہے چنانچہ پاؤں کی ایڑی تقریباً مفقود الحس ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر عضو جسم بوسہ لینے کا اپنے حس کی نسبت سے شائق ہوتا ہے۔ ہاتھ سے جب آپ کسی جزو جسم کو محبت سے مس کرتے ہیں تو یہ بھی ایک طرح کا بوسہ ہے۔

یہ مسئلہ جب طے ہو چکا تو اب سوال یہ ہے کہ بوسہ لینے والا کس جسم کا اور کیوں بوسہ لیتا ہے۔ مثل کو مثل سے رغبت ہوتی ہے" ایک طرف تو آپ کے لب محبوب کے لبوں ہی کا بوسہ لینے کا سب سے پہلے اشتیاق کریں گے، اس کے علاوہ آپ کا یہ علم کہ محبوبہ کے سارے جسم میں لب سب سے زیادہ ذکی الحس ہے آپ کو لب چومنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہاں انسان میں وہ فطری قوت کارفرما ہوتی ہے جو اپنی لذت کے بعد دوسرے کی منفعت اور لذت کو مدنظر رکھتی ہے۔

مگر افسوس کہ موجودہ مادی تمدن کی کشمکش نے انسان کو اس اعلیٰ مقصد و تاہل سے تعبیر کر کے محض ذاتی لذت و منفعت کا متلاشی بنا رکھا ہے۔ مغرب میں طلاق کی کثرت میرے دعوی کا کافی ثبوت ہے آج بہائم کی طرح وہاں اختلاط کے نہایت نازیبا طریقے رائج ہیں۔

ایک مغربی معلم حکمت کا خیال ہے کہ بوسہ اس لئے لذت بخش ہے کہ دانت جبڑے اور لب کی رگیں بوسہ لیتے وقت ایک برقی لہر پیدا کرتی ہیں۔ جارج ڈی پرنٹس (George D Prentice) کے پاس ایک عورت نے خط میں یہ لکھا تھا کہ:۔

"جب دو دل برقِ اُلفت سے لبریز ہو جاتے ہیں اُسوقت مشتعل صورت میں ایک بوسہ ظاہر ہوتا ہے جسے جوشِ محبت کا شعلہ جوالہ کہیئے"

پرنٹس کا خیال ہے کہ "برقی لہر اس کا صحیح مفہوم نہیں ہے۔ عریاں بائرن (Byron) بوسہ کی طاقت کا تخمینہ طوالت وقت سے کرتا ہے، جسقدر قوی بوسہ ہوگا اُسی قدر لذت بخش ہوگا۔ مگر واقعیت بالکل اس کے خلاف ہے، میرا خیال ہے کہ اس کی لطافت اس امر کی مقتضی ہے کہ نرمی کے ساتھ اور قلیل سے قلیل وقت میں لیا جائے۔

مسز براؤننگ (Mrs. Browning) اپنی مشہور زمانہ تصنیف" ارورا لے (Aurora Leigh) میں اس کا معیار

"طویل لیکن خاموش جیسے شبِ وصل"

قرار دیتی ہیں۔ ایک اور شاعر کا خیال ہے

انسوس کہ اس کی مسرت انگیز گھڑیاں ہمیشہ قایم نہیں رہیں
شیریں، نرم اور خوش مزہ۔
صبح کو شبنم کے قطرے جو گلاب پر ہوتے ہیں وہ بھی اس درجہ لذت بخش نہیں ہوتے
خدا کرے کہ جب میں دوبارہ اس سے لطف اندوز ہوں اُسی وقت میرا دم رُک جائے۔
اور میری جان اسی عالم میں نکل جائے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا عضوِ جسم اس باب میں حساس واقع ہوا ہے، اس کی تصدیق آپ قوت لامسہ کی ترقی سے کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ تھوڑی مشق بہم پہونچائیں تو اپنے ہر عضو جسم میں وہی جوشِ حلاوت پیدا کر سکتے ہیں جو لبوں میں ہے۔ لب استعمال کے باعث ذکی الحس ہوتے ہیں اور بقیہ اعضا عدم استعمال، سرعت احساس کھو چکے ہیں۔ ہسپانوی شاعر کی مذکورۂ ذیل نظم اگر معناً نہیں تو ضمناً میری تائید کرتی ہے۔

نمبر ۱　وہ پہلے تو اپنی نگاہوں سے بوسہ لیتی ہے
پھر وہ اپنے پردۂ چشم سے بوسہ لیتی ہے
نمبر ۲　اس کے بعد اُس کے ابروے محراب دار بوسہ لیتے ہیں
تب وہ اپنے نرم گالوں کو آہستہ آہستہ ملتی ہے
نمبر ۳　اُس کے زنخدان، اُس کے ہاتھ اور اُس کی اُنگلیاں
اُس کا سرو قد جسم
اُس کا خون اُس کی روح
سب بوسۂ مشتعل بنجاتی ہیں
اور وہ اُن کی شکر فشانی پر زندہ رہتی ہے۔

تصوف و بوسہ

میرا خیال ہے کہ قوت عمل اور شاعری میں باہم کچھ تضاد سا ہے، جب کسی قوم میں شاعری کا مذاق ترقی پذیر ہو تو آپ یہ سمجھ لیں کہ اُس کے افراد کی قوت عملی رو بہ انحطاط ہے اول تو جذبات سے اُسی وقت

زیادہ کام لیا جاتا ہے جب انسان کی قوت منطقیہ عقلیہ کمزور پڑ گئی ہو اور دوسری جانب قوت متخیلہ نے قوت عمل پر اپنا تسلط جما لیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ عجمی فضا اسلام کو راس نہ آئی، عیش و تعیش نے قوائے عمل سارے کے سارے مضمحل کر دئے اور مامون الرشید کے ورثا نے شعر و شاعری کی ایسی سرپرستی کی کہ وہ مستقل ایک روگ ہو کر رہ گیا شاعری کو اسلامی زندگی میں اس درجہ دخل ہو گیا کہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں یہی ایک واحد مقبول عام طریقہ ہر صنف علم کے اظہار کا قرار پایا۔ قرآن و احادیث کے اہم مسائل نظم میں پیش ہونے لگے۔ فلسفہ کے نکات کی تشریح کا ذریعہ شاعری قرار پایا، مناجات، حمد، نعت، منقبت، درود و سلام غرض ہر چیز پر شاعری ہونے لگی۔ مسلمان قوم نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ گھبرائے، اصلاح کا اُسوقت خیال آیا جب قوم میں صلاحیت تقریباً مفقود ہو چکی تھی مسلمان قرآن اور اُس کی صحیح تعلیم کو مدتوں سے بھول بیٹھے تھے۔ نماز، روزہ کی تعلیم دینے والے زاہد خشک کا لقب پا چکے تھے ایسی حالت میں اصلاح کے لئے نئے طرز تعلیم کی ضرورت تھی۔

ایسی صورت میں بجز شاعری کوئی دوسرا موثر ذریعہ تعلیم و تلقین کا نظر نہ آیا "اللہ کے نیک بندوں" نے شاعری ہی کو خدا اور اُس کے رسول کے احکام کی تلقین کا ذریعہ بنایا۔ اس وادی کے امام سنائیؔ عطارؔ، رومیؔ و حافظؔ ہیں۔

چونکہ مجازی شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی اس لئے "بیان حقیقت" کے لئے مصطلحات مجازی کا استعمال ضروری اور لابدی تھا۔ علاوہ اس کے چونکہ حقیقت کا تعلق 'حال' سے ~~تھا~~ اور اُس کے نکات الفاظ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے مجبوراً اُس کو صورت 'قال' میں پیش کرنے کے لئے 'میدانِ مجاز' کی ضرورت ہوئی۔ تیسرا سبب مجازی شاعری کی ظاہری دلبستگیاں تھیں۔ حقیقت کی بلند فضا میں پرواز کرنے والوں نے صرف اس خیال سے بردہ مجاز کو پسند کیا کہ اس طرح وہ سطح عام پر آکر عوام کے لئے ایک مقبول انام پیغام پہونچا سکیں گے۔ مولانا شاہ عبدالعلیم صاحب آسیؔ مرحوم کی نظروں میں یہ تمامی اسباب موجود تھے۔

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
تو شعر لغو ہے آسیؔ کلام ناکارہ

اسوقت میں ناظرین کے سامنے اس مسئلہ میں صرف صوفیائے کے حالات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے حافظ کو مخصوص طور پر پیش کرنے کی صرف اس لئے کوشش ہے کہ اول تو اُس وادی کا

اہم ہے، دوسرے یہ کہ کسی ایک مخصوص شاعر کا کلام اُس کے خیالات کو مجموعی صورت میں مستقلاً پیش کر سکتا ہے اور اس لحاظ سے حافظؔ سے بہتر میری نظروں میں کوئی نہ تھا۔

شاہان عجم نے 'پابوسی' آداب محفل میں داخل کر رکھی تھی، حاضرین دربار واقعتاً بادشاہ کے پاؤں چومتے، صوفیاء کے نزدیک 'پابوسی' کے معنی پیروی و تقلید کے ہیں۔

حافظا گر پائے بوس شاہ دستت می دہد
یافتی در ہر دو عالم زینت عز و علا

مفسرین حافظؔ کا خیال ہے کہ "شاہ" سے یہاں مراد نبی اکرم صلعم ہیں۔ اور بوسہ، رحمت ایزدی کے معنی میں بھی مستعمل ہے

اگر روم زپیش فتنہا برانگیزد
دراز طلب بنشینم بکینہ برخیزد
دگر برہگذری یک دم از وفاداری
چو گرد در پیش افتم چو باد بگریزد
دگر کنم طلب نیم بوسہ، صد افسوس!
زحقۂ دہنش چوں شکر فرو ریزد

کہا جاتا ہے کہ یہاں بوسہ بہ معنی 'دیدار باری' استعمال کیا گیا ہے۔

از بہر بوسۂ زلبش جاں ہمید ہم
اینم نمی ستاند و آنم نمی دہد

یہاں بہ معنی معرفت حقیقت ہے ذیل کے شعر میں انسان کی کم مائگی کیجانب اشارہ ہے۔

من خاکی کہ ازیں در نتوانم برخاست
از کجا بوسہ زنم برلب آں قصر بلند

انسان ذات باری کا ایک جزو ہے وہ اس 'تفریق ازلی' پر ہمیشہ نوحہ کناں رہا اور اُسکی یہ ہمیشہ خواہش رہی کہ وہ پھر اُسی ذات میں متحد و مدغم ہو جائے۔

بگفتمش بلبم بوسہ حوالت کن!!
بخندہ گفت کیت با من ایں معاملہ بود؟

دوسرے مصرع میں طرز استفہام قابل لحاظ ہے، دراصل یہ گزشتہ واقعات کو یاد دلا کر سائل کی اُمید افزائی کرتا ہے ذیل کی شعر میں' بوسہ' بمعنی 'مقال شیریں' استعمال ہوا ہے۔

چوں لعل شکرینت بوسہ بخشد
مذاق جانِ من زو پُر شکر باد

خدا سے ڈرنے والے بندے فلاح دنیوی پر فلاح اخروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ دنیاوی مصیبت کو اخروی فلاح کا مقدمہ سمجھتے ہیں۔

قند آمیختہ باگل نہ علاج دل ماست
بوسۂ چند بیامیز بدشنامے چند

یہاں اسکے معنی توفیق ایزدی کے ہیں اور 'دشنام' سے مراد وہ دنیاوی مصیبت ہے جو خدا کی یاد تازہ کرتی ہے

"بوسۂ چشم عبارت از توصیف انتخاب و حسن نظر"

ہر کس کہ دید روے تو بوسید چشم من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نہ کرد

'بوسہ' سے کبھی حق الیقین بھی مراد ہوتا ہے۔ حافظ کی آنکھیں علم الیقین کا لطف اُٹھا چکی ہیں لیکن اس سے وہ مطمئن نہیں

چشمم از آئینہ داران خط و خالش گشت
لبم از بوسہ ربایان لب نوشش باد

اہل محبت کو دوران ریاضت میں متعدد مدارج سے گزرنا ہوتا ہے بعض ایسے مراحل بھی ہیں جن میں اُس پر کرب بےچینی طاری ہوتی ہے' ان مواقع پر وہ کسی اپنے مرید طریقت کو درس محبت نہیں دے سکتا۔ حافظ تعلیم و تلقین کا خواہاں ہے۔ لیکن مرشد اپنی معذوری بیان کرتا ہے۔

گفتم کہ ابتدا کنم از بوسہ گفت نے
بگذار تا کہ ماہ زعقرب بدر شود

سالک راہ طریقت کی زندگی میں ایک وہ وقت بھی آتا ہے جب اُس کے ہاتھ خدا کے ہاتھ ہوتے ہیں اُس کے لب خدا کے لب ہوتے ہیں اور اُس کا قول خدا کا قول ہوتا ہے۔

گفتم کیم دہان و لبت کامراں کنند
گفتا بچشم، ہر چہ تو گوئی ہماں کنند

کہا جاتا ہے کہ انسان جنت میں جب داخل ہوگا تو جوان ہو کر داخل ہوگا۔ حافظ کا خیال ہے کہ یہ محض جلوۂ باری کی شکر فشانی کا نتیجہ ہے

گفتم ز لعل نوش لباں پیر را چہ شد
گفتا بہ بوسۂ شکرینش جواں کنند

عاشقان الٰہی اپنی جان کو بھی اُس کی 'رضا'، 'بوسہ'، کی جستجو میں قربان کر دیتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس میں "خسارہ" کم ہے۔

گفتم خراج مصر طلب می کند لبت
گفتا دریں معاملہ کمتر زیاں کنند

ایک مبصر جب قدرت کی صناعیوں کو دیکھتا ہے تو بے اختیار پکار اُٹھتا ہے۔

ماخلقت ھٰذا باطلا

خدا کے رحم و کرم اس امر کے مقتضی ہیں کہ انسان اپنی ساری زندگی عبادت الٰہی میں صرف کردے حافظ اس عبادت کو بوسہ و کنار سے تعبیر کرتا ہے۔

با یار شکرلب و گل اندام بے بوس و کنار خوش نباشد

اسی معنی میں 'بوسہ' حسب ذیل شعر میں بھی مستعمل ہے۔ حافظ شوق و ذوق عبادت کی تعلیم دیتا ہے۔

بنوش جام صبوحی بنالۂ دف و چنگ
ببوس غبغب ساقی بنغمۂ نے و رود

شاہان عجم کے دربار کا یہ ادب تھا کہ ہر آنے والا آستانِ در کو چوم کر داخل ہوتا تھا، دربار میں داخل ہونے کے بعد اور متعدد آداب و احترام ادا ہوتے تھے اصطلاح تصوف میں "آستان بوسی" بمعنی ابتدار ریاضت ہے یا جسے منزل اولین کہئے۔

جناب عشق را درگہ بسے بالاتر از عقل ست
کسے آں آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد

'بوسہ چیدن' بمعنی انتفاع طریقت گرفتن

منم یارب کہ جاناں را ز عارض بوسہ میچینم
دعائے صبحدم دیدی کہ چوں آمد بکار آخر

ابتدار سلوک میں سالک کو جلوۂ باری نظر نہیں آتا، اُسوقت اُس کو صرف مراقبہ و خیال یار پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ 'بر آستیں خیال بوسہ دادن' کے معنی 'تصور الٰہی' کے ہیں۔

بر آستین خیال تو میدہم بوسہ
بر آستان وصالت چو نیست دستِ نیاز

'خاک پا بوسیدن' بمعنی اتباع و تقلید' حافظ جملہ پیغمبران مذاہب کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آکر رسولِ عربی کا مذہب قبول کریں۔

خوباں سزد کہ بر در رت آیند جلگی وانگاہ خاک پائے تو بوسند یک بیک

"خاک بوسیدن" بمعنی عاجزی و زاری کردن پیش حق تعالےٰ

آنکہ پامال جفا کردہ چو خاک راہم
خاک می بوسم و عذر کرمش می خواہم

ایران میں یہ رواج تھا کہ ارباب نشاط اظہار تشکر و امتنان میں ساغر مے کو بوسہ دیتے۔ حافظ بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

بایں شکرانہ می بوسم لب جام
کہ کرد آگہ ز درد روزگارم

شریعت و طریقت دو مختلف راہیں ہیں علمائے ظاہر (نادان) کے وعظ سے متاثر ہو کر حافظ نے راہ طریقت (بوسہ لب ساقی) سے توبہ کی تھی، لیکن اُسے یہ جلد معلوم ہو گیا کہ یہ اُس کی غلطی تھی۔

توبہ کردم کہ نہ بوسم لب ساقی و کنوں
میگزم لب کہ چرا گوش بنا داں کردم

"بوس و کنار" کے معنی "آسائش جنت" جو دیدار باری کے علاوہ میسر ہو گی

دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم
از بخت شکر دارم واز روزگار ہم

حافظ رسول اکرم صلعم کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میدان حشر میں جب

سرمست در قبائے زر افشاں چو بگذری

اُسوقت "حافظ پشمینہ پوش" کو نذر شفاعت (بوسہ) سے محروم نہ رکھیں گے۔

یک بوسہ نذر حافظ پشمینہ پوش کن

مولانا محمد برکت اللہ صاحب لکھنوی نے 'بوسہ' کے معنی جو پیش کئے ہیں یہ ہیں:-

"مراد از بوسہ عشق و محبت است و نیز کنایہ از نفخ روح و احیاء و افاضت فیض وجودی و نیز فیض و جذبۂ باطن را گویند کہ نسبت سالک واقع شود و نیز کنایہ از استعداد قبول کیفیت کلام علمی و عملی صوری و معنوی و نیز کنایہ از تلذذ روح است یا جسم"

کبھی کبھی 'بوسہ' بمعنی محبت عقبی بھی مستعمل ہوتا ہے۔

بوسیدن لب یار اول ز دست مگذار
کا خر ملول گردی از دست لب گزیدن

سالک کی تمام کوششیں صرف اُس اُصول پر مرتب ہوتی ہیں

السعی منی والاتمام من اللہ تعالےٰ

وہ قربت الٰہی کی کوششیں کرتا ہے لیکن اُس کی دستگیری صرف توفیق ایزدی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ بوسہ بمعنی قربت الٰہی

گفت مگر زلعل من بوسہ نداری آرزو
مردم ازیں ہوس ولے قدرت و اختیار کو

بوسہ بمعنی رمز طریقت بھی مستعمل ہے۔ حافظ اپنے پیر مرشد کی صحبت کی ترغیب دیتا ہے۔

باصنمے چو لعبتے خوش بنشیں بہ خلوتے
بوسہ ستاں بکام از و تازہ بتازہ نو بنو

حافظ دیدار جنت کے لئے نوید دیتا ہے جہاں ایک طرف خدا کا دیدار ہوگا (شاید) اور دوسری جانب رسولِ اکرم کی زیارت ہوگی (ساقی) "لب گرفتن و رخ بوسیدن" بمعنی دیدار بادۂ مے نوشی و گلبوئی کا تعلق ساقی سے ہے۔

مسند بگلستاں برتا شاہد و ساقی را
لب گیری و رُخ بوسی مے نوشی و گلبوئی

حافظ کا مایۂ ناز پیام بھی قابل لحاظ ہے۔

ہوس جز لب معشوق جام مے حافظ
کہ دست زہد فروشاں خطاست بوسیدن

(نوٹ از اڈیٹر) [illegible]

اگر حافظ نے واقعی یہ سب کچھ اسی معنی میں کہا ہے جو صاحب مضمون ظاہر کرتے ہیں تو شاید ہی حافظ سے بدتر کوئی شاعر دُنیا میں پیدا ہوا ہو۔ لیکن اگر اس غریب نے الفاظ کے وہی معنی لئے ہیں جو عام عاشقانہ شاعری میں مراد ہوتے ہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سے زیادہ حافظ کی توہین کوئی اور ہو سکتی ہے جو صاحب مضمون نے ان تاویلوں سے کی۔

[illegible]

صحت کے نقطۂ نظر سے

میرا خیال ہے کہ اس کی مخالفت کی تاریخ بہت ابتدا سے شروع ہوتی ہے۔ گذشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اہالیانِ یونان و روم نے اپنی عروج حکومت میں اس کو مسدود کرنے کی ناکامیاب کوشش کی۔ انگلستان و دیگر مغربی ممالک میں صدیوں سے اس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ جان بنین (John Benyan) نے اس رسم کے خلاف اعلانیہ جہاد شروع کر دیا تھا لیکن اُس کو مستقل کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے پھر زندگی حاصل کی۔

مخالفت کی تاریخ کو اگر آپ غور سے ملاحظہ فرمائیں تو وہ دو بڑے زبردست زمانوں میں تقسیم کیجا سکتی ہے

(۱) مخالفت بر بناء اخلاق

(۲) مخالفت بر بنار حفظان صحت

اول دور یونانی و رومی سیادت سے شروع ہوتا ہے اور لندن کی وبار عظیم تک ختم ہوتا ہے جس نے ۱۳۴۷ء-۱۳۴۸ء میں شہر لندن کو تباہ و برباد کر دیا۔

دوسرا دور وبار عظیم سے شروع ہوتا ہے اور موجودہ مخالفت کا دور بھی اُسی میں شامل ہے۔

وبار عظیم کے زمانہ میں لندن کے اطبار نے ایک عام ہدایت نامہ مشتہر کیا تھا کہ کوئی کسی کا بوسہ نہ لے اس لئے کہ پلیگ متعدی امراض میں شامل ہے اور بوسہ سے جراثیم ایک دہن سے دوسرے دہن میں داخل ہوتے ہیں عوام نے اس ہدایت پر مطلق توجہ نہ کی۔ فرط محبت میں اعزہ و اقارب اپنے عزیزوں کی نعش کا بوسہ لیتے اور خود اُسی مرض میں مبتلا ہو کر موت کے گھاٹ اُترتے تعلیم یافتہ طبقہ نے پرہیز سے کام لیا لیکن جارج سوم کی عیاشیوں نے بہت جلد لوگوں کے دلوں سے اس پرہیز کے فوائد کو مٹا دیا۔ اُنیسویں صدی کے اختتام میں متعدد انجمنیں اس کی مخالفت میں قایم ہوئیں لیکن ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں امریکہ نے اس تحریک کو زندہ کیا لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

جنگ عظیم کے بعد روسی حکومت نے اس کے خلاف شدید قوانین نافذ کئے۔ نفاذ قانون کے

ساتھ ساتھ عام تبلیغ و تشہیر کے ذریعہ سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ نہایت درجہ مضر صحت ہے۔ امریکہ کی جمہوریت پسند سلطنت نے بھی روسیوں کا اتباع کیا اور گو ابھی مستقل قوانین کا نفاذ نہیں ہوا ہے لیکن جس نوبت پر تحریک پہونچ چکی ہے اُس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکہ بھی بہت جلد روسیوں کی طرح اسکے انسداد کے متعلق مستقل قوانین جاری کر دے گا۔

گذشتہ سال امریکہ کے چند مشہور اطباء نے اس کے مضر اثرات کی تحلیل کی ہے۔ اُن کا قطعی خیال ہے کہ اس سے نہ صرف دونوں کی زندگی کم ہوتی ہے بلکہ تماشہ دیکھنے والے بھی اس سے بری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ ہر بوسہ ۱۸۰ سکنڈ کی زندگی کم کرتا ہے اس طرح ۴۸۰ بوسے زندگی کا ایک قیمتی دن کم کر دیتے ہیں۔

مسٹر اے۔ جے۔ ایوز (A. J. Eanes) اس نظریہ کے بہت بڑے حامی ہیں۔ انھوں نے اپنے دارالعمل میں، بیس آدمیوں کو اکٹھا کیا جو مختلف پیشوں سے متعلق تھے۔ دو سانولی اور دو سپید رنگ کی نوجوان لڑکیاں بھی بلائی گئیں جنھوں نے معمول کی حیثیت اختیار کی۔ ہر مرد کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ہر عورت کا باری باری بوسہ لے۔ سامنے دو مشینیں نصب کی گئیں۔ ایک مشین کا کام یہ تھا کہ وہ خفیف سی آواز کو بھی بہت بلند آواز بنا دیتی تھی اور دوسری مشین قلب کی صحیح حرکت کا اندازہ کرتی تھی۔

مس بٹی وان ایلن (Miss Betty Van Allen) نے سب سے پہلے خود کو پیش کیا۔ اُن کا بوسہ ایک دفتر کے کلرک نے لیا۔ مشین کے ذریعہ سے یہ صاف معلوم ہوا کہ مس بٹی کے قلب کی حرکت پانچ بار فی سکنڈ دوران بوسہ میں زیادہ ہوگئی۔ بیسوں نے باری باری ہر عورت کے بوسے لئے اُسکے بعد جو عمل ظاہر ہوا وہ حسب ذیل تھا۔ سڑک کوٹنے والوں کے سردار نے جب ایک سانولی لڑکی کا بوسہ لیا اُسوقت اس کے قلب کی حرکت ۶۶ بار فی سکنڈ بڑھ گئی اور جب اُس نے ایک سپید عورت کا بوسہ لیا اُس وقت اُس عورت کے قلب کی حرکت ۸۰ بار فی سکنڈ زیادہ ہوگئی۔ اس سے ڈاکٹر موصوف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس قدر تندرست و توانا مرد ہوگا اُسی قدر عورت کے قلب کی حرکت زیادہ ہوگی۔

اس دلچسپ عمل کے بعد ایک گانے والے نے اپنی "خدمات" پیش کیں۔ پہلی لڑکی کا جب اس نے بوسہ لیا اُسوقت اُس لڑکی نے فرط لذت میں اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کرسی کو دونوں ہاتھ سے مضبوط پکڑ لیا۔ آواز بلند کرنے والی مشین میں ایک دھماکے کی آواز آئی۔ دوسری لڑکی کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہوئی، اس عمل کے بعد ڈاکٹروں نے مشورہ کیا اور اُسوقت وہ اس

نتیجہ پر پہونچے کہ گانے والے کی مونچھیں اس غیر معمولی اثر کی ذمہ دار نہیں مزید تجربات نے یہ ثابت کیا کہ سانولے رنگ کی عورتیں بوسہ سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ انجمن حفظان صحت کنساس (Kansas) نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا ہے جس میں اس کو متعدی امراض کی ترقی کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

ایک اطالوی ڈاکٹر نے متعدد امراض کے اسباب صرف یہ بتائے ہیں کہ لوگ بلی، کتے اور طوطے کا بوسہ لیتے ہیں۔ یورپ میں آج کل سانپ اور تنید و اکثرت سے پالا جاتا ہے۔ اطبا کا خیال ہے کہ ان میں دق کے جراثیم کثرت سے پائے جاتے ہیں اور جو لوگ اپنا جزو جسم ان سے مس کرتے ہیں وہ یہ خطرہ برداشت کرتے ہیں۔

تاریخی نقطۂ نظر سے

کتاب پیدائش (قدیم عہدنامہ) میں حضرت یعقوب کے بوسہ کا ذکر ہے کہ:۔

"جب یعقوب نے ریشائیل (Richael) کے بوسے لئے

"تو اُن کی آواز بلند ہوگئی اور وہ رونے لگے"

حضرت یوسف نے جب اپنے نابینا باپ سے ملاقات کی اُسوقت

"وہ اپنے باپ کے چہرے پر گر پڑے اور خوب روے اور اُن کا بوسہ لے لیا"

(Juda) نے قیصر کے سپاہیوں سے یہ کہہ رکھا تھا کہ:۔

"جس شخص کا میں بوسہ لوں وہی شخص ہوگا۔ اُس کو مضبوط پکڑ لینا"

اس کے بعد وہ مسیح کے پا[illegible] کہا" اخاہ! میرے [illegible] بوسہ لیلیا (متی ۲۶ - ۴۸ - ۴۹)

جولیس سیزر (Julius Caesar) روم کا[illegible] م میں پیدا ہوا۔

۴۹ ق۔م میں اس نے اپنی جرات و ہوشیاری سے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسکے خلاف دربار کے اکثر امرا تھے جنھوں نے اس کے قتل کی سازش کی دشمنوں نے آخر وقت تک سیزر کو غافل رکھا چنانچہ مرنے سے چند منٹ قبل بروٹس نے سیزر کے بوسے لئے تھے۔ جوداسکے بوسے کی طرح بروٹس (Brutus) کا بوسۂ فریب بھی محاورہ میں داخل ہے۔

تاریخی حیثیت سے وہ بوسہ بھی اہم ہے جو ملکۂ این (Ane) شاہزادی ڈنمارک (Denmark) نے جیمس اول (James I) شاہ اسکاٹلینڈ (Scotland) سے طلب کیا تھا لیکن جیمس نے انکار کر دیا۔

آئرلینڈ کی بغاوت عظیم کے دوران میں ایک ملک کا بہادر وجاں نثار لیڈر گرفتار ہوا اور اُس کو سزائے موت کا حکم ہوا۔ قیدخانہ کے ارد گرد ہزارہا سپاہیوں کا پہرہ تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ وہاں جا سکے مجرم کی ایک عزیزہ نے افسروں سے اجازت حاصل کر کے اُس سے ملاقات کی اور اختتام ملاقات پر دونوں نے ایک دوسرے کے بوسے لئے۔ عورت کے منھ میں ایک خط تھا جس میں قیدخانہ سے بھاگنے کی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں۔ دوران بوسہ میں عورت نے اس خط کو مجرم کے منھ میں منتقل کر دیا اور پہرہ دار دیکھتے ہی رہے۔ مجرم نے آخر کار اُسی ترکیب سے رہائی حاصل کی۔

ظالم بیڈاجوز (Badajoz) اور سلامانکا (Salamanca) نے جب اسکاٹلینڈ کے دستہ پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ساری فوج تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑی ہو اُسوقت ایک حسین عورت لیڈی گارڈن نے یہ اعلان کیا کہ "جو سپاہی میدان جنگ میں بہادری سے لڑے گا اُس کو میں اپنے لبوں میں ایک اشرفی دبا کر بوسہ دوں گی اور سپاہی اس طرح اشرفی اور بوسہ دونوں پائے گا" اس اعلان نے سپاہیوں میں ایک جوش پیدا کر دیا اور جنگ کامیاب ہوئی۔

~~جہانگیر کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار نورجہاں نے اُس سے شکایت کی کہ بوسہ لیتے وقت اُس کے (جہانگیر کے) منھ سے بو آتی ہے۔ جہانگیر کو بیحد رنج ہوا اور اُس نے اپنی ہندو رانی جودھا بائی سے شکایت کی کہ اُس نے اس نقص پر اُس کو کیوں نہیں آگاہ کیا۔ جودھا بائی کا جواب تاریخ محبت میں ایک نذریں~~ یادگار ہے۔

[redacted]

بعض بوسے [redacted] سے معروف ہیں اور جن کی بابت ادبیات میں آپ اکثر لطیف اشارے پائیں گے۔

(۱) اسکاٹلینڈ کی ایک معزز خاتون نے فوجی دستہ میں شمول کے لئے یہ شرط قائم کی تھی کہ جو مرد اُس کے دانتوں میں دبا ہوا شلنگ اپنے لبوں سے کھینچ لیگا وہ فوج میں بھرتی ہو سکیگا۔ ڈنکن میکنزی (Duncan Mackenzie) نے کامیابی کا یہ طریقہ نکالا کہ اُس نے خاتون کے بوسے لے لئے اور

اس طرح جذبات سے متاثر ہو کر اُس نے شلنگ دانتوں سے چھوڑ دیا۔

(۲) پٹروشیو (Petrochio) کا "شور انگیز" بوسہ مشہور ہے۔ اُس نے اپنی دُلہن کا اسطرح بوسہ لیا کہ "سارا گرجا اُس کے شور و غل سے گونج اُٹھا"

(۳) عاشقانہ لطافت اور شاعرانہ نزاکت کے اعتبار سے وہ بوسہ بھی مشہور ہے جو "نوجوان عاشق" نے فاطمہ کا لیا تھا۔ بالفاظ ٹینی سن (Tennyson)

فاطمہ :- اُس نے ایک بوسہ میں میری ساری روح کھینچ لی

جس طرح آفتاب کی تیز شعاعیں شبنم سے اپنی پیاس بجھا لیتی ہیں۔

(۴) جب مارگیریڈا (Margarida) کے شوہر کو اپنی بیوی کی بیوفائی معلوم ہوئی اور اُسنے اس کی تصدیق کر لی کہ اُس نے اپنے آشنا کو ناجائز بوسہ دیا ہے تب اُس نے اپنے رقیب کو قتل کر ڈالا اور اسکے قلب کا کباب بنا کر اپنی بیوفا بیوی کے سامنے دسترخوان پر پیش کیا۔

(۵) شارٹیر (Chartier) فرانس میں سب سے زیادہ بدشکل مرد تھا لیکن موسیقی میں وہ یکتائے زمانہ تھا۔ ملکہ مارگرٹ (Margeret) نے جب اُس کے بوسے لئے تو درباریوں نے اس لطف و عنایت کا سبب دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا

"میں اُس روح کا بوسہ لیتی ہوں جو گاتی ہے"

(۶) میروپ (Merope) یکتائے روزگار والٹیر (Voltaire) کی مشہور و معروف تصنیف ہے۔ قوم نے اس کتاب کی یہ قدر کی کہ ایک خاص مجمع میں والٹیر کی قابلیت کا اعتراف کیا گیا اور بطور انعام فرانس کی حسین ترین خاتون ڈچز ڈی ویلرس (Duchess de Villars) نے اُسکے بوسے لئے۔

(۷) جب فاکس (Fox) اپنے انتخاب کے لئے کوشاں تھا تو اُس کی معاون ڈچز آف ڈیون شائر (Duchess of Devonshire) نے یہ اعلان کیا تھا کہ "جو کوئی اس کو رائے دے گا وہ میرا ایک بوسہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ اسٹیل نامی ایک شخص نے اسی طرح ایک بوسہ حاصل کیا۔

(۸) ایک خطرناک مجرم قیدی کا واقعہ نہایت درجہ سبق آموز ہے۔ بست سالہ میعاد میں سے دس سال کی طویل مدت اُس نے قوانین جیل کی نافرمانی میں صرف کر دی۔ اس مدت میں اُس نے تین بار بھاگنے کی ناکامیاب کوشش بھی کی۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا جس میں کسی نہ کسی حکم عدولی پر اُس کو قید تنہائی یا بیڑی کی سزا نہ ملتی۔ ہر سزا اور قید کا ہر روز اُس کی بدطینتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجرم کو ناقابل سمجھ کر قید خانہ کے افسران نے بھی اُس کی جانب توجہ کم کر دی تھی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دُنیا کا کونسا واقعہ ہماری زندگی پر بھلے یا بُرے طور پر اثر کریگا۔ اہم سے اہم واقعات ہم پر غیر موثر ثابت ہوتے ہیں لیکن ایک ذرا سا واقعہ ہماری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔

مامون الرشید کا شاندار دربار ہے۔ امراء سلطنت خلعت فاخرہ زیب تن کئے ہوئے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک امیر پر شاہانہ عنایت ہوتی ہے اور ایک خلعت عطا ہوتا ہے جس کو وہ باادب پہنکر پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس درمیان میں اُن کو چھینک آتی ہے اور اپنی ناک کو غیر ارادتاً آستینِ خلعت سے پاک کرتے ہیں۔ خلیفہ اسے اپنے عطیہ کی توہین سمجھتا ہے اور وہ دربار سے باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔ آیئے اب ہم اُسوقت اُن کے اندرونی خیالات کا مطالعہ کریں۔

"اللہ! اللہ! اس دُنیاوی بادشاہ نے مجھے ایک معمولی سی خلعت دی اور اُسکے بیجا استعمال پر مجھے یہ سزا ملی۔

"اعیاذُ باللہ! خدائے بزرگ و برتر نے مجھے لباس جسم عطا کیا جس کا استعمال بیجا ہماری زندگی کا ایک معمولی مشغلہ ہے۔

"مگر اُس کی کریمی کے صدقے کہ اُس نے اپنی مملکت سے ایک بار بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی"۔

یہ کہکر وہ رونے لگے۔ اس واقعہ کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ اُنھوں نے دُنیا ترک کر دی۔

وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "دو بدنصیب" میں ایک مجرم کا واقعہ لکھا ہے۔ رہائی کے بعد دنیا نے اُسے کتے کی طرح بھگا دیا، وہ جہاں جاتا لوگ اُس سے پرہیز کرتے اور بھاگتے۔ سالہا سال، کی قیدخانہ کی فضا، نے اُس کی مجرمانہ ذہنیت میں پختگی پیدا کر دی تھی اُس پر دُنیا کا یہ برتاؤ۔ اب تو وہ علی الرغم چوری و بدی پر مائل تھا۔ ایک دن اُس نے پادری کے گھر میں چوری کی۔ گرفتاری کے بعد وہ شناخت مال کے لئے پادری کے پاس لایا گیا۔ اُسوقت ملزم کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب پادری نے نہ صرف اُس کی اُس خطا کو نظر انداز کر دیا بلکہ اُس کو گلے لگا کر پیار کیا اور بہت سے برتن اُس کے سامنے رکھدئے۔ "میرے بیٹے! یہ سب تیرا مال ہے، مری اجازت کی کوئی ضرورت نہیں"۔

اس ایک واقعہ نے ملزم پر اتنا اثر کیا کہ چند خفیف لغزشوں کے بعد اُس نے توبہ کی اور وہ ایک نہایت مفید اور کارآمد شخص ثابت ہوا۔

اسی طرح انسان کی زندگی میں بعض ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جو معاً اُسکو بدی کیجانب مائل کر دیتے ہیں ایک بزرگ شہر بغداد کے باہر جانا چاہتے تھے۔ شہر پناہ کے دروازہ پر پہونچے تو اُنھیں معلوم ہوا کہ دروازے صرف اس لئے بند ہیں کہ بادشاہ کا باز چھوٹ گیا ہے۔ وہ چلا اُٹھے۔

ظلم! ظلم! ایک بیوقوف تخت مکنت پر اور میں اس طرح دربدر گھومتا ہوا۔

مدتوں وہ ملحد رہے اس کے بعد اُنھوں نے توبہ کی۔

مذکورہ بالا امثلہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب آپ پھر اُس مجرم کی جانب مائل ہوں جسکی مستقل بدکرداریوں نے حکام زنداں کو بھی عاجز کر رکھا تھا۔ ایک دن چند اشخاص جیل کا معائنہ کر رہے تھے اُنکے ساتھ ایک ننھا بچہ بھی تھا۔ زینہ پر چڑھتے ہوئے رہبر نے قیدی سے استدعا کی کہ وہ بچہ کو گود میں لیکر اوپر چڑھا دے۔ قیدی رُکا، اُس کے خشونت آمیز چہرہ پر ایک سُرخی سی دوڑ گئی، بچہ نے اپنے بازو پھیلا دئے اور کہا "اگر تم میری یہ مدد کرو گے تو میں تمھارا بوسہ لے لوں گا"۔ قیدی کے چہرہ سے ساری خشونت غائب تھی اُس نے فوراً بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ تھوڑی دور جا کر بچہ نے بوسہ لے لیا۔ اور کہا "اب تم کو میرا بوسہ لینا ہوگا"۔

اس آخری استدعا نے قیدی کے دل پر چھریاں مار دیں، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ عورت کی طرح شرم آگیں نگاہوں سے دیکھنے لگا، پھر اپنی طبیعت کو سنبھال کر اُس نے بچہ کا بوسہ لے لیا۔

گو قیدی نے اپنے متاثر ہونے کا سبب نہیں بتایا لیکن کہا جاتا ہے کہ اُس کا ایک بچہ قیدخانہ کی دیواروں سے صدہا کوس پر ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں رہتا تھا جس کی یاد نے اُس پر تیر برسا دئے اُس دن سے اور رہائی کے وقت تک کسی نے اُسکی ایک بھی شکایت نہ سُنی۔

(۹) لوئنز وائل (Ville Kounoa) میں بوسہ نے ایک بچہ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ ایک شخص جوزف میر (Joseph Meyer) کے دو بچے تھے۔ ایک بچہ یک بیک بیمار ہو گیا، ڈاکٹر بلایا گیا لیکن اُس نے دیکھنے کے بعد جواب دیدیا، صبح کو سکرات کا عالم شروع ہو گیا اور دن چڑھتے چڑھتے بچہ ایک جسم بیجان تھا۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی، نبض ساقط تھی اور جسم میں سختی پیدا ہو گئی تھی۔ قلب کی حرکت بھی بند ہو چکی تھی۔ ان سب علامات کو دیکھ کر ڈاکٹر نے مایوسانہ لہجہ میں یہ کہا کہ "بچہ مر گیا اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔

اس خبر کو سُنکر گھر میں ایک کہرام مچ گیا، ہر شخص رونے پیٹنے میں مصروف تھا۔ چھوٹے بھائی نے آخری دیدار کے لئے لاش کے مُنھ سے چادر ہٹائی اور لپٹ گیا اس کے بعد اُس نے اُس نعش کے بوسے لے لئے۔ بوسہ لینے میں اس کی سانس اُس کے منھ میں داخل ہوئی تو جسم میں حرکت پیدا ہو گئی رفتہ رفتہ زندگی کے سارے علامات عود کر آئے اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

(۱۰) یورپ کے ایک ہوٹل میں ایک فلاکت زدہ روزگار کی تلاش میں آیا۔ چند بدمستوں نے اُسے ایک پاؤنڈ دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ وہ ایک امیرزادی کا بوسہ لے جو ہوٹل میں اُس وقت

مقیم تھی۔ اُس نے آخر یہ جرأت کر دکھائی۔ لڑکی کا باپ اس گستاخی پر نہایت برافروختہ ہوا اور اُسے اِس زور سے ڈھکیلا کہ وہ کوٹھے سے نیچے گر کر بیہوش ہو گیا۔ لیکن جب اُسے واقعہ کی اصلیت معلوم ہوئی اُسوقت اُس نے اُس پر بیحد عنایت کی اور اُسے ہسپتال میں پہونچا کر اُس کی علالت کے تمام اخراجات کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ تندرست ہونے کے بعد وہ اُس امیر کے پاس ملازم ہو گیا اور اسقدر دیانتداری اور محنت سے کام کیا کہ اُس نے خوش ہو کر اپنی اُسی لڑکی سے اُس کا عقد کر دیا جس کے بوسہ لینے کے جرم میں وہ کبھی معتوب ہو چکا تھا۔

(۱۱) لندن کی سڑک پر چلتے ہوئے ایک شخص نے ایک امیرزادی کا بوسہ لے لیا۔ جب وہ گرفتار ہو کر عدالت کے سامنے آیا اُسوقت اُس نے یہ عذر کیا کہ اُس نے بوسہ نیک نیتی میں لیا تھا اس لئے کہ اُسی شکل و شباہت کی ایک عورت اُس کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ عدالت نے اس عذر کو نامعقول قرار دیکر ملزم پر للعہ ر شلنگ جرمانہ کی سزا سنا دی۔

جب یہ مقدمہ اخبارات میں شائع ہوا اُسوقت اُس کی اصلی محبوبہ نیوزیلینڈ میں رہتی تھی۔ اُس نے اس خبر کو سُنکر اُس کے نام فوراً خط لکھا کہ اگر وہ ابتک اُس سے محبت کرتا ہے تو فوراً نیوزیلینڈ پہونچ جائے اس لئے کہ اُس کا شوہر بستر مرگ پر ہے جس کی موت کے بعد وہ اُس سے عقد کرے گی۔ بیچارہ لندن سے روانہ ہوا لیکن نیوزیلینڈ کے ساحل پر پہونچ کر گرفتار کر لیا گیا واقعہ یہ تھا کہ خط لکھنے کے بعد اُس عورت نے اپنے شوہر کو زہر دیدیا، پولیس نے تلاشی میں ان دونوں کے خطوط برآمد کئے، عورت کو عدالت نے مجرم قرار دیکر موت کی سزا دی مگر "لندن کا مسافر" بری کر دیا گیا۔ اب وہ اس زندگی سے عاجز تھا اس لئے اُس نے بھی خودکشی کر لی۔

عقائد و توہمات

(Juda) نے حضرت مسیح کا بوسہ لیکر گرفتار کرایا۔ اور عیسائی دُنیا میں یہ واقعہ ایک اہم حیثیت رکھتا ہے یہاں تک کہ بعض مذہب پرست اسکو صرف اس لئے معیوب سمجھتے ہیں کہ حضرت مسیح اس کے باعث گرفتار ہوئے تھے۔ صوبہ ورجینیا (Virg inia) کے شہر لورے (Lauray) میں ایک ہر شخص کا یہ اعتقاد ہے کہ بوسہ لینا گناہ ہے اس لئے کہ حضرت مسیح کو اس سے نقصان پہونچا۔ اُس کا بیان ہے کہ اُس نے آجتک کبھی کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ اُس کے عقد کو بائیس ۲۲ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور وہ گیارہ اولاد رکھتا ہے لیکن آجتک نہ اُس نے کبھی اپنی بیوی کے بوسے لئے اور نہ کبھی اپنے لڑکوں کا مُنھ چوما۔

سینٹ ویلنٹائن (St. Valentine) کے مبارک دن کا بوسہ عقد کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے

سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scot) نے اپنے مشہور ناول (The fair maid of Perth) میں اس رسم کا ذکر کیا ہے۔ صبح کو محبوبہ اپنے عاشق ہیری (Harry) کے بوسے لیتی ہے، چند دنوں کے بعد دونوں شادی کے تحائف ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور چند دنوں کے بعد دونوں میں عقد ہو جاتا ہے۔

میکسیکو کے ایک شہر میں یہ عام خیال ہے کہ جسوقت لاش دفن کر کے اعزہ و احباب واپس آنے لگتے ہیں اُسوقت قبرستان سے آخری نکلنے والے کو ایک روح حسین عورت کی شکل میں ملتی ہے اور ناز و ادا سے اُس کو متوجہ کر لیتی ہے۔ روح ایک ماہ بعد اُسی قبرستان میں ملنے کا وعدہ کرتی ہے اور بوسہ لے لیتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ جسوقت وہ شخص قبرستان کے احاطہ سے باہر نکلتا ہے اُسی وقت وہ مجنون ہو جاتا ہے اور چند دن بعد مرجاتا ہے۔ اگر قبرستان سے آخری نکلنے والی عورت ہوئی تو وہ روح حسین مرد کی شکل اختیار کرتی ہے۔

اسکینڈی نیویا (Scandinavia) میں یہ روایت مشہور ہے کہ لوکی (Lokie) شرارت کے دیوتا نے اکاس بیل (Mistletoe) کا تیر نابینا ہوڈر (Hoder) کو دیا جس سے اُس نے بیلڈر کو مارا اور وہ مرگیا۔ بیلڈر بعد میں زندہ کر دیا گیا لیکن وہ تیر فریگا (Friga) کی سپردگی میں دیدیا گیا تاکہ پھر اُس سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہونچ سکے۔ جب تک کہ وہ لوکی کی سلطنت زمین کو مس نہ کرے۔ اس لئے یہ ہمیشہ سقف مکان میں نصب و آویزاں رہتا ہے۔ عشاق کا اعتقاد ہے کہ جب دو مرد و عورت اس کے نیچے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا بوسہ لیں گے تو وہ کسی آفت میں مبتلا نہ ہوں گے۔

رفتہ رفتہ یہ رواج ہوگیا کہ ہر گرجا کی چھت میں اکاس بیل کی ایک شاخ آویزاں کر دی جاتی تھی۔ مرد یا عورت جو بھی اُس کے نیچے سے گذر جاتا ہے فوراً اُس کا بوسہ لے لیا جاتا ہے۔

جب یہ رسم عام ہوگئی تو ۲۵ ر دسمبر اس لطف کے لئے مخصوص کر دی گئی، مگر جب اس رسم کے قبیح اثرات نمایاں ہونے لگے اُسوقت کلیسا سے اکاس بیل کی شاخ ہٹا دی گئی۔
ہون (Hone) کا بیان ہے کہ ایک زمانہ میں یہ عام اعتقاد تھا کہ جب تک کسی دوشیزہ کا کرسمس میں اس طرح بوسہ نہ لیا جائے اُسوقت تک اُس کی ایک سال کے اندر شادی نہیں ہوتی تھی۔

مختلف ممالک اور رسم بوسہ

روما رومی تہذیب زمانۂ قدیم میں آپ اپنی نظیر تھی۔ وسیع سلطنت کے مالک ہونے کی باعث اہالیان روم مختلف و متفرق تمدن کے امتزاج کا بہترین نمونہ تھے۔ آج یورپی تمدن کا بیشتر حصہ رومی بنیاد پر قایم ہے۔ طاقتور سلاطین نے نہ صرف عمدہ اُصول حکومت کی بنیاد ڈالی تھی بلکہ وہ متعدد و متفرق سامان دلچسپی و فرحت کے بانی تھے۔ دوسری قوموں کی طرح ان کے اسباب زوال بھی عیش پرستی اور شراب خواری ہی ثابت ہوئے زنا کی گرم بازاری۔ شراب خواری کی کثرت ہر اعلیٰ و ادنیٰ طبقہ میں موجود تھی۔ مے نوشی کی انتہا کا اندازہ آپ صرف اس واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ عورتیں مردوں سے زیادہ اس بداخلاقی میں مبتلا تھیں۔ مسٹر پلینی (Pliny) کا بیان ہے کہ اُس زمانہ میں مردوں نے جب یہ دیکھا کہ باوجود ممانعت کے عورتیں اس سے محترز نہیں رہتیں تو اُنھوں نے از راہ تجسس عورتوں کا مُنھ سونگھنا شروع کیا مگر چونکہ یہ طریقہ تجسس کا معیوب تھا اس لئے بوسہ کا رواج شروع ہوا۔ چنانچہ کیٹو Cato نے اس "طرز تجسس" کی سفارش ہر مرد سے کی ہے۔ (سنہ ۲۳۴ قبل مسیح) کیٹو ہی نے یہ قانون بھی نافذ کیا تھا کہ کوئی شادی شدہ مرد یا عورت اپنے بچوں کے سامنے ایک دوسرے کا بوسہ نہ لے۔

تاریخ خاموش ہے کہ آیا یہ طریقۂ تجسس عورتوں کے لئے مفید ثابت ہوا یا نہیں مگر یہ اظہر من الشمس ہے کہ مرد خود اس طرح "شراب بوسہ" سے مدہوش رہنے لگے۔ چنانچہ پلوٹارک (Plutarch) کا بیان ہے کہ ٹائی برس (Tiberius) ([illegible] ق.م) نے اس کے خلاف ایک فرمان جاری کیا جس کا مفہوم بقول کلیمنٹ (Clement) یہ تھا کہ

"محبت کا امتحان بوسہ سے نہیں ہوتا

بلکہ محبت آمیز جذبات سے"

دوسری صدی قبل مسیح میں ڈایوسرائے ڈیز (Dioscorides) کا حسب ذیل شعر بھی رواج بوسہ کی تصدیق کرتا ہے۔

"اُف لے تیرے گلگوں و ترنم ریز لب! خداداد دہن کے سحر آفریں دروازے!

دوسری صدی بعد مسیح "بوسۂ امن" کے رواج کی موجودگی جسٹن (Justinus) کی روایت سے ثابت ہوتی ہے۔

تیسری صدی بعد مسیح میں ڈایوکلیٹن (Diocletian) (۲۸۴ء) نے اعزازی بوسہ کا رواج دیا۔ جنگی خدمات کے صلہ میں شاہنشاہ بہادر سپاہیوں کی پیشانی کا بوسہ لیتا تھا۔

مارسلی نس (چوتھی صدی بعد مسیح Marcellinus) رومن امراء کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

جب کوئی اُن سے ملتا ہے اور اُنھیں سلام کرتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ بوسہ دینے کیلئے بڑھا دیتے ہیں۔

اس زمانہ میں پیران طریقت کا بھی یہی حال ہے۔

تیسری صدی (بعد مسیح) کے آخر میں عام طور پر بوسہ بجائے سلام رائج تھا۔ سلام کا خلوص بوسہ کی تعداد پر منحصر تھا، جتنی تعداد میں بوسے لئے جاتے اُسی قدر خلوص سمجھا جاتا۔ شاہنشاہ قسطنطین (Constantine) نے سنہ ۳۱۳ء میں یہ قانون نافذ کیا کہ جو مرد اپنی منگیتر کا بوسہ لے، اگر مرد نکاح سے قبل فوت ہوجائے تو عورت اُس کی وراثت میں نصف کی شریکدار رہیگی اور اگر اس درمیان میں خود عورت ہی مرجائے تو عورت کے ورثاء بھی اس نصف کے حقدار ہوں گے۔

متاخرین نے قانون کو اور بھی سخت بنا کر اس امر کی کوشش کی کہ یہ رسم کلیتًا مفقود ہوجائے چنانچہ قسطنطین کے جانشین نے یہ قانون نافذ کیا کہ اگر ایک شادی شدہ عورت کسی غیر شخص کو بوسہ دیگی تو وہ اپنے مہر سے محروم کر دی جائے گی۔

جمہوریت کے ابتدائی دور میں بوسہ کا رواج عمومًا ادنی طبقہ میں تھا، غرباء امراء کا بوسہ لیتے تھے مساوی طبقہ کے لوگ ہاتھ ملاتے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے۔ بعد چندے سپاہیوں نے اپنے افسروں کا بوسہ لینے سے انکار کر دیا۔ جمہوریت کے بعد جب شاہنشاہیت کا دور شروع ہوا تو یہ فرائض میں شامل سمجھا جانے لگا اور امیر و غریب سب پر ایک دوسرے کا بوسہ لینا لازم تھا۔ ادنیٰ درباری مجبور تھے کہ وہ جامۂ سلطانی کی تعظیم رکوع کے ساتھ کریں اور داہنے ہاتھ سے اُٹھا کر اپنے لب سے لگائیں۔ مغرور سلاطین نے اس کو بھی روا نہ رکھا اور بجائے اس کے یہ رسم قرار پائی کہ وہ ایک فاصلہ سے رکوع کرتے اور اپنے ہاتھ کو بوسہ دیتے۔ اسی طریقہ سے وہ اپنے دیوتاؤں کی بھی پرستش کرتے تھے۔

سوٹن ([illegible]) نے "بارہ شاہنشاہوں کی سوانح عمری" میں تحریر کیا ہے کہ اُن کے زمانہ میں بوسہ بازی جنون کی حد تک پہونچ گئی تھی یہاں تک کہ اگسٹس (۶۳ ق۔م) اور ٹبیریس نے اسکے

خلاف سخت قوانین نافذ کئے۔ اُس زمانہ کی شاعری میں بھی اسی کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے چنانچہ ہوریس (Horace) اپنے قطعات میں لکھتا ہے۔

"تیرے لبوں پر پُرجوش لڑکا وحشت اثر محبت کے نشانات اپنے دانتوں سے بناتا ہے"۔

سینٹ والنٹائن (St. Valentine) (سنہ ۲۶۳ء) کا کلام بھی اس ذکر سے مملو ہے۔

بعض معتبر تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر عظیم الشان دعوت میں رسماً ہر مہمان کا فرض ہوتا تھا کہ وہ خادمہ کے لب چومے۔ عموماً بوسہ کی تعداد اُسی قدر ہوتی تھی جتنے کہ میزبان کے نام میں حروف ہوتے کبھی کبھی اس کی تعداد اُن حروف پر بھی منحصر ہوتی جو مخصوص مہمان کے نام میں ہوتے۔

ہومر کا بیان ہے کہ اوڈیسیس (Odysseus) کے ملازم اپنے آقا کا سر، شانہ اور ہاتھ چومتے تھے۔ اُسی سے یہ بھی روایت ہے کہ صرف مخصوص ملازمین کو یہ شرف حاصل تھا۔ ادنیٰ درجہ کے ملازمین صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کرتے تھے۔ اس واقعہ سے اس مشہور عام روایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ روم میں عام طور پر ادنیٰ درجہ والے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا سر، ہاتھ اور پاؤں کا بوسہ لیتے تھے۔ جسقدر ادنیٰ درجہ کا شخص ہوتا اُسی قدر معمولی جزوِ جسم کا بوسہ لیتا، مثلاً ایک خانہ زاد پاؤں چومتا۔ ایک مفلس اجنبی ہاتھ چومتا، معمولی دوست سر کا بوسہ لیتا۔ شاہنشاہیت کے ابتدائی دور میں ایک ممتاز شخص کے لئے گھر سے باہر نکلنا مشکل تھا اس لئے کہ ہر کہ و مہ اُس کا بوسہ لینا اپنا فرض سمجھتا۔ وہ لوگ جو مندر میں داخل ہوتے وقت اپنے ہاتھوں کو بوسہ نہ دیتے وہ کافر و ملحد سمجھے جاتے تھے۔

اہلِ یونان و اہلِ روما دونوں میں یہ عام رسم تھی کہ مرد اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں شراب پیتے اور بعد کا پینے والا اُس حصۂ جام کا بوسہ دیتا جو پہلے پینے والے کے لبوں سے مس ہو چکے ہوتا۔ بن جانسن (Ben Jonson) اس رسم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اگر تو پیالہ میں ایک بوسہ چھوڑ دے
تو پھر یقین ہے کہ میں شراب نہ مانگوں گا

اہلِ روما کا یہ شوق زندگی تک محدود نہ تھا۔ وہ مرنے والے کا بھی بوسہ لیتے تھے اس لئے کہ اُن کا اعتقاد تھا کہ اس طرح مرنے والا مرنے کے بعد چین کی نیند سوئے گا۔ اُن کی زندگی میں بوسہ کو اسدرجہ دخل تھا کہ اُنھوں نے مختلف الفاظ مختلف قسم کے بوسوں کے لئے اختراع کر رکھے تھے دوستوں کے بوسہ کو آسکولم (Osculum) کہتے، جب کوئی مہربانی اور عنایت سے کسی کا بوسہ لیتا تو اُسے بیسیم (Basium) کہتے۔ اور جب عاشق و معشوق اس لطف سے محظوظ ہوتے تو

...سے سوآویم (Suavium) کہتے

* رومن سلاطین مخصوص سرداروں کو بوسہ سے سلام کرتے۔ ہر خوشی کے موقع پر مبارکباد دینے والا ...لب اور آنکھوں کا بوسہ لیتا۔ جب افسران اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوتے تو سپاہی اُنکا ہاتھ چومتے ...پ اپنی بیٹی کے سامنے اپنی زوجہ کا بوسہ نہ لیتا مگر قریبی رشتہ داروں کو یہ اجازت تھی کہ اپنی عزیز عورتوں کے لب کا بوسہ لیں۔

کیٹولس[1] (Catullus) نے بوسہ کے متعلق ایک نہایت کامیاب نظم لکھی ہے۔

نمبر ا نرمی سے میرے بوسے لیلو اور مجھ سے آہستہ کلام کرو

بعض کے کان بہت تیز ہوتے ہیں

ممکن ہے کوئی دشمن ہماری جاسوسی کر رہا ہو تو کیا ہو؟

یونان یونانی تہذیب وتمدن کا بھی دُنیا کے قدیم تمدن میں شمار ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رواج یونان قدیم میں بھی تھا۔ ہومر نے پریام (Pariam ...۹۵۰ ق۔م) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُس نے اچیلز (Achilles) کے ہاتھ چومے اور گھٹنوں کو سینہ سے لگایا تاکہ وہ ہیکٹر (Hector) کو واپس دیدے۔

تاریخ سے بوسہ لب کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ قدیم یونان میں ایک قانون نافذ تھا کہ جو مرد کسی عورت کا شاہراہ پر بوسہ لیگا اُس کو سزائے موت دیجائے گی۔ ایتھنز کے ایک نوجوان نے پسٹریٹس ظالم (Pisistratus ۶۱۲-۵۲۷ ق۔م) کی حسین لڑکی کا بوسہ بازار میں لے لیا۔ ملکہ نے جب ملزم کے قتل کی خواہش ظاہر کی اُسوقت پسٹریٹس نے جو جواب دیا وہ دُنیائے محبت میں ہمیشہ یادرہیگا۔

"اگر ہم اُنھیں نیست ونابود کر دیں جو ہم سے محبت کرتے ہیں تب اُنکے لئے ہم کیا سزا تجویز کرینگے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں"

بادشاہ گو ظلم تعدی میں مشہور زمانہ تھا لیکن خلوص ومحبت کے اثرات سے وہ بھی محفوظ رہے گا۔

ہیروڈوٹس (۴۸۴ ق۔م) کا بیان ہے کہ

کوئی مصری مرد یا عورت اس کا مجاز نہ تھا کہ وہ کسی یونانی کے لبوں کا بوسہ لے

---

[1] ...۱۔۵۴ ق۔م۔ مشہور رومن شاعر، سیسرو کا دوست اور پہلا رومن شاعر ہے جسنے یونانی نظم کا کامیابی سے یونانی زبان میں ترجمہ کیا۔

مورخین فن کا خیال ہے کہ افلاطون (۴۲۹-۳۴۷ ق-م) کے زمانہ میں بھی یہ رواج قایم تھا، لیکن ایک انگریزی شاعر اس کی تردید کرتا ہے

"افلاطونی بوسہ کسے کہتے ہیں۔

"مجھے شبہ ہے کہ آیا افلاطون اس لذت سے واقف بھی تھا"

"مجھے یقین ہے کہ افلاطون کے زمانہ کی دُلھنیں کبھی اس طرح حاصل نہ کی جاتی رہی ہوں گی"

"دعوت" مصنفہ زینافن (Xenophon ۳۵۴ ق-م) میں اُس رقص کا مفصل ذکر پایا جاتا ہے جس میں ڈایونسس (Dionysus) اور اریاڈنی (Ariadne) ملکر ناچے اور گائے تھے

اہلِ روما کی طرح یونانیوں میں بھی یہ رواج تھا کہ مندر میں داخل ہونے سے قبل ہر شخص اپنے ہاتھوں کا بوسہ لیتا تھا۔ لوسین (Lucian) کا بیان ہے کہ جب ڈیاس تھینز (۳۸۲ ق-م) این ٹی پیٹر (Antipater) کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگیا اُسوقت اُس نے قریب کے مندر میں جاکر عبادت کی اجازت طلب کی۔ حسب معمول ڈیاس تھینز نے داخلہ سے قبل اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیا جس کو محافظین مندر نے معمولی اُصولِ عبادت سے تعبیر کیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے اس طرح زہر کھالیا۔

پلوٹارک کی تصنیفات میں بھی بوسہ کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ رومن کی طرح اہلِ یونان میں بھی 'بوسۂ ساغر' کا رواج پایا جاتا تھا۔

ایک زمانہ تک یہ باور کیا جاتا رہا کہ خوبصورت عورت کا بوسہ لینا دردِ سر کا علاج ہے۔ اُصول علم النفس سے یہ خیال ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض حصۂ ملک میں یہ بھی رواج تھا کہ بعد نکاح دولہا دُلہن کے کان پر گھونسہ مارتا اُس کے بعد بوسہ لیتا۔ اول الذکر کے یہ معنی تھے کہ اگر تو مجھے ناراض کرے گی تو مار کھائے گی اور خوش رکھے گی تو موخر الذکر صورت پیش آئے گی۔ کسی حصۂ ملک میں یہ بھی دستور تھا کہ جب لڑکا پیدا ہوتا تو اُسے زمین پر لٹا دیتے اُسوقت باپ یا کوئی قریبی رشتہ دار آکر اُسے اُٹھاتا اور اُس کا بوسہ لیتا۔ ابائی دس میں یہ عام دستور تھا کہ جب کوئی دعوت ہوتی تو دودھ پیتے بچوں کو دایوں کے گود سے لیتے اور ہر مہمان کے روبرو لیجاتے جو سلسلہ سے اُس کا بوسہ لیتا۔

اہلِ یونان و روم کا دستور تھا کہ جب بچوں کا بوسہ لیتے تو اُن کو کان سے پکڑ لیا کرتے۔ روم میں ابھی تک محبت کے دیوتا کا بت اس طور پر بنا ہے کہ دیوتا کے ایک ہاتھ میں عورت کا کان ہے اور دوسرا ہاتھ بغل میں ہے اور وہ عورت کا بوسہ لے رہا ہے۔

انگلستان اسکنڈینیویا (Scandinavia) میں یہ عام روایت مشہور ہے کہ ملک انگلستان میں بوسہ کا رواج ہنجسٹ (Hengist) کی خوبصورت لڑکی راوینہ (Rowena) نے قائم کیا۔ برطانوی شاہنشاہ نے اپنے اتحادیوں کی دعوت کی تھی جس میں راوینہ بھی شریک ہوئی۔ اپنی ملکی رسم کے مطابق راوینہ نے وارٹی جرن (Vortigern) کو ایک بوسہ سے سلام کیا۔ اڈورڈ چہارم کے زمانہ میں بوسہ بیحد مقبول عام تھا۔ ایک مہمان کا یہ فرض تھا کہ وہ آمد و رخصت دونوں موقعوں پر گھر کی تمام عورتوں کا بوسہ لے۔ یہ رسم رفتہ رفتہ اس درجہ عام ہوئی کہ نہ صرف مخصوص اوقات میں لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے بلکہ یہ تفریح و لطف کے عام سامان میں شامل ہو گیا۔ جب اریسمس (Erasmus) ۱۴۹۷ء میں انگلستان گیا اُسوقت اس رسم کا عروج تھا اس کا بیان ہے کہ "اگر تم کسی جگہ جاؤ تو وہاں کا ہر شخص ایک بوسہ سے تمھارا استقبال کرے گا، اگر تم کسی سفر کے لئے رخصت ہونا چاہوگے تو ہر شخص تمھیں بوسہ سے الوداع کہیگا۔ جب تم واپس آؤگے تو بوسے لئے جائیں گے، اگر کوئی تم سے ملنے آئے گا تو بوسہ پہلی چیز ہوگا اور جب وہ رخصت ہوگا تو وہ ہر شخص کا بوسہ لیگا۔ اگر وہ تمسے کہیں ملیں گے تو بوسہ کی بوچھار ہو جائے گی۔ الغرض جہاں تم جاؤ بجز بوسہ کے تمھیں کچھ نظر نہ آئے گا۔ اگر تم نے ایک بار بھی اس کا لطف اُٹھالیا ہے تو نہ صرف تم دس برس تک ملک نہ چھوڑو گے بلکہ زندگی بھر تم وہیں رہجاؤگے (خط موسومہ فاسٹس (Faustus))

جان بنین (John Bunyan) مصنف (Pilgrims Progress) نے اس کے ایک صدی بعد کی جو حالت بیان کی ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے۔ جان بنین ایک مذہبی شخص تھا اس لئے اس نے انگلستان کے اس عُریاں رسم کو بری نظروں سے دیکھا وہ لکھتا ہے کہ "عورتوں کے عام طرز سلام سے مجھے بیحد نفرت ہے۔ میں جس کسی میں یہ عادت دیکھتا ہوں میرا دل دُکھتا ہے۔ جب میں نے ایک نفس لوگوں کو مہمان یا میزبان عورتوں کا بوسہ لیتے دیکھا تو میں نے سخت اعتراض کیا جس کا جواب مجھے یہ ملا کہ یہ محض اخلاقاً تھا جس کا میں نے یہ جواب دیا کہ بایں ہمہ یہ منظر نہایت بدنما و عریاں تھا میرے اس اعتراض کا اُن* کے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ پھر تم سلام میں جوان و بوڑھے کی تمیز کیوں کرتے ہو۔ خوبصورت عورتوں کو فوراً بوسہ سے سلام کیا جاتا ہے لیکن بدصورت کی طرف التفات بھی نہیں کیا جاتا۔

جیمس اول و چارلس اول کے زمانہ میں یہ عام رواج تھا کہ خوبصورت میزبان ہوٹل کے ہر نئے مسافر کا بوسہ لیتی۔ اس زمانہ میں جن بیرونی سیاحوں نے انگلستان کو دیکھا ہے وہ اس رسم پر بیحد متعجب رہے ہیں۔ ۱۶۰۰ء کے لکھے ہوئے ایک قلمی ہسپانوی نسخہ میں ہسپانوی سفیر کا ایک واقعہ

درج ہے کہ " اُس نے ملکہ کے ہاتھوں کو بوسے دئے اور بعد ازاں ملکہ کی اجازت سے تمامی بیگمِ موجودہ مجلس کے لبوں کے بوسے لئے، یہ ایک ایسی رسم تھی جس کا ترک عورتوں کی صریحی توہین سمجھی جاتی تھی"۔

" سوانح وُزلی (Life of Wooley) مصنفہ کیونڈش (Cavendish) کا حسب ذیل اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہیں :- " میں کھانے کے بڑے کمرے میں بیٹھکر صاحبۂ خانہ کا انتظار کرنے لگا اور جب وہ اپنے کمرے سے بارہ سہیلیوں کو لیکر باہر آئی تب اُس نے مجھ سے کہا " چونکہ تم انگلستان کے باشندہ ہو جہاں رواجاً میزبان کے گھر کی ہر عورت کا بوسہ لینا ضروری ہے اس لئے میں اور میری تمام سہیلیاں تمھارا بوسہ لیں گی گو یہ میری ملکی رواج کے خلاف ہے"۔

ہم انگلستان میں ازدواجی بوسہ کا ذکر سب سے پہلے " کنٹربری ٹیلس (Canterbury tales) مصنفہ چاسر (Chaucer) میں پاتے ہیں جو ۱۳۸۹ء میں تصنیف کی گئی تھی۔

" میری پیاری زوجہ ! اب میں تیرے خلوص کا قائل ہوا ہوں۔ یہ کہکر اُس نے اُسے اپنے آغوش میں لے لیا اور اُس کے لب چوم لئے"۔

اڈورڈ چہارم (۱۴۶۱-۱۴۸۳ء) کے زمانۂ سلطنت میں بوسہ کا عام رواج تھا۔ ہر مہمان کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ آمد و رخصت کے اوقات پر خاندان کی ہر عورت کا بوسۂ استقبالی یا بوسۂ وداعی لے ارسمس کا مذکورۂ بالا بیان اسی رسم کا اثر تھا۔

اس کے علاوہ انگلستان میں اور قسم کے بوسوں کا بھی رواج تھا۔ ۱۵۳۰ء کارڈینل وُلزلی نے اُنسٹھ اشخاص کے پاؤں دھوئے اور اُن کے بوسے لئے۔ اُس صدی میں بوسۂ رقص کا بھی بیحد رواج تھا۔ نکاح کے موقعہ پر زوجین ایک دوسرے کا بوسہ لیتے تھے۔

ازمنۂ قدیمہ میں حضرت مسیح کے عجز و انکسار کی یادگار میں بادشاہ و ملکہ بذات خود اپنی عمر کے سال کی تعداد میں لوگوں کے پاؤں دھوتے اور اُنکا بوسہ لیتے اور مناسب انعامات تقسیم کرتے۔ ملکۂ الیزبتھ نے اس فرض کو گرینوچ (Greenwich) میں انجام دیا تھا۔ سینتالیس غریب و مفلس اشخاص کے پاؤں دھوئے گئے، سب سے پہلے اس فرض کو حامی نے انجام دیا ہر شخص کا پاؤں دھونے کے بعد حامی نے اُس کے پاؤں پر ایک صلیب کا نشان بنایا اور اُس کو بوسہ دیا۔ اسکے بعد تینتالیس سہیلیوں کے ساتھ ملکہ نے گلاب و عنبر کے پانی سے اُن کے پاؤں دھوئے اور اُن کا بوسہ لیا۔ آخر میں کپڑے، غلے اور روپیہ تقسیم کئے گئے۔

اسی زمانہ میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ رقص کے بعد مرد اپنی شریک رقص عورت کو اپنے ساتھ لاکر کرسی پر بٹھا دیتا اور بٹھاتے وقت اُس کا بوسہ لے لیتا۔ اسوقت بوسہ سے احتراز توہین وناشائستگی سمجھی جاتی تھی۔

ملک میں بوسہ کے رواج کا انداز آپ صرف اس ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ چودھویں صدی میں ایک انگریزی فوج کا سپاہی "فیلڈ آف دی کلاتھ آف گولڈ" (Field of the Cloth of Gold) دیکھنے کے لئے فرانس گیا۔ ایک گاؤں کے قریب اُس کے گھوڑے کا نعل گر گیا اُس کی مرمت کے لئے اُسے ایک نزدیک کے گاؤں میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں اُسوقت گاؤں کا حاکم اعلیٰ موجود نہ تھا اُس کی بیوی اپنی بارہ سہیلیوں کے ساتھ قلعہ سے باہر آئی اور سوار سے کہا "تمہارے انگلستان میں یہ رسم ہے کہ ہر مرد ہر عورت کا بوسہ لیتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اس رسم کی پیروی میرے اور میری سہیلیوں کے ساتھ کرو" اس حکم کی تعمیل بخوشی کی گئی۔

سترھویں صدی کے وسط تک انگلستان میں یہ عام رواج تھا کہ جب دو مرد یا دو عورتیں یا دو مرد و عورت سڑک پر ملتے تب بھی وہ ایک دوسرے کا بوسہ لیتے۔ یہ بوسہ بطور سلام رائج تھا۔ ہوَن (Hone) کی "سالانہ کتاب" کا حسب ذیل اقتباس قابل ملاحظہ ہے:۔

"ہماری قدیم رسم کا دوسرا نمونہ فرانسیسی بفلگیری میں ملیگا۔ مرد ایک دوسرے کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور پھر اُس کے بعد ایک دوسرے کے گال چھوتے ہیں۔ لیکن جب اُن کا تعارف کسی عورت سے ہوتا ہے تب وہ اُس عورت کے باپ یا بھائی سے اجازت طلب کرکے اُس کے گالوں کو سلام کرتے ہیں"۔

جیمس اول (۲۵-۱۶۰۳) بادشاہ انگلستان کے زمانہ میں بھی اس کا بیحد رواج تھا، چنانچہ ایولین (Evelyn) نے مسز اُوِن (Mrs Owen) کو جو خط لکھا ہے اُس کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"سر جے۔ شا (Sir J. Shaw) پنجشنبہ کو ہمارے مکان پر آئے تھے لیکن افسوس کہ ملاقات نہو سکی۔ اُس کے بعد لندن میں اکثر اُن سے ملاقات ہوا کی اور میں نے بلا تکلف اُن کے بوسے لئے"۔

چارلس دوم کی تخت نشینی کے بعد (۱۶۶۰ء) اس رواج میں کمی پیدا ہو گئی تھی۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ انقلاب اُس درس وتدریس کا نتیجہ تھا جو فرانس سے واپسی پر چارلس نے ملک میں رائج کیا تھا۔ مردوں میں تو تقریباً اس کا رواج ختم ہو گیا لیکن صنف نازک میں برابر قایم رہا۔

دارالعوام کے انتخابات میں کبھی "بوسۂ رشوت" سے بھی رائیں حاصل کی گئیں ہیں۔ فاکس کے

انتخاب میں لیڈی ڈیون شائر نے ہر رائے دہندہ کو بوسہ دینے کا وعدہ کیا۔ گزشتہ صدی میں ایک امیدوار نے ہر رائے دہندہ کی زوجہ کے بوسے مُنھ میں گنی لیکر لئے۔ اس اُصول رشوت کو قانون نے ناجائز تصور کرکے اُمیدوار کو برطرف کردیا۔

انگریزی شاعری میں بوسہ کے لئے حسب ذیل تشبیہات مستعمل ہیں:۔

(۱) مرہم اُلفت۔ (۲) مُہر کا مدیو۔ (۳) اُجرت عاشق۔ (۴) معاوضۂ فراق۔ (۵) اولین و آخری مسرت (۶) پیشکش حیات۔ (۷) ضمانتِ عہد۔ (۸) زبانِ عشق۔ (۹) خراجِ اُلفت۔ (۱۰) فصاحت عشق۔ (۱۱) تسنیم زہرہ۔ (۱۲) عہد مسرت و محبت۔ (۱۳) مُہر مسرت۔ (۱۴) جرعۂ دلگداز۔ (۱۵) ثمر اُلفت۔

چونکہ سیکارتھی کی "شیریں مقالی" آئرلینڈ والوں کے لئے مفید ثابت ہوئی اس لئے وہ تو اس کو سیکارتھی کے حُسن تقریر سے تعبیر کرتے ہیں لیکن چونکہ انگلستان کو اس سے نقصان پہونچا اس لئے وہ اسے سیکارتھی کی دروغ بافی سمجھتے ہیں۔ ایک شاعر نے اسی خیال کو نظم کیا ہے:۔

قلعہ بلارنی کے شکستہ مینار پر ایک پتھر ہے جہاں تم آسانی سے پہونچ سکتے ہو۔
اگر تم اُس کا بوسہ لے لو تو تم کو کذب آمیز تقریر میں ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے جو شخص بھی ایسی تقریر کرتا ہے ملک کے کسان کہتے ہیں کہ اُس نے 'بلارنی اسٹون' کا بوسہ لیا ہے۔

اسکاٹلینڈ اسکاٹلینڈ میں بوسہ عام طور پر رائج ہے لیکن چند دنوں سے منظر عام پر بوسہ لینے کے خلاف ایک زبردست تحریک صنفِ نازک کی جانب سے شروع ہوئی ہے

ایک قدیم کتاب "عورتوں کی لغت" (The Ladies' Dictionary) میں تحریر ہے کہ:

"بوسہ اور شراب کا اس ملک میں اسدرجہ رواج ہے کہ رومن حکومت کے دور میں بھی اس قدر نہ رہا ہوگا۔"

رُومن حکومت میں کیا حالت تھی اس کا اندازہ آپ کو مارشل (Martial) کی تصنیف "ایپگرام" (Epigram) کے حسب ذیل اقتباس سے ہوگا۔

"ہر داڑھی مونچھوں والا دہقانی آپ کا ایک قوی اور معطر بوسہ لے لیتا ہے۔ یہاں ایک جلاہا آپ پر حملہ کرتا ہے تو وہاں کوئی لوہار آپ کو سینہ سے لگاتا ہے، تیری جگہ ایک موچی جس نے ابھی چمڑے کو بوسہ دیا تھا وہ آپ کے لبوں سے لب ملانے کو آمادہ ہے۔ کہیں ایک نہایت گندی داڑھیوں والا مستعد ہے تو دوسری جگہ کوئی کانا اُسی حرکت کے لئے آمادہ ہے۔ پھر کہیں اگر کوئی گندی آنکھوں والا موجود ہے تو دوسری جگہ کوئی ایسا شخص بھی آپ کو ملیگا جس کے مُنھ سے سخت بُو آرہی ہو۔"

روس آج سے دس سال قبل تک روس اس رواج و رسم میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ ایسٹر (EASTER) کے موقعہ پر ہر شخص ایک دوسرے کو بوسہ لیکر اور دے کر سلام کرتا تھا۔ یونہی عام طور پر ہر رکن خاندان دوسرے کا ملاقات کے وقت بوسہ لیتا تھا۔ اتفاقیہ ملاقات میں احباب ایک دوسرے کا بوسہ لیتے تھے۔ مالک اپنے ملازم کا منھ چومتا تھا۔ سردار اپنے ماتحت سپاہیوں کا بوسہ لیتے تھے۔ زار روس ملاقات کے وقت اپنے ہر رکن خاندان کے لب چومتا تھا اور خاص مواقع پر تو شاہنشاہ اُس شخص کا بوسہ لیتا تھا جس پر اُس کو خاص عنایت کرنی منظور ہوتی تھی۔

ملک کے بعض حصوں میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی غریب رعایا کسی عالی خاندان خاتون کے سامنے آجاتا تو وہ یہ کہتا کہ :-

'حضرت مسیح زندہ ہو گئے'

جس کے جواب میں اُسے بوسہ عنایت ہوتا اور ساتھ ہی خاتون یہ جواب دیتی

بیشک وہ زندہ ہو گئے۔

یہاں عورت کی دست بوسی کا رواج تقریباً مفقود تھا۔ لبوں کے بعد پیشانی مقبول عام سمجھی جاتی تھی۔ اگر کوئی معزز خاتون کسی شخص سے خلوص کا اظہار کرنا چاہتی تو اُس کی پیشانی کے بوسے لیتی۔ عام کسان اپنے آقا کے گھٹنوں کو سینہ سے لگا کر اُن کا بوسہ لیتے تھے۔

ملکہ کیتھرائن (Catherine) نے ایک انجمن قایم کی جس میں مرد و عورت دونوں شریک تھے۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ وہ عوام میں عمدہ اخلاق و آداب کی تلقین کرے۔ اس انجمن کے قواعد خود ملکہ نے منضبط کئے تھے جن کا ایک اہم واقعہ یہ تھا۔

"مجلس کے اندر کوئی مرد کسی عورت کا بوسہ لینے کا مجاز نہوگا۔ اگر کوئی مرد اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کو موت کی سزا دی جائے گی۔"

جولائی سنہ ۱۸۸۸ء میں شاہنشاہ ولیم نے زار روس سے سینٹ پٹرس برگ میں ملاقات کی۔ اُسوقت دونوں بادشاہوں نے ایک دوسرے کو سینہ سے لگایا اور متعدد بوسے لئے۔

الکزنڈر ڈوما (سنہ ۱۸۰۲-۱۸۷۰) کا بیان ہے کہ "میں نے روس سے زیادہ بوسہ کا رواج کسی ملک میں نہیں پایا۔ اس کثرت و افراط کے بعد خیالات عامہ نے تبدیلی حاصل کی یہاں تک کہ آج روس سے زیادہ دُنیا میں کوئی ملک بوسہ کا دشمن نہیں ہے۔ وہ سیاح جو ابھی سیاحتِ روس سے واپس آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ حکومت نے بوسہ کے خلاف علانیہ جنگ شروع کر دی ہے حکومت کا ایک اعلان بعنوان

"تم کو بوسہ سے احتراز کرنا ہوگا"

شائع ہوا ہے۔ جماعت کے رہبروں کا خیال ہے کہ بوسہ اُصول حفظان صحت کے بالکل منافی ہے اسلئے تمام بیرونی خطرات سے قبل اس خطرہ کو رفع کرنا چاہئیے۔ ایک انجمن موسومہ "جماعت مخالفِ بوسہ" قایم کی گئی ہے جس کی شاخیں ملک کے تمام شہروں میں کھول دی گئی ہیں۔ اس انجمن نے مختلف اشتہارات و رسائل تقسیم کئے ہیں چند اشتہارات کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس شرمناک و خطرناک رسم کو ترک کرو

(۲) بوسہ بازی کو فنا کردو

ڈاکخانوں نے بھی اس تبلیغ میں حصہ لیا ہے چنانچہ ہر ٹکٹ کے نیچے یہ عبارت درج ہوتی ہے کہ:۔

"بوسہ لینے سے قبل غور کر لو کہ ہر بوسہ چالیس ہزار جراثیم پیدا کرتا ہے"۔

آئس لینڈ آئس لینڈ کی سرد آب و ہوا میں بوسہ کی گرما گرمی نہایت موزوں سامانِ تفریح سمجھا جاتا ہے لارڈ ڈفرن نے اپنے سفرنامہ میں ایک واقعہ لکھا ہے جو وہاں کی حالت سے بہت کچھ واقفیت بہم پہونچاتا ہے

"میں نے فرٹنر سے دریافت کیا کہ کیا سیاح کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ رخصت کے وقت ا

میزبان کا بوسہ لے۔ مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ شخص میرے الفاظ کی گرفت کرے گا۔ آپ میری حیرت کا اندازہ کریں جب اُس نے ایک قابل رشک بے باکی سے بطور تمہید پہلے توماں کو سینہ سے لگایا پھر وہ نہایت بے تکلفی سے صاحبزادی کی طرف بڑھا۔ میں اسدرجہ خوفزدہ تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے منھ میں زبان ہی نہیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ دوسرے لمحہ میں ہلوگ کان پکڑ کر گھر کے باہر نکالدئے جائینگے اور بیگم پر بیہوشی طاری ہوجائے گی۔ لیکن اس نے ایک طالب العلمانہ بے تکلفی سے فرٹنر کا استقبال کیا اور اُس کا بوسہ لیا اس درمیان میں اُس کی آنکھوں کی پتلیاں شرارت سے ناچ رہی تھیں۔ اُس واقعہ کے بعد میں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ ملکی رسم کی پیروی کروں"۔

اس رسم نے جب ایک قبیح صورت اختیار کر لی تو حکومت نے اس کے خلاف قانون نافذ کئے جسکی رو سے ناجائز اور نار وا بوسہ لینے والے کی سخت سزا تجویز کی گئی۔ کسی عورت کا اُس کی مرضی کے خلاف بوسہ لینا یا کسی شادی شدہ عورت کا بوسہ لینا جرم قرار دیا گیا جس کی سزا میں مجرم شہر بدر کیا جاتا یا جرمانہ کا مستوجب ہوتا۔ اگر غیر شادی شدہ عورت بوسہ کی اجازت بھی دے تب بھی مجرم کو فی بوسہ تین مارک بطور جرمانہ ادا کرنے ہوتے تھے۔

اس قانون کے نفاذ سے قبل ملک میں یہ عام رواج تھا کہ مہمان کو شب کے کھانے کے بعد

گھر کی مالکہ سونے کے کمرہ میں لیجاتی تھی اور اپنے ہاتھوں سے اُس کے کپڑے اُتار کر اُسے پلنگ پر لٹادیتی اور جھکتے وقت اُس کے دو بوسے لے لیتی۔ صبح کے وقت بھی ضیافت کے سامان اُس کے بیدار کرنے کے لئے بھی مہیا رہتے۔ رخصت کے وقت مالکۂ خانہ کا یہ فرض ہوتا کہ وہ مہمان کے بوسے لے

جرمنی | جرمنی میں دو ضعیف العمر داڑھی موچھوں والوں کا ایک دوسرے کا منھ چومنا عام بات ہے۔ جولائی ۱۸۸۸ء میں جب شاہنشاہ ولیم (William) نے سینٹ پیٹرس برگ میں زار روس سے ملاقات کی تو دونوں تاجداروں نے ایک دوسرے کو سینہ سے لگایا اور متعدد بوسے لئے۔

گو انگلستان و امریکہ میں بوسہ بازی بطور فن عمل میں لائی جاتی ہے لیکن جرمنی سے زیادہ قرینہ سے دُنیا میں کوئی قوم بوسہ نہیں لیتی۔ ماہران فن کا خیال ہے کہ جرمن مرد و عورت ایک دوسرے کو اپنے بوسہ سے بہترین طور پر لطف اندوز کرسکتے ہیں۔

ایک جرمن عاشق مزاج کا مشہور مقولہ ہے کہ "بوسہ دانتوں کے درد کی حکمی دوا ہے"۔ ملک کا یہ عام رواج ہے کہ منگنی کی رسم کے بعد ہونے والا شوہر جب اپنی منگیتر کے مکان سے رخصت ہوگا اُسوقت وہاں کی ہر عورت و مرد کا بوسہ لیگا۔

قدیم ٹیوٹنس (Teutons) بوسہ کو محض محبت و دوستی کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

پولینڈ | پولینڈ (Poland) میں یہ عام رواج ہے کہ چھوٹے اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ بزرگوں کا یا اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا شانہ چومتے ہیں۔

زیچوسلیوکیا | زیچوسلیوکیا (Czechoslovakia) کے باشندے ایک دوسرے کا دامن چومتے ہیں۔

ہسپانیہ | ہسپانیہ میں بوسہ کا نسبتاً کم رواج ہے۔ جب دو مرد و عورت ملتے ہیں تو مرد کا یہ فرض تصور کیا جاتا ہے کہ وہ عورت کو سلام کرے لیکن یہ سلام بوسہ کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے "اقرار باللسان" کافی سمجھا جاتا ہے۔ مرد یہ کہتا ہے کہ "میں نے تمھارے ہاتھوں کو بوسے دئے"

موجودہ ہسپانوی لڑکی کے متعلق ایک مبصر کی رائے ہے کہ وہ اپنے ہر عضو جسم سے بوسہ لیتی ہے۔

الفانزو ثالث (Alfanso III) ابھی چند ہی سال کا تھا کہ تخت پر بٹھا دیا گیا اور اُس کی ماں کے سپرد انتظام سلطنت کردئے گئے۔ مشہور رقاصہ ایڈی لینا پیٹی (Adelina Patti) جب دربار میں حاضر ہوئی اور اپنے ہُنر دکھائے تو ملکہ نے بیحد تعریف کی۔ پیٹی نے درباری آداب کے لحاظ سے جُھک کر بادشاہ کے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا۔ ملکہ نے کہا۔ "میں اپنے بچہ کو وہ پہلا

بزدل ہسپانوی نہیں ہونے دینا چاہتی جو ایک عورت کو اپنے ہاتھ کا بوسہ لینے کی اجازت دے۔ اس لئے تم اُسے اجازت دو کہ وہ انتقاماً تمھارے لبوں کا بوسہ لے۔ چنانچہ فرمانبردار بادشاہ نے جُھک کر بیٹی کو سینہ سے لگا لیا اور اُس کے بوسے لے لئے۔

فرانس موجودہ فرانس بھی اس رواج سے محروم نہیں لیکن انگلستان سے نسبتاً یہ رواج فرانس میں جدید سمجھا جاتا ہے۔ کارڈینل جان (Cardinal John) جب ڈچز آف سیوائے (Duchess of Savoy) کے حضور میں پیش کیا گیا اُسوقت ڈچز نے اپنے ہاتھ بوسے کیلئے بڑھا دئے۔ ڈچز کی یہ حرکت کارڈینل کو بیحد ناگوار گزری اور کہا کہ "خاتون محترمہ! کیا آپ مجھے اسطرح ذلیل کرنا چاہتی ہیں۔ میں اپنی ملکہ کے بوسے لیتا ہوں جو دُنیا میں سب سے بڑی سلطانہ ہے، کیا ایسی صورت میں میں آپ کے بوسے نہ لوں جو ایک گندی اور معمولی ڈچز ہیں" یہ کہکر کارڈینل نے شاہزادی کو گلے لگا لیا اور اُس کے لبوں کے تین بار بوسے لئے۔

اُنیسویں صدی سے اس رواج میں بیحد ترقی ہوئی چنانچہ اُسوقت جب انگلستان میں شاہراہ پر بوسہ لینے کی رسم مفقود ہو چکی تھی فرانس میں زور و شور سے جاری تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر ہر آنے جانے والا ایک دوسرے کو بوسہ سے سلام کرتا تھا۔

فرانس کی ایک حسینہ نے ایک بوسہ کی عوض میں تین بھیڑوں کا مطالبہ کیا۔ چند دنوں تک تو ارباب محبت اس کا مطالبہ پورا کرتے رہے لیکن جب بازار ٹھنڈا ہو گیا تو ایک بھیڑ کی عوض میں تین بوسے بھی لینے والے مشکل سے نکلتے تھے۔ اور آخر آخر تو یہ حالت ہو گئی کہ

"وہ خود تین بھیڑیں اس شرط پر دینے کے لئے آمادہ تھی کہ اُس کا کوئی ایک بوسہ لے لے"

آسٹریا آسٹریا میں عورتوں کے ہاتھوں کا بوسہ لینا عام طور پر رائج ہے۔ ایک مرد کا یہ اخلاقی فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ ملاقات اور رخصت کے وقت ہر عورت کے ہاتھوں کو بوسہ دے۔ کسی سائلہ کو جب آپ کچھ دیں گے تو وہ آپ کا ہاتھ چومیگی اور اگر کسی وجہ سے وہ اس حرکت سے معذور رہی تو وہ اپنا شکریہ ان الفاظ میں ادا کرے گی کہ "میں آپ کا ہاتھ چومتی ہوں"۔ ہر سیاح کو اس کی توقع رکھنی چاہیئے کہ آسٹریا پہونچ کر نہ صرف گدا، خادمہ اور ہرکارہ اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دیں گے بلکہ بوڑھے آدمی بھی اُس کا ہاتھ چومنے کی کوشش کریں گے۔

یہ رسم ہاتھ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ لب تک پہونچتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ اگرام (Agram) کے غربا کی مدد کے لئے شہر ٹورنیٹال (Torrenthal)

کے باشندوں نے نیلام بوسہ کی تجویز سوچی۔ ایک حسینہ نے اپنے شوہر کی رضامندی سے اعلان کیا کہ جو شخص سب سے زیادہ قیمت دے گا اُس کو وہ ایک بوسہ لینے کی اجازت دے گی۔ بالآخر ایک مرد نے پندرہ فلارنس قیمت لگائی۔ گھنٹوں ایک دو ہوا کیا لیکن جب اس سے زیادہ قیمت نہ بڑھی تو نیلام کنندہ نے "تین" کی آواز دی۔ حسینہ کے شوہر نے جب دیکھا کہ اُسکی بی بی کے حُسن کی اسدرجہ معمولی قیمت آئی تو اُس نے وہ رقم خود اپنی جیب سے ادا کر دی اور بوسہ لینا چاہا۔ لیکن خریدار نے اسے منظور نہیں کیا کیونکہ اُس کی رقم "تین" کے ساتھ ہی جمع ہو چکی تھی۔ بالآخر خریدار نے وہ چیز حاصل کر لی جس کے لئے اس نے قیمت ادا کی تھی۔

ناروے | ناروے میں اس کا رواج نہایت پر لطف ہے۔ ایک سیاح کا بیان ہے کہ جب وہ ملک میں سفر کر رہا تھا تو اُس کو ایک حسین عورت ملی جس نے اُس کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔ جب سیاح مکان پر پہونچا تو اسنے اُسے ایک نہایت اچھا بستر پیش کیا اور جب وہ دراز ہو گیا تو اُس حسینہ نے جھک کر اُس کی داڑھی کے بوسے لے لئے۔

رومانیا | ہل میگن میں ہر سال ایک میلہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر شہر کی تمام شادی شدہ عورتیں موجود ہوتی ہیں ان کے ہمراہ اُن کی ساسیں بھی ہوتی ہیں۔ ہر عورت کے ہاتھ میں ایک شراب کا جام ہوتا ہے وہ جس مرد کے پاس سے گزرتی ہیں اُس کا بوسہ لے لیتی ہیں اور اُس کے عوض میں جام شراب دیتی ہیں بوسہ یا شراب سے احتراز سخت ناشائستگی سمجھا جاتا ہے۔

ہالینڈ | ہالینڈ میں بھی یہ رسم معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ جرمنی ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ وہاں بازار میں کسی نوجوان نے ایک عورت کے بوسے لے لئے عورت نے عدالت میں استغاثہ دائر کیا لیکن عدالت اپیل تک اُس کو ناکامیابی رہی۔ عدالت نے یہ تجویز کی کہ عزم سے یہ حرکت جوشِ محبت میں سرزد ہوئی اور یہ فعل اضطراری تھا ارادی نہ تھا اس لئے قابلِ معافی ہے۔

اطالیہ | اطالیہ صدہا سال تک پاپائیت کا مرکز رہا اس لئے وہاں بوسہ کا رائج ہونا تعجب خیز نہیں۔ مگر آپ کو یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ محض مخلص احباب ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں اور یہ رسم وہاں انتہائی بے تکلفی یا خلوص کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

امریکہ | آج دُنیا میں امریکہ سے زیادہ کسی ملک میں یہ رسم رائج نہیں اور دوسرے ضروری مشاغل کی طرح اس کو بھی ایک فن بنانے کی کوشش کیجا رہی ہے۔

انگلستان کی طرح امریکہ میں بھی بوسۂ رقص کا عام رواج ہے۔ ایک نامہ نگار نے جب اس

حیاء سوز منظر کی شکایت کی تو بجل (Bugle) نے جواب دیا "ہم مجبور ہیں کہ اپنے لبوں کو حسین عورتوں کے لبوں سے ایک منٹ تک متحد رکھیں ورنہ اُن کی عجلت سارے رقص کو خراب کردیگی۔
سرجان لکنگ (Sir John Suckling) کہتا ہے:-

"سرود کی آواز کی بلندی کے ساتھ وہ اُٹھ کر ناچنے لگتے ہیں۔ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ لمبی سانسیں لیتے ہیں، ہر طرف دیکھتے ہیں پھر ناچتے ہیں اور بوسہ لیتے ہیں"۔

برینڈ نے اپنی کتاب (Popular Antiquities) میں بوسۂ رقص کو عام رسم بتایا ہے جو کہتا ہے کہ:-

"جب سارنگی بجانے والا یہ دیکھ لیتا ہے کہ نو عمر مرد و عورت گانے سے کافی لطف اُٹھا چکے ہیں اُسوقت وہ اپنے باجہ سے دو نئے سُر نکالتا ہے۔ یہ نئے سُر نوید بوسہ کا حکم رکھتے ہیں اور ہر مرد اپنے ساتھی عورت کا بوسہ لے لیتا ہے"۔

یہ کہا جاتا ہے کہ بوسۂ رقص کی رسم کے موجد یونانی تھے۔ زینو فن (Xenophon) (سنہ ۴۳۵-۳۰ ق م) نے اپنی تصنیف بینکوٹ (Banquet) میں اُس رقص کا ذکر کیا ہے جس میں ڈایونیسس (Dionysus) اور اریاڈنی (Ariadne) (سنہ ۳۴۰-۳۰ ق م) دل کھول کر ناچے تھے۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ساری محفل مست ہوگئی۔ جو کنوارے تھے اُنھوں نے عقد کی قسم کھائی اور جو شادی شدہ تھے وہ فوراً گھوڑوں پر بیٹھ کر اپنے اپنے گھر پہونچ گئے۔

ڈیڈرک نکر باکر (Dedrick Knicker Bocker) نے اپنی تصنیف تاریخ نیویارک میں بیان کیا ہے کہ ہر نوروز کو نیو امسٹرڈم (New Amsterdam) کے تمام باشندے اچھے اچھے کپڑے پہنکر گورنر کو سال نو کی مبارکباد دینے جاتے ہیں جہاں گورنر ہر عورت کا یہ کہتے ہوئے بوسہ لیتا ہے کہ "تمھیں بھی سال مبارک ہو"۔

مغربی قصبات میں ایک نہایت مفید کھیل کا رواج ہے جسے (Kissing bees) کہتے ہیں۔ دیہات میں جب غلّہ کی فصل تیار ہوجاتی ہے تو نوجوان مرد و عورت کھیت کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ مرد خوشہ چینی میں مصروف رہتے ہیں اور عورتیں علیحدہ کھڑی رہتی ہیں۔ ہر عمدہ خوشہ کا انعام عورت ایک بوسہ سے دیتی ہے اور جب کوئی خراب خوشہ لاتا ہے تو وہ اُس کے کانوں پر تھپکی مارتی ہے۔
جوئل بارلو (Joel Barlow) امریکن شاعر نے اس منظر کو نظم کیا ہے کہ:-

"جب کسی حسینہ کے سامنے کوئی خوشہ پیش کرتا ہے جو اُس کے لبوں کی مانند سرخ ہوتا ہے،

تب وہ قدم آگے بڑھاکر اُس کو منتخب کر لیتی اور وہ خوشی سے اُچھل کر انعام حاصل کر لیتا ہے۔
اسی طرح سارے کھیت کے خوشے چُن لئے جاتے ہیں اور وہ شخص جو آخری خوشہ توڑتا ہے
اُس کو کامیاب سمجھتے ہیں"

امریکہ میں ایک نہایت پُرلُطف رواج یہ ہے کہ مرد یا عورت ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ دوسرے کو جب سوتا ہوا پائے تو اُس کا بوسہ لیلے اگر سونے والے کو اس طرح نہ جگا سکا تو ایک دستانہ دینا پڑتا ہے۔ ایک بار مسٹر فینچ (Mr Finch) نے جو شہر نیوبرن (New bern) کے مشہور جوہری ہیں ایک قیمتی زیور مس واٹرس (Miss Waters) کے ہاتھ اس صورت میں فروخت کیا کہ مس مذکور اُس کی قیمت میں سو بوسہ دیں گی اور مسٹر فینچ مس صاحبہ کے مکان پر ہر روز جاکر یہ اُجرت حاصل کرلیا کریں گے۔ اتوار کے دن اس سے مستثنیٰ تھا۔ تیس روز تک علاوہ اتوار برابر قیمت کی ادائگی اس طور پر ہوتی رہی۔ لیکن اکتیسویں دن مس واٹرس نے بجائے بوں کے اپنے عارض کو پیش کیا انکار و اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر فینچ نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ:۔

"مدعی مدعا علیہ کی کمر میں ہاتھ ڈالکر تا ریخ حکم سے ستر روز تک (اتوار چھوڑکر) ستر بار روزانہ یہ عمل کرسکتا ہے"۔

کلیفورنیا کی ایک دوشیزہ نے فی دو سنٹ (Cent) کا نرخ قایم کر دیا اور ایک ہفتہ میں اسنے ۱۱ شلنگ ۲۵ سنٹ حاصل کئے۔ ایک شخص نے بارہ درجن کے معاوضہ میں ۲ شلنگ ۵ سنٹ ادا کئے۔

مشہور عالم ایکٹر مسٹر بوتھے کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ ایک بار وہ بوسٹن میں سفر کر رہے تھے کہ اُنھوں نے ایک متوسط العمر خوش لباس عورت کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "اگر یہ مرد مجھے اپنا بوسہ لینے دے تو میں پچاس ڈالر دوں"۔ بوتھے نے نہایت متانت و سنجیدگی سے بوسہ دیدیا اور عورت لے اپنا کیسہ کھولکر رقم موعودہ حوالہ کر دی۔ بوتھے نے یہ رقم فوراً ہی ایک بگیر مفلس عورت کو دیدی اور خود روانہ ہوگیا۔

کانکٹکٹ (Connecticut) میں یہ وبا اسدرجہ پھیلی کہ حکومت نے اس کے انسداد کے لئے سخت قوانین نافذ کئے۔ ایک مخصوص قانون نے (جس کا نام "نیلگوں قانون" مشہور ہے) ماں کو بھی ممانعت کر دی کہ وہ اپنے بچہ کا بوسہ نہ لے۔

عام ملکی قانون کی رو سے وہاں بغیر اجازت بوسہ لینا جرم ہے، متعدد عدالتوں نے مختلف مقدار میں جرمانہ کی سزا دی ہے۔ پن سلوینیا (Pensylvania) میں ایک نوجوان کو اسی جرم میں

۵۰ شلنگ جرمانہ دینا پڑا ہے۔ نیویارک (New york) میں ایک شخص کو ۵۰۰ شلنگ دینے پڑے۔

میکزیکو | میکزیکو (Mexico) جنوبی امریکہ کی ایک آزاد جمہوری ریاست ہے۔ اُنیسویں صدی کے اختتام تک یہاں کے باشندے اس کی لذت سے ناواقف تھے مگر موجودہ امریکن تہذیب تمدن کے اختلاط نے اُن میں بھی یہ ذوق وشوق پیدا کر دیا ہے۔

کارٹیز (Carteza) نے اپنے سفرنامہ میں اس کی تصدیق کی ہے اُس کا بیان ہے کہ جب وہ وہاں پہونچا تو ہزارہا معزز اشخاص نے اُس کا استقبال کیا اُن کے سلام کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے اُنھوں نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے اور پھر اُن کے بوسے دئے۔

فن لینڈ | فن لینڈ (Finland) کے باشندے ابتک اس لطف سے ناواقف ہیں۔ عورتیں نہ صرف اس سے نفرت کرتی ہیں بلکہ وہ اپنے شوہروں کو بھی اس لطف سے محروم رکھنا چاہتی ہیں۔ ایک عورت نے جب انگلستان کے واقعات سُنے تب وہ چلا اُٹھی کہ " میں اس رسم کو نہایت نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوں۔ اگر میرا شوہر بھی اس نازیبا حرکت کا مجھ سے مرتکب ہو تو میں اُسے ایسا گھونسہ رسید کروں کہ وہ ایک ماہ تک یاد کرے"۔

پیراگوئے | پیراگوئے میں لوگ رسمًا مجبور ہیں کہ جس عورت کا تعارف کرایا جائے اُس کا بوسہ بھی لیں۔ ایک ملکی شخص ممکن ہے کہ اس آزادی سے لطف اندوز ہوے لیکن اجنبی کو یقینًا لطف نہ آئے گا اس لئے کہ تیرہ سال سے زیادہ کی تمام عورتیں تمبا کو کھانے کی بےحد عادی ہیں۔ ملک کی عورتیں کافی طور پر ملیح و حسین ہوتی ہیں اس لئے اکثر "منچلے" اس تکلیف کو برداشت کرتے ہیں۔

نیوانگلینڈ | نیوانگلینڈ ریاست متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ہے۔ اس ملک میں ایک "جماعت" قایم ہے۔ جو ہر سال کیبسہ میں ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ ہر عورت اپنا شریک منتخب کرلیتی ہے اور اُس کے بعد ہر جوڑا قالین پر لوٹتا ہے یہاں تک کہ اُن میں بجلی کا اثر پیدا ہوجاتا ہے اسکے بعد روشنی گل کر دی جاتی اور عمل تقبیل شروع ہوجاتا ہے۔

جاپان | میکزیکو کی مانند اہل جاپان بھی اس لذت سے ناواقف تھے۔ لیکن موجودہ امریکن اختلاط نے اُن میں بھی یہ ذوق وشوق پیدا کر دیا ہے۔ ایک امریکن فوجی افسر نے اپنے جاپانی سیاحت کے زمانہ میں ایک چینی دوشیزہ سے محبت شروع کر دی۔ ایک بار فوجی افسر نے التجائے تقبیل پیش کی۔ لیکن لڑکی یہ چلاتی ہوئی نزدیک کے کمرہ میں دوڑ گئی کہ:-

" یہ خوفناک آدم خور ــــ مجھے کھاجائیگا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اُس کے قلب سے فوری اثرات غائب ہوسئے تو وہ دوبارہ واپس آئی اور اس کی وہ وحشت باقی نہ تھی۔

چین | عام طور پر ملک میں اس کا رواج نہیں پایا جاتا، لیکن ایک چینی شاعر کی نظم کا حسب ذیل اقتباس اسکا کافی ثبوت ہے کہ اگر عوام نہیں تو کم سے کم شعراء ضرور اس لذت سے واقف ہیں۔

"اُف رے تیرے شرم آلود رخسارے۔ جس میں دونوں جانب چاہ غبغب موجود ہیں
اور جو گل سرخ سے زیادہ رنگین ہیں۔
اگر ایک کو چومتا ہوں، تو دوسرے کا چڑھتا ہوا رنگ یہ کہتا ہے کہ
"مجھے بھی چوم لو"۔

ملک میں یہ عام رواج ہے کہ عقد کے بعد داماد اپنے خسر کی دست بوسی کرتا ہے۔

عرب | قدیم عرب میں اس کا عام رواج غالبًا نہ تھا۔ مگر احادیث و فقہ میں اختلاط سے متعلق جو مسائل موجود ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس لطف سے بے بہرہ نہ تھے۔ گو عرب کی شاعری سے زیادہ دُنیا میں کوئی شاعری علمی حیثیت نہیں رکھتی لیکن فارسی شاعری کی مانند بوسہ جزو شاعری نہیں سمجھا جاتا۔ اُن کی مجاہدانہ زندگی سے صرف 'بوسۂ شمشیر' کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے گھوڑوں کا بھی بوسہ لیتے تھے۔ آپس میں بوسہ بازی ممنوع تھی۔ غلام اپنے آقا کی دست بوسی کرتے تھے۔ الف لیلیٰ میں بعض حکایتوں سے بھی اس مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔

ہندوستان | ہندوستان قدیم میں اس کا رواج بالکل نہ تھا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بعد میں پیدا ہوگیا۔ قدیم سنسکرت زبان میں 'بوسہ' کے لئے کوئی لفظ موجود نہ تھا لیکن بعد کو پیدا ہوگیا۔
فارسی مذاق شاعری سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اسلامی حکومت کے زمانہ میں بھی ارباب محبت اس سے ناآشنا نہ تھے۔ ایران کی طرح زمین بوسی و قدم بوسی کا رواج دربار شاہی میں عام تھا۔ پیران طریقت نے دست بوسی کو رائج کیا جو آج تک موجود ہے۔
ہندو شاستر و اسلامی شریعت کے اعتبار سے غیر عورت کا بوسہ لینا جرم تھا خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہندوستان میں قانون انگلشیہ نے صرف عدم رضامندی کی صورت میں اسے جرم قرار دیا ہے۔

مصر | زوجین کے تبادلۂ بوسہ کا تاریخی ثبوت امینافس چہارم (Amenophis) کی اُس تصویر سے ملتا ہے جس میں وہ اپنی بیوی کو پیار کررہا ہے۔ ہیروڈوٹس (۴۸۴ ق م)

مشہور مستند یونانی مورخ کا بیان ہے کہ:-

"کوئی مصری مرد یا عورت کو مجاز نہ تھا کہ وہ کسی یونانی کا بوسہ لے"۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں بوسہ کا رواج تھا۔ یونان و مصریین قدیم تعلقات رہ چکے ہیں، یہ البتہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں ملکوں میں سے کس ملک نے یہ رواج دوسرے سے حاصل کیا

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں عربی تہذیب معانقہ اور دست بوسی کی رائج ہوئی۔ اسوقت ہر ادنیٰ اپنے سے اعلیٰ رتبہ والے کا ہاتھ چومتا ہے، اگر رتبہ میں تفاوت زیادہ ہو تو پشتِ دست ورنہ ہتیلیوں کا عموماً بوسہ لیا جاتا ہے۔ لڑکا اپنے باپ کا ہاتھ چومتا ہے، بیوی اپنے شوہر کی دست بوسی کرتی ہے۔ غلام یا ملازم اپنے آقا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے۔

اہلِ روما کی طرح مصریوں میں بھی بوسۂ دامن یا بوسۂ قبا کا رواج پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ امرا کے دربار کا یہی اصول ہے۔

چارلس ریڈ کا خیال ہے کہ مصر کی قدیم ترین تاریخ رواج بوسہ کی شہادت سے خالی ہے، کہ مصریوں نے یہ رسم اہلِ شام سے حاصل کی اور اس نظریہ کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ قدیم مصری زبان میں کوئی لفظ بوسہ لب کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اور جو لفظ موجود تھا اُس کے معنی سینہ سے لگانے کے ہیں۔

مغربی شاعری

ایک انگریزی شاعر نے اس کو "موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو" سے تعبیر کیا ہے جو نہایت بلند خیال ہے۔ کالرج (Coleridge) نے اسے 'دم جاں بخش' سے موسوم کیا ہے، شکسپیر اسے 'مہرِ محبت' کہتا ہے۔ اور سڈنی کا خیال ہے کہ یہ دو روحوں کو متحد کرتا ہے۔ کسی گمنام انگریزی شاعر کا شعر ہے:-

"یہ کیا ہے آہ!

"یہ ایک قطرہ ہے جس سے پیاس بجھتی ہے۔

"گو بعض مسرت آگیں اوقات میں اس کا اثر
"اُس پہلے شیریں قطرہ کے مانند ہوتا ہے جو مسلسل بارش کا پیش خیمہ ہے"
رابرٹ ہیرک (Robert Herrick) قدیم انگریزی شاعر کہتا ہے :-
"اس کی تخلیق دو سُرخ لبوں کے درمیان نہیں ہوتی۔
"یہ تو ایک متحرک شعلہ ہے جو اُڑکر پہلے تو آنکھوں کی پتلیوں تک جاتا ہے
"وہاں سے گالوں پر اور گالوں سے زنخدان تک اور زنخدان سے کانوں تک
"وہ کھلتا ہے اور اُڑتا ہے، کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔
"کبھی بہت دور اور کبھی بہت نزدیک
"یہاں، وہاں اور ہر جگہ

بعض نے اس کو "افواہ" سے موسوم کیا ہے اس لئے کہ یہ ایک لب سے دوسرے لب تک جاتا ہے
اہلِ صرف و نحو اسے "حرف عطف" کہتے ہیں۔ بعض اسے 'نشان استفہام' بتاتے ہیں۔ مارشل (Martial) کہتا ہے کہ :- "وہ عطر مہندی ہے زعفران زار کی بھینی خوشبو ہے اور اُن پھلوں کی خوشبو جو ...ا کے گودام میں رکھے ہوئے ہیں۔ موسم بہار کی پھولوں سے بھری کیاریاں۔ اور باغ جس کی خوشبو ...ہد کی مکھیوں کو کھینچتی ہے"

جوناس سکنڈ بس کہتا ہے :-
"یہ آب حیات ہے۔
تسکین بخش شبنم کی خوشبودار بارش ہے
جو صرف تیرے لب دنیا میں پھیلا سکتے ہیں
یہ وہ معطر ہوا ہے
جو افریقہ کے خوشبودار درختوں سے عطر بیا کرتی ہے"

سام سلک (Sam Slick) نے سے "تخلیق حیات" کہا ہے :-
رابرٹ برنس (Robert Burns) کی تشبیہات بھی نہایت دلچسپ ہیں۔
محبت کا نازک ترین پیمان
تعلقاتِ شباب کا عزیز ترین رشتہ
بائرن (Byron) نے اس کا نہایت بلند معیار پیش کیا ہے :-

" ابتدائی معصومانہ زندگی کے تازہ بوسے
" جب قلب، روح و جذبات متحد زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:-

" فلسفی کہتے ہیں کہ جس طرح ایک درویش اپنی خانقاہ میں مقید رہتا ہے۔
" اُسی طرح انسان کی روح اُس کے دماغ میں محدود ہے
" لیکن میں اس کا قائل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ
" روح کا مرکز میری معشوقہ کی آنکھیں ہیں
" وہاں سے یہ روح اُس کے لبوں پر آجاتی ہے
" جہاں میں اس کے بوسے لیتا ہوں"

مراسم عقد میں بوسہ کو ایک خاص اہمیت دیگئی ہے۔ بعد عقد شوہر اپنی زوجہ کے بوسے لیتا ہے۔ عرصہ تک یہ رسم جاری رہی کہ احباب دُلہن کا بوسہ لینے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے۔ چنانچہ (Edward Chicken) کا یہ شعر اس دعوے کی دلیل ہے:-

چار مضبوط دہقانی اس امر کے منتظر تھے
کہ وہ گرجا کی سیڑھیوں پر دُلہن کا بوسہ لیں

فارسی لٹریچر | فارسی زبان میں اس بحث پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں ہے، لیکن زبان میں محاورات موجود ہیں اُن سے یہ نتیجہ صحیح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایرانی اس لذت سے زمانۂ سلف میں بھی آشنا تھے۔ بادشاہوں کے دربار میں دست بوسی، قدم بوسی، خاک بوسی، زمیں بوسی، جامہ بوسی برابر جاری رہی۔ اسلام نے جب ایران میں قدم رکھا اُسوقت بوسہ آداب شاہانہ میں داخل تھا۔ عربی ذہنیت نے چندے تو اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن عجم کی فضاء نے بہت جلد اُنھیں اپنا کر لیا۔

بوسہ تعظیمی کا ثبوت زبان میں حسب ذیل محاورات کی موجودگی سے پایا جاتا ہے۔

(۱) دست بوسی

ہوس جز لب معشوق و جام مے حافظ
کہ دست زہد فروشاں خطاست بوسیدن

(۲) قدم بوسی - پا بوسی

حافظ سر از لحد بدر آرد بپائے بوس
گر خاک او بپائے شما بے سپر شود

(۳) خاک بوسی - زمیں بوسی بغرض اظہار انکسار و عجز
خوباں سزد کہ بر در ست آیند جملگی
وانگاہ خاک پائے تو بوسند یک بیک

(۴) بوسۂ بساط - ایران میں رواج تھا کہ جب عوام دربار شاہی میں پیش کئے جاتے اُس وقت وہ قالین کا بوسہ لیتے - میرے خیال میں یہ زمیں بوسی کا بدل تھا -

گو مغرب کی طرح یہاں اس کی کثرت کا ثبوت نہیں ملتا، لیکن اہل مذاق پھر بھی خلوت میں ایسے کھیلوں سے دل بہلایا کرتے تھے جس کا ثبوت خود اس محاورہ کا وجود ہے - حسب ذیل محاورات ایرانی مذاق کا کافی ثبوت ہیں -

(۱)- بوسہ شکستن - بوسہ چیدن - بوسہ آوردن - بوسہ اوفتادن - بوسہ افگندن - بوسہ بخشیدن بوسہ برافشاندن - بوسہ بردن - بوسہ پیچیدن - بوسہ جستن - بوسہ خریدن - بوسہ خوردن - بوسہ طلبیدن بوسہ کردن - بوسہ گرفتن - بوسہ گنجیدن - بوسہ مردن - بوسہ دزدیدن - بوسہ ربودن - بوسہ ریختن - بوسہ شمردن -

(۲) بوسہ برلب خویش زدن
بوسۂ زد بہ لب خویش دگر مستانہ رفتم از کار ازیں کش زدن مردانہ

بوسہ بہ پیغام
باز مشتاق ترا بوسہ بہ پیغام افتاد گفتگو ہائے زبانی بہ لب بام افتاد

بوسہ جائے
ز غیرت دو لب من دو دیدہ خوں گردید چو آستانۂ تو بوسہ جائے خوش نکنم

بوسہ گاہ شناس
جدائی شود از پیش لعل میگونش چہ بوسہ گاہ شناس است خال موزونش

بوسہ دادن و دوا بوسیدن
با اینہمہ آرزو لبش را یکمرتبہ بوسیدم و دوا بوسیدم

بوسہ دال
مگر در خلوت آئینہ تنہا یافتی خود را کہ از نقش حیا سادہ است ہر بوسہ دان تو

بعض اشعار:-

(۱) دزدی بوسہ عجب زدی خوش عاقبت است
که دگر باز ستانند دو چنداں گردد (صائب)

(۲) زردرویی می کشد مہر از ترنج غبغبت
بوسہ در پرواز می آید ز تحریک لبت (")

(۳) دائم غم نخوردن یک بوسہ میخورم
بوسے نخوردۂ ز تو آموسس میخورم (ملا طغرا)

(۴) یک بوسہ از رخت بدہ دیک بوسہ از لبت
تاہر دو را چشیدہ بگویم کدام بہ (ابو القاسم)

(۵) زبانم سیر بود از گفتگو لیک
ہم در بوسہ موز دل آشنا داشت (طالب آملی)

(۶) ازاں کوچک دہانت در گمانم
کہ در دسے بوسہ گنجد یا نگنجد (جمال اصفہانی)

محاورات، استعارات وتشبیہات وصفات یوں تو بوسہ کے لئے متعدد تشبیہات مستعمل ہیں۔
لیکن چند مشہور و معروف حسب ذیل ہیں:-

(۱) حلوا

ہنوز دعوت حلوائی بوسہ در راہست زخط ولب نمک وترہ ماحضر داری (نظیری)

(۲) شربت آبریشم

اے کہ در فکر علاج ضعف دل درماندۂ بوسہ بہائے تو خط شربت ابریشم است (افضل ثابت)

(۳) ثمر

ہستی بے طلب بوس از دہاں یار می ریزد ثمر چوں پختہ گردد خود بخود از دار میریزد (صائب)

(۴) مئے نقل

از مئے نقل بیک بوسہ قناعت کردم رحم کن بر جگر تشنۂ ما اے ساقی

(۵) خبر

طمع بوسہ ازاں لعل شکر خا دارم خبر از خانۂ در بستہ تمنا دارم

(۶) مرکز

مرکز دائرہ عشرت جاوید شعر — بوسہ راکہ کند راہ بکنج دہنش (صائب)

(۷) سیلی

از بوسہ ظلم بر لب جاناں روا مدار — سیلی بروے یوسف کنعاں روا مدار ″

(۸) گوہر

عاشقانرا بوسہ از دشنام سازد خشک تر — گوہر سیراب جائے لب نتواند گرفت ″

(۹) متاع

بگیر جان و بدہ بوسۂ ور آخر حسن — کہ ایں متاع دریں چند روز شیریں است ″

(۱۰) خراج

نگرفت است خراج از عدم آباد کسے — چوں بیک بوسہ ز لعل تو قناعت نکنم ″

(۱۱) روزی

نہ بوسۂ ۔ نہ شکر خندۂ ۔ نہ پیغامے — بہیچ وجہ مرا روزی ز دہاں تو نیست ″

(۱۲) شرر

امید بوسہ ازاں لب زتنگ چشمی ماست — شرر ز آتش یاقوت بر نیامدہ است ″

(۱۳)

زاں لب شکر بوسہ نصیب دگراں شد — در طالع ما تلخیٔ دشنام نوشتہ اند (ذہنی)

(۱۴) گل

ز چاک پیرہنش سیر بوستاں کردم — ہزار رنگ گل بوسہ در گریباں بود (کلیم)

اُردو شاعری | گزشتہ صفحات میں آپ فارسی اسلوب بیان ملاحظہ فرما چکے ہیں، اس کی عمدہ ترجمانی جس حد تک فارسی زبان نے کی ہے کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی۔

اُردو شعراء نے مصطلحات محبت کو تو فارسی سے حاصل کیا لیکن جذبات میں سراسر ملکی رنگ قائم رکھا۔ جسوقت اُردو شاعری نے جنم لیا اُسوقت ہندی شاعری اور ہندی زبان اپنی ایک مستقل حیثیت قایم کر چکی تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ ابتدائی اُردو شاعری میں ایک طرف تو فارسی شاعری کے مصطلحات پائینگے اور دوسری طرف ملکی زبان و شاعری کے جذبات۔ اس میں شبہ نہیں کہ عریانیت کسی حد تک مطابق فطرت ہونے کی باعث بیحد مقبول رہی لیکن جس طرح ہر فطری جذبہ اور اُسکا

فطری طریقہ اظہار ممدوح نہیں ہوا کرتا اُسی طرح ہر فطری شاعری بھی مقبول نہ ہو سکی۔

متقدمین کے کلام میں تقریباً اس مخصوص آوازۂ محبت کا عمدہ اسلوب بیان معدوم ہے۔ متوسطین نے بے شک اس میں معتدبہ ترقی کی مگر اُسوقت تک ایک طرف تو زبان خود عمدہ اور باریک خیالات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، ——— زمانہ کے مذاق نے کسی حد تک اُن کو لکیر کا فقیر بننے پر مجبور کر دیا تھا غالب ایسا پاکیزہ خیال شاعر بھی جب اس مبحث پر لکھنا چاہتا ہے تو اس حد تک نیچے اُتر آتا ہے

(۱) لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

(۲) صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

پھر بھی متوسطین نے اس مخصوص "شغلِ محبت" کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ غالب ایک جگہ لکھتا ہے:۔

(۱) غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مُنھ سے مجھے بتا کہ یوں

اس شعر میں غالب اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ دوسرا شعر یہ ہے:۔

(۲) بوسہ نہیں۔ نہ دیجئے۔ دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں۔

بوسہ کی قیمت و معاوضہ بھی ملاحظہ ہو:۔

جاں ہے بہائے بوسہ دلے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیمجاں نہیں

انسان جس سے محبت کرتا ہے اُس کا بوسہ لیتا ہے، لیکن کبھی کبھی وفور محبت میں یہ حالت بھی ہو جاتی ہے کہ وہ محبوب کی خیالی تصویر کی پرستش کرتا ہے۔ وہ اُس کا نام لیتا ہے اور اُس نام سے لطف اُٹھاتا ہے۔ مولانا روم نے مذکورۂ ذیل شعر میں اس لطف کی جانب اشارہ کیا ہے:۔

گفت مشق نام لیلی می کنم
خاطر خود را تسلی می دہم

مولانا کا مخصوص انداز بیان اس کا مقتضی تھا کہ وہ اپنے شعر کو واضح رکھیں۔ لیکن غالب نے

اس لطف کی توضیح سے اجتناب کر کے مضمون کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

میرا خیال ہے کہ متوسطین میں مومن نے اس "آوازۂ محبت" کا کافی مطالعہ کیا ہے اور ہر چند اس میں ایک حد تک عُریانی ہے لیکن اتنی ہی جو ایسے مبحث کے لئے ناگزیر ہے۔

متاخرین نے ایک طرف فارسی کی تقلید کی اور دوسری طرف عریاں طرز اظہار سے اجتناب کیا میں صرف شاہ عبدالعلیم صاحب آسی کے چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں:۔

ذوق میں صورت موج آ کے فنا ہو جاؤں
کوئی تو بوسہ بھلا اے لب ساحل دینا

پائے بوس آسی دیوانہ کا اللہ رے شوق
حلقۂ چشم تصور، حلقۂ زنجیر تھا

حسب استعداد طالب چاہئے فیض و کرم
مُنھ ہمارا دیکھئے اور ایک بوسہ دیکھئے

مصرفِ خیر مادی ترقی کے ساتھ ساتھ معیار عصمت روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ نیم وحشی اقوام میں عورتوں کی عصمت کا معیار نہایت بلند ہے۔ بلوچستان میں ایک عورت صرف اسلئے گردن زدنی ہو کر دہ کسی مرد کے ساتھ ہنستی ہوئی دیکھ لی جائے۔ آج سے بیس سال قبل ایک شخص نے اپنی بیوی کو صرف اس لئے قتل کر ڈالا کہ اُس نے پردہ سے اپنے ہاتھ باہر نکالکر اپنی نئی چوڑیاں دیور کو دکھائی تھیں۔ یہ سب تنگی نظر نہ صرف ہماری جہالت کا نتیجہ تھی بلکہ عورت کی بے بسی اور غلامی بھی بہت حد تک اس ظلم کی ذمہ دار تھی۔ اب زمانہ بدل گیا، ہمارے زاویۂ نظر مختلف ہو گئے، عورتیں اپنے حقوق کی طالب ہیں اور اب وہ کسی ایسے ظلم کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں جس کو عقل و قانون اُن کے لئے واجب نہیں قرار دیتا۔

مغرب کی آزادیاں ہمارے احاطۂ خیال سے بالکل باہر ہیں یہاں تک کہ اب ایک شوہر اپنی بیوی کی انتہائی بے تکلفی کو بھی نظر انداز کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ برنرڈ شا کی کتاب (man and superman)

کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ زمانہ قریب ہے جب عقد و نکاح کی پابندیاں دُنیا سے بالکل اُٹھ جائیں گی اور ایک عورت دیگر اشیائے ضروریہ کی طرح (جس میں عورت کی خواہش کو بھی دخل رہیگا) ہاتھوں ہاتھ منتقل ہوتی رہیگی۔ ہندوؤں کا مسئلہ نیوگ ہزارہا سال کا قدیم اُصول ہے لیکن عقد و مناکحت کی موجودہ رفتار یہ بتا رہی ہے کہ اس سے بھی آزادتر اُصول ہماری آئندہ تمدنی زندگی میں دخیل ہوکر رہیں گے۔

مغرب میں ایک شادی شدہ عورت (مسز جیمیس براؤن پاٹر) ایک غیر ملکی سیاہ خام کو اپنا ایک بوسہ تین شلنگ کے عوض میں دیتی ہے۔ اُس کا یہ فعل مستحسن سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وہ اس رقم کو جنوبی افریقہ کی جنگ میں بطور چندہ دیدیتی ہے۔

ایک دوسری معزز خاتون کا قول ہے:-

"میں جنگ کے زخمیوں کی مدد کے لئے سب کچھ کرنے کو آمادہ ہوں۔ گو میرے بوسہ کی قیمت بیس گنی حقیر قیمت ہوگی لیکن مجھے مطلق عار نہیں کہ کوئی شخص میرا بوسہ شاہراہ پر لے لے"۔

ایک امریکن عورت نے گریس جارج (Grace George) سے یہ سوال کیا کہ کیا بوسہ کی کوئی قیمت قایم کی جاسکتی ہے؟ اس نے کہا ہو سکتی ہے۔ آخر تھیٹر میں ایک تماشہ کرنے والی اپنی تنخواہ کی عوض دورانِ تماشہ میں بوسہ لینے کی اجازت دیتی ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر وہی رقم تھیٹر سے باہر ملے تو وہ کیوں انکار کرے خصوصاً اُسوقت جب وہ رقم کسی کارِ خیر میں صرف ہوتی ہے۔

اینا ہلڈ (Ana Held) کا قول ہے کہ وہ اپنے بوسہ کی قیمت پانچسو ڈالر (ایک ڈالر ڈھائی روپیہ کے برابر ہے) قرار دیتی ہے۔ "میں نے اپنی تصویر ایکسو ڈالر میں فروخت کی تھی اور اُس رقم کو میں نے یتیم بچوں کے لئے وقف کر دیا تھا"۔

اڈنا ولیس (Edna Wallace) کا بیان ہے کہ:-

"مسز پاٹر کی رائے صحیح ہے۔ میں نصف ریاست متحدہ امریکہ کا بوسہ لینے کے لئے آمادہ ہوں اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کے عوض میں فلپائن کے غربا کو مدد ملیگی"۔

تفنن مقام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے معنی میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب آپ کسی کے لب چومتے ہیں تو اسکے یہ معنی ہیں کہ آپ اس سے عیسیٰ نفسی کے طالب ہیں۔ بوسۂ لب محبت کی علامت ہے۔ پا بوسی یا زمیں بوسی سے عجز و انکسار ظاہر ہوتا ہے۔ بوسۂ دامن سے توقیر و عزت کا اعلان مقصود ہوتا ہے۔ دست بوسی دُنیا کی قدیم رسم ہے جو مذہبًا اور اخلاقًا دونوں صورتوں میں رائج رہی۔

رومن و عجمی سلاطین کا آفتابِ عروج جب نصف النہار پر تھا اُسوقت اُن کی کبر و نخوت نے درباریوں کو اس "اتصال دست و دہن" سے بھی محروم کر دیا۔ اُسوقت ہر دربار میں آنے والا ایک فاصلہ پر کھڑا ہو کر رکوع کرتا اور اُسوقت خود اپنے پشت دست کو بوسہ دیتا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس رسم کا ماخذ قدیمی یونانی رواج ہے۔

ازمنۂ قدیمہ سے دست بوسی کا مقصد اظہارِ عقیدت و امتنان رہا کیا ہے، چنانچہ پاپائے روم عموماً اپنے ہاتھ دست بوسی کے لئے بڑھا دیا کرتے تھے۔ روما کی دورِ جمہوریت میں ہر چھوٹا اپنے بزرگ کے ہاتھوں کا بوسہ دیتا، دورِ شاہنشاہیت میں تو یہ رواج فرائض میں داخل ہو گیا تھا چنانچہ جیسا میں عرض کر چکا ہوں رفتہ رفتہ بادشاہوں نے اس قرب کو معیوب سمجھکر یہ حکم دیا کہ لوگ فاصلہ سے اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیا کریں۔ سالومن (Soloman) نے اپنے زمانہ کے خوشامدیوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اُسوقت امراء کی دست بوسی ترک نہ کرتے جب تک کہ اُن کی مرادیں پوری نہ ہو جاتیں۔ میکزیکو میں چھوٹے اپنے ہاتھوں سے زمین کو چھوتے ہیں اور پھر اُس کے اُس ہاتھ کو بوسہ دیتے ہیں اس طرح وہ بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ اسٹریا (Austria) میں دست بوسی قومی اُصول ادب میں داخل ہے۔ کارڈینل جان (Cardinal John) اور ڈچز سیوائے (Duchess of Savoy) کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دست بوسی کی رسم فرانس میں بھی جاری تھی۔

اہلِ روما میں بعض وقت دست بوسی کا مفہوم و داعی سلام کا بھی ہوتا تھا۔ سردار سپاہ جب اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوتے تو سپاہی اُن کا ہاتھ چومتے۔

پابوسی یا نعل بوسی عجز و انکسار کے اظہار کے لئے مخصوص ہے۔

پاپائے روم و قسطنطنیہ کے درباری آداب میں پابوسی داخل تھی۔ ہر امیر و غریب کو پوپ کی پابوسی کرنی ہوتی تھی۔ ہنری چہارم شاہنشاہ جرمنی کو گریگری ہفتم کے پاؤں چومنے پڑے تھے۔

شاہنشاہان روم نے اپنے زمانہ عروج میں نقشِ قدم کے چومنے کا حکم دے رکھا تھا۔ زمیں بوسی کا رواج بھی اس سے ماخوذ ہے، مورخین کا خیال ہے کہ زمیں بوسی کی رسم عروج روما سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ انجیل مقدس میں ہے:-

"بادشاہ تیرے خبرگیر باپ ہوں گے اور ملکہ تیری خبرگیر ماں ہوں گی۔ وہ سب تیرے سامنے اپنے چہروں کو زمین پر جھکا دیں گے اور تیری خاک قدم کو چاٹیں گے۔ اور تب تجھے معلوم ہوگا کہ میں مالک ہوں، اس لئے کہ وہ جو میرے منتظر ہیں وہ کبھی شرمندہ نہوں گے" (اسحاق ۴۹/۲۳)

آپ کو یہی مضمون میکانیل ہے میں بھی ملیگا۔

اہلِ روما میں یہ رواج تھا کہ ہر تقریب کے موقعوں پر مساوی الرتبہ اشخاص ایک دوسرے کے چشم و دہن کا بوسہ لیتے جس کا مفہوم مبارکباد تھا۔

بازیہائے بوسہ | مغرب نے اس ادارہ کو ترقی دینے کے لئے مختلف کھیل اختراع کئے ہیں جنمیں شریک ہونے والے ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں۔

(۱) متعدد نوجوان لڑکیاں ایک دائرہ میں کھڑی ہوجاتی ہیں اور اُن کے وسط میں ایک لڑکا کھڑا ہوتا ہے۔ لڑکیاں حسب ذیل گیت گاتی ہوئی لڑکے کے گرد آہستہ آہستہ گھومتی ہیں۔

بادشاہ ولیم، بادشاہ جیمس کا لڑکا تھا
اور وہ شاہی خاندان سے تھا
اُس نے اپنے سینہ پر ایک ستارہ کا نشان بنا رکھا تھا جسے وہ اس لئے برابر لگاتا
تاکہ لوگ اُس کا فوجی عہدہ سمجھیں

جب یہ گیت گائی جاتی ہے اُسوقت لڑکا شغل انتخاب میں مصروف ہوتا ہے۔ اسکے بعد لڑکیاں اپنے اشاروں میں کسی قدر مزید تخصیص سے کام لیتی ہیں۔ پھر وہ گاتی ہیں:۔

اب مشرق کی سمت دیکھو
اور اب مغرب کی جانب نگاہ ڈالو
اور اُس کی طرف دیکھو جس سے تم کو سب سے زیادہ محبت ہے
اگر وہ تمھارے لطف میں شریک ہونے کے لئے یہاں موجود نہیں
اُسوقت تم اُس کا انتخاب کرو جو نسبتاً اُس سے کم تم کو عزیز ہے۔

اُسوقت لڑکے کی نگاہیں محبوبہ کو منتخب کر چکتی ہیں، اُس کے بعد لڑکیاں حکم دیتی ہیں کہ:۔

قالین پر تم جھک جاؤ
جس طرح گھاس چراگاہ میں اُگتی ہے
تم اپنی دُلہن کو سلام کرو اور اُس کے بوسہ لیلو

اس حکم کی تعمیل ہوتی ہے، پھر حکم ہوتا ہے:۔

اب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاؤ۔

(۲) ایک دوسرا کھیل جو "چشم سوزن" (The Needle's Eye) کے نام سے موسوم ہے

وہ اس سے زیادہ پر لطف ہے۔
ایک لڑکا اور ایک لڑکی دو مقابل تپائیوں پر کھڑے ہوتے ہیں اور دونوں اپنے ہاتھ پھیلاکر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اس طرح وہ اس کھیل کی اصطلاح میں ایک 'پل' بناتے ہیں۔ اس پُل کے نیچے سے لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ایک جوڑا یہ گاتا ہوا گزرتا ہے:۔

چشم سوزن اسقدر چھوٹا ہے
لیکن کس قدر حقیقی ہے
اس نے متعدد ہنستی ہوئی لڑکیوں کو گرفتار کر لیا ہے
اور اب یہ تمھیں بھی گرفتار کر سکتا ہے
اس نے ایک کو پکڑا
اس نے دو کو پکڑا
اور اب اس نے تم کو گرفتار کر لیا۔

اس مصرع کے ساتھ کہ:۔ "اُس نے ایک کو پکڑا" "اُس نے دوسرے کو پکڑا" بازو کے پُل نیچے گزرنے والے جوڑے کو گھیر لیتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ:۔
اب اُس نے تم کو گرفتار کیا
اُسدم 'پُل' کی گرفت اُسوقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ نیچے گزرنے والا جوڑا ایک دوسرے کو سینہ سے لگا کر بوسہ نہ لے لے۔

(۳) امریکہ (مغربی ورجینیا (Western Virginia)) میں ایک اور رواج ہے۔ ہر مہمان اپنے ساتھ ایک مرغ لاتا ہے اور میزبان سبزی مہیا کرتا ہے۔ ترکاری اور سبزی ایک ہی برتن میں رکھ کر پکائی جاتی ہیں پکانے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہوتی ہیں جن کے ہاتھوں میں لانبے لانبے چمچے ہوتے ہیں۔ ہر شخص گھومتا جاتا ہے اور دیگچی چلاتا جاتا ہے جس لڑکے کا چمچہ جس لڑکی کے چمچہ سے متصادم ہو جاتا ہے لڑکا اُس کا بوسہ لینے کا مستحق قرار پاتا ہے۔

بوسۂ مادری | گزشتہ صفحات میں میں آپ کا اُس نظریہ سے تعارف کرا چکا ہوں جس کی رو سے بوسہ کی موجد ماں سمجھی جاتی ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو یا غلط لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بوسۂ مادری خلوص و شفقت کا ایک ناپیدا کنار دریا ہے۔ بچہ روتا ہوا آتا ہے ماں اُسے گلے لگا کر پیار کر لیتی ہے بچہ کی ساری تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔ اُستاد کی مار یا باپ کا غصہ بچوں کو اُسدرجہ مفید نہیں ہوتے

جسقدر کہ ماں کا ایک بوسہ لیکر یہ کہنا کہ:-

بیٹا، یہ بُری بات ہے - پھر میں تمہیں پیار نہ کروں گی۔

میرے علم میں ایسی تنبیہیں زد و کوب سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہیں۔ ماں کا بوسہ بچوں کے لئے ایک نعمت ہے جس کو وہ کہیں اور حاصل نہیں کر سکتے۔ خوش قسمت ہے وہ بچہ جس نے لب اُسکی ماں کے لب کے مزے اُٹھا چکے ہیں۔

ٹام براؤن (Tom Brown) نے رخصت سے قبل اپنے باپ سے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ اُس کا بوسہ کبھی نہیں لیگا، لیکن بوسہ مادری کا وہ ہمیشہ متمنی رہا جس کی یاد اُس کے قلب میں مرتے دم تک رہی۔

بنجمن ویسٹ (Benjamin West) مشہور مصور کا بیان ہے کہ:-

"میری ماں کے ایک بوسہ نے مجھے مصور بنا دیا"

بوسہ بہ پیام | فارسی میں یہ محاورہ طنزاً مستعمل تھا، لیکن اہلِ مغرب نے اس کو بھی تعظیماً صحیح کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابتداءً یہ رسم تھی کہ خط کے اختتام پر ایک صلیب کا نشان بنا دیا کرتے تھے جسکا مفہوم "بوسہ دور افتادہ" سمجھا جاتا تھا۔ جب یہ خط مکتوب الیہ کے پاس پہونچتا اُسوقت وہ اُس صلیب کو بوسہ دیتا۔

واشنگٹن کی ایک لڑکی نے اس رسم دیرینہ میں ایک کامیاب ترمیم کی ہے۔ اس ایجاد کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے ایک بار اُس نے اپنے دوست کو خط لکھنے کا ارادہ کیا، موسم نہایت سرد تھا اور اسکے لب شدت سرما سے پھٹ رہے تھے اُس نے اپنے لبوں پر ایک لعلگوں خوشبودار مرہم لگا لیا۔ خط ختم کرنے کے بعد اُس نے رسمی صلیب کا نشان بنایا اور جاذب لگانے کے بعد اُسنے اُس نشان کا بوسہ لے لیا۔ اُس کی خوشی و حیرت کی انتہا نہ تھی جب اُس نے اپنے لبوں کی مجسم تصویر کاغذ پر نمایاں دیکھی۔ مکتوب الیہ کے پاس جب وہ نامہ محبت پہونچا اُسوقت اُس کو کسی بتانے والے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ نشان کسکے ہیں اور کیوں ہیں۔

ایک امریکن وِل رائٹر (Will Rauter) کا خیال ہے کہ ٹیلیفون کے ذریعہ سے بھی بوسہ منتقل کیا جا سکتا ہے میرے خیال میں اسوقت جب لاسلکی کے ذریعہ سے ہزارہا کوس کی تصویریں لیجا سکتی ہیں 'بوسہ بہ پیام' ایک 'حقیقت' معلوم ہوتا ہے۔

عیسائیت اور یہودیت | قدیم و جدید عہد ناموں کے اقتباسات سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ

یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی مراسم میں بوسہ کو دخل تھا۔ پاپائے روم نے جب مذہبی اقتدار سے بڑھکر سیاسی عظمت حاصل کرلی اُسوقت سے بوسہ آدابِ مجلس میں مستقل طور پر داخل سمجھا جانے لگا۔ یہ عام رواج تھا کہ پوپ اپنا ہاتھ اپنے وزراکو بوسہ کے لئے بڑھا دیا کرتے تھے جنپر وزراء نہایت ادب سے جھک کر بوسہ دیتے۔ اٹھارھویں صدی تک یہ رواج قایم رہا لیکن اس درمیان میں ایکبار ایک عورت نے پوپ کے ہاتھوں کا بوسہ لیتے وقت ہاتھوں کو اتنے زور سے دبایا کہ پوپ چلا اُٹھے اُس کے بعد سے بجائے ہاتھ، پاؤں بوسہ کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ پابوسی کی رسم لیوس (Leo) نے ایجاد کی، چونکہ اُس کا داہنا ہاتھ غائب تھا اس لئے اُس نے پابوسی کو ترجیح دی۔

کلائسٹر اینڈ دی ہارتھ (Cloister and the Hearth) مصنفۂ چارلس ریڈ (Charles Reed) اُن چند کتابوں میں سے ہے جنھوں نے ترتیب حیات میں مجھے بیحد مدد دی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں میٹریکولیشن کے نصاب میں داخل تھی اور میں نے سبقاً اس کا مطالعہ کیا ہے۔ فراکالونا (Fra Colona) کلیسا کی متعدد رسوم کی بابت اپنے ہم نشین برادر جرم (Brother Jerome) سے کہتا ہے۔

"بتوں کا بوسہ یا پوپ کے انگوٹھہ کا بوسہ یہ سب مشرقی کفر ہے۔ مصریوں نے اس رسم کو اہلِ شام سے حاصل کیا، یونانیوں نے مصریوں سے اور ہم لوگوں نے اہلِ روما سے۔ شاہنشاہیت کے دور میں پانٹی فکس میکسی مس (pontifex maximus) نے اپنے انگوٹھے کا بوسہ لینے پر لوگوں کو مجبور کیا تھا۔ ایکہزار سال قبل مسیح ڈرواڈس (Druids) کے پادریوں کے بھی انگوٹھے چومے جاتے تھے۔ مسلمان (جو تمھاری طرح کفر و شرک کے دشمن ہیں)، حجر اسود کو چومتے ہیں۔ پال کے کاہن اپنے بتوں کو بوسہ دیتے تھے"

مستند تاریخی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پوپ کے پاؤں یا انگوٹھہ چومنے کی رسم قایم ہوئی۔ سب سے پہلے اس عزت کا فخر کانسٹین ٹائن (Constantine) کو نصیب ہوا شاہنشاہ جسٹی نین دوم (Justinian II) جب ۷۱۰ء میں قسطنطنیہ کے اندر داخل ہوا اُسوقت اُس نے پوپ کے پاؤں کو بوسے دئے۔ ۸۲۷ء میں ویلنٹائن اول (Valentine I) اول نے پابوسی کو درباری آداب میں شامل کردیا، ہر کہ دمہ کا فرض تھا کہ وہ حاضری کے وقت پوپ کے پاؤں کو بوسہ دیتا۔ رفتہ رفتہ پابوسی سے نعل بوسی شروع ہوگئی۔ بعد کے آنے والے پوپ ایک سلیپر پہنتے جسپر صلیب کا نشان بنا ہوتا۔ عوام صلیب کو بوسہ دیتے لیکن در اصل یہ سلیپر کا بوسہ تھا۔ اصلاح کے بعد

پروٹسٹنٹ فرقہ کے متقدمین نے پا بوسی یا نعل بوسی سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس سے مستثنیٰ کر دئے گئے اور اب وہ صرف اپنے دونوں گھٹنے جھکا دیتے ہیں۔

ہنری چہارم شاہنشاہ جرمنی جب معتوب ہو کر پوپ کے دربار میں لایا گیا ہے اُسوقت اُسکو حکم دیا گیا کہ وہ روزہ رکھے تین دن کی زبردست ریاضت کے بعد وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر پوپ گریگری ہفتم (Gregory VII) کے سامنے لایا گیا اور اُس کو پوپ کی پابوسی کا فخر عطا کیا گیا۔

مورخین کا خیال ہے کہ بوسہ کی رسم یہودیوں سے عیسائیوں میں داخل ہوئی۔ قدیم مسیحی بوسۂ محبت سے بالکل ناآشنا تھے یونانی کیتھولک مذہب میں ایسٹر (Easter) کا بوسہ ابتک رائج ہے۔ جب دو ہم مذہب ملتے ہیں تو وہ یہ کہکر ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں۔ حضرت مسیح زندہ ہو گئے، دوسرا جواب دیتا ہے کہ "بیشک وہ زندہ ہو گئے"

پوپ کی بابت میں عرض کر چکا ہوں کہ اُس کے سلیپر کا بوسہ دیا جاتا تھا، لیکن اُس سے کم درجہ کے مذہبی مقتدا مثلاً بشپ وغیرہ کی انگشت شہادت میں ایک انگوٹھی ہوا کرتی تھی معتقدین اسی کو بوسہ دیتے تھے۔

انجیل کو بوسہ دینے کی رسم عیسائیوں میں زمانۂ قدیم سے جاری ہے، عدالتوں میں گواہان انجیل کو بوسہ دیکر حلف لیتے تھے۔ اس خیال سے کہ جھوٹے اور سچے سب انجیل کو بوسہ دیتے ہوں گے بعد میں یہ رسم جاری ہوئی کہ انجیل کو سیلولائڈ (Celluloid) کے غلاف میں بند رکھتے اور ہر حلف کے بعد کپڑہ کو تر کرکے اُسے صاف کر دیتے۔ رفتہ رفتہ یہ رسم بھی مفقود ہو گئی اب صرف انجیل کو ہاتھ میں لیکر قسم کھاتے ہیں۔

قدیم یہودیوں میں بوسہ کی رسم عام تھی لیکن فی زمانہ اب نسبتاً کم ہے۔ یہودیوں کی قدیم تاریخ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ دو یہودی جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کے ہاتھ، سر اور شانوں کا بوسہ لیتے اور یہی اُن کے سلام کا طریقہ تھا۔ اور اگر وہ کسی شخص کا بیحد احترام کرتے تو اُس کا پاؤں چومتے اور کبھی کبھی نقشِ قدم کا بوسہ لیتے۔ جوڈا جس نے حضرت مسیح کو بوسہ دیکر گرفتار کرایا وہ بھی یہودی ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بوسہ کی رسم یہودیوں ہی سے عیسائیوں میں داخل ہوئی۔

ایک مغربی نقاد کا خیال

آج سے قبل یہ مسئلہ کبھی اسدرجہ زیر بحث نہیں رہا۔ امریکہ کے ایک جج نے شوہر کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ چھ ماہ تک دن میں ایک بار اپنی زوجہ کے بوسے لیا کرے۔ لیکن افسوس کہ جج کا یہ حکم موجودہ اُصول حکمت کے منافی ہے۔ خود امریکہ میں اس مسئلہ کے متعلق دو مختلف فریق ہیں۔ ایک طرف تو ہماری نظروں سے چند سال قبل کا وہ واقعہ گزرتا ہے جب مسٹر ڈروپی (Mr. Drope?) کی زوجہ کو صرف اس عدالت نے خلع کی ڈگری دی کہ آٹھ برس کی متواتر رسم کے بعد مسٹر ڈروپی

نے اپنی زوجہ کے بوسے صبح و شام لینے بند کر دئے۔

دوسری طرف امریکہ کے ڈاکٹروں نے دوسری قوموں کے ڈاکٹروں سے ملکر یہ طے کیا ہے کہ یہ رسم مضر صحت ہے اس لئے اس کا سد باب ہونا چاہئے۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ "اب وہ وقت آگیا ہے کہ تعلیم یافتہ صنف نازک کو یہ بتا دیا جائے کہ اُن کے ہر بوسے انھیں دق و بخار کی ہلاکت سے قریب کرتے جاتے ہیں"

شوہر و زوجہ کے 'حقوق بوسہ' کے متعلق بھی امریکہ میں دو فریق ہیں۔ ابھی چند سال کی بات ہے کہ ایک شوہر کو معتد بہ جرمانہ صرف اس جرم میں ادا کرنا پڑا کہ اُسنے شاہ راہ پر اپنی زوجہ کے بوسے لے لئے تھے۔

بہت سے لوگ بوسہ کے خلاف دلائل کو امریکہ کے ابتدائے دورِ تہذیب کی یادگار سمجھتے ہیں لیکن غور کیجئے تو امریکہ کا یہ جہاد یکہ و تنہا نہیں ہے اس لئے کہ دوسرے ممالک میں بھی بوسہ کے خلاف جنگ کا اعلان ہو چکا ہے۔ آج یورپ میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں بوسہ کے خلاف تحریک نہ شروع ہوگئی ہو لطف یہ ہے کہ مختلف ممالک میں اختلاف کے اسباب مختلف ہیں۔ کہیں یہ بداخلاقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کہیں اعلیٰ تخیئل کے منافی سمجھا جاتا ہے کوئی اسے اُصولِ حفظانِ صحت کا مخالف سمجھتا ہے۔ مسٹر ملیرنڈ (Millerand) اور مسٹر ہور (Hoore) ایسے قاعدانِ قوم بھی ہیں جنھوں نے اسے فرائض جہانبانی و سیاسیات سے بالکل جدا رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر سب سے زیادہ نمایاں مخالفت اطبا و ڈاکٹروں کی جانب سے ہوئی ہے۔ گزشتہ انفلوئنزا کی عام وبا میں مختلف انجمنیں یورپ و امریکہ میں اسکو روکنے کے لئے قایم کی گئیں۔ ایک اخبار کا بیان ہے کہ ایک انجمن نے اپنا شعار اس اُصول کو بنایا ہے:-

"بوسہ موٹر کے تصادم سے زیادہ مہلک ہے"

نوجوانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہر بوسہ کے ساتھ چالیس ہزار جراثیم دہن کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ ومنیا (ملک اسٹریا) میں حکومت نے بوسہ کی ممانعت کر دی ہے۔ چند سال ہوئے کہ ایک انگریزی ڈاکٹر نے ایک ایسا آلہ اور دوا ایجاد کی تھی جو چالیس ہزار جراثیم کو فنا کر دیتی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ ایک کھیل معلوم ہوتا ہے لیکن موجد کا قطعی اور پر زور بیان ہے کہ:-

مجھے اطمینان ہے کہ ایک دن متین و سنجیدہ دماغ والے بھی اُس کی دہی عزت کریں گے جو آج معمولی قلب و دماغ والے کرتے ہیں۔

گو یہ آلہ نہایت مختصر اور سہل الاستعمال ہے اور عینک کی طرح لگایا جاتا ہے لیکن افسوس کہ مخالفین بوسہ نے ابتک اس کی کما حقہ تائید نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں ان میں تنظیم پیدا ہوئی بجز مکمل اجتناب

واحتراز کوئی دوسری تدبیر اُن کو مطمئن نہ کرسکیگی۔ علاوہ اس کے کہ بوسہ سے انفلوئنزا و دیگر متعدی امراض میں ترقی ہوتی ہے ایک ماہرفن کا خیال ہے کہ ہر بوسہ زندگی کے تین منٹ ضایع کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مخالفین بوسہ محض بوسہ کے سد باب سے مطمئن نہوں گے اس لئے کہ امریکہ کی ایک معزز خاتون کا بیان ہے کہ مصافحہ بھی اُسی قدر خطرناک ہے۔ اور وہ زمانہ بعید نہیں جب سو برس کے بعد ہماری آیندہ نسل مصافحہ سے بھی محروم کردیجائے گی۔

محافظان صحت کی تحریک کے دوش بدوش اُن اشخاص کے دلائل بھی جاری ہیں جو اعلیٰ تخئیل کے منافی ہونے کی باعث بوسہ کے مخالف ہیں۔ لیکن موخرالذکر کے دلائل بہت زیادہ اثر قایم نہ کرسکے اس لئے کہ اُنھیں خوف ہے کہ مبادا اُن کے اعتراضات علماء اخلاق کے اعتراضات کے ساتھ خلط پریشان نہ کردئے جائیں۔ باایں ہمہ اس کا بعید امکان ہے کہ ان کی تحریک دیگر تحریکوں سے زیادہ آیندہ صدی میں مقبول عام ہوجائے گی۔ ابھی قریب بیس سال گزرے ہوں گے کہ وینا (Viena) کے ایک کلرک نے جب وہ سڑک پر گزر رہا تھا یہ دیکھا کہ ایک طالب علم ایک کمسن عورت کا اُس کے دروازہ پر بوسہ لے رہا ہے کلرک نے پولیس سے شکایت کی اور طالب العلم پر عدالت نے یہ الزام قایم کیا کہ اُس کی حرکت عام اخلاق کے منافی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت جس نے اس واقعہ کا عینی مشاہدہ کیا تھا وہ ثبوت کی جانب سے بطور گواہ پیش ہوئی۔ اس عورت کا بیان ہے کہ اُس نے جب یہ حرکت دیکھی تو اُس نے مُنھ پھیر لیا اس لئے کہ وہ اس فعل کو اعلیٰ تخئیل کے منافی سمجھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عورت اس تحریک کی پیش رو تھی۔ وہ اس مسئلہ کی تہ کو پہونچ گئی اور ایسا نکتہ بیان کیا کہ اگر ہالی وُڈ (Hollywood) کے ارباب فن اسکو سمجھ لیں تو سنیما کی تاریخ بدل جائے۔ بہت سے اصحاب نے سینما کی طویل بوسہ بازیوں کو بُری نظروں سے دیکھا ہے لیکن شاید وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس نفرت کا سبب کیا تھا۔ اگر وہ مذکورۂ بالا وینا کی خاتون کے خیالات جانتے تو اُنھیں نفرت کا سبب معلوم ہوجاتا۔ اخلاقی وطبی اُصول پر تو بوسہ کی تائید میں کچھ کہا بھی جاسکتا ہے لیکن اعلیٰ تخئیل عشاق کے بوسوں کی حمایت میں زبان تک نہیں کھول سکتی۔ اب اُسوقت کے منظر کو ذہن نشین کیجئے جب دو چہرے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ سینما نے جتنی بھی کثیف چیزیں پیش کی ہیں اُن میں شاید اس منظر سے زیادہ کوئی بھی فنون لطیفہ کے منافی نہیں ہے۔ اُنیسویں صدی میں تھیٹر کے اس منظر پر تماشہ بیں قہقہہ لگاتے تھے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محبت کے صحیح احساس سے ایک عام دماغ معذور و مجبور ہے۔ رومیو اور جولٹ (Romeo and Juliet) کے جذبات کو ایک ہالی وُڈ کا فلم ساز بالکل ہی جذبات سے معرا کر کے متعدد غیر دلچسپ صورتوں میں پیش کریگا۔ یہ فن کی

مخصوص اقتصادیات ہوتی ہیں۔ جب شیکسپیر عاشق و معشوق کے اختلاط کو دکھاتا ہے اُسوقت اُسکے اقتصادی اُصول خیالات میں ایک تموج پیدا کر دیتے ہیں جو ہالی وُڈ سے ناممکن ہے۔

یہ اُس بوسہ بازی کا حال ہے جو سینما کے پردہ پر ظاہر ہوتی ہے۔ سینما کے تماشہ میں مرد و عورت بھی اس شغل میں اکثر مبتلا پائے گئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ اُن کا فعل بھی شعریت سے معرا ہے۔ کوئی شخص ایسے دو مرد و عورت کے پشت پر بیٹھنا پسند نہیں کرے گا جو تماشہ کی دلچسپیوں سے خالی الذہن ہو کر بوسہ بازی کے لطف میں منہمک ہوتے ہیں۔ وہ ہمدردی کے مستحق ہیں لیکن اس فعل سے وہ دوسروں کے ذہن کو پردہ سے منتقل کر دیتے ہیں جہاں اُن کے عشق و محبت سے زیادہ پر لطف تماشہ دکھایا جا رہا ہے۔ ایک سینما منیجر کا خیال ہے کہ موجودہ سینما ملکۂ وکٹوریا کے زمانہ حکومت کے اُن محلات کا بدل ہے جہاں ارباب محبت جمع ہو کر شغل الفت سے دل بہلاتے تھے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے تب بھی آپ کی یہ کوشش کہ آپ انسانی مسرت کو شعریت کی بنا پر محدود کرنا چاہتے ہیں ایک سعیٔ مہمل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ میں جس سینما میں جاتا ہوں اُس میں اکثر ظاہر پرست عشاق اگلی صف میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر بوسہ سینما میں قابل اعتراض نہیں تو اس کا کیا سبب کہ پارلیامنٹ میں بوسہ بازی کی اجازت نہیں۔ ابھی گزشتہ فصل خزاں میں ایک مرد و عورت صرف اس بنا پر فرانسیسی چیمبر آف ڈیپوٹیز (Chamber of Deputies) سے نکالدئے گئے کہ وہ ایک غیر دلچسپ مباحثہ کے دوران میں بوسہ لیتے ہوئے دیکھے گئے۔

یہ تمام مسائل متعدد دقتوں سے مملو ہیں۔ وہ دلائل جو جذبات کو بھلے معلوم ہوتے ہیں وہ ماہر طب کو مرغوب نہیں...... عدالت ہائکاؤ (Hankow) نے حال میں ایک شادی شدہ مرد و عورت پر صرف اس جرم میں پانچ پاؤنڈ جرمانہ کیا کہ وہ دونوں آپس میں کرایہ کی گاڑی کے اندر ایک دوسرے کا بوسہ لے رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جج کا یہ طرز عمل محض تعصب پر منحصر تھا۔ خلاف اس کے اسٹرین فڈرل ریلوے (Austrian Federal Rly) نے جب حسب ذیل نوٹس مسافروں کے لئے شایع کیا اُسوقت اُس کا منشا کچھ اور ہی تھا جس کا ذکر خود ذیل کی نوٹس میں موجود ہے کہ:-

"مسافروں کو چاہیئے کہ وہ ریلوے پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کا بوسہ نہ لیں اس لئے کہ وداعی بوسے جو عموماً ٹرین کے چھوٹنے سے کچھ ہی قبل کھڑکیوں میں سر ڈالکر لئے جاتے ہیں وہ ہر دو فریق کے لئے نہایت خطرناک ہیں۔"

یہ مسئلہ بیحد دقت طلب ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا مستقبل مخالفین کے ہاتھوں میں ہے۔

خواہ بنائے اختلاف جو بھی رکھی جائے۔ آج سے بیس سال قبل واشنگٹن میں اسی قسم کی ایک تحریک کے سلسلہ میں بچوں کے سینوں پر فیتے نظر آتے تھے جن پر نمایاں حرفوں میں حسب ذیل عبارت تحریر ہوتی تھی

میرا بوسہ نہ لینا

میرا خیال ہے کہ پچاس برس کے اندر اس قسم کی نوٹس ہر سڑک پر چلنے والے کے سینہ پر نظر آئے گی تمدن کی رفتار بے پناہ ہے۔

نتیجہ

آپ نے پڑھ لیا یہاں تک جو کچھ لکھا گیا؟ - اس رسم کے متعلق مختلف قسم کی تاریخی، نفسیاتی و فنی معلومات فراہم کردی گئی ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ آپ مغرب و مشرق کی تہذیب کا مقابلہ کرکے دیکھیں کہ وہ قومیں جو اپنی تہذیب و شرافت پر اسقدر نازاں ہیں، شرم و حیا، عصمت و عفت، اخلاق و بزرگداشت کے لحاظ سے کتنی پیچھے ہیں۔

یقیناً لب کا اتصال لب سے مطلقاً معیوب نہیں اور بعض صورتیں اس میں استحسان کی بھی نظر آتی ہیں، لیکن اگر کوئی فعل اپنے مصرف کے لحاظ سے بُرے پہلو بھی اختیار کرسکتا ہے تو اس کا اعلان کسی طرح جائز نہیں۔

ایک سرزمین یوروپ ہے جہاں غیر مرد و عورت کا شاہراہ پر بھی بوسے لینا معیوب نہیں سمجھا جاتا اور ایک ایشیا، ہے جہاں ایک ماں بھی اپنے بچہ کا بوسہ سب کے سامنے لینا پسند نہیں کرتی۔

اس میں شک نہیں کہ مغرب خواہ کتنی ہی مادی ترقی کرجائے، لیکن وہ مشرق کی اُن خصوصیات کو کبھی حاصل نہیں کرسکتا جن کا تعلق اخلاق سے ہے۔

اس لئے جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اس اُصول پر کہ کسی حکیم سے پوچھا گیا کہ "ادب تم نے کن سے سیکھا" اسنے جواب دیا کہ "بے ادبوں سے"۔ دریافت کیا گیا کہ "کیونکر" اسنے کہا کہ "جو وہ کرتے ہیں اُن سے میں احتراز کرتا ہوں"

ان صفحات کا مطالعہ کیجئے اور اپنے جذبات غیرت و حمیت کو کام میں لاکر کوشش کیجئے کہ یہ مغربی آزادی کبھی آپ پر غالب نہ آجائے اور آپ اپنی اُن خصوصیت تہذیب کو ترک کردیں جن پر نہ صرف آپ کے ملک نے بلکہ تاریخ اخلاق نے بھی ہمیشہ ناز کیا ہے۔

میرے نزدیک یہاں رکنا بے سود ہے۔ یہ ہیلن کیا بلا ہے؟ الگزنڈرا بھی یہی کہتی ہے۔ کیلو پیٹرا نے بھی یہی کہا۔ اور اب بادشاہ آگون۔ نئی بناولہ یہ ہیلن میں کونسا جادو بھرا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں ہیلن سے ضرور ملونگا کو دیکھوں کتنا! میرا دل کیسے چھینتی ہے۔ لو میں چلا۔ پیاری! نہ روکو، جانے دو۔ میں چلا۔ اور وہ چلا گیا۔"

ٹرائے سے چل کر پاری سیدھا اسپارٹا پہونچا۔ یونان کے بادشاہ مونی لس کا مہمان ہوا۔ اُسے ملکۂ حسن وجمال بادشاہ مونی لس کی بیوی، ہیلن کی خدمت میں آسانی سے باریابی حاصل ہوگئی۔ اُس نے ملکہ کو دیکھا، ملکہ نے اسے دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں لڑیں۔ دل سے دل ملے۔ ایک ہی نظر میں تمام معاملات طے ہوگئے، پیچ کھل گئے، گتھیاں سلجھ گئیں۔ واقعی ہیلن، کچھ اور ہی چیز تھی

(۲)

بھیانک رات۔ تاریکی۔ سناٹا۔ تیز رو گھوڑے پر ایک بہادر شہسوار اور ایک پری پیکر حسینہ ہوا سے باتیں کر رہے ہیں! خوفناک دن۔ طوفان۔ شور۔ قیامت سمندر کی موجوں پر ایک نوجوان ملاح کسی ماہ طلعت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کشتی چلا رہا ہے!

یہ دونوں کون ہیں؟

طرح طرح کی افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ ہر جگہ یہی چرچا، ہر طرف یہی قصہ، یونان کی رگِ حمیت جوش میں آگئی۔ ایشیا والوں سے انتقام کی تیاریاں ہیں۔ بچہ بچہ کی زبان پر ہیلن کے اغوا کی داستان ہے۔ لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قیاس آرائیاں کرتے ہیں:۔۔۔ "یہ ہو نہیں سکتا!۔۔۔ اگر وہ خود راضی نہ ہوتی تو کس کی مجال تھی!۔۔۔ اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ راضی ہو۔ تو پھر اس کا بھید؟ وہ پاری کے ساتھ کیوں چل دی؟"

کارکنان قضا و قدر شوق و استعجاب سے کرۂ زمین کے مستقبل کو دیکھ رہے ہیں۔ شاید کوئی عظیم الشان انقلاب آنے کو ہے! شاید پھر زمین کا طبقہ الٹنے کو ہے! ہواؤں میں ہیلن اور پاری کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ آسمانوں پر یہی چرچا ہے۔ وہ پاری کے ساتھ کیوں.....؟

جنگ چھڑ گئی!۔۔۔ عالمگیر جنگ۔ خونخوار، خونریز، ہولناک۔ جوپیٹر کا قہر۔ جوپیٹر کی پناہ! الامان الحفیظ!۔۔۔

کچھ تاجدار اسپارٹا (یورپ) کی حمایت میں ہوگئے۔ کچھ ٹرائے (ایشیا) کی۔ برسوں لڑائی جاری رہی دو چار، پانچ چھ، سات آٹھ، دس بارہ برس گذر گئے اور جنگ کی آگ کم نہ ہوئی بڑھتی چلی گئی آخر، تابکے؟۔۔۔ ٹرائے کی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پاری مارا گیا۔ ایشیا والوں کو شکست ہوئی۔ مونی لس جیت گیا۔ فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ قتل عام شروع ہو گیا

مونی لس، ہیلن کے قتل کرنے کے لئے دیوانہ وار شاہی محل کی طرف دوڑا۔ اُدھر، اسی قسم کی ایک تحریک کے کی دیوی! حسن وجمال کی مورت!۔ اس نے قاتل کی آسانی کے لئے آنچل ہٹا دیا، سینہ کھول دیا۔ سوبرت تحریر ہوتی تھی ہوگئی، خاموش، متین، آفتاب، ماہتاب

خونخوار شہنشاہ سکتہ میں آگیا۔ دم بخود رہ گیا۔ اس اُبھرے ہوئے سینہ کو چیروں یا اس ہنس کی سی گردن کو کاٹوں؟ ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ قریب تھا کہ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے۔ تھرتھرانے لگا۔ ڈر گیا۔ دنگ ہوگیا۔ ہیلن پہلے سے کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ شگفتہ۔ حسن وعفت کی مکمل تصویر۔ صانع قدرت کے کمال کا مرقع۔ گلشن فردوس کا بہترین گلاب۔ اس کی عمر بڑھنے کے بجائے بارہ برس گھٹ گئی تھی۔ نئے سر سے کم سن ہوگئی تھی۔ سولہ برس کی لڑکی!

کسی نے پیچھے سے کہا:— "جہان پناہ! ہاتھ روکئے!۔ یہ کیا غضب ہے!۔ جوپیٹر نے عالی جاہ کو کامیاب بنایا۔ پاری مارا گیا۔ دشمن پامال ہوئے۔ ملکہ حسن وجمال واپس مل گئیں۔ اب یہ خون کیسا!۔ ملکہ کو ساتھ لیجئے اور اسپارٹا چلئے۔ آخر یہ جنگ اسی لئے تو ہوئی تھی کہ ملکہ واپس لائی جائیں!

مونی لس چپ تھا۔ یہ جنگ کیوں ہوئی؟ یہ عظیم الشان جنگ؟ بارہ برس کی مسلسل جنگ؟ کیا اسی لئے کہ ہیلن واپس لائی جائے! شاید!۔ مگر میں تو یہ نہیں سمجھا تھا۔ کہیں کوئی اور مقصد نہ ہو! کچھ یاد نہیں آتا۔ شاید! ..... مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ..... نہیں

(۳)

گناہ، بالجبر، بدترین، ارذل ترین، اسفل ترین۔ سپاہ سالار اعظم "ٹی لس" نے زیادتی کی۔ خود خداوند قدوس کے حضور، خود خداوند جوپیٹر کے مندر میں، محراب کے پاس، مورت کے سامنے، دن کے وقت، الگزنڈرا پاری کی بہن .... صاف، صریح، ظلم عظیم۔ اثم کبیر

ٹی لس کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے عبادت گاہ میں اُس وقت خداوند کی مورت موجود نہ تھی۔ لہٰذا مجھ پر خداوند کی توہین کا الزام غلط ہے۔ مگر اس کی حجت مسموع نہ ہوئی اور خداوند جوپیٹر کی توہین کی پاداش میں اُسے پھانسی کی سزا دیدی گئی۔ نیز اسی معصیت کے کفارہ میں لگاتار چالیس دن تک روز ہو سو بکروں کی قربانی کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ تمام فاتح تاجداروں کی یہی رائے تھی۔ صرف بادشاہ مونی لس اس رائے سے متفق نہ تھا

مونی لس نے کہا:— ٹی لس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے جلدی کی، اگر ایک روز ٹھہر جاتا تو الگزنڈرا بطور لونڈی کے اس کے حوالہ کردی جاتی اور کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اب ٹی لس مارا جاچکا ہے۔ قربانیاں بھی تھوڑی بہت ہوچکی ہیں، لہٰذا اب اس اُجڑے ہوئے شہر میں پڑے رہنا اور قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھنا، مناسب نہیں۔ اگر خداوند جوپیٹر کو اس شہر کی بے حرمتی منظور نہ ہوتی تو یہ شہر ویران نہ ہوتا، لوٹا نہ جاتا۔ میں اتنی لمبی قربانیوں کا قائل نہیں ہوں

میرے نزدیک یہاں رکنا بے سود ہے

بادشاہ آگمونس نے جواب دیا:۔ تم اس گناہ کا احساس نہیں کر سکتے! تمھارے گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ہیلن کو دیکھو کتنوں نے اُسے شکار کیا اور کتنوں کو اس نے شکار کیا! تم ٹی ٹس کے گناہ اور خداوند قدوس کی توہین کا کیونکر تصور کر سکتے ہو! اپنا فلسفہ پاس رکھو۔ قربانی کے فرائض رُک نہیں سکتے!

مونی لس ——— میں یہ منطق سمجھنے سے قاصر ہوں

آگمونس ——— اچھا، تو تم چلے جاؤ۔ اور اپنا لشکر ساتھ لے جاؤ۔ ہم اور ہماری فوجیں یہیں ٹھیریں گی

مونی لس ——— میں کل روانہ ہوں گا

خداوند جوپیٹر کے مندر میں منبر کی سیڑھیوں پر ہیلن کھڑی قربانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کی روشن پیشانی پر پسینہ کی بوندیں جھلک رہی ہیں۔ سامنے مقدس آگ جل رہی ہے جس میں وہ آہستہ آہستہ گھی ڈال رہی ہے۔ راہب جوپیٹر کی حمد گا رہے ہیں۔ آگ کی گرمی سے ہیلن کا رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کی نگاہیں خداوند جوپیٹر کے بجائے اسی حسن کی جیتی جاگتی مورتی کی پوجا کر رہی ہیں۔ جوپیٹر کی مورت پر کسی کی بھی نظر نہیں۔ البتہ ہیلن اسی خداوند قدوس کے مقدس سونے کے پتلے کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی عبادت بے لوث، بے عیب، بے ریا ہے۔ شام ہو گئی اور ہیلن پہلے دن کی قربانی کے فرائض انجام دے چکی۔ اب انتالیس دن اور باقی رہ گئے

رات کے وقت ہیلن اور مونی لس میں باتیں ہو رہی ہیں

مونی لس ——— ہم کل اسپارٹا روانہ ہوں گے

ہیلن ——— ایں!۔ اتنی جلدی!۔ اور قربانیاں!

مونی لس ——— کیا اب بھی جلدی ہے! تم ٹھہرنا چاہو تو شوق سے ٹھہرو

ہیلن ——— نہیں۔ میرے لئے تو ہر جگہ برابر ہے۔ ٹرائے ہو یا اسپارٹا۔ یورپ ہو یا ایشیا۔ البتہ سپاہیوں کے احساس کا خیال ضروری ہے۔ ان کے دلوں سے قربانی کی اہمیت کیونکر دور کی جا سکتی ہے!۔ اور پھر جیسا تم مناسب سمجھو۔ تعجب ہے کہ میرے تعاقب میں تو اتنی جلدی نہیں کی گئی تھی۔ اور قربانی کی تمام رسمیں ایک ایک کرکے ادا کی گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جلدی کا محل تھا نہ کہ اب۔ میرے خیال میں قربانی کی رسمیں ادا ہو لیں تو چلیں۔ اس کے علاوہ لشکری سب بہت تھک بھی گئے ہیں۔ تھک کے چور ہو گئے ہیں۔ انھیں کچھ دنوں کے لئے آرام مل جائے گا۔ لشکریوں کو ناخوش کرنا مصلحت کے خلاف ہے کہو، تم کیا کہتے ہو؟

مونی لس ——— خدا ہماری قربانیوں کا بھوکا نہیں۔ آگمونس اور اس کے ساتھی یہاں بیٹھے قربانیاں کرتے رہیں گے۔ میں اپنے لشکر کے ساتھ کل روانہ ہو جاؤں گا

ہیلن ——— میرے خیال میں تمہارا بھائی آگوناس حق پر ہے اور تم غلطی پر ہو

موبی لس ——— شاید میرا دماغ چل گیا ہے - مگر میں صبح روانہ ہوں گا - تم چلوگی یا نہیں ؟

ہیلن ——— میں چلوں گی

(۴)

کشتی ڈول رہی ہے اور ہوا مخالف ہے - ہیلن کی زلفوں سے تیز ہوا کے جھونکے بدمستیاں کر رہے ہیں - اس کی آنکھیں دور سمندر کی حد پر گڑی ہوئی کتاب شفق کا مطالعہ کر رہی ہیں - وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، سمندر کے تلاطم سے بے پروا، زمانہ کی نیرنگیوں سے بے فکر، کسی اور ہی عالم میں مدہوش ہے - سپاہی بار بار اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں :- " اگر یہ آسمانوں کی دیوی ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو کشتی ڈوب جاتی اور ہم سب مر جاتے - بھلا خداوند جوپیٹر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے ! "

ہیلن نے کروٹ بدلی - ملاحوں کے ہاتھ خود بخود رک گئے - سب ہمہ تن گوش ہو گئے - وہ کہنے لگی :-

" ہم کہاں جا رہے ہیں ؟ "

موبی لس :——— اسپارٹا !

ہیلن ——— نہیں - یہ اسپارٹا کا آسمان نہیں ہے

کئی ہفتے گذر گئے اور شاہی بیڑا اسپارٹا نہ پہنچ سکا - ادھر اُدھر بھٹکتا رہا - سامان رسد بھی ختم ہو گیا - چاروں طرف ہلاکت ہی ہلاکت نظر آنے لگی - بڑی مُدت کے بعد آسمان پر کچھ مرغابیاں دکھائی دیں - پھر کنارہ نظر آیا - موبی لس چلّا اٹھا :- " ہیلن! وہ دیکھو! اسپارٹا کا ساحل آگیا ! "

ہیلن نے کہا :- " نہیں یہ اسپارٹا کا ساحل نہیں - کوئی اور بستی ہے "

وہ اسپارٹا نہ تھا - مصر کی زمین تھی - کشتی رُکی تو سب سے پہلے ہیلن بے دھڑک کنارہ پر اُتر آئی - لبِ ساحل شاہی خیمے نصب ہو گئے - مصر میں اک دھوم مچ گئی - " ہیلن آئی ! ہیلن آئی ! جنگِ عظیم کی دیوی ! حسینانِ عالم کی رانی ! معشوقانِ جہاں کی ملکہ ! " - مصر والے حیرت میں تھے - یہ کوئی بشر ہے، یا حور ہے، یا پری ہے، یا آسمان کا تارہ !

ہیلن کو مصر کی سرزمین بہت پسند آئی - اس نے اپنے خاوند سے کہا :- یہ کیسی حیرت انگیز زمین ہے ! یہاں کی ہر چیز بے نظیر، بے عدیل، بے بدل ! میں تو کہتی ہوں کہ تہذیب و تمدن میں بھی مصر، اسپارٹا اور ٹرائے دونوں سے بڑھ کر ہے

موبی لس ——— مجھے اتنی فرصت نہیں کہ یہاں کے تمدن کا اپنے تمدن سے مقابلہ کروں - ہمیں چاہئے کہ جلد سے جلد تمام سامان رسد فراہم کر لیں اور چل نکلیں ! میرے لئے ایک ایک منٹ پہاڑ ہو رہا ہے

تاریخ ہند کا ایک ورق

بندھیلکھنڈ کا موتی

(دو ایکٹ کا مختصر ڈرامہ)

ایکٹ اوّل ـــــــ پہلا منظر

(تاریک رات ہے اور چمبل ندی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکرا ٹکرا کر رات کی تاریکی کو اور بھی بھیانک بنا رہی ہے۔ ندی کے داہنی جانب ساحل پر ایک ٹیکرا ہے جس پر ایک بہت پرانی گڑھی قائم ہے فصیلوں پر گھاس اور کائی سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہیبت معلوم ہوتی ہے۔ اندر گڑھی کے ایک دالان میں سارندہ اور سیتلا دیوی بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں)

سیتلا دیوی - پورے تین برس ہو گئے کہ پران ناتھ کو چین سے بیٹھنے کو نہیں ملا، رام جانے وہ کون لوگ ہیں جنکے دن آرام سے کٹتے ہوں گے

سارندہ - (چونک کر) کیوں، سیتلا، کیا ہوا؟ کیا بھیّا کے راج میں تم کو سکھ نہیں ملا

سیتلا دیوی - نہیں، ایشور نہ کرے کہ میں ایسی چنتا کروں، پرنتو ـــــــ

سارندہ - بولو سیتلا بولو چھپانے کا کام نہیں تم راجپوتنی بھی ہو اور راجپوت کی بیوی بھی۔ تم کو کوئی بات چھپانا نہ چاہیئے

سیتلا دیوی - تم خفا ہو گی۔ اور سوامی بھی اگر سنیں گے تو خفا ہوں گے اس لئے اب نہ پوچھو، جانے دو

سارندہ - ٹالو نہیں، اب میں بغیر پوچھے نہ رہوں گا اور تمھیں بتانا پڑے گا

سیتلا دیوی - میں نے کتنی بار ان سے بنتی کی پاؤں پڑی کہ میری آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ مجھے ہردوار لے چلو بندرابن لے چلو۔ اجودھیا کے درشن کرا لاؤ، رسی کیس، پریاگ بدری ناتھ لے چلو۔ اپنے ساتھ جنگل میں رکھو۔ مگر یہ بیوگ کسی طرح نہیں سہا جاتا کہ پہاڑوں ویا بانوں میں اپنی جان دیتے پھرو۔ پرنتو میں قسمت کی ہیٹی ہوں کہ میری کسی بنتی سے سوامی کے دل پر قابو نہیں

سارندہ - (زناتی کر) کیا سیتلا دیوی تم چاہتی ہو کہ بھیّا بندیلو

کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیں کیا تمھاری رنواس کی خاطر وہ اپنا نام میٹ دیں - کیا تم چاہتی ہو کہ وہ دشمنوں سے لڑنے کی جگہ تمھاری سیوا کے لئے محل میں بیٹھے رہیں ——
(غصہ سے) تم کو کیا معلوم کہ اس وقت کیا حال ہے، اور دشمنوں نے کیسا گھیر رکھا ہے - کیا تم چاہتی ہو کہ وہ چوڑیاں پہنکر بیٹھ جائے - یاد رکھنا سیتلا دیوی ایشور نہ کرے اگر دشمن جیت گئے تو تمھاری لاج کی خیر نہیں ——"

(دروازہ کھلتا ہے اور ایک طویل القامت نوجوان اندر داخل ہوتا ہے)

سیتلا - (خوشی سے اچھل کر) سارن - لو وہ آ گئے

سارن - (متفکرانہ انداز میں) بھیا - یہ کپڑے کیسے بھیگے ہیں ؟ کیا پانی برسا ہے ؟

انردھ - نہیں، ندی پار کر کے آیا ہوں

سیتلا - ایشور نے بڑی خیر کی آج کل ندی باڑھ پر ہے

سارن - ہتھیار کیا ہوئے ؟

انردھ - چھن گئے !

سارن - اور ساتھی !

انردھ - کام آ گئے !

سارن - (سیتلا کی طرف دیکھ کر) سیتلا، یہ سب تمھارے کارن ہوا - تم نے کنبہ کی ناک کٹوا دی - اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی

انردھ - نہیں اس میں سیتلا کا قصور نہیں ہے - خود میں نے دھوکا کھایا

سارن - تو بھیا، شاباش ہے تم کو - کہ بزرگوں کی ناک کٹوا کر اپنی صورت دکھانے یہاں آئے ہو، راجپوت تو باپ دادا کی آن کبھی نہیں کھوتے،

(انردھ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور پھر باہر چلا جاتا ہے سیتلا پیچھے پیچھے جاتی ہے انردھ کو پکارتی ہے - لیکن انردھ فصیل کی دیوار پھاند کر رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے - اور سیتلا چٹان پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے)

سارن - سیتلا کہاں ہو

سیتلا - یہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں

(سارن بھی جاتی ہے)

سارن - کیوں روتی ہو !

سیتلا - (ناگن کی طرح بل کھا کر) کیا باپ دادا کی آن اتنی پیاری ہے

سارن - (غصہ سے تیور اکر) ہاں، ہے

سیتلا - اپنا پتی ہوتا تو کلیجہ میں بٹھا لیتیں

سارن - کلیجہ میں - بالکل جھوٹ - تلوار چبھو دیتی

سیتلا - (غصہ سے) جھوٹ - ڈولی میں چھپاتی پھرو گی - خیر دیکھا جائے گا - کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات !

دوسرا منظر

(سارندہ سیتلا دیوی آپس میں مصروف گفتگو ہیں)

سیتلا - آج پورے ۳ مہینے ہو گئے مگر کچھ خبر نہیں ملی

سارندہ - شیر کچھار میں ہو گا - خبر کیا ملتی

سیتلا - سارن - تم نے اُس رات بہت رولایا

سارن - لیکن بزرگوں کی آتماؤں کو خوش کیا

سیتلا - (چونک کر) سارن - یہ سنکھ کی آواز کہاں سے آ رہی ہے

سارن - (کان لگا کر) ہاں راجپوتی آن پر جان دینے والا

راجہ انرودھ سنگھ آگیا - مبارک ہو

سیتلا (وفورِ مسرت سے) کہاں - کہاں

(آواز اور قریب ہوتی جاتی ہے)

سارن - (**مسرور**) میرا دل بول رہا ہے کہ ہو نہ ہو وہی ہیں

سیتلا - ایشور ایسا ہی کرے

(دروازہ کھلتا ہے اور انرودھ سنگھ داخل ہوتا ہے)

سیتلا - پران ناتھ ------- (قدموں پر گر پڑتی ہے)

سارن - بھیّا - بھیّا

انرودھ سنگھ - سارن میں مہرونی کا قلعہ فتح کرکے آرہا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی طے کرچکا ہوں کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ کے ساتھ تمھارا بیاہ کردیا جائے گا -------

منظر سوم

(رات کا وقت ہے رنواس میں روشنی ہورہی ہے - رانی سیتلا دیوی اور مہاراجہ انرودھ سنگھ بیٹھے ہوئے باتیں کررہے ہیں)

انرودھ سنگھ - رانی کچھ سُنا

سیتلا - نہیں، کیا ہوا

انرودھ سنگھ - دیکھو یہ ایک پتر کسی کا آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ راجہ چمپت رائے بندیلہ راجپوت نہیں ہے

سیتلا - کیا یہ صحیح ہے

انرودھ سنگھ - بالکل جھوٹ - میں خوب جانتا ہوں وہ راجہ پورن چند کے راجکمار ہیں - اور پورن چند، راجہ اودیاجیت کے پُتر تھے - جو راجہ پنچم اور وہ بیر بھدر کے خاندان سے تھے - بھلا میں نے جو بات طے کی تھی وہ جھوٹ ہوسکتی ہے

سیتلا - پھر کب تک اس کو ٹالئے گا - بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے

انرودھ سنگھ - ہاں ارادہ ہے کہ اگلے مہینہ میں فارغ ہوجاؤں کیونکہ خبر آئی ہے کہ محی الدین اورنگ زیب اس طرف سے گزریں گے اور عجب نہیں کہ ولیعہد بہادر کے خلاف جنگ مقصود ہو - اور پھر میں جنگ میں پھنس جاؤں اور یہ کام رہ جائے

سیتلا - سوامی کیا لڑائی آپ ہی کے لئے بنائی گئی ہے

انرودھ سنگھ - ہاں رانی راجپوت کے گھر میں پیدا ہونے کا یہی سبھاؤ ہے

منظر چہارم

(دربار آراستہ ہے درمیان میں آگ جل رہی ہے پروہت ہون کررہا ہے ------ ہون کے ختم پر بندیلہ راج کا قومی ترانہ گایا جاتا ہے - اور راجہ چمپت رائے کا بیاہ راجکماری سارندہ سے ہوتا ہے)

انرودھ سنگھ - پروہت اب تم بھونری پھیرو

پروہت - جو حکم

(پروہت بھونری پھیرتا ہے)

درباری - راجہ چمپت رائے، مبارک

انرودھ سنگھ - چمپت رائے - میں بھی تم کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن اسی مُلک میں چاروں طرف جنگ کا دیوتا سنکھ پھونک رہا ہے کہیں تم اس شادی کے بعد عیش و عشرت میں نہ پڑجانا، لو یہ بیش قیمت خنجر جو شہنشاہ اکبر نے میرے بزرگوں کو عطا کیا تھا - وہ تم اپنی کمر سے باندھو لیکن اس خنجر کو لے کر قسم کھاؤ - کہ تم حق کے لئے جان دینے سے دریغ نہ کروگے - یاد رکھو بندھیلکھنڈ کے پاس بہادر بیٹوں کی بہت کمی ہے - اس لئے اس مبارک تقریب کی عزت

حرمت اب تمھارے ہاتھ ہے

درباری ۔ جے ۔ مہاراج انردھ سنگھ کی جے ۔ بندیلہ راج کا بول بالا ہو

راجہ چمپت رائے ۔ (خنجر کو چوم کر) میں بزدل نہیں ہوں یقین رکھئے ۔ چمپت رائے کے رگوں میں بندیلہ خون دوڑ رہا ہے ۔ اگر میں بندیلہ وقار کو گرانے کی کوشش کروں گا تو سب سے پہلے یہ خنجر میرے قلب میں لہرائے گا ـــــ

درباری ۔ جے ہو ۔ راجہ اورچھا کی جے ہو

پروہت ۔ راجہ چمپت رائے اس مقدس اگنی کو دیکھو

چمپت رائے ۔ دیکھ رہا ہوں

پروہت ۔ خنجر کو چومو

چمپت رائے ۔ خنجر کو میان سے باہر نکالتا ہے اور چومتا ہے

پروہت ۔ کہو میں راجپوتوں کی سبھا میں اقرار کرتا ہوں کہ جب تک بندیلہ راج کی گذشتہ شان و شوکت واپس نہیں آئے گی ۔ اس وقت تک قلعہ اورچھا پر آزادی کا پرچم نہیں لہرائے گا ۔ جب تک کمزور استریاں بندیلہ راجدھانی میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک بے کھٹکے نہ چلی جائیں گی ـــــ تم چین سے نہ بیٹھوگے کیا یہ پرتگیا کرتے ہو

چمپت رائے ۔ (تلوار سے قسم کھا کر) ایسا ہی ہوگا

انردھ سنگھ ۔ اچھا اب آپ سارن کو لے کر اورچھا سدھاریئے سب انتظام مکمل ہے (بے تاب ہو کر رونے لگتا ہے)

درباری ۔ مہاراج ۔ آنسو بہانا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے

(سنکھ پھنک رہا ہے ۔ سارن اورچھا روانہ ہوتی ہے)

انردھ سنگھ ۔ کیا مجکو اپنی سب سے پیاری بہن سے ہمیشہ کے لئے چھٹنے کے بعد آنسو بہانے کا حق حاصل نہیں ہے؟

درباری ۔ مہارانا ۔ اسی لئے تو کنیا کا دان بڑا ہوتا ہے صبر کیجئے ورنہ راجکماری سارن کو ڈولہ میں قرار نہ آئے گا

(انردھ سنگھ نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑتا ہے)

منظر پنجم

(دربار عام میں چمپت رائے تقریر کرتا ہے)

چمپت رائے ۔ درباریو ۔ آج تم سے رخصت ہوتا ہوں اور اپنا تاج و تخت اپنی خوشی سے اپنے قوت بازو پہاڑ سنگھ کے سپرد کرتا ہوں ۔ تم کو معلوم ہے کہ میں نے تخت نشین ہوتے ہی سلاطین مغلیہ کو خراج دینا بند کر دیا تھا ۔ لیکن اب میں مصلحتاً اطاعت کرنا چاہتا ہوں ۔ میں اپنی فوج کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے میرے اشاروں پر اپنے گھر بار کو چھوڑا ۔ اور ہتیلی پر جان لے کر میرے احکام بجا لائے ـــــ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں ـــــ پہاڑ سنگھ اورچھا کی راجدھانی پر تم کو براجماں ہونا مبارک

(درباری رونے لگتے ہیں ۔ اور رانی سارندہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

عورتیں ۔ مہارانی ہم کو چھوڑ کر کہاں چلیں

رانی ۔ سوامی کی اچھا سب سے مقدم ہے

پہاڑ سنگھ ۔ اچھا اس شرط پر میں سنگھاسن پر بیٹھوں گا کہ جب آپ اورچھا واپس تشریف لائیں تو سنگھاسن آپ ہی کا ہے۔

درباری۔ ہاں ضرور شاباش بہادر سنگھ۔ بندیلہ راجکماروں کا یہی طریقہ ہے

چمپت رائے۔ اچھا رخصت

(سارندہ اور چمپت رائے جاتے ہیں)

منظر ششم

(نظام الدین کا شکستہ قلعہ)

(چمپت رائے۔ جگمل سنگھ۔ رانی سارن)

چمپت رائے۔ جگمل سنگھ کیسے آئے

جگمل سنگھ۔ مہاراجا۔ اشیرباد دینے آیا ہوں

چمپت رائے۔ سب پرماتما کا احسان ہے

جگمل سنگھ۔ اعلیحضرت نے بہت خوشی کا اظہار کرکے آپ کو کالپی کی بیش قیمت جاگیر عنایت کی ہے۔ اس سے زیادہ احسان پرماتما کا کیا ہوسکتا ہے؟

چمپت رائے۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کا اب آخری وقت ہے۔ بھائیوں میں رقابت ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ شہنشاہ دہلی دکن میں ہے

جگمل سنگھ۔ اس بساط کے مہرہ سب خطرناک ہیں

چمپت رائے۔ ہاں لیکن اقبال محی الدین ہی کے سر ہے

جگمل سنگھ۔ تو ہم لوگ کیا کریں

چمپت رائے۔ ہم تو تلوار کے دھنی ہیں۔ جو تلوار کہے گی وہی ہوگا۔ لیکن ہوگا بڑا برا۔ خون کی ندیاں بہیں گی

جگمل سنگھ۔ رام نہ کرے ——— (جاتا ہے)

(رانی سارن محل سرا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور چمپت رائے داخل ہوتا ہے)

چمپت رائے۔ تم نے سنا۔ کالپی کی ایک نولاکھ سالا کی جاگیر مجکو آج دربار میں عطا ہوئی ہے اب تو خوش ہو

سارن۔ پران ناتھ آپ کی عزت بڑھی میں بھی خوش ہوئی ایشور آپ کو اس سے زیادہ عزت دے

چمپت رائے۔ سارن تم اُداس سی کیوں ہو۔ کہو کیا ہوا۔ جب سے آئی ہو کچھ کھوئی ہوئی سی رہتی ہو۔ بولو کیا بات؟

سارن۔ پران ناتھ۔ یہ خیال غلط ہے

(رونے لگتی ہے)

چمپت رائے۔ کوئی بات ضرور ہے تم روتی کیوں ہو؟ سچ کہ کیا بات ہے

سارن۔ (روتے ہوئے) آپ یہ نہ پوچھئے۔ اس کو ایسا ہی رہنے دیجئے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آجکل میں کچھ اداس سی رہتی ہوں

چمپت رائے۔ (چیں بجبیں ہوکر) کیوں؟ اورچھا میں کیا تھا جو یہاں دہلی میں نہیں ہے؟

سارن۔ (ناگن کی طرح بل کھاکر) ہاں اورچھا میں رانی تھی دلی میں جاگیردار کی باندی ہوں ——— کوئی گھوڑے پر چڑھ کر گدھے پر نہیں بیٹھتا۔ سوامی آپ برا نہ مانیں آپ نے یہ آرام و چین بڑے مہنگے داموں خریدا ہے

چمپت رائے (ششدر ہوکر) میں تمھاری روحانی عظمت سے بے خبر تھا۔ آج آنکھیں کھل گئیں ایک پردہ تھا جو اٹھ گیا۔ (رونے لگتا ہے)

اچھا سارن چمپت رائے بندیلہ راجہ ہے اور راتوں رات دہلی کو چھوڑ دے گا۔ اب ———

سارن۔ سوامی۔ ٹھیرئے کوئی پرتگیا نہ کیجئے۔ دربار شاہی

ت اجازت لے کر آپ اورچھا جانے کا ارادہ کریں۔

راجپوت پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگتا ہے

پت رائے۔ مناسب ہے۔ آج دربار میں تذکرہ کروں گا

منظر ہفتم

(راجہ چمپت رائے دربار سے اجازت لے کر اورچھا واپس آگیا ہے۔ اور سارا بندھیل کھنڈ اس خوشی سے نہال ہوگیا ہے۔ رانی سارندھہ بھی بہت خوش ہے۔ اسی عرصہ میں شاہجہان بیمار پڑ جاتا ہے۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے رقیبانہ جنگ تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی دلوں کا غبار ظاہر ہوگیا۔ مراد و محی الدین دکن سے چل کھڑے ہوئے۔ برسات کا موسم ہے دھول پور کے قریب چمبل ندی کے کنارہ خونریز جنگ نے محی الدین کو مجبور کیا ہے۔ کہ وہ چمپت رائے سے مدد طلب کرے)

چمپت رائے۔ خاں صاحب۔ میں مدد کرنے کو طیار تو ہوں لیکن ولیعہد کے خلاف ہوگا

فیر۔ مہاراجہ اس وقت تو آپ کو شہزادہ محی الدین کی امداد کرنا پڑے گی۔ آپ کو معلوم ہے شہزادہ کو بڑی تشویش ہے عین دریائے چمبل کے کنارہ شاہی فوج پڑے جمائے کھڑی ہو اس حالت میں تو آپ کو مدد کرنا ہی چاہئے

(چمپت رائے کچھ علیٰحدہ گفتگو کرتا ہے)

یر۔ مہاراجہ آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔ آپ کی امداد انشااللہ رائگاں نہ جائے گی۔ اور اس کے علاوہ الطاف خسروانہ سے بھی آپ محروم نہ رہیں گے

ماراجہ۔ خانصاحب آپکا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن یہ معاملہ ملکی حیثیت سے بھی اہم ہے میں اس معاملہ میں ذرا ذمہ دار عہدہ داروں اور فوجی افسروں سے بھی مشورہ کرلوں۔ اوس کے بعد آپ کو شام تک اطلاع دیدوں گا

(خانصاحب جاتے ہیں)

(پردہ بدلتا ہے)

(رانی سارن ایک کتاب دیکھ رہی ہے)

چمپت رائے۔ سارن، شہزادہ محی الدین کا پیام آیا ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف تلوار اٹھاؤں تمہاری کیا رائے ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اس ہار میں محی الدین ہی ایک سچا موتی ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ فتح دیکھنا محی الدین ہی کی ہاتھ رہے گی — خون بہت بہیگا

سارن۔ آپ کو محی الدین کی مدد کرنا چاہئے

چمپت رائے۔ خوب سوچ لو۔ دارا شکوہ سے عداوت مول لینا ہے

سارن۔ اچھا میں بھاگوت میں سری کرشن جی سے مشورہ مانگتی ہوں

(بھاگوت بند کرکے سری کرشن جی کا دھیان کرکے بھاگوت کھولتی ہے)

دیکھئے۔ پہلے ادھیا کے اشلوک ۲۸۔ ۳۱۔ ۳۲ میں سری کرشن جی فرماتے ہیں کہ "اے کرشن مجھے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دیکھ کر جو جنگ کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں بھلائی نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں کو مار کر نہ مجھے کامیابی اور نہ سلطنت اور نہ راحت کی خواہش ہے" "اے ارجن مخنثوں کا طریقہ اختیار نہ کر تیرے لئے یہ زیبا نہیں اے دشمنوں پر فتح پانیوالے بزدلی اور پست ہمتی کو چھوڑ کر کھڑا ہو۔" "اے ارجن جو سوچنے کی بات نہیں اوس کو سوچتے ہو اور اہل علم کی باتیں کرتے ہو حالانکہ اہل علم کسی شخص کی موت یا زندگی کی فکر نہیں کرتے" "اے ارجن اگر تو جنگ میں کام آئیگا

تو سورگ میں جائے گا اور اگر فتح پائے گا تو تجھے روئے زمین کی بادشاہت ملے گی۔ اس لئے اے کنتی کے لڑکے جنگ کی ٹھان کر اٹھ

"تمھارا ادھکار افعال تک ہی محدود ہے نہ کہ اُن کے ثمرات پر نتائج کی غرض سے افعال عمل میں نہ لا البتہ افعال کے ترک سے بچ"

سوامی - اب کیا ہے - دیکھئے سری کشن جی نے صاف صاف بتلا دیا کہ

راجہ چمپت رائے - ٹھیک ہے - لیکن معاملہ بڑا مشکل ہے

سارن - پران ناتھ - "میں واقف ہوں - منزل کٹھن ہے - قدم قدم پر کانٹے ہیں - ہمیں اپنے سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا - ہم اپنا خون پانی ایک کریں گے اپنے سجیلے بہادروں کا سر کٹوائیں گے - اور چنبل ندی کا گھاٹ بنائیں گے - لیکن سوامی یاد رکھنا جب تک چنبل کا دھارا اجلال وعفت کے ساتھ اپنے مُنھ کا پھین اُگلتا ہے گا تو ہمارے سرفروشوں کا خون لعل بن بن کر روشن رہیگا - اور جب تک بندیلہ قوم کا نام لیوا دنیا میں باقی رہے یہ خون اوس کے ماتھے پر کیسر بن کر چمکے گا "

چمپت رائے - اچھا پیاری سارن ابھی شہزادہ محی الدین کو جواب بھیجے دیتا ہوں

(جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر ہشتم

(برسات کا زمانہ ہے - آسمان پر بادل ہی بادل نظر آرہے ہیں قلعہ سے سرفروش بندیلوں کی کالی گھٹا اٹھتی ہے - اور چمبل ندی پر چھا جاتی ہے ہر سپاہی " بیر رس " سے جھوم رہا ہے - رانی سارن اپنے دونوں راجکماروں کو گلے سے لگاتی ہے اور راجہ چمپت رائے کو پان کا بیڑہ دیتی ہے ہتیار سجتی ہے اور دستار پر کلغی مرصع لگاتی ہے)

رانی سارن - راجکمارو، اب بندیلہ قوم کی لاج تمھارے ہی ہاتھ ہے دیکھنا لڑائی سے منھ موڑ کر نہ آنا - بندیلہ قوم کے وقار کو قائم رکھنا - کوئی بچہ بوڑھا یا عورت سامنے آئے تو تلوار کو اوس بے گناہ خون سے آلودہ نہ کرنا - جاؤ راجکمارو جاؤ ——— دیر ہوتی ہے شہزادہ محی الدین کو تم لوگوں کی ضرورت ہے ——— اور تمھارے پتا زبان دے چکے ہیں - دیکھو کہیں اون کو شرمندگی نہ ہو

دونوں راجکمار - ماتا جی - جیسی آپ کی اگیان ہوگی ویسا ہی ہو گا

(رانی سارن دونوں کو گلے لگاتی ہے)

(راجکمار جاتے ہیں)

راجہ چمپت رائے - سارن - راجکماروں کو رخصت کر دیا تمھاری ہمت کی داد دینا چاہیئے

رانی سارن - ایشور کی سہایتہ چاہیئے ورنہ میں ایک کمزور عورت کیا کر سکتی تھی وہی صبر دیتا ہے - میں نے کیا کیا وہ امانت قوم ہی کی تھی - اوس کے دینے میں مجھکو کیا عذر ہوتا

چمپت رائے - سارن (ہاتھ لے کر) پیاری سارن یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے - معاف کرنا میں بھی جانتا ہوں ——— زندہ بچے تو ملاقات ہوگی

لیجئے بیڑا لیجئے - لائیے ہتیار بھی سج دوں اور دستار

کلغی بھی لگا دی ہے۔ اچھا سوامی رخصت۔ ایشور تمھاری تلواروں کو اندر کا بجر ا بنا دے۔ بندیلوں کی لاج تمھارے ہاتھ ہے

چمپت رائے۔ پان کھا کر۔ رخصت۔ آج تو خوشی سے تمھارا ایک ایک عضو۔ پھڑک رہا ہے۔ ایک راجپوتنی کا یہی وصف ہے

(جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

(رانی سارن فوج کے ایک حصّہ کو طلب کرتی ہے)

سارن۔ کوشلیا۔ استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔ میں دو گھنٹہ بعد مردانہ بھیس میں پچھم جانب سے چمبل ندی کے دشمنوں پر حملہ کردوں گی۔ سب تیار رہیں ———

کوشلیا۔ رانی۔ ایسا ہی ہوگا

(کوشلیا جاتی ہے)

منظر نہم

(میدان جنگ۔ راجہ چمپت رائے نے بندیلوں کو کمیں گاہ میں چھپنے کا حکم دے دیا۔ شہزادہ محی الدین و مراد کی منتشر فوج کو منظم کیا دارا شکوہ کو دھوکہ ہوا۔ بندیلہ اپنی کمیں گاہوں سے نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیئے۔ چمپت رائے دارا شکوہ کی فوج کو دھوکہ دیکر دریا کے اس پار جاتا ہے۔ محی الدین کی فوج کی ہمتیں بندھ گئیں دست بدست جنگ کی نوبت آئی کہ ایک جتھا سپاہیوں کا پچھم جانب سے نمودار ہوا۔ یہ سارن دھا تھی)

راجہ چمپت رائے۔ چھترسال۔ تم مشرقی جانب اپنی فوج لیجاؤ۔ اور کمیں گاہوں میں چھپ جاؤ

(چھترسال چلا جاتا ہے)

چمپت رائے۔ اندرجیت۔ تم اتر جانب اپنی فوج لے جاؤ اور کمیں گاہ میں چھپ جاؤ

(اندرجیت چلا جاتا ہے)

(شہزادہ محی الدین و شہزادہ مراد خیر مقدم کرتے ہیں)

محی الدین۔ راجہ چمپت رائے۔ آپ کی اس مہربانی کا شکریہ تو ادا کرنا فضول ہے۔ کیونکہ شکریہ ادا کرکے آپ کے قومی وقار کو ٹھیس لگے گی۔ ہاں خدا کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہیئے

مراد۔ مہاراجہ اُرچھا کو ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملیگا

محی الدین۔ یہ قبل از وقت گفتگو ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو

چمپت رائے۔ شہزادہ صاحب یہ سچ ہے جو خدا کی مرضی ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ میری رائے ناقص میں فوج کی تنظیم کرنا ضروری ہے

محی الدین۔ ہاں ضرور۔ آپ نے اس فوج کے کے حصّہ کئے ہیں

چمپت رائے۔ تین حصّہ ایک حصّہ میرے تحت میں ہے دو حصّہ خادم زادوں کی تحت میں مشرق و شمال کی کمیں گاہوں میں ہیں۔ وہ دیکھئے شہزادہ دارہ شکوہ مورچہ ہٹا رہے ہیں۔ اون کو دھوکہ ہو گیا بس اب وقت ضایع نہیں ہونا چاہیئے گھوڑے دریا میں ڈال دینا چاہیئے

محی الدین (بسم اللہ کہکر) گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہے

(اللہ اکبر کی پرہیبت تکبیر سے ارض بندیلہ گونج اٹھتی ہے)

چمپت رائے۔ اس سات گھنٹہ کی نقل و حرکت میں... بندیلہ جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی ہیں۔ شکر ہے کہ میری بات خالی نہیں گئی

محی الدین۔ چمپت رائے دیکھنا وہ افق مغرب پر کیا غبار

دکھائی پڑ رہا ہے

چمپت رائے - دیکھئے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے

(سپاہیوں کا ایک دل دارا شکوہ پر حملہ آور ہوا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرشتہ رحمت آپ کی امداد کے لئے آسمان سے اترا ہے)

(گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے)

چمپت رائے - فتح - مبارک۔

محی الدین - خدا کا شکر ہے کہ اوسنے حق و باطل کا فرق دکھا دیا

(ایک سردار آتا ہے)

چمپت رائے - کیا ہے ـــــــ

سردار - ہنس کر - بندیلہ قوم کا راج مبارک - اس جان نثار کو بھول گئے ـــــــ

چمپت رائے - میری سارن ـــ

سارن - (سر تعظیم خم ہو کر) سوامی

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ دوسرا

پردۂ اوّل

(شہزادہ محی الدین چنبل کے ساحل سے آگرہ کی طرف چلا" اقبال اس کے سر پر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت و کامرانی نقارہ بجاتی تھی۔ آگرہ پہنچتا ہے تو شوکت اوس کے لئے تخت شاہی کو سجاتی ہے۔ دربار ہوتا ہے سرداران شاہی کی خطائیں معاف ہوتی ہیں مناصب بحال کئے جاتے ہیں۔ راجہ چمپت رائے کو اوس کی سرفروشانہ خدمات جلیلہ کے صلہ میں دوازدہ ہزاری کا منصب عطا ہوتا ہے اور اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر عطا ہوتی ہے اور بندیل راجہ پھر دہلی میں قیام کرتا ہے۔ اور رانی سارندھا پھر خاموش ہو جاتی ہے)

چمپت رائے - جگمل سنگھ - کنور چھتر سال - سارن

(چمپت رائے دربار سے خلعت پاکر آتا ہے)

کنور چھتر سال - پتاجی مبارک

سارن - کیسی مبارکباد

چھتر سال - شہنشاہ اورنگ زیب نے آج دربار عام میں پتاجی کو بندیلہ راج کی جانبازانہ خدمات و "سرفروشیوں" کے صلہ میں اورچھا سے بنارس تک کی جاگیر اور دوازدہ ہزاری منصب مع خلعت ہفت پارچہ عطا کیا ہے

سارن - ہاں - سوامی

چمپت رائے - سارن - دیکھو یہ تلوار خاص شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے اسلحہ خانہ کی عطا کی ہے - اس تلوار کو شہنشاہ جہانگیر نے لاہور کے معرکہ میں استعمال کیا تھا - اصفہانی تلوار ہے

سارن - سوامی آپ کو مبارک ہو - دشمنوں کے حسد سے پرماتما آپ کو محفوظ رکھے

چمپت رائے - سارن تمھاری خوشی میری تمام کلفتوں کیلئے کافی ہے

سارن - سوامی ـــــــ

(جگمل سنگھ آتا ہے اور کنور چھتر سال اور رانی سارن جاتے ہیں)

چمپت رائے - کہو جگمل کیا سماچار ہیں!

جگمل - اشیرباد دینے آیا ہوں - بہت سے راجپوت آپ کی اس عزت کو دیکھ کر بھسم ہو گئے

چمپت رائے - کون

جگمل - نام لینے سے کیا فائدہ - کوئی گھوڑا آپ کے اصطبل میں

دلی بہادر خاں کا ہے ؟

چمپت رائے۔ ہاں ۔ کیوں

جگمل سنگھ۔ دلی بہادر خاں کو اوس کی بڑی فکر ہے کسی مناسب موقع سے اوس کو واپس کر دیجئے گا

چمپت رائے۔ لیکن وہ تو میدان جنگ میں گرفتار ہوا ہے۔ دلی بہادر خاں زخمی پڑا ہوا تھا۔ اور یہ گھوڑا اپنی دم سے مکھیاں اُڑا رہا تھا مجکو پسند آیا میں نے منع کیا کہ کوئی شخص اس کو جان سے نہ مارے زندہ گرفتار کرے ۔ لیکن رانی اُرچھا نے اوس کو زندہ گرفتار کیا ہے ــــــ

جگمل۔ ہاں دلی بہادر خاں کو وہ بہت عزیز ہے اور شائد وہ اوس کی طلبی کی درخواست دینے والے ہیں ــــــ

چنپت رائے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ (متفکر ہوکر)

(جگمل جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر دوم

(دلی میں رہتے سال بھر ہوا تھا۔ کہ ایک دن کنور چھتر سال گھوڑے پر سوار ہوکر سیر کو گیا۔ اور دلی بہادر خاں کے محل کی طرف سے جا نکلا۔ راجکمار تنہا تھا دلی بہادر خاں کے آدمی دقت کے منتظر تھے گھوڑا چھین لیا۔)

(کنور چھتر سال مغموم داخل ہوتا ہے)

سارن۔ کیوں خیریت ہے

کنور چھتر سال۔ گھوڑا دلی بہادر خاں کے آدمیوں نے چھین لیا !

سارن۔ (غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا) کچھ فکر کی بات نہیں گھوڑا گیا بلا سے گیا۔ لیکن دُکھ یہ ہے کہ تو اوسے زندہ کھو کر کیسے لوٹا۔ ؟ کیا تیری رگوں میں بندیلہ خون نہیں ہے ؟ مجکو ثابت کر دینا چاہیئے تھا کہ بندیل راجکمار سے گھوڑا چھین لینا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے ــــــ"

(غصہ سے) جاؤ کوشلیا استری پلٹن کو لیس ہونے کا حکم دو۔ (کوشلیا جاتی ہے)

چھتر سال تم اور تمھارے پتا دونوں اب شاہی غلام ہوگئے ہیں ۔ تم لوگ اب داد عیش دو۔ اور میں ابھی اپنی استری پلٹن کی مدد سے گھوڑا لاتی ہوں ــ چاہے انجام کچھ ہی ہو

(جاتی ہے)

(سپاہیانہ باناسجاکر اور استری پلٹن کو لے کر خانصاحب کے اصطبل سے زبردستی گھوڑا کھولتی ہے۔ جنگ کی نوبت آتی ہے مگر بندیلہ خواتین کے سامنے کسی کی پیش نہیں جاتی ہے)

چھتر سال۔ راج ماتا۔ آپ آگئیں (قدم چومتا ہے)

سارن۔ لو۔ یہ تمھارا گھوڑا ہے

(گھوڑا سارن کی گود میں اپنا سر ڈال دیتا ہے۔ اوس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہنے لگی)

اے بے زبان گھوڑے تو کیوں رو رہا ہے۔ لا تیرے آنسو پونچھ دوں

(گھوڑا سر جھکا دیتا ہے)

(چنپت رائے داخل ہوتا ہے)

چھتر سال۔ پتاجی۔ دیکھئے راج ماتا نے کمال کر دیا

چنپت رائے۔ کمال کر دیا ــــــ

سارن۔ سوامی آپ متفکر کیوں ہیں

چنپت رائے۔ کاش یہ گھوڑا مجکو نہ دکھائی دیتا۔ یہ گھوڑا میرے اعزاز کے لئے آہوئے زرنگار ثابت ہوا۔ سینا چاہئے

ہرن دیکھا۔ ہرن ہوئیں۔ میں نے گھوڑا دیکھا۔ اعزاز ہرن ہوا

چھترسال۔ (متحیر ہوکر) کیا قصہ ہے

چنپت رائے۔ رانی سارن گھوڑا کھول لائیں۔ اور ادھر عالمگیر کو پرچہ لگا اور ان کو رانی کی یہ جرأت ایک منصب دار کے خلاف ناگوار ہوئی اور گھوڑے کی واپسی کا حکم آیا ہے اور اوسی کے ساتھ منصب وجاگیر بھی اس گھوڑے کی نذر ہوگیا۔ ولی بہادر خاں پہلے ہی سے مجھ سے جلتے تھے۔ اور بہت سے راجپوت بھی اس سازش میں شریک ہیں

چھترسال۔ گھوڑا واپس کردیا جائے

رانی سارن۔ نہیں میری لاش جب اٹھیگی اوس وقت یہ گھوڑا جاسکے گا

چنپت رائے۔ رانی تمہاری ضد سے یہ ہوا —— گھوڑا تو جائے گا

رانی سارن۔ سوامی۔ جب آپ ہی یوں کہتے ہیں تو بیشک چلا جائے گا (رونے لگتی ہے)

منظر سوم

(راجہ چنپت رائے قلعہ میں مقیم ہیں۔ منصب وجاگیر جانے کا قلق ہے لیکن رانی سارندہ کی وجہ سے شکایت نہیں کرتے۔ عالمگیر نے اطمینان ہولنے کے بعد چنپت رائے کی جانب توجہ کی راجہ سبھ کرن بندیلہ نے راجہ چنپت رائے کو خاک میں ملانے کی قسم کھائی۔ بندیلہ سردار راجہ چنپت رائے سے منحرف ہوکر شاہی فوج میں شامل ہوگئے۔ قرب وجوار کے بندیلہ راجاؤں نے بھی رفاقت سے منہ موڑا۔ چنپت رائے نے بھی آوارہ گردی شروع کی۔ رانی سارندہ اور دیگر چھترسال برابر راجہ کے ساتھ سائے کی طرح تھے۔ شاہی فوج نے مقابلہ سے عاجز آکر عالمگیر کو اطلاع کی کہ راجہ کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ محاصرہ اٹھالیا گیا۔ راجہ جیرچھ قلعہ میں واپس آیا لیکن چند ہی ماہ کے بعد آوارہ دخست ہونا پڑا۔ اس وقت میں ہفتوں سے شاہی فوج اورچھا کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اور راجہ چنپت رائے بخار میں مبتلا ہیں)

چنپت رائے۔ (آنکھ کھول کر) سارن کیا سماچار ہے ؟

سارن۔ فصیلوں کو گولوں نے چھلنی کردیا ہے۔ بیس ہزار جانیں قلعہ میں بند ہیں۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ مردوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ رسد بند ہے۔ باہر سے آمد ورفت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ استریاں اپنے بالکوں اور سوامیوں کو زندہ رکھنے کے لئے فاقہ کررہی ہیں۔ استریاں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوس رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ کی بیماری نے قلعہ میں کہرام مچادیا ہے

راجہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارن آج دشمن ضرور قلعہ کے اندر گھس آئیں گے

سارن۔ ایشور نہ کرے کہ یہ دن دیکھنا پڑے

راجہ۔ ان قلعہ والوں کا کیا حال ہوگا ؟

سارن۔ ہم لوگ قلعہ چھوڑ کر چلے جائیں تو کیا ہو ؟

راجہ۔ کیا ان بدنصیبوں کو اپنی زندگی پر نفرت کرنے کے لئے

سارن۔ نہیں شاید دشمن ان پر رحم کریں۔ دشمنی تو ہم سے ہے نہ کہ ان سے

راجہ۔ نہیں یہ تو مشکل ہے۔ ہم سے نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنی بلا ان غریبوں کے لئے چھوڑ جائیں —— عورتوں و بالکوں کو میں کسی طرح بھی چھوڑ نہیں سکتا

سارن۔ مگر یہاں رہنے سے ہم کیا کرسکتے ہیں

راجہ۔ مر تو سکتے ہیں؟ قید کی مصیبتیں سہوں گا لیکن قلعہ میں رہوں گا

سارن۔ پران ناتھ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھکو شرمندگی ہوئی کہ ایسی بات کیوں کی۔ (کچھ سوچ کر) اچھا اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ ان کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہوگا تو آپ چل سکتے ہیں؟

راجہ۔ (بہت غور کرنے کے بعد) یقین کیسے ہو؟

سارن۔ شاہی سپہ سالار کی تحریر!

راجہ۔ ہاں۔ اس شرط سے کہ یہ لوگ بھی ہم کو رخصت کر دیں

(سارن جاتی ہے)

منظر چہارم

سارن۔ کنور میں نے تم کو اس لئے بلایا ہے کہ تم کو میں بندیلہ راج کی آن پر بھینٹ چڑھا دوں

چھترسال۔ ماتا جی جو آگیان ہو میں تیار ہوں

رانی سارن۔ آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے

چھترسال۔ اب تک پچاس آدمی مر چکے ہیں

رانی سارن۔ بندیلہ کی لاج اب ایشور کے ہاتھ ہے۔ اچھا یہ کام کس کے سپرد کیا جائے

چھترسال۔ میرے

رانی۔ پورا کروگے

چھترسال۔ ہاں یقین تو ہے۔ اچھا ماتا جی رخصت

رانی۔ (سینہ سے لگا کر) ایشور تمہاری صورت جلد دکھائے

(روتی ہے)

(چھترسال جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے)

رانی سارندھا۔ جیون ناتھ۔ آپ نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیجئے

راجہ۔ تم نے وعدہ پورا کیا؟

رانی سارن۔ تحریری معاہدہ حاضر ہے جو آج تیر میں باندھ کر کنور چھترسال نے بھیجا ہے

راجہ۔ ہاں اب میں چلوں گا۔ اور ایشور نے چاہا تو ایک بار پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا مگر سارن سچ بتانا اس کاغذ کا کیا مول ہے؟

سارن۔ (آبدیدہ ہوکر) ایک جوان بیٹا۔ کاغذ کے ایک پرزے کی اس قدر گراں قیمت کس نے ادا کی ہوگی

راجہ۔ (سکتہ ہوگیا) بیج کر کون

سارن۔ کنور چھترسال

راجہ ——— ہائے ——— (بیہوش ہوکر گر پڑتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظر پنجم

(راجہ چنپت رائے۔ صاحب فراش ہے۔ تاریک رات میں پالکی میں بیٹھ کر قلعہ والوں کو اپنی قسمت پر رونے کے لئے قلعہ کی ذیبی وز راستہ سے اور چھ سات میل آگے نکل چکا تھا۔ رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے۔ گھوڑے پر سوار تھی۔ راجہ پالکی میں بے سدھ تھا۔ اور کہار پسینہ میں شرابور تشنگی سے قافلہ کا برا حال تھا۔ پانچ سوار پالکی کے ساتھ تھے۔ کہ دفعتاً شاہی فوج آگئی اور پالکی سارندھا کے حکم سے روک لی گئی)

سارندھا۔ سوارو۔ دیکھو وہ فوج کیسی آرہی ہے

سوار۔ شاید شاہی فوج ہے!

رانی۔ شاید میرے راجکمار۔ میری سہایتہ کے لئے آتے ہوں گے

راجہ - (ہوش میں آکر) کیا ہے - ؟

رانی - (غور سے دیکھ کر) فوج آگئی ہے - کہارو پالکی روک لو

(پالکی رکتی ہے)

راجہ - بہادرو بیرو - آخری جوش اور دکھادو

(تلواریں کھنچ جاتی ہیں)

سپاہی - جے ہے جے

راجہ - (پالکی سے باہر آکر) —— سارن ——

(غش کھا کر گر پڑا)

سارن - (آبدیدہ ہوکر) پران ناتھ ——

چنپت رائے - سارن افسوس جس ذلت سے تمام عمر بچتا رہا وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی - میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پوتر شریر کو چھوئیں گے اور میں ہل بھی نہ سکوں گا —— ہائے موت کب آئے گی ؟

...... سارن ! تم نے بہت نازک موقعوں پر میری آن رکھی ہے -"

سارن - (خوش ہوکر) پران ناتھ - ایشور نے چاہا تو جب تک سانس باقی ہے جیون ناتھ کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی

(تیغہ کو لے کر اپنے سینہ کے قریب رکھتی ہے)

راجہ - کیا تم کو منظور ہے !

سارن - مرتے دم تک مانوں گی

راجہ - آخری خواہش ہے اس کو رد نہ کرنا

سارن - (تیغہ کو سینہ میں چبھوئے ہو) یہ آپ کی درخواست ہے ؟

چنپت رائے - نہیں یہ خواہش نہیں ہے

سارن - میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو

چنپت رائے - تم نے میرا مطلب غلط سمجھا - میں ایک بردان مانگتا ہوں

سارن - شوق سے کہئے !

راجہ چنپت رائے - زبان کا پاس کرنا

سارن - (کانپ کر) فرمائیے

راجہ - اپنا خنجر میرے سینہ میں چبھو دو

سارن - (سناٹے میں) جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے ؟

راجہ - میں قید ہونے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا

سارن - مجھ سے کیسے ہوگا

(پانچواں سوار بھی حق نمک ادا کرتا ہے)

راجہ - (جھنجھلا کر) کیا اسی پر آن نباہنے کا دعویٰ تھا

شاہی سپاہی - راجہ کو لینا —— راجہ کو ——

رانی —— ٹھیرو ——

(خنجر آبدار راجہ کے سینہ میں پیوست کر دیتی ہے)

شاہی سپاہی - رانی صاحبہ - ارے آپ کیا کر رہی ہیں - ہم آپ لوگوں کا بال بیکا نہ کریں گے شہنشاہ عالمگیر کا حکم تھا آپ لوگوں کو عزت و آبرو کے ساتھ حضور کے پاس پہنچا دیں آپ نے غضب کر دیا - کسی عورت کی تلوار سے بھی کبھی ایسا کام ہوا ہے ؟ ہم نے اودے پور اور ماڑواڑ کے راجپوتنیوں میں بھی یہ خودداری کا جذبہ نہیں دیکھا - عورت کے لئے جان دیدینا بہت آسان ہے مگر رانی صاحبہ جو کام آپ نے کیا ہے وہ کوئی عورت کر ہی نہیں سکتی - بتلائیے ہم شہنشاہ عالمگیر کو کیا منھ دکھلائیں گے - آپ کے بندہ بے دام ہیں آپ کا جو حکم ہو اوس پر سر و چشم بجا لائیں اسلام سچا مذہب ہے اور ہم اوس کے نام لیوا ہیں - ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آپ کے جسم

پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لئے حرام ہے جو حکم آپ دیں اوس کے بجالانے کے لئے ہم تیار ہیں۔

مارن۔ (مسکراتے ہوئے) یہ خنجر۔ فرض کی کٹار ہے۔ پریم کی برچھی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا رہی ہے۔ جو سینہ کل تک عزت کا پاسبان اور میری محبت کا خزانہ تھا۔ آج اسی پاک سینہ کو میری تلوار چوم رہی ہے ——— اگر ہمارے راجکماروں میں سے کوئی زندہ ہو تو ہماری دونوں لاشیں اون کو سونپ دینا ——— (خون آلود خنجر اپنے سینہ میں بھونک لیتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

مشیر احمد علوی ناظر (کاکوری بی۔اے)

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر مع محصول مل سکتے ہیں

مہینہ	قیمت
سنہ ۲۲ء	
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
سنہ ۲۳ء	
مئی	۶ر
جون	عہر
سنہ ۲۴ء	
جنوری	۴ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۶ر
اگست	۴ر
ستمبر	۶ر
اکتوبر	۸ر

مہینہ	قیمت
سنہ ۲۶ء	
جنوری	۴ر
اپریل	۸ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	عہ
سنہ ۲۷ء	
مارچ	۴ر
اپریل	۴ر
مئی	۴ر
جون	۴ر
سنہ ۲۸ء	
دسمبر	۸ر
سنہ ۲۹ء	
مارچ	۸ر
اکتوبر	عہ
نومبر	عہ

مہینہ	قیمت
سنہ ۳۰ء	
مئی	۴ر
اگست	۸ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۶ر
سنہ ۳۱ء	
جولائی	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر
سنہ ۳۲ء	
جنوری	۱۲ر
فروری	۴ر
مارچ	۴ر
اپریل	۸ر

مہینہ	قیمت
سنہ ۳۲ء	
مئی	۴ر
جون	۴ر
جولائی	۴ر
اگست	۴ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۴ر
سنہ ۳۳ء	
فروری	۴ر
مارچ	۸ر
اپریل	۸ر
جولائی	۴ر
ستمبر	۴ر
اکتوبر	۴ر
نومبر	۴ر
دسمبر	۴

مینیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

(جناب محمد عبد اللہ خاں صاحب - کراچی)

بیدل کے چند اشعار

تکلیف تو ہوگی لیکن براہِ کرم بیدلؔ کے حسب ذیل اشعار کا مطلب واضح طور پر بیان فرما دیجئے، چونکہ آپ نے اکثر و بیشتر بیدلؔ کا ذکر کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ وہ اشعار یہ ہیں :——

به کدام فرصت ازیں چمن ہوس ادفضولی اثر کند   شب خوں بعمر خضر زنم کہ نفس شراب سحر زند

شکست زاں چشم فتنہ مائل غبارِ امکان آں بالِ بسمل   مباش زافسونِ سرمہ غافل ہنوز دستے ست زیر سنگش

بہ کدام آئینہ مائلی کہ زفرصت اینہمہ غافلی   تو نگاہِ دیدۂ بسملی مژہ وا کن و بہ کفن در آ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما   چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

(نگار) میں بیدلؔ کا شمار اُن شعراء میں کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے کلام مفہوم سمجھنے سے عاری ہو تو اُسے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ شعر کا لطف صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب بغیر وساطت توضیح و تفسیر کے وجدانی طور پر ذہن نشین ہو جائے ——— پھر چونکہ ہر شخص کا ذوق ایک مخصوص دائرہ کے اندر کام کرتا ہے،

اس لئے جب اس دائرہ سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا ذہن متوحش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے سمجھانے سے مفہوم سمجھ میں آ بھی گیا تو وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو از خود سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

بیدلؔ کو شاعر کہا جائے یا نہ کہا جائے، مجھے تو اس میں بھی تامل ہے کیونکہ اس کی تخئیل اس درجہ نازک ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بھی بعض اوقات اس کی نزاکت تک نہیں پہونچ سکتے۔

بیدلؔ ایک مجذوب ہے شاعر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا غلطی ہے بلکہ ایک رند ژولیدہ مُو، ایک سر بصحرا زدہ مجنوں کی حیثیت سے اس کے آواز کو سننا چاہئے

جو اشعار آپ نے لکھے ہیں میں اپنی فہم و فراست کے مطابق اُن کا مفہوم تو بیان کئے دیتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ وہ لُطف جو اخیر تفصیل و تشریح کے یوں.... حاصل ہونا چاہئے وہ آپ کو حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں صرف مفہوم ظاہر کردوں گا تعبیرات شاعرانہ کو آپ اس کے مطابق کر لیجئے گا۔

(۱) پہلے شعر میں اس کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کارگاہ عالم میں انسانی تگ و دو کی ہوس لاانی حد درجہ حماقت ہے کیونکہ انسان کو یہاں کوئی فرصت ہے کہ آ ہی نہیں اور بڑی سی بڑی فرصت و مہلت بھی حد درجہ مختصر ہے

پہلا مصرعہ:۔

اتنی فرصت کہاں کہ اس چمن یا دنیا میں ہماری ہوس کوئی نتیجہ پیدا کر سکے

دوسرا مصرعہ:۔

کیونکہ اس تنگی فرصت کا یہ عالم ہے کہ عمر خضر مل جائے تو بھی وہ اس سے زیادہ کام نہیں دے سکتی کہ بہ مشکل ہم شام کو سحر کر سکیں

(۲) محبوب کی چشم فتنہ پرواز کا یہ اثر ہے کہ یارِ بسمل سے غبار امکان لوٹ گیا یعنی بسمل تڑپ کر مر گیا۔ اس لئے اس وقت سے غافل نہ ہو جب اُن آنکھوں میں سُرمہ بھی لگ جائے کہ اس وقت تو خدا جانے وہ اور کیا قیامت ڈھائیں گی سُرمہ کے متعلق یہ کہنا کہ "ہنوز دستہ ست زیر سنگش" صرف اس لحاظ سے ہے کہ طیار ہونے سے قبل وہ کھرل میں پیسا جاتا ہے

(۳) تو کس تماشہ میں مصروف ہے، کس آئینہ کے سامنے اپنی زیبائش و آرائش میں لگا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی فرصت تجھے ملی ہے وہ دیدۂ بسمل کی آخری نگاہ سے زاید نہیں اس لئے آنکھ کھول اور کفن کے اندر آجا کہ تیری فرصت کا اقتضاء اس سے زاید نہیں

(۴) یہ شعر صاف ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق کی تمنائیں وصل محبوب کے باب میں اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر وہ محبوب سے کہتا ہے کہ "ایک عمر گزر گئی تیرے

ساتھ بادہ خواری میں مصروف ہوں۔ لیکن خمارِ محرومی اب تک نہیں گیا، خدا کے لئے بتا یہ کیا قیامت ہے کہ باوجود پہلو سے مستقل رہنے کے بھی میرے پہلو سے جُدا ہے، باوجود آغوش میں رہنے کے آغوش سے علیحدہ ہے

کسان

دے نہ گر درسِ تپش، خورشید کی تابندگی
ظلمتوں میں ڈوب کر رہ جائے نبضِ زندگی

گر نہ ہو محوِ تبسم، ماہِ تاباں کا جمال
نرم رَو موجوں کو حاصل ہو نہ طوفاں کا جلال

گر نہ گرمِ سیر ہو، صحنِ گلستاں میں نسیم
حشر تک سوتی رہے غنچے کے سینے میں شمیم

گر ہوا میں ابرِ تر قطروں کا پھیلائے نہ جال
ہو نہ دُنیا میں پرافشاں طائرِ حُسن و جمال

یوں ہی گر دہقاں رہے سعی و عمل سے بیخبر
زندگی کی موج رقصاں ہو نہ سطحِ خاک پر

کس قدر اس بے نوا، دہقاں کی سیرت ہے عجیب
خود مریضِ مضطرب اور دردِ عالم کا طبیب

اس کے عالم میں نہیں جنگِ یقین و احتمال
خال و خد سے ہے عیاں صدیوں کی محنت کا جلال

کوہ کے مانند ہے اس کے ارادوں کا ثبات
ہے اسی کے دوش پر صدیوں سے بارِ کائنات

مطمئن اپنی روش پر، محوِ آئینِ قدیم
اس کے سینے میں نہیں ہنگامۂ اُمید و بیم

بیل ہے، یہ ہے، زمیں ہے، اور خیالِ فصلِ کشت
جھونپڑا ہے قصر اس کا، کھیت ہے اسکی بہشت

آگ برسے چرخ سے، رُک جائے یا نبضِ حیات
اس کی دنیا میں نہیں پروائے سیلِ حادثات

کھیل ہے اس کے لئے ہر شورشِ ہمت شکن
شیر کا انداز، طوفاں کی طرح ہیبت فگن

بازوؤں میں آندھیوں کا زور، لوہے کا جگر
حوصلہ بیباک، دل بے خوف، بے پروا نظر

زندگی کا راز دنیا کو بتا دیتا ہے یہ
محنتِ صبر آزما پر مسکرا دیتا ہے یہ

ہے مگر اس کاوشِ سعی و عمل کا یہ مآل   اس سے بڑھ کر کون ہوگا، بدنصیب و خستہ حال
باوجودِ ہمت آزاد و عزمِ اُستوار   اس سے بڑھکر کون ہوگا، دردمند و دلفگار

. . . .

قصرِ دولت کی ستم رانی سے تھرّایا ہوا   زخم دارِ بےکسی، دنیا کا ٹھکرایا ہوا
اس کی نظروں میں نہیں تہذیب و دانش کا جلال   اس کی آنکھوں سے نہاں ہے عشرتِ بزمِ جمال
اس قدر ناآشنا، یعنی سمجھتا ہی نہیں   اس کے دل میں زندگانی کی تمنا ہی نہیں
یہ رہینِ صد محن کیا جانے کیا ہے زندگی   شام کا حُسنِ لطافت، صبح کی تابندگی
روح کو کیونکر جگا دیتا ہے اِک رنگیں گلاب   کس طرح نغموں سے چونک اُٹھتا ہے احساسِ شباب

زندگی کا راز حُسن و نغمۂ صہبا میں ہے
فصل و بارش کے سوا کچھ اور بھی دُنیا میں ہے

ہے اس احساسِ الم پرور کا آخر کیا سبب ؟   کس نے اسکی روح کو رکھا ہے پابندِ تعب ؟
کیوں ہے یہ ابتک رہینِ جستجوئے ناتمام ؟   کس نے اس کی سیرگاہوں میں بچھا رکھے ہیں دام ؟
کون اس کی فکر کو دیتا ہے درسِ نارسی ؟   کس کے اطمینان کا ساماں ہے اسکی بےکسی ؟
اس کی نارسی ہے کس کی خودسری کا مدعا ؟   کیوں سرورِ نور سے محروم ہے اس کی فضا ؟
چھیڑتا ہے ذرہ ذرہ گو سرودِ مہر و ماہ ؟   بن گئی ہے اسکی ہستی کیوں سراپا اشک و آہ ؟
غرقِ آسائش ہے دنیا کی بہشتِ مختصر   یہ مگر اِن سرمدی جلووں سے ہے کیوں بیخبر ؟

کس نے اس ظلم فراواں کا کیا ہے بند و بست ؟
دے رہا ہے کون اس کے عزم کو پیہم شکست ؟

کیا یہ ممکن ہے، کہ ہو یہ مرضیٔ پروردگار   کیونکہ اُس کے حکم پر ہے زندگانی کا مدار
جس کی صناعی نے کی تشکیلِ ماہ و آفتاب   اِک پئے فکر و عمل اور ایک بہرِ درسِ خواب

راستے پیدا کیے اِن کے گزرنے کے لئے اپنے اپنے محوروں پر رقص کرنے کے لئے
عقل انسانی پہ کھولے جس نے اسرارِ حیات مختلف جلووں سے کی معمور بزمِ کائنات
جس نے کی اِس خاک کی چٹکی کو وہ رفعت عطا کھل گئی اس کی نگاہوں پر ستاروں کی فضا
جس نے اس مجبور کو بخشا وہ عزمِ فتحمند بڑھ گئی اوجِ فلک سے اس کی پروازِ بلند

نسلِ انسانی پہ اتنا ظلم ایسا قتلِ عام
حیف ہے گر ہو یہ دُنیا کے خدا کا اہتمام!

اس سے بڑھکر کوئی صورت اور کیا ہوگی مہیب نوعِ انسانی کی تخریب و تباہی کی نقیب
اس سے بڑھکر اور کیا درد آفریں ہوگی فغاں جس کے سننے پر ہو قادر گوشِ ابنائے زماں
اور کیا ہوگا بپا ہنگامۂ روزِ مصاف ظلم و حرص و آز کی سفاک دُنیا کے خلاف
اور کیا ہوگی حیاتِ نوعِ انسانی تباہ اور کیا دیکھے گی دُنیا ظلمتِ روزِ سیاہ

لطفِ پیہم کے ارادوں سے گزر سکتا نہیں
خالقِ ارض و سما یہ ظلم کر سکتا نہیں

ہل چکی ایوانِ دولت کی بنائے استوار ہوشیار اب اے خداوندانِ گیتی ہوشیار
ناز ہے جس پر تمھیں ہے یہ وہی جنسِ گراں بیکسوں کے اشک، مزدوروں کی آہِ ناتواں!
یوں ہی ہوتا ہے، سپاسِ منتِ یزدانِ پاک سرمدی جلووں سے کی معمور جس نے سطحِ خاک
خواہشوں کی رَو میں اتنا جبر، یہ قہر و عذاب کیا یہی ہے بے شمار اکرامِ فطرت کا جواب
آندھیوں میں ظلم کی بہنائے گیتی ہے تباہ ظلم ایسا، جس کی بے اندازہ صدیاں ہیں گواہ

کر رہا ہے برق کی تعمیر فطرت کا جلال
یہ بتاؤ تم نے سوچا ہے کبھی اس کا مآل

دہقاں، یہی بیگانۂ علم و شعور جس کو ٹھکرا کر تمھیں ملتی ہے تسکینِ غرور

جس کی محرومی سے پاتی ہے خداوندی غذا
جس کے دل پر ہے تمھارے قصرِ نخوت کی بنا

جس کی بربادی سے ہے بزمِ طرب کا اہتمام
خون سے جس کے درخشاں ہیں تمھارے صبح وشام

جس سے چھینا تم نے احساسِ حیاتِ کامگار
عشرتوں کا ناز، عقل وعلم ودانش کا وقار

محرمِ انوارِ آسایش نہیں جس کی جبیں
جس کو آزادی سے جینے کا بھی حق حاصل نہیں

جو حزیں ابتک اسیرِ ہستی موہوم ہے
جس کی دنیا سرمدی انوار سے محروم ہے

کچھ خبر ہے رنگِ ہستی کیا سے کیا ہوجائے گا
جب دماغ اس کا حقیقت آشنا ہوجائیگا

جب بغاوت کی اٹھیں گی حشر پرور آندھیاں
جب یہ لے گا اِس جہاں کے حوصلے کا امتحاں

ہوش میں آئیگا جب مدت کی مدہوشی کے بعد
جب زباں کھولے گا یہ صدیوں کی خاموشی کے بعد

کون روکے گا وہ جوشِ قہر وطوفانِ عتاب
کون دے گا اس کے پُرہیبت سوالوں کا جواب

کس کے بازو میں ہے یہ طاقت کہ روکے اسکے وار
کس کی ہمت کو یہ قدرت ہو کہ ہو اس سے دوچار

ٹھوکریں کھاتی پھرے گی سطوتِ جاہ وجلال
موجِ ظلمت بن کے رہجائیں گے اجزائے جمال

عظمتوں کا قصر آنسو کی طرح بہ جائے گا
دولتوں کا ناز اپنے حال پر شرمائے گا

صبح اُن کے حق میں ہوگی نوحۂ و ماتم کی شب
زندگی کا حق جنھوں نے اس سے چھینا بےسبب

چاہتے ہو گر کہ دُنیا ہو نہ برباد و زبوں
انتقام اس کا نہ ہو غارت گرِ امن وسکوں

اس سے پہلے جبکہ یہ اس خواب سے بیدار ہو
اور اس کے قہر کی تلوار، آتش بار ہو

جبکہ اس کے دل میں ہو بیچین جوشِ انتقام
اور لہو پی کے ہو دیوِ بغاوت شادکام

تمکو اس کی فکر "استمار" کرنا چاہیے
اور اپنے جُرم کا اقرار کرنا چاہیے

علی اختر (حیدرآباد دکن)

معلومات

بعض محیر العقول تماشوں کی حقیقت

آج کل بعض فقرا ایسے دہشت ناک تماشے دکھاتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے درانحالیکہ حقیقتاً وہ کچھ نہیں ہوتے۔ مثلاً نوکدار کیلوں ننگی تلواروں پر لیٹ جانا۔ سینہ پر پتھر رکھوا کر تڑوانا، کانچ کے ٹکڑوں پر برہنہ چلنا، ننگے بدن آگ سے گزر جانا، منہ میں انگارہ لے لینا، گھنٹوں تک زمین میں دفن رہنا۔ یہ تمام باتیں بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی معجزہ و کرامت نہیں ہے

مثالاً نوکدار کیلوں پر لیٹنے کی حقیقت کو ملاحظہ کیجئے کہ ہر شخص بغیر کسی مشق کے کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا ثقل تمام کیلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور جتنا وزن ایک کیل کے اندر پیوست ہونے کے لئے ضروری ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور پر وہ تختہ جس پر لوگ لیٹتے ہیں کم از کم ۵ - ۶ ہزار کیلیں رکھتا ہے اور جس وقت انسان کے وزن کو ان کیلوں پر تقسیم کیا جائے گا تو مشکل سے ۱۰ رتی فی کیل کا اوسط پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنے وزن سے ایک کیل جسم کے اندر پیوست نہیں ہو سکتی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ دو تلواروں پر لیٹ کر سو جاتے ہیں اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر توڑا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جسم و اعصاب کو سخت کر کے لیٹ جاتا ہے اور لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس پر مسمریزم کا عمل کیا گیا۔ پھر دو تلواریں دو آہنی ڈھانچوں پر رکھ کر اسے تلواروں پر لٹا دیتے ہیں۔ جو تیز نہیں ہوتیں۔ اس کے بعد سینہ پر پتھر رکھ کر توڑتے ہیں۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ جسم کے اس حصہ کے نیچے جہاں پتھر رکھا جاتا ہے خلا ہوتا ہے اور اس لئے جب ضرب لگائی جاتی ہے تو اس کا اثر صرف ان آہنی ڈھانچوں پر پڑتا ہے۔ جن پر تلواریں رکھی ہوئی ہیں اور جسم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آپ ہاتھ میں لیں اور اسے ہتوڑی سے توڑیں تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ اور ہاتھ میں ضرب نہ آئے گی، لیکن اگر آپ کا ہاتھ زمین پر ہوگا تو مجروح ہو جائے گا

کانچ کے ٹکڑوں پر چلنے کی حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ ٹکڑے تیز نوکدار نہیں ہوتے اور اُن کی دھار کرنڈ پتھر سے ماردی جاتی ہے ——— آگ پر چلنے یا آگ منہ میں رکھ لینے کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے پھٹکری کا پانی اور گندھک کا تیزاب ملا کر

جسم پر مل لیتے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ آگ کا اثر فوراً نہیں ہوتا اور ایک شخص تیزی سے آگ پر دوڑ سکتا ہے

زندہ دفن ہو جانے کی اصلیت یہ ہے کہ جس تابوت میں لٹا کر دفن کرتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کی آکسیجن ۶-۷ گھنٹہ تک انسان کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ احتیاطاً اس کے منہ، ناک اور کان پر روئی رکھ دیتے ہیں تاکہ تنفس آہستہ آہستہ ہو اور آکسیجن کی موجودہ مقدار زیادہ دیر تک کام دے سکے

لاشوں کا تبادلہ

جرمنی کی ایک ضعیف عورت ڈرسڈین سے ویانا سفر کر رہی تھی۔ جب ریل زیکوسلوویکیا کے حدود میں پہونچی تو وہ بیمار ہو گئی اور وہیں کسی شفا خانہ میں داخل کر دی گئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ مر گئی تو اس کے خاندان والوں کو ذریعۂ تار اس کے مرنے کے اطلاع دیدی گئی۔ جب چار دن کے بعد اس کا تابوت جرمنی میں پہونچا۔ اور اُسے کھولا گیا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ تابوت کے اندر بجائے ضعیف عورت کے ایک اطالوی فوجی افسر کی لاش وردی کے ساتھ نظر آئی

یہاں سے فوراً تار بھیجا گیا کہ "تابوت میں اطالوی افسر کی لاش ملی ہے، بڑھیا کی لاش کہاں گئی" وہاں سے جواب آیا۔ "اس غلطی پر سخت افسوس ہے۔" بڑھیا کی لاش بولون چلی گئی"۔ لوگوں نے بولون تار دیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ "یہاں تو وہ لاش دفن کر دی گئی۔ اور تمام انھیں فوجی مراسم اعزاز کے ساتھ جو ایک افسر کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اور قبر پر فوجی نشان وغیرہ بھی نصب کر دیے گئے۔ اس لئے ہمارے فوجی افسر کو بڑھیا سمجھ کر وہیں دفن کر دیجئے"

بولون میں آج بھی بڑھیا کی قبر موجود ہے اور جب فوج اُس طرف سے گزرتی ہے تو اسی طرح سلامی دیتی ہے جیسے کسی فوجی افسر کی قبر کے سامنے دی جاتی ہے

حُسن و ذکاوت کی جنگ

ذہانت و جمال کے درمیان ایک زمانہ سے جنگ جاری ہے۔ بعض لوگ حسین عورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی غبی کیوں نہ ہو۔ اور بعض اس کے برخلاف صرف ذہانت و ذکاوت کو پسند کرتے ہیں

شکاگو کی یونیورسٹی (دی پول) کا معمول ہے کہ وہ ہر سال اپنی رپورٹ کے ساتھ جمیل ترین طالبات کی تصویریں بھی شایع کرتی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جو رپورٹ شائع ہوئی وہ اس قاعدہ کے خلاف تھی۔ یعنی اس میں بجائے جمیل طالبات کے ذہین لڑکیوں کی تصویریں شایع کی گئیں۔ اس پر وہاں کے طلبہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اس اختلاف نے اس حد تک طوالت اختیار کی کہ آخر کار یہ تجویز قرار پائی کہ آیندہ سے پانچ حسین لڑکیوں کی اور پانچ ذہین طالبات کی تصویریں دی جائیں

تخفیف اسلحہ کی حقیقت

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد تمام ممالک کا رُجحان اس طرف ہے کہ اسلحہ کو کم کیا جائے اور سامانِ حرب کو رفتہ رفتہ مفقود کر دیا جائے کہ دنیا کا آیندہ امن و سکون

اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر پر تمام حکومتوں نے اتفاق کرکے باہمی معاہدہ بھی کر لیا۔ لیکن اس عہد و پیماں کا عملی نتیجہ کیا ہوا۔ وہ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا :۔

سنہ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۳۱ء کے آخر تک ——— برطانیہ نے ۲۳۷۰۰۰۰ گنی آلات حرب پر صرف کیں،
فرانس نے جنگی جہازوں کی طیاری میں ۵۰۰۰۰۰ گنی صرف کیں
اطالیہ نے فوجی طیاریوں میں ۱۲۵۰۰۰ گنی خرچ کیں
امریکہ نے ۳۶۰۰۰۰۰ گنی اور جاپان نے ۱۱۰۰۰۰۰ "

برطانیہ کے تمام فوجی مصارف سنہ ۱۹۳۱ء میں وہی رہے جو ۱۹۲۵ء میں تھے، فرانس میں ۲۰۸۰۰۰۰ کا اضافہ ہوگیا۔ اور اطالیہ میں ۱۵۴۰۰۰۰ کا۔ اسی طرح امریکہ نے ۱۵۶۸۰۰۰۰ گنی زیادہ صرف کیں

دماغوں کا عجائب گھر دینا میں ایک شخص ڈاکٹر اکونومو ہے۔ اس نے ایک عجائب گھر صرف انسانی دماغوں کے لئے قائم کیا ہے۔ اور بڑے بڑے علماء، فیلسوف، شعراء، ادباء، اور سیاسی رہنماؤں کے دماغ شیشے کے ظرف میں نہایت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر شیشہ پر وہ اس شخص کا نام، اور دماغ کا وزن وغیرہ بھی درج کر دیتا ہے۔ اس وقت تک کثیر تعداد میں اس نے "دماغ" جمع کرلئے ہیں اور دنیا کے تمام مشاہیر سے وہ اس باب میں خط و کتابت کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی بابت اس کو دئے جانے کی وصیت کر جائیں

چھڑی کا استعمال جرمنی کے ایک رسالہ نے نہایت بسیط بحث کی ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اس نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا بیان ہے کہ چھڑی لے کر انسان کا چلنا اس کی صحت کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو اس کا استعمال نہیں کرتے عموماً زیادہ فراخ سینے، بھرے ہوئے بازو اور مضبوط ہاتھ رکھتے ہیں

اس کا خیال ہے کہ چھڑی کا استعمال انسان کے عہدِ وحشت کی یادگار ہے جب اُسے سنگلاخ زمین پر کوہستانی صحراؤں میں چلنا پڑتا تھا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اب اس کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا استعمال انسان کو سہارا لینے کا عادی بنا دیتا ہے جو اعضا کے نشو و نما کے منافی ہے

شانتا ماہ ایم۔اے، سردار سوہن سنگھ بی اے، مفتون اڈیٹر ریاست، مدیر تیج مسٹر مکند بہاری لال نادم وغیرہ اس زمانہ میں اُردو کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں، فراق گورکھپوری کی ایک نظم " ترانہ خزاں " کے عنوان سے ایوان (آہ ! مرحوم) گورکھپور میں شایع ہوئی تھی اس کے متعلق زبان اُردو کے مسلمہ ادیب مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں،

" فراق نے جس نظر سے خزاں کو دیکھا ہے، اس نے خزاں کی ماہیت کو بدل دیا ہے، خزاں کے جو رموز فراق نے بیان کئے ہیں ان سے اُردو اور فارسی زبانیں محروم ہیں انگریزی میں البتہ شیلی، اور کیٹس کی نظمیں مجھے بے طرح یاد آرہی ہیں حالانکہ " ترانہ خزاں " ان دونوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے " (ایوان، بابت مارچ ۱۹۳۱ء)

جناب فراق گورکھپوری کا خاندان فارسی اور اردو کی خدمات کے لئے ممتاز رہا ہے، ایوان اشاعت سنے آپ کے بزرگ جناب منشی گورکھ پرشاد متخلص بہ عبرت کی ایک مثنوی "حسن فطرت " شایع کی تھی،

پیشوا کے " رسول نمبر " (بابت ۱۹۳۳ء) میں اکثر ہندو اہل قلم کی نظمیں و مقالے شایع ہوتے ہیں، ہمارے عہد میں ایک اور ہندو ادیب جمپت رائے جین ہیں، جو آجکل یورپ میں جین دھرم کی تبلیغ میں سرگرم ہیں، آپ انگریزی کے ایک مشہور مصنف ہیں، مذہبیات و فلسفہ، تاریخ و اساطیر سے آپ کو خاص شغف ہے، آپ نے انتہائی دریا دلی سے کام لے کر اپنی ہزاروں روپے کی کتابیں جین سدھانت بھون (آرہ) میں وقف کر دی ہیں، حال میں آپ نے " جواہرات اسلام " کے نام سے اُردو میں دو کتابیں لکھی ہیں، پہلی کتاب میں فارسی شعرا، خصوصاً رومی کے کلام سے اپنی جینی معتقدات کا موازنہ کیا ہے، اور اسلام کے صوفیانہ عناصر پر مفصل بحث کی ہے، دوسری کتاب میں اردو شعرا کے کلام کا اقتباس درج ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب کے اندر زبان کی بعض خامیاں ہیں لیکن عہد حاضر میں ہندو مسلمانوں کے جو تعلقات ہو رہے ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جین صاحب کی یہ کتاب ملک کے لئے " الہام " کا درجہ رکھتی ہے کاش ہمارے دوسرے وطنی بھائی بھی اسی بنیاد پر قومی عمارت استوار کریں،

عبدالمالک (آروی)

"زبانِ بے زبانی"

ہمارے فاضل دوست جناب اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ فسانہ روسی ادب جدید کے مشہور علمبردار بیبل کے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جس کا عنوان " درخت کے تاثرات " ہے

اردو میں افسانہ نویسی کا یہ انداز بالکل نئی چیز ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اختر حسین صاحب بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں

امید ہے کہ ناظرین نگار جذبات و تخیل کی اس فضا کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے، جو اس رنگ کے افسانہ نگاری کی اصل روح ہے (اڈیٹر)

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی !

نہ جانے کتنی مدت سے میں تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور بیقرار ! بے زبان اور نغمہ زن ! یاد نہیں کتنی مرتبہ کڑکتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کہاسہ کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں میں نے آسمان کی طرف اٹھائی ہیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے میں لاغر اندام ہو رہا ہوں۔ میرے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے میں بے پرواہ ہو گیا ہوں۔ میری پتیاں گر گئی ہیں۔ سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں۔ لیکن بہار ! اس کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل میں ہی ایک ایسی کشش ہے کہ میری ان بے حرکت رگوں میں نئی زندگی کی بجلی دوڑنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندوہگیں پشیمانی خون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے

بہار ! یہ لفظ کتنا سوگوار ہے اور کتنا جان سپار۔ جب حدِ نظر تک راتوں رات لاتعداد کنول کھل جاتے تھے اور میں اپنے آپ کو پھولوں کے ایک ناپیداکنار سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہان رنگ و بو میں سورج نئی شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس شان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی حلاوت رہ گئی ہے۔ پیمانۂ دل مسرت اور احسان سے چھلکنے لگتا تھا۔ لیکن اس احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ مسرت اس روحانی سوز کو دبا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے ساز پر ہمیشہ

در دکے ترانے الاپا کرتا ہے۔ حسن وجمال کی اس جولانگاہ میں بڑھاپا اپنی دزدیدہ نگاہیں ڈال کر یکایک مسکرا دیتا تھا اور میرے سکون واطمینان کو ایک کھٹک اڑائے جاتی تھی

تخیل تمناؤں کے آغوش میں پروان چڑھتا ہے۔ جب بڑھاپے کا خیال مجھے بے چین کرتا تو میں ایک جہانِ نو کی بنا ڈالتا ـــــ ایسا جہان جس میں برگد کی شاخوں میں بھی پھول لگتے ہیں، رنگا رنگ کے پھول، جن سے ٹہنیاں دلہن بن جائیں ایک شاخ میں یاسمین دوسری میں گلاب تیسری میں صنوبر ـــــ پستی سے لے کر بلندی تک میں گل بداماں ہوتا! آہ وہ تصور کتنا روح پرور تھا؟ لیکن عہدِ کہن کی ان داستانوں میں کیا رکھا ہے۔ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور یہ "امربیل" ـــــ لامحدود اور لازوال ـــــ پھلتی اور پھیلتی ہوئی یہ "امربیل" اب مجھ پر محیط ہو چکی ہے۔ میں عظیم الشان اور پُر وقار ہوں لیکن میری عظمت اور شوکت نے ہی مجھے اس چنچل "البیلی بیل" کے آگے بے بس کر دیا ہے۔ ایک دن یہ ننھی اور حقیر بیل میرے قدموں سے لپٹی رہتی تھی لیکن آج اس نے میرے جسم کو زنجیروں سے کس دیا ہے اور میری مغرور گردن کو خم کرنا چاہتی ہے

اس کی گرفت کتنی جانکاہ ہے ـــــ کتنی روح فرسا اور دردناک! تمنا کی طرح لادوا اور فراق کی طرح یاس انگیز، جو میرے ناتواں جسم کو پیس کر اس کی تازگی اور شگفتگی سلب کر لینا چاہتی ہے۔ اور میں ـــــ حرماں نصیب اور بدبخت "میں" ـــــ ماضی کی یاد میں اشکبار اور مستقبل سے خوف زدہ میں" ـــــ اس بے حقیقت بیل کی خواہش کے آگے مائل بہ خود سپردگی نظر آتا ہوں

تاہم گاہے گاہے محسوس ہوتا ہے کہ اس بیل کے مس میں کوئی مقناطیسی کشش ہے۔ جس طرح کسی باکمال کے رباب کی جھنکار خفتہ اور مُردہ راگوں کو زندہ کر دیتی ہے، جس طرح موت کی ہچکیاں بھرتے ہوئے بھی سراپا بہار کی رنگینیوں سے دوچار ہو کر دم بھر کے لئے جوان ہو جاتا ہے، جس طرح کسی رہزنِ عقل و ہوش کے شانوں پر سر رکھ کر زاہد خود فریب کی پسلیاں پھڑکنے لگتی ہیں ـــــ ہاں اسی طرح میرے تمام جسم میں، میری ٹہنیوں میں اور میری پتیوں میں، دل کی ایک ایک دھڑک اور نبض کی ایک ایک چپک میں اس کا مس ایک دلنوازبے دلی اور ایک دھندلی سی تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت دفعتاً میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری ٹہنیوں میں اتنی ہی لچک ہوتی جتنی اس "امربیل" میں ہے تو میں اس کی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیتا اور اس کے بوسہ کو پوری زندگی کی درازی عطا کرتا۔ لیکن الٰہی! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا کہ میں محبت حاصل کر سکتا ہوں واپس نہیں کر سکتا۔ دامِ عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں گرفتار نہیں کر سکتا۔ پریت کے گیت سمجھ سکتا ہوں گا نہیں سکتا

جب بادۂ عشق میں سرشار ہو کر جذباتِ دل کو عالم آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یکایک مجھے اپنی بے حسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور ارمانوں کے ہجوم پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے۔ میری بے تابی کا صرف ایک ثبوت ہے۔

پتیوں کی خاموش جنبش! ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوز نہانی کی سرگرم ہے۔ اُف اتنا تندو توانا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں

بہار، نسیم، گل و بلبل، آہ وزاری ——— رنگین خوابوں کا ایک میلہ! لیکن زندگی کی پت جھڑ میں بہار کی اُن محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی۔ اب میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں جہاں غنچے نہیں چٹختے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی ایسی کہ ان میں کیف و سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک رہ گئی ہے۔ اب بھی میرے اِردگرد بہاران میں زمین گل فروش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرطِ انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی بھر آتا ہے۔ لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ دریائے حسن کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لگاؤ محسوس کرتا ہوں گویا ستاروں سے مصروف گفتگو ہوں۔ جس محفل سے میں اُٹھ آیا اس میں شمول کی آرزو نہیں کرتا۔ میری تمامتر توجہات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہوتی ہے جس کا تخیل میرے ناسوروں کو ہرا بھرا رکھتا ہے ——— یہ بیل فنا پر حاوی اور ابد و بقا کی ندیم ہے۔ جب میں زمین کے دامن میں لیٹ جاؤں گا تو شاید وہ میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی۔ ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج اُبھرا تھا اور میں جوان تھا۔ میرے سڈول جسم میں مسرت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور رُوح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا۔ میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج نے سر نکالا۔ اس کی زرد کونپلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس و ناکام مرجھانے لگیں۔ ہاں، اس وقت اسے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے بچے کو گود میں لے کر باپ کو ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس کی باہنیں دل میں یہی جذبہ پیدا کرتی رہیں۔ لیکن چشم بد دور، رفتہ رفتہ وہ ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی اور اب اسے چھونے کے بعد وہ معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس میں ایک ایسا عجیب بانکپن پیدا ہو گیا جو میری آزادی پر پھندے ڈالنے لگا۔ جب کبھی کچھ سوچنا چاہتا تو اسی کی یاد آتی گو کہ اس یاد میں حیا بھی تھی اور تمنا بھی، غرض کے ساتھ اس پر مرمٹنے کی آرزو بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ۔ آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہونچ چکا ہوں۔ ان دنوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصویرِ حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، تمنا و اطمینان سے لبریز تھی۔

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سیندور اور چندن ملا کرتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سیندور کی ایک گہری لکیر کھینچ دیتیں۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی دوشیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے سیمیں بازوؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے آہنی تنے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبیں کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی شاید اس سے اس کے قلب حزیں کو کچھ قرار ہو آتا تھا

دنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حسینانِ عالم اس بیل کی صورت دامِ بلا میں گرفتار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھ پر

ان کے ناز و نیاز کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بدبخت میرے دامن کو تھام کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتی " دیوتا میری مراد کب بر آئے گی " تو میں بھی پسیج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلا کر کچھ کہنا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کہ میرے اشاروں کو وہ سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل و ثمر برگد نہ ہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا۔ کم از کم اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حسن کی وہ مورت مجھے چھوتی تو مرجھائے ہوئے پھول پھر کھل جاتے۔ اور اس کے قدموں پر اشکبار برس کر گویا میرا پیغام پہونچا دیتے ——— لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی

تاہم، ان کی قرابت میرے جسم میں تھرتھری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ میں از سر تا پا کانپنے نہ لگتا تھا۔ لیکن کبھی جب کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی کونپلوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ جمال باری سے دل ہی دل میں میں فریاد کرتا اس امید پر کہ وہ روح کی آواز کو پہچانتا ہے " یا رب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب و الم نصیب ہو " وہ بیچاری مجھے دیوتا مان کر پھولوں کی نذر چڑھاتی اور اسے میں بد دعا دیتا۔ محبت کے نشہ میں میں مدہوش تھا۔ حتیٰ کہ عقل و خرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبت ؟ کاشکہ میں جانتا ہوتا ! کاشکہ میں جانتا ہوتا !!

لیکن کیا سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا ؟ گو کہ یہ بیل آج میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا مس میرے لئے کتنا ولولہ انگیز ہے۔ محبت آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکس رخ دیکھتا ہے اور ایک بار چور چور ہو جانے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آئے گی ؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑ جاتا ہے۔ عشق وار پر وار سہتا ہے، پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اف نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خود دار اور غیور ہوتا ہے۔ صرف ایک جھڑکی اس کی شمع زندگی کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں استاد خل حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کشش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ بیکلی عشق کی پرتو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس

داستان محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ محبت سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ سب تشنہ تکمیل رہیں اور اس کا سزاوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے مجھے، اس " امر بیل " سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان اطہر تمنا والوں سے انصاف نہیں کیا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے ——— الساحق جو ناقابل بیان ہے ——— محروم کر دئے گئے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لیتے لگتی ہے تو آرزو ہوتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا۔ ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی، اپنی پرچھائیں

کوتاکتے تاکتے میں یوں بوڑھا نہ ہوجاتا۔ میری زندگی بھی رواں، دواں، اورجوان ہوتی تاکہ محبت کا اظہار کرسکتا اور اس طرح بے زبان و بیقرار نہ ہوتا!

لیکن کیا قلب انسانی میرے جذبات کا احساس نہیں کرسکتا؟ کیا انسان کی محبت اتنی مختلف ہے؟ کیا اس کی فریاد کی کوئی لے ہے؟ کیا اس کے نالوں میں کوئی لے ہے؟ کیا میرے جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ گہری سانس کافی نہیں جو طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی دنیا میں بھی محبت کا پھول اندھیرے میں کھلتا اور مرجھاتا نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی محبت کی انتہا یہ نہیں ہے کہ گفتگو کے لئے الفاظ نا کافی ہوں اور صرف سانسوں کا اتار چڑھاؤ جہان معنی میں ارتعاش پیدا کرسکے؟ کیا ان میں بھی تمنا کے بعد پشیمانی اور فریاد کے بعد شرمساری پیدا نہیں ہوتی؟ ندی کی طرح انسان ہمیشہ گردش میں ہے اور ہم پہاڑ کی طرح اچل ہیں۔ لیکن ہم اس سے کہیں زیادہ عمر دراز اور مستقل ہیں۔ انسان کی محبت ایک شمع ہے جو بجھنے کے لئے روشن ہوتی ہے۔ ہماری محبت کی مثال جگنو سے دی جاسکتی ہے جو تاعمر جلتا ہے اور بعداز مرگ بھی روشن رہتا ہے

ایک زمانہ گذرا۔ ان دنوں مجھے اس " امربیل " کی نازبرداری سے فرصت نہ تھی۔ اوّل اوّل اس کے بوسوں میں مجھے ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اس نئے جذبہ کے اسباب واثرات معلوم کرنے میں مَیں اتنا محو تھا کہ گردوپیش سے قطعاً بے نیاز ہوگیا تھا بھولے بھٹکے اپنے ماحول پر ایک آدھ نگاہ غلط انداز ڈال دیا کرتا تھا۔ میں جس واقعہ کا ذکر کررہا ہوں وہ روز پیش آتا تھا اور اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی میں بے خبر تھا۔ تاہم نادانستہ طور پر یہ حادثہ مجھ پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ اسے میں آج تک نہ بھول سکا

جو بُت میری قدم بوسی کررہا تھا، اس کی پوجا کے لئے صدہا عورتیں آتی تھیں۔ روز کوئی پُرانی پجارن غائب ہوجاتی اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی نئی حُسن کی دیوی آجاتی تھی۔ یہ نئی نویلی شرم کے بارسے دبی جاتی تھی۔ نرگسی آنکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں اور رُخ پرنور تار نقاب کے اندر بھی عرق عرق ہوجاتا تھا ——— مجھے بے جان سمجھ کروہ کبھی میرے جسم کا سہارا لیتی اور کبھی اپنے ناخونوں سے میرے تنے کو کُریدا کرتی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا اور میں گہری سانس کھینچ کر خاموش ہوجاتا کہ مُبادا وہ سہم نہ جائیں۔ ایک لمحہ کے بعد نقاب ان کے رُخ روشن کا پردہ دار بن جاتا، پھولوں کے ہاران کے بیدار جذبات کو تھپکیاں دیتے اور چھاگل کے گھونگرو ان پیروں کو چوم کر رقص کرنے لگتے تھے

اِن مہوشوں میں سے ایک کا وتیرہ سب سے جدا تھا۔ نگاہیں سمیٹے سب سے چھپ کر وہ میرے پاس آتی اور سر جھکا کر فوراً چلی جاتی تھی ——— اس خوف سے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ زیبائش سے وہ اتنا ہی دور تھی جتنا کہ چاند۔ نہ اسکی

جبیں پر "کم کم" ہوتا نہ بیروں میں چھاگل - اس کی سادگی سفید ساری سے یوں چھن چھن کر نکلتی تھی جیسے بنت البحر نے نہنگ آسا موجوں سے سر نکالا ہو یا دوشیزۂ صبح سفید بادلوں میں تیر رہی ہو - اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا - کبھی وہ صبح میں آتی کبھی دوپہر میں اور کبھی دونوں وقت ملے - جب وہ شام کو آتی تو اسی "امر بیل" کو تھام کر میری گھنی چھاؤں میں بیٹھ جاتی جب تک سورج شب کے محل میں آرام کرنے نہ چلا جاتا وہ اپنی پُرحسرت نگاہوں سے اس منزل ناتمام کو تاکا کرتی - لہرائی ہوئی پگڈنڈی کی خاک شفق کے پرتو سے لالہ گوں بن جاتی جیسے خونِ تمنا کی سرخی ابھر آئی ہو

ماضی ناکامیوں کا آماجگاہ اور مستقبل امیدوں کا آئینہ ہے - ماضی افسردگی کے قلم سے اس کے چہرہ پر ناکام آرزوؤں کے افسانے لکھا کرتا - جب اس کے سینہ سے گہری سانسیں نکلتیں تو میرے پتے بھی ضبط نہ کر سکتے اور پیہم چیخ اٹھتے تھے - کبھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور نہ اس نے کوئی دعا مانگی - ہاں گاہے گاہے وہیں بیٹھ کر وہ کچھ گن گناتی ضرور تھی لیکن ان نغموں کو میں نہ سمجھ سکتا تھا

پہلے تو میری توجہ اس کی طرف منعطف ہی نہیں ہوئی لیکن شام کے سناٹے میں جب وہ عموماً ادہر گذرنے لگی تو میری دلچسپی بھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی - سورج کے ڈھلتے ہی میں بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگتا اور اس کے آنے میں جتنی تاخیر ہوتی ہولِ دل اتنا ہی بڑھتا جاتا - مجھے یاد ہے کہ خلاف معمول ایک روز وہ نہ آئی تو میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا - دامن مغرب میں سورج نے منہ چھپا لیا، لیلائے شب نے نقاب سے سر نکالا، ستاروں کی انجمن منعقد ہوئی چاند کی کرنوں نے اپنا ساز چھیڑا، کہکشاں نے آسمان پر بجلیاں بکھیر دیں ——— پھر بھی وہ نہ آئی!

دو دن، تین دن، سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن وہ نہ آئی یہاں تک کہ میں نے اس کے انتظار سے منہ موڑا اور اپنے منتشر جذبات کا مخزن اسی باوفا "امر بیل" کو بنانے کی کوشش کرنے لگا

میں اسے بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ آ گئی ——— ایک ہیبت ناک خواب کی طرح - وہ دن بھی مجھے یاد رہیگا گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے - غضب کی سردی تھی - بادِ تند کے جھکولے کھا کھا کر "امر بیل" تھر تھرا رہی تھی - میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے کس پہلو میں جگہ دوں - یکایک دیکھا کہ اسی خاک آلود راستہ پر وہ تیزی سے چلی آ رہی ہے - لیکن وہ بدل چکی تھی - وہ جمال جہاں آرا بوئے گل کی طرح غائب ہو چکا تھا - چہرہ پر اتنی جھریاں تھیں گویا عمر رفتہ نے اپنی آستینوں کو چنا ہو آنکھوں میں حلقہ پڑ گئے تھے - ہونٹ سوکھ کر لٹک گئے تھے - جب میں نے دونوں تصویروں کا مقابلہ کیا تو وحشت سی ہونے لگی

الٰہی! حسن کو فنا ہے تو عشق کو لازوال کیوں بنایا؟ قریب آ کر نہ اسنے ہاتھ باندھے نہ سر جھکایا اور نہ اس بیل کا سہارا لیا - ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑی اور زار زار رونے لگی - آہ! میں اس کے گیت سننے کا آرزومند تھا - آنسوؤں کی زبان کو میں کیا سمجھ سکتا!

میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک ساری باندھے ہوئے ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے پیر خون میں رنگے ہوئے، ماجسم نازنیں خاک آلودہ، روتے روتے وہ کہنے لگی " دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا۔ انسانوں کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی۔ میں نے بیوفائی کی، احسان فراموشی کی ---- کس اُمید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامن عاطفت میں جگہ دوگے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لئے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد طیار نہیں۔ دیوتا! کیا تم میرے گناہوں کو درگذر کروگے "؟

اس کی فریاد میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاشکہ شبنم کے کچھ قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اُسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ اسی حال میں پڑی رہی۔ بعدازاں اس کا جسم یکبارگی لرزا اور پھر اینٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بڑبڑانے لگی " کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا؟ اور اس بچہ کو؟ ---- اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے ---- شائد مردوں کے لئے لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ ---- خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے ---- آہ میرا بچہ! میرا بچہ!! "

آسمان پر ستاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جگمگا تا رہ گیا۔ نسیم صبح کی خنکی تیز تر ہو گئی۔ شب کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی۔ اسی عالم سکون میں یکایک ایک روح فرسا چیخ اس کے سینہ سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ساری کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی۔ ایک ہچکی اور ایک چیخ ---- کتاب زندگی کی یہ تفسیر تھی وہ مر چکی تھی

جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے، بازو میں پھٹی ہوئی ساری پڑی تھی جس پر ایک بچہ کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا اور آس پاس کی مٹی پر ایک سُرخ تہہ پڑ گئی تھی

جذبہ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقانیت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب و غریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو، ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میرے تخیل کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ دو پایہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شقی القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے سینچی گئی ہیں جنھیں انسانیت نے محبت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں

بے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشات نفسانی پر ؟ وہ عورت بے گناہ تھی ۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا ۔ وہ مرد کی ناپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اُسے مجرم کیوں قرار دیا گیا ؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی ۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچہ نے کیا نقصان پہونچایا تھا ؟

انسان دراصل کس سے محبت کرتا ہے ——— اپنی خودی سے یا معشوق سے ؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں ! جو بھی ہو ، انسانیت کے دعویٰ محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں زندگی مسکرا رہی ہے

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت ایک گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکایک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی ——— اتنی طولانی زندگی یونہی برباد ہو رہی ہے ——— اس امر بیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پنہاں ہے ۔ ایک درد ہے میٹھا میٹھا ، ایک ٹیس ہے دلنواز ، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود ۔ بربادی کا یہ احساس ، زندگی کی یہ تمنا ، کسی تصور پر مرمٹنے کی یہ آرزو ، کسی دوسرے خیال کو دلنشین ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی ۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو قدرت کی لامحدودیت میں گم کر دوں ، کبھی نہ سوچوں کہ زندگی لاحاصل اور بے معنی ہے ، ایک مرتبہ از سر نو شباب پرور اور تازہ دم ہو جاؤں ۔ مگر کجا پیرانہ سال برگد کا ایک "ٹھونٹھ" اور کجا قدرت کا اٹل قانون ! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں ، چلنا چاہتا ہوں لیکن پیر نہیں ۔ آہ ! میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں ، ایسی محبت جو ہمیشہ حیات تازہ بخشے اور کبھی نہ مرجھائے ۔ لیکن میرا جمود مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے اور عشق کی بارگاہ پر جبیں سائی کا موقع نہیں دیتا ۔ یا تو میں اظہار محبت سے ہی قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مُہر سکوت لگا دیتی ہے

میرے ذہن میں کسی کی یاد کا دھندلا سا خیال رہ گیا ہے ۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے ۔ صرف ایک نقش ہے وہ بھی ناکام آرزوؤں کی راکھ میں دبا ہوا ۔ جس طرح کہر میں شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی شبنم کی بوندیں دکھلائی پڑتی ہیں اسی طرح وہ یاد بذات خود پس پردہ ہے اس کا ایک نقش باقی ہے ۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کی ہمہ گیری اور وسعت سے اسکا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یہ یاد نہیں آتا

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جس نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شائد لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے ۔ اب نہ وہ بت شرمندۂ پرستش ہوتا اور نہ میرا چبوترہ سجدہ گاہ قرار پاتا ۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گذرتا تو سہمی ہوئی نظر ڈال

سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے سایہ سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہو کر میری طرف پتھر پھینکتے اور بھوت بھوت کا شور مچایا کرتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت بھی اتنی ہی پا در ہوا ہے جتنی اس کی محبت ؟ زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگ آستاں اس گاؤں کا سنگ جبیں بنا ہوا تھا۔ حسینانِ عالم بصد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دُکھ درد کا مداوا مانگتے تھے گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کشا تھا۔ حالانکہ میں ان کے آلام کا سدباب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔ میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن مقام حیرت ہی کہ جیسے ہی اس دکھیاری نے میرے پاس آ کر اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر لیا تو گویا میری ساری وقعت بھی اس کے خون میں دُھل گئی۔ کیا ان تمناؤں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بو نہ تھی ؟ اس روز پتہ چلا کہ انسانیت کو دراصل کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس نے بھی مجھے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے۔ اب جو میں اس عالمگیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے ! عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں ؟ محبت ... روشنی ہے، عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے محبت اُمید ہے، عبادت نا اُمیدی میں اُمید کی تلاش ہے محبت دریا کی پُرسکون روانی ہے، عبادت تلاطم خیز سمندر میں ساحل کی تلاش ہے۔ میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے۔ میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے

'خزاں یہ کہتی تھی میں شوخیٔ بہاراں ہوں'

رفتہ رفتہ جنون وحشت کا یہ دَور گذر گیا اور میں از سر نو جوان ہونے لگا۔ میری کونپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کج ادائی آنے لگی۔ میرے برگشتہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تلک ہر شے موسیقیت کے نشہ میں متوالی ہو گئی ہے

شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔ اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملتے دیکھا تھا آج یہ کلنک کا ٹیکہ بھی مٹ گیا۔ عزت کا ستون ایک لمحہ میں مسمار ہو گیا تھا دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف و خطر میرے قریب آنے لگے۔ گو کہ وہ میری پوجا نہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لاپرواہی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ یا تو یہ تغافل تھا یا غرورِ حسن بہر کیف میں خوش ہوتا تھا کہ پسماندگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انھیں کچھ دیر سکون تو پہونچا سکا۔ اور

تو اور ننھی لڑکیاں بھی میرے ارد گرد ناچنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقص شرر تھی اور بس! آہ میرے ٹوٹے ہوئے مندر کی تعمیر از سرِ نو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہو گئی ہو اور لوگ اس سے سرائے کا کام لینے لگے ہوں

قسمت نے پھر پلٹا کھایا جب مشرق کی وادیوں سے دوشیزہ صبح آنکھیں ملتے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پپیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں۔ نسیم صبح کی جمال آرائیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرطِ انبساط میں لرزنے لگتے۔ کنول کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی۔ جب ساری دنیا بہ یک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو "وہ" آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں نیند کی ماتی کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں جب آفتاب کی گستاخ کرنوں کے بوسے اس کے رخساروں کو لالہ زار بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوتی۔ اس کی سج دھج بھی نرالی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے۔ یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا نرگسی اور ناگن لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں۔ اور اللہ رے دیدہ دلیری! اس کی نگاہیں کبھی نیچی نہ ہوتیں ہمیشہ سامنے کی طرف تاکتیں۔ ان میں جھجک کا نام نہ تھا ان میں ایک برق تجلی پنہاں تھی جو دیدارِ عام کی دعوت دے رہی تھی۔ شوخی اور جادو کی لاانتہا بجلیاں جو کینہ اور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری پابندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی جولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لبریز ہے میں سوچنے لگتا کہ ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور جاں نواز ہو اکثر وہ ادھر آتی اور گھنٹوں عالمِ تخیل میں مسرت کے طلسم گڑھا کرتی اور مجھے کبھی اس خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا۔ حیف جس چھوٹے دیوتا کی عبادت میں میں نے عمر گذار دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اس کی ہی پجارن تھی۔ دریائے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی کیا در حقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا کیا وہ تمناؤں اور حسرتوں کے بھنور سے نکل چکی تھی اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا

ایک روز اسی راستہ سے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا، اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے ——— اس نے پجارن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے اور وہ مسکرائی تھی ——— آہ وہ مسکراہٹ!

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کر کے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں۔ انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا اندازِ تکلم بھی بھول جاتا ہے۔ وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنھیں تم بے جان نہیں سمجھ سکتے۔ آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھک جاتی ہیں۔ کاشکہ میں جانتا ہوتا! کاشکہ میں جانتا ہوتا!

ایک عرصہ تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی نوجوان پہلے آتا۔ اور زیر لب کچھ گنگنایا کرتا۔ گو میں اس کی آواز نہ سن سکتا تھا لیکن اس کی خود فراموشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹہلنے لگتی اور کبھی کبھی اوس سے بھیگا ہوا ایک آدھ تنکا اٹھا کر اپنے دانتوں کو کریدنے لگتی

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔ وہ نور کے ترکے آئی اور دوپہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں، اس خلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔ عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تمکنت کی ضد تھی کہ ان کی بات رہے۔ آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس "امربیل" کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی دوپہر تک وہ بیٹھی رہی ـــــ لیکن وہ نہ آیا

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہوگئی۔ اب انتظار تھا اضطراب کا نام نہ تھا۔ انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی جاتے جاتے وہ کہنے لگی ـــــ مجھ سے یا اس "امربیل" سے، اپنے آپ سے یا کسی نامعلوم آدمی سے کہہ نہیں سکتا۔ وہ کہنے لگی "ٹھیک ہوا۔ اس محبت کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اگر فرض منصبی کو بھول کر راحت کی جستجو ہی محبت کا ماحصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر نہ کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے۔ اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔ محبت ضدین کی گود میں پھولتی پھلتی ہے ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی" وہ اٹھی اور چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرہ سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے میرے مشاہدات بھی ختم ہوگئے۔ سالہا سال جس سراب صحرا کی جستجو میں میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا "ورنہ ہماری محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی" جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشو و نما پاتا ہے روشنی آتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے۔ عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے۔ میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنۂ تکمیل رہ گئی ـــــ لیکن اس سے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ ادا کر دے گا

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازع ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقاء کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی، شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری طاقت تخریبی ہے۔ طوفان میں درختوں کو توڑ کر، برق بلا سے

خرمن کو جلا کر، آگ اور خون میں بربادی کے نشان چھوڑ کر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے - لگتا ہے کہ یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی - ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی ہے - شائد محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دنیا میں اکیلا ہوں - نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا - میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں، غمگسار اور ہمدم کہاں ہیں - ممکن ہے کہ پہاڑ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت نہ ہو - لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمنا دل کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا - تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے - میرے چاروں طرف قدرت ارتقا کی بلندیوں پر ہمدردی اور محبت کی سیڑھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تن تنہا بے چارگی کی حالت میں کھڑا یہ تماشا دیکھا کرتا ہوں

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں - یہ سچ ہے کہ میری تمام خواہشیں پوری نہیں ہوئیں - کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا - لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے - صدہا بار دنیا کو بہار کی رنگینیوں میں شرابور دیکھا ہے - ہزاروں آدمیوں نے میری قدمبوسی کی ہے اور بے شمار نازنینوں نے مجھے اپنا رازداں بنایا ہے - نہ معلوم کتنی مرتبہ اس " امر بیل " کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی، برسات کی سحر پروری، خزاں کی گرمی، اور ہوا کی تندی کا لطف بہ یک وقت نصیب ہوا ہے - اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آزادی کی مسرت حاصل کی ہے - صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ٹوکے دیا کرتی ہے —— وہ یہ کہ —— میں بے زبان رہ گیا! میری تمنا ایک معنی بے لفظ ہو کر رہ گئی - لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دنیا بے زبان ہے

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں - جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم نطق رکھا - مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دنیا کی " زبان بے زبانی " کا ایک خاموش تماشائی ہوں

اختر حسین (رائے پوری)

ضرورت ہے

نگار جنوری و جون و اگست ۴۱ء کے پرچوں کی - جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں ۔ منیجر نگار لکھنؤ

وحی کی حقیقت علمی نقطۂ نظر سے

(سلسلۂ ماسبق)

قرآن کی عبارت پر مروجہ بحور میں سے کسی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور نہ عروض کے اصول اس سے مطابقت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اور صرف اس لحاظ سے اس کا دعویٰ کہ یہ شاعر کا کلام نہیں بجا ہے۔ اور اسی لئے "شاعرٍ لامجنون" کہہ کر اس کی تردید کی گئی ہے کیونکہ عرب خواہ شاعر کی کتنی ہی قدر کرتے ہوں مگر اس کو پیغمبر یا ہادی سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے بنابریں ایک سوشل مصلح کے مقاصد کے خلاف ہوتا اگر اس کی تبلیغ کو شاعری پر محمول کیا جاتا۔ علاوہ بریں قرآن کا ایک معتدبہ حصہ نثر ہے اور بعض مقامات پر فن خطابت کی سی تکمیل پائی جاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے لیکن یہ خیال کہ رسول اللہ کے معاصرین کا ان کے کلام کو سنکر کہہ اٹھنا کہ " یہ انسان کا کلام نہیں " اس امر پر شاہد ہے کہ اس وقت کے لوگ اسے واقعی خدا کا کلام سمجھتے تھے درست نہیں، کیونکہ اس قسم کے فقرے انتہائے تحسین کے لئے اس وقت بھی بولے جاتے تھے اور اب بھی اکثر زبانوں میں مستعمل ہیں (مثلاً سورہ قمر و سورۂ رحمٰن)

ایک خطیب یا شاعر کی تصور آرائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محاکات اور استعاروں میں ہمیشہ مسلمات علمی سے کام لیتا ہے۔ اور اشیا کے معانی میں وسعت پیدا کرنا یا اُن کے اطلاق کا دائرہ بڑھانا۔ اس کے حیطۂ عمل سے خارج ہے۔ مثلاً قرآن میں آسمان، زمین، ستارے، عرش و کرسی، رعد و برق، حور و قصور وغیرہ بار بار استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کے معانی میں پیشتر کی نسبت کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آسمان کو ذات البروج کہنا بطلیموسی نظام اور اس زمانہ کے علم ہیئت کے مطابق خطیبانہ انداز بیان ہے، آسمانوں کا ٹوٹنا پھٹنا۔ ستاروں کی بے ربط حرکت و جوش و طیور کا اضطراب وغیرہ یہ سب موجودات عالم پر شخصی تخیل کا عمل ہے۔

والسماء ذات البروج والیوم الموعود وشاهد و مشهود

ان تین جملوں میں مشترک بات صرف وزن اور قوافی ہیں ورنہ بروج والے آسمان اور وعدہ کئے ہوئے روز اور گواہ و امر واقعہ میں کافی تاویل کے بعد مناسبت قائم کی جاسکتی ہے لیکن ذہن سامع پر خدا کی قدرت، روزِ حشر

اور حساب وکتاب کا اثر جیسا ان بلیغ کنایوں سے پڑتا ہے وہ مخفی نہیں۔ قرآن میں ہر ہر موقع پر کوشش کی گئی ہے کہ کلام کو خدا کا کلام اور کتاب کو " تنزیل من رب العلمین " باور کرایا جائے۔ اور ایک مصلح یہی تدبیر اختیار کر سکتا تھا

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ معقولی براہین سے قرآن کے بعض دعاوی اس کے اعلیٰ ماخذ کا پتہ دیتے ہیں یا نہیں ظاہر ہے کہ ایک مستند بیان کو اپنی تفصیل میں قدرت کے عام اور مسلم قاعدوں کے منافی نہ ہونا چاہئے ورنہ عینی محسوسی شہادت کے مقابل میں ہم مجبوراً اس بیان سے روگردانی کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اُس مشہور معاہدہ پر تبصرہ کریں گے جو ارواح اور اُن کے رب کے مابین ابتدائے تخلیق میں ہوا تھا۔ اور جس کی بنا پر بنی نوع آدم پر ایک قسم کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ خدا کو جتنی روحیں پیدا کرنی مقصود تھیں اُن کو حاضر کر کے سوال کیا کہ 'کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں جس کے جواب میں تمام ارواح نے متفق اللسان ہو کر اقرار کیا ' ہاں ' یہاں یہ امر واضح نہیں ہے کہ ارواح سے صرف انسانی ارواح مراد ہیں یا جمیع حیوانات ومخلوقات کی اس لئے کہ رب تو سب کا ہے۔ بالفرض صرف بنی آدم مُراد تھے تو کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل گرفت نہیں ہوتا۔ جب تک معاہدہ ثبات ہوش اور اختیار بالذات نہ رکھتا ہو۔ ہوش وحواس کا ثبات جسم پر منحصر ہے ـــــ اور یہ صورت اُس وقت متشکل نہ تھی۔ علاوہ اس کے ارواح اگر وہی ہیں جنھوں نے معاہدہ کیا تھا تو تسلسل فی الذات ہونا چاہئے تھا اور اس صورت میں ناممکن ہے کہ اتنا اہم معاملہ سب نے فراموش کر دیا ہو اور اگر ارواح کا تشخص وہی نہیں ہے تو معاملہ ساقط ہو جاتا ہے

اسی طرح انسان کا خلیفہ بنایا جانا ، آدم کا قصہ ، سلیمان کی قدرت ، جانوروں کی باتیں موسیٰ کی تکلیم عیسیٰ کی ولادت وغیرہ توضیح طلب ہیں۔ ان کا بیشتر مواد بنی اسرائیل کی کتابوں اور دینی روایات سے ماخوذ ہے۔ جن کی صداقت خود معرض بحث ہے

رہا یہ سوال کہ دوسروں نے ایسا کیوں نہ کر لیا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر امر ایک وقت خاص اور ایک عامل مخصوص کے لئے موقوف رہتا ہے۔ واقعات وحوادث رفتہ رفتہ ماحول کو اس طرح ترتیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ مظاہرہ اس خاص وقت میں اُس خاص ایجنٹ کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر ہر فرد کا ہر فعل اپنی نوعیت کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ ہے جو ماحول کے زیر اثر سرزد ہوتا رہتا ہے

مثالاً ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جیمس واٹ کا بخاری قوت اور متحرک انجن کا دریافت کرنا۔ اٹھارہویں صدی میں برنگھم کے اندر کیونکر واقع ہوا۔ کیوں نہ سرزمین ہند پر اکبر کے زمانہ میں خانخاناں نے اسے دریافت کر لیا یا زید، عمر، بکر نے ایران۔ آسٹریا یا لندن میں کیوں نہ جان لیا۔ لیکن یہ سوال لغو ہو گا کیونکہ زمانہ کا اقتضا اور جیمس واٹ کا ماحول اکبر کے عہد سے بالکل علٰحدہ چیز تھا۔ اگر واٹ نے بخاری انجن دریافت کر لیا تو اس کے اسباب بھی موجود تھے ـــــ

انیسویں صدی کے رُجحانات جیمس کی ابتدائی تربیت اس کا کوئلہ کی کان میں کام کرنا۔ حرکت کی مختلف شکلوں کا حسب اتفاق اس کی نظر میں ہونا۔ کوئلہ کے تاجروں کو بر سروقت ایسی کسی قوت کی تلاش ہونا۔ تجارتی سرگرمی کا آغاز۔ نوآبادیات اور مقبوضات میں منفعت کے مواقع۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کی خواہش۔ صنعتی کارخانوں کے لئے متحرک قوت کی مانگ یہ سب باتیں اس انکشاف کے قدرتی اسباب میں شامل ہیں۔ اسی طرح چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے حالات متقضی تھے کہ ایک شخص اس شان کا، اس اخلاقی شخصیت کا۔ اس ذہنی سرمایہ کا نمودار ہو۔ جس کو سیاسی بے نظمی سے اس طرح کی مدد ملے، قبائلی خانہ جنگی اس طرح معاونت کرے اور مکہ کی مرکزیت کا یہ اثر ہو۔ رہا یہ امر کہ اس وقت یا اس کے بعد ایسا کلام کیوں نہ ظاہر ہوا۔ اس کے وجوہ بھی ظاہر ہیں۔ جب قرآن کی حکومت عربی بولنے والی اقوام پر مستحکم ہوگئی تو اُن کی دماغی اور عملی سرگرمیاں دوسری طرف منتقل ہوگئیں۔ اور شاعری کی مسلسل تردید جو مصلحتاً کی گئی تھی۔ اس کی بنا پر تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں کسی شاعر کو عروج نہ ہوا اور جب بالآخر بنوامیہ کے اخیر عہد اور ابتدائے عباسی خلافت میں شعرگو پیدا ہوئے تو وہ اسلامی روایات و عقائد میں رنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اس خیال کا موئد بلکہ شدید حامی تھا کہ قرآن جیسا کلام بشر کے امکان سے باہر ہے۔ اور کسی کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوسکتی تھی اور اگر جرأت کرتا تو بیدریغ پیس دیا جاتا۔

عیسیٰ ابن مریم کے ولادتی معمہ پر قرآن کا اتفاق بانی اسلام کی ابتدائی مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے۔ نبوت کے ابتدائی زمانہ یعنی دوران قیام مکہ میں محمد (صلعم) یقیناً اپنی تبلیغی سرگرمی کو مسیحی مشن کا تسلسل سمجھتے تھے یا کم از کم اہل کتاب کی ہمدردی کے متوقع تھے اور اپنے مشن (دلبعثت) کو ابراہیم و اسمٰعیل۔ موسیٰ و عیسیٰ کی تائید میں ہونیکا اعلان کرتے رہے کیونکہ اس نظام سے خود کو منسوب کرنا گویا مروجہ تاریخی مواد کو اپنی حمایت کے لئے صرف کرتا تھا۔ عرب خواہ بت پرستی کے اسفل ترین مدارج میں ہوں لیکن اپنے اجداد کے نام پر فدا تھے اور اپنے طریقوں کو اُن سے منسوب کرنے پر مصر تھے لہٰذا ایک مصلح کے لئے ضرور تھا کہ وہ اسی تاریخی روایتی زمین پر اپنی بساط تلقین پھیلائے۔ چنانچہ ابتدائی مکی سورتوں میں صرف کافروں اور مشرکوں کی مذمت کرتا۔ اور اہل کتاب سے استنداد اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ بعد کو عیسائی اور یہودی اس قدر مخالفت کریں گے تو اخوت کا یہ مظاہرہ کبھی نہ کیا جاتا مگر مشکل یہ تھی کہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا مواد ایسا تھا جو عرب میں اصنام پرستی کے بالمقابل تسلیم کئے جانے کا امکان رکھتا تھا۔ بودھ اور زرتشتی خیالات سے لوگ قطعاً ناآشنا تھے۔ لہٰذا ایرانی و ہندی زمین پر کوئی عمارت بنانا محال تھا الغرض اسلام اسرائیلی مذاہب کا نئے حالات کی روشنی میں ترمیم شدہ چربہ تھا چنانچہ خود قرآن میں جا بجا یہی ظاہر کیا گیا ہے مثلاً نزل علیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس۔ اسی طرح ملت ابراہیم حنیف کی متابعت کا یقین دلانا ان ہی تمدنی رجحانات کو اپنی حمایت

جہنم

(بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۳۳ء)

دوسرا سین — "کانفرنس"

بعلزبول نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ اس کے زور سے جہنمی کوہ آتش فشاں کی دیواریں پھٹنے لگیں اور ان میں سے پگھلے ہوئے سونے کے چشمے اُبلنے لگے۔ اسی سونے سے خود بخود ایک عظیم الشان محل تیار ہو گیا۔ یہ شیطانی کانفرنس کا محل باغ عدن کے برابر لمبا اور باغ فردوس کے برابر چوڑا تھا

پھر اس نے دوسرا منتر پڑھا تو آگ کے سمندر میں سے ہیرے، یاقوت، اور زمرد کے ترشے ہوئے گولے فواروں کی طرح اُڑنے لگے اور اُسی محل میں بعلزبول کے اشارہ سے خود بخود پیوست ہوتے چلے گئے۔ انہی موتیوں سے اس سونے کے محل کی آرائش ہو گئی

بعلزبول کو آسمان پر معمار اعظم کا لقب حاصل تھا۔ جنت کی تمام بہترین عمارتیں اسی کے دماغ کی اختراع اور اسی کی صناعی کا نتیجہ ہیں۔ جب خداوند عالم کے حکم سے اس معمار اعظم نے عرش معلیٰ کے بُراق گنبد اور مینار نئے طریقہ پر بنائے تو اسے اپنی کاریگری پر بڑا گھمنڈ ہو گیا۔ اور سمجھنے لگا کہ ہیچو من دیگرے نیست۔ اور یہ نہ سمجھا کہ مجھ میں جو کچھ بھی طاقت ہے اسی پروردگار کی دی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند عالم نے اس پر لعنت کی اور دوسرے شیطانوں کے ساتھ اُسے بھی جہنم میں ڈھکیل دیا

جب کانفرنس کے لئے سونے کا شاندار محل تیار ہو چکا تو بعلزبول نے محل کے اندر عرش کے نمونہ کا ایک تخت بنایا جس پر ستر ہزار یاقوتی کرسیاں نصب کیں اور بیچوں بیچ ابلیس کے لئے ایک ہیرے کا معلق شہ نشین قایم کیا

جلسہ شروع ہوا۔ کرسیوں پر وہی شیاطین بیٹھے جنھیں آسمان پر معزز القاب حاصل تھے۔ باقی ماندہ شیطانوں نے اپنا جسم چھوٹا کرکے ننھے ننھے جگنوؤں کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ اور تخت کے چاروں طرف پرے باندھے ہوئے جگمگانے لگے۔ جگنوؤں کی کثرت سے سارا محل نورانی ہو گیا

ابلیس معلق شہ نشین پر جلوہ افروز ہوا اور یوں کہنے لگا :—

" اے علم و دانش کے خداوندو ! آزادی کے دیوتاؤ ! حریت کے پرستارو ! معظم و مکرم و محترم فرشتو ! سنو یہ سنہ نشین اور یہ تخت جس پر میں جلوہ آرا ہوں جنت کی راحتوں اور عرش کی رفعتوں کا تخت نہیں ہے۔ مصیبتوں اور بے چینیوں کا تخت ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں ہے کانٹوں کا ڈھیر ہے۔ اس تخت پر جو سب سے اونچا ہے عرش والے دیوتا کے نزدیک وہی سب سے نیچا ہے۔ جو سب سے بلند ہے وہی سب سے پست ہے۔ مگر یہ بلندی و پستی محض ایک دھوکا ہے، فریب ہے، واہمہ ہے۔ سودا ہے، جنون ہے، بطلان حق و ابطال حقیقت ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہم درجہ و ہم رتبہ۔ یہاں نہ کوئی عزیز ہے نہ ذلیل۔ نہ اونچا نہ نیچا۔ نہ بلند نہ پست۔ البتہ ہم آسمانی مخلوق سے ستر ہزار درجہ بلند ہیں یہ اس لئے کہ ہم آزاد ہیں۔ اور آسمانی مخلوق ہم سے ستر ہزار درجہ پست ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ غلام ہے"

میں تمہارا وقت خیالی بحثوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ نئی جنگ کی تیاری کریں اور اس کے طریقوں پر غور کریں۔ جو شخص جو کچھ بھی مشورہ دے سکے کھڑا ہو جائے اور ہدایت کی روشنی پھیلائے "

البیعال کی تقریر

ابلیس کے بیٹھتے ہی البیعال کھڑا ہو گیا۔ پست ہمت، حیلہ جو، مفسد، فریبی، دغاباز، دور اندیش، زیرک، ذہین، فتنہ۔ وہ زور سے چلانے لگا :-

" خداوند ابلیس ! علیک العزت والاکرام۔ و خداوندانِ جہنم۔ میں تمہیں آسمانی اعزاز کے القاب سے نہیں پکاروں گا۔ میری نظر میں تمام آسمانی القاب گرد و غبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ تم آج سے خداوندانِ جہنم ہو، خداوندانِ سقر، خداوندانِ سعیر، اور تم میں وہی سب سے زیادہ عزت و اکرام کا مستحق ہے جو عرش والے خداوند جنت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ سب سے بڑا باغی ہے۔ سب سے بڑا سرکش ہے !

" خداوندانِ سعیر ! میں تمہیں عرش والے دیوتا سے کھلی جنگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ اب تک ہمارا بند بند آسمانی کوڑوں کی ضرب سے دکھ رہا ہے اور اب تک ہمارے حواس پراگندہ ہیں۔ لہٰذا حالات حاضرہ میں علانیہ جنگ کی تیاری ہمارے حق میں مضر ہو گی۔ کیا عجب ہے کہ عرش والا دیوتا ہمیں ذلت کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنمی جھیل کے گندوں میں باندھ دے۔ اور ہم اتنی بھی رہی سہی آزادی کھو بیٹھیں "

" میرا مشورہ یہ ہے کہ مکر و فریب سے آگے بڑھنا چاہیئے اور مکر و فریب سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ عرش والا دیوتا بھی خیر الماکرین ہے۔ اور اس کا مکر بھی مکر اکبار رہا ہے۔ مگر ہمارے مکر و شر کے آگے اس کا مکر ٹھہر نہیں سکتا۔ اسی مکر و شر کی قوت سے ہم آسمان کی ایک تہائی فوجوں کو اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ باقی دو تہائی فوجیں بھی اسی قوت سے ہمارے ساتھ آجائیں گی بشرطیکہ ہم مکر کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں اور دور اندیشی سے قدم بڑھائیں

" جب آسمان کی ساری فوجیں ہمارے قبضہ میں آجائیں گی تو خداوند عرش اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر اعراف کی برفانی

چوٹیوں پر چلا جائے گا - اور خداوند ابلیس کو اپنی گدی پر تخت نشین کرے گا

(زور کی تالیاں بجیں)

" یہ بات یقینی ہے اور ایسا ضرور ہوگا - ہم آسمان کے تمام فرشتوں کو عقل و حکمت اور فریب و دجل کے زور سے اپنا ساتھی بنالیں گے اور زمانہ شاہد ہے کہ فریب و دجل کا کوئی توڑ نہیں ، یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں - بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا "

ملوخ کی تعتریر

البیعال کے بیٹھتے ہی ملوخ کھڑا ہوگیا - دلیر - غصہ ور - غضب ناک - جنگ جو - پر رعب - خوفناک - کوتاہ فہم - عاقبت نااندیش - لسان - طرار - چلانے لگا :-

" لڑائی - جنگ - کھلی لڑائی - کھلی جنگ

" خداوند ابلیس و خداوندان کرام - ملائکہ عظام - شہزادگان والاتبار - فرمانروایان گردوں وقار - جنگ - کھلی تیز اور علانیہ جنگ - لڑائی - تیر و تفنگ کی لڑائی - گرز و شمشیر و تیغ و سناں کی لڑائی

گرائے گا سرِ عرش جھنڈا ہمارا ۔ بجے گا زمانہ میں ڈنکا ہمارا
ہلادیں گے جنت کو نعرے ہمارے ۔ الٹ دے گا دوزخ کو تیغا ہمارا
فرشتوں کے سردار و سالار ہیں ہم ۔ خداوند ابلیس آقا ہمارا
ہماری دلیری کے سکے جمے ہیں ۔ دو عالم میں ہے بول بالا ہمارا
قدم دمبدم بجلیاں چومتی ہیں ۔ قیامت ہے نقشِ کفِ پا ہمارا
گرایا سرِ عرش روح الامیں کو ۔ کوئی آ کے دیکھے کلیجا ہمارا
جہنم کے دیوار و در کانپتے ہیں ۔ کہ اب معرکہ ہے خدا کا ہمارا
ڈرو عرش والو کہ پھر ہورہا ہے ۔ تمہاری طرف آج دھاوا ہمارا

زور کا کڑکا ہوا - سونے کے محل کی چھت شق ہوگئی - زلزلہ آگیا - آسمانوں کے پردے اٹھ گئے - عرش بے نقاب ہوگیا - تمام شیطانوں کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں

تیسرا سین ۔۔ خداوند عالم کا دربار

عرش

عرش معلی کے قلعہ میں تمام ملائکہ کرام و کروبیان عظام جمع ہیں - اور ابلیس کی فوجوں پر فتح مبین کی خوشیاں منائی جا

ہیں۔ پیارے پیارے غلمان شراب طہور کی ننھی ننھی پیالیاں ہاتھوں میں لئے ساقی بنے ہوئے فرشتوں کو پلا رہے ہیں۔ حوریں حمد کا ترانہ گا رہی ہیں :۔

حمد

الٰہی مالک ہے تو سبھوں کا زمیں بھی تیری زماں بھی تیرا
ملک بھی تیرے فلک بھی تیرے مکیں بھی تیرے مکاں بھی تیرا

متاعِ حسن عیاں بھی تیری طلسمِ عشق نہاں بھی تیرا
نمود صبح و مسا بھی تیری شہود سود و زیاں بھی تیرا

تجھی سے ہے خیر و شر ہویدا بدی تجھی سے تجھی سے نیکی
عذابِ نارِ سقر بھی تیرا ثواب باغ جناں بھی تیرا

تجھی سے تاروں میں ہے یہ گردش تجھی سے قائم ہے عرش و کرسی
ظہور شمس و قمر بھی تیرا رواق ہفت آسماں بھی تیرا

ترے ہی در کے سبھی گداہیں میں کے اوپر فلک کے نیچے
رئیس ذی عز و شاں بھی تیرے گدائے بے خانماں بھی تیرا

تجھی سے جنت میں روشنی ہے تجھی سے دوزخ میں ہے اندھیرا
ترا ہی جلوہ چہار سو ہے یہاں بھی تیرا وہاں بھی تیرا

رحیم بھی تو کریم بھی تو ازل بھی تیرا ابد بھی تیرا
فنا بھی تیری بقا بھی تیری جنیں بھی تیرا جناں بھی تیرا

خودی بھی تو ہے خدا بھی تو ہے بھلا بھی تیرا برا بھی تیرا
چھپا بھی تو ہے کھلا بھی تو ہے عیاں بھی تیرا نہاں بھی تیرا

قلعہ کے بیچوں بیچ خداوند عالم کا گول تخت ہے۔ تخت کے چاروں طرف سبز زمردی پردے پڑے ہیں جن کے اندر سے رحمت و نور کی شعاعیں چھن چھن کر یوں نکل رہی ہیں جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور اسی نور ایزدی کے پرتو سے کروڑوں میل تک عرش کا حصار بقعہ نور بن گیا ہے

تخت کے نیچے شاندار کرسیوں پر تین جلیل القدر سپہ سالار جلوہ افروز ہیں۔ میکائیل۔ اسرافیل۔ جبرائیل

تخت کی غلام گردش میں ستر ہزار طاق ہیں۔ ہر طاق میں ستر ہزار فرشتے سربسجود سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحان ربی العظیم کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ کروڑوں پدموں فرشتے قیام میں دست بستہ کھڑے ہیں اور انوار الٰہی کی کرنوں سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے ہوئے حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ نعم المولیٰ ونعم النصیر کا ورد کر رہے ہیں

جب شراباً طہوراً کے جام سب چھوٹے بڑے ملاحظہ فرما چکے تو رقص و سرود بند ہوا اور جبرائیل کے توسط سے خداوند عالم نے ملائکہ کو خطاب کر کے فرمایا :۔

" میرے فرماں بردار بندو۔ فرماں بردار فرشتو۔ تم پر بار بار میری رحمت ہو۔ اور ابلیس لعین پہ میری لعنت ہو "

" تم سب گواہ رہو کہ قیامت کے دن ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا منہ کالا ہوگا اور انھیں بڑا درد دینے والا عذاب دیا جائے گا۔ اور تم سب نیک بندوں کا منہ روشن ہوگا اور انھیں جنت میں مزے مزے کی نعمتیں دی جائیں گی

" میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ دور بہت دور جنت کے ایک کونے میں میری ایک مخلوق ہے جسے آدم کہتے ہیں۔ اس مخلوق کو میرے سیدھے راستہ سے بہکا کر اپنے ٹیڑھے راستہ پر لے جانے کے لئے شیطان الرجیم اپنی ذریات سے مشورہ کرنے والا ہے۔ پس تم گواہ رہو کہ اگر ابلیس لعین یعنی شیطان الرجیم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں اپنے بیٹے یسوع کو اس مخلوق کے درمیان اتاروں گا تاکہ وہ آدم کو ہدایت دے اور اس کے شرمناک گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ جو میرے بیٹے پر ایمان لائے گا اس کے سب گناہ بخش دئے جائیں گے۔ اور اسے مرنے کے بعد فردوس میں تمھارے ساتھ جگہ دی جائے گی اور جو یسوع پر ایمان نہیں لائے گا اور اُسے میرا بیٹا نہیں جانے گا اور اس کا کلمہ نہیں پڑھے گا اور ابلیس لعین کے راستہ پر لگ جائے گا اُس کی سب نیکیاں اکارت جائیں گی اور اس کا وہی حشر ہوگا جو ابلیس لعین کا حشر ہونے والا ہے

" پس اے میرے فرماں بردار فرشتو! تم سب میرے فرمان کے گواہ رہو۔ قسم ہے مجھے میری بزرگی کی اور جبرئیل کے سر کی کہ میں اپنا وعدہ پورا کرکے رہوں گا چاہے ابلیس اور اس کی ناپاک ذریات کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو"

" اے میرے نیک فرمانبردار فرشتو! تم سب دن رات میری حمد و ثنا کرتے رہو تاکہ تم پر میری رحمتیں زیادہ ہوں اور تم کو میری پاک ذات کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہوسکے۔ تم میں جو کوئی زیادہ عبادت گذار ہے میرے نزدیک وہی زیادہ بلند رتبہ والا ہے۔ والسّلام "

ایک زوروں کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دی۔ اور معاً تخت پاک غائب ہوگیا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ تمام فرشتے جو سرو قد ہاتھ باندھے کھڑے تھے یکبارگی سجدے میں گر پڑے اور خداوند عالم کی تسبیح پڑھنے لگے

جبرئیل نے انگلی کے ایک اشارہ سے ستر ہزار سورج پیدا کئے اور نئے سرسے عرش معلّی کے قلعہ کو منور کردیا تمام فرشتے چاندی کی مرصع کرسیوں پر ڈٹ گئے اور باضابطہ ملائکہ کی مجلس شوریٰ گرم ہوئی۔ میکائیل صدارت کے یاقوتی تخت پر رونق افروز ہوئے۔ اُن کے داہنے ہاتھ کی جانب اسرافیل اور بائیں ہاتھ کی سمت جبرئیل سنہرے لباس میں جلوہ فرما ہوگئے

میکائیل ——— حضرات۔ میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس ناچیز حقیر کو اپنے گرانقدر جلسہ کا صدر منتخب کیا۔ حضرات۔ آج کا دن بڑا ہی مبارک دن ہے۔ آج کے دن خداوند عالم کی مدد سے ہماری فوجوں کو نافرمان باغیوں پر فتح حاصل ہوئی اس لئے میں صدارت کے تخت سے خداوند عالم عزّ اسمہٗ کے شکریہ کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ صرف اس کی پاک ذات تمام شکریوں کی مستحق ہے

(چاروں طرف سے آمین آمین کی صدائیں بلند ہوئیں)

میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لٹکا دئے جائیں

(اور ایسا ہوگیا ۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب دوسری تجویز جناب اسرافیل پیش کریں گے

اسرافیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام ۔ خداوند عالم عزاسمہٗ کے فرمان سے آپ حضرات کو معلوم ہوگیا ہے ۔ کہ خداوند عالم اپنے بیٹے خداوند یسوع کو آدم کی ہدایت کے لئے دور دراز جنت کے کسی مقام پر بھیجنے والے ہیں ۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جس روز خداوند یسوع اس مخلوق کے درمیان مبعوث ہوں اس روز ہم سب پھر اسی عرش معلیٰ کے قلعہ میں جمع ہوں اور خوشیاں منائیں

(چاروں طرف سے آمین آمین کی پر زور صدائیں بلند ہوئیں)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر نصب کر دئیے جائیں

(اور ایسا ہوگیا ۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب تیسری تجویز عالی جناب جبرئیل پیش فرمائیں گے

جبرئیل ——— معزز صدر و حاضرین کرام ۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ ابلیس کے لشکر کو زک دینے کے لئے ہم سب کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں ۔ اور کروروں برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ اب خداوند عالم عزاسمہٗ کی مدد سے ہمیں اُس پر پوری کامیابی ہوگئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا ۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم لوگ ہر تسبیح سے پہلے ایک دفعہ ابلیس پر ضرور لعنت کر لیا کریں اور اس کے شر سے پناہ مانگا کریں

(چاروں طرف سے آمین آمین کا شور بلند ہوا)

میکائیل ——— میں حکم دیتا ہوں کہ اس تجویز کے مقدس الفاظ بھی نور کے حرفوں میں لکھ کر لوح محفوظ پر لگا دئیے جائیں

(اور ایسا ہوگیا ۔ لوح محفوظ پر یہ الفاظ جگمگانے لگے)

اب جلسہ برخواست کیا جاتا ہے

عزرائیل ——— حضور میں بھی ایک ضروری تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں

میکائیل ——— اب کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی ۔ خداوند عالم عزاسمہٗ کی طرف سے صرف تین تجویزوں کی اجازت ملی ہے

(دفعتاً تمام فرشتے غائب ہوگئے اور قصر عرش خالی ہوگیا)

آسمانوں کے پردے گر گئے۔ جہنم کے دروازے بند ہو گئے۔ سونے کے محل کی چھت جڑ گئی۔ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں ہنوز اوپر کی طرف جمی ہوئی ہیں۔ سکتہ کا عالم ہے

ابلیس ——— ہوشیار ہو جاؤ۔ اے محترم شہزادو ہوشیار ہو جاؤ۔ تم نے یہ آسمانی کھیل دیکھا! یہ دلفریب تماشا دیکھا، یہ تماشا صرف اس لئے دکھایا گیا ہے کہ تم جنت کے عیش و عشرت کی لالچ میں آکر بہک جاؤ اور غلامی کے سنہرے طوق گلے میں ڈال لو۔ مگر نہیں ہماری مقتدر جماعت کا ایک فرد بھی بھٹک نہیں سکتا۔ بہک نہیں سکتا۔ ہمیں آگ کی زنجیریں پہننا قبول ہیں مگر غلامی کا تاج منظور نہیں

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

محترم شہزادو۔ اب مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ خود آسمانی روشنی کے پردے ہم پر کھل چکے ہیں۔ اور آدم کا راز فاش ہو گیا ہے

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

میں خوب جانتا ہوں کہ آدم عرش والے دیوتا کی عزیز ترین مخلوق ہے اور اسی مخلوق میں وہ اپنا بیٹا مبعوث کرنے والا ہے۔ مگر قسم ہے تمھارے سربلند سروں کی کہ میں اس مخلوق کو چٹکیوں میں باغی کر دوں گا۔ اور اس کے ایک ایک فرد کو سرکشی اور نخوت کا داعی بنا دوں گا بلکہ خود یسوع کو بھی اس کے باپ کے خلاف کھڑا کر دوں گا۔ اور کل ہی تم دیکھو گے کہ یسوع کے ہاتھ میں بغاوت کا جھنڈا اور آزادی کی تلوار ہے

(زور کی تالیاں بجیں)

آدم۔ محض ایک مجہول العقل ہستی ہے۔ نجس مٹی کی بنی ہوئی۔ نجس پانی کی افتاد۔ خود ستا و خود پرست۔ طامع و حریص۔ مغرور و متکبر۔ ذلیل و پست

عالم کیف ہے دانائے رموز کم ہے

خیر اب بتاؤ۔ کون ہے جو جنت میں آدم سے ملنے جائے گا۔ اور اسے خدا کے خلاف باغی کر دے گا"

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جہنم کے بند دروازے کیونکر کھل سکتے تھے۔ جہنم سے باہر نکلنا محال تھا۔ شیاطین ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ابلیس نے کہا:۔

"میں خود جاؤں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سمندر کی غواصی میرا کام ہے۔ میں اکیلا جاؤں گا تن تنہا۔ اور بہت جلد تمھارے پاس واپس آجاؤں گا۔ اور تمھیں اپنی معلومات سے بہرہ اندوز اور اپنی کارروائیوں سے آگاہ کروں گا ——— جلسہ برخواست"

(پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا سین - جہنم کا دروازہ

ابلیس جہنم کی ناری فضا میں اُڑتا ہوا اُس مقام پر پہنچا جو جہنم اور آسمان کے مابین واقع ہے - وہاں دروازہ پر اُس نے ایک عجیب حیوان دیکھا جس کے دس سینگ اور سات سر تھے - اُس کے سینگوں پر دس تاج اور سروں پر سات کفر کے نام لکھے ہوئے تھے اس کا منہ ببر کا سا تھا اور پاؤں ریچھ کے سے اور سینہ تیندوے کا سا اور دھڑ اژدھے کا سا - اس کی بچھوؤں کی سی ایک سو دُمیں تھیں - اور ان میں ڈنک بھی تھے - وہ حیوان ابلیس کو دیکھ کر کڑک کر بولا :-

" خبردار - نابکار - ذرا آگے بڑھا اور مَیں تجھے سموچا نگل گیا - خبردار . . . . "

اُس حیوان کے پیچھے ایک عورت نظر آئی جو آفتاب کو اوڑھے ہوئے تھی - اور چاند اُس کے پاؤں کے نیچے تھا - اور بارہ ستاروں کا تاج اُس کے سر پر تھا - وہ ہمہ وقت حاملہ اور بچہ جننے کی تکلیف میں رہتی تھی - یہ عورت اُس حیوان کی بیوی تھی - ہر روز اس کے پیٹ سے دو بڑے بڑے کتّے کے پلے پیدا ہوتے - جنھیں وہ حیوان فوراً کھا جاتا تھا - کسی دن اگر اُس عورت کے بچے پیدا نہ ہوتے تو حیوان اُسے بہت تکلیف دیتا اور کہتا :-

" جلدی بچے جن - نہیں تو میں تجھی کو سموچا کھا جاؤں گا "

وہ عورت دراصل حیوان کی ماں تھی مگر اُس نے اُسے زبردستی بیوی بنا رکھا تھا - دونوں میں خوب اَن بَن رہتی اور اسی ان بن میں دونوں خوش تھے

حیوان کی کڑک سنتے ہی عورت اپنے غار سے باہر نکل آئی اور ابلیس کو پہچان کر اپنے خاوند پر لپکی :-

" سجدہ کر - مُردار - سجدہ کر - یہ ہمارے آقا خداوند ابلیس خداوند جہنم ہیں "

حیوان ڈرا اور جھٹ سجدہ میں گر پڑا - عورت بھی سجدہ میں جھک گئی - دونوں ابلیس کی تسبیح و تحمید کرنے لگے - ابلیس نے بلند آواز سے کہا :-

" اے بدنصیب دربانو ! تمھیں آسمانی دیوتاؤں نے بدترین عذاب میں پھنسا رکھا ہے - تمھاری لعنت بدترین لعنت ہے - افسوس تم اپنی غلامی میں خوش ہو اور اپنی بدکاری کو عیش و عشرت سمجھے ہوئے ہو اور جہنم کی ذلیل دربانی پر فخر کرتے ہو

اے بدنصیب حیوانو ! جاگو ! ہوش میں آؤ - اور تیار رہو - عنقریب میں اُس عرش والے دیوتا سے جنگ کرنے والا ہوں جس نے تمھیں نجس اور ناپاک ٹھہرا کر جہنم کی نگرانی کا ذمہ دار بنایا ہے

اے بدنصیب حیوانو ! میں بہت جلد تمھیں اس مکروہ غلامی سے نجات دلاؤں گا - مگر تم بھی اپنے فرائض میں غفلت نہ کرنا - جب ہمارے لشکر جنگ کا بگل بجائیں - تم بھی کھڑے ہو جانا اور ہمارا ساتھ دینا - غنیم کی فوجوں کی کثرت سے نہ ڈرنا

میں تمہارے ساتھ ہوں - اور تمہاری کامیابی یقینی ہے

عورت ——— خداوندتم سچ کہتے ہو - ہم تمہارے حکم کے بندے ہیں اور تمہارے حکم کو خدا کا فرمان جانتے ہیں

ابلیس ——— میں باہر جاتا ہوں - دروازہ کھول دو

عورت نے اپنے سر کے سورج میں سے ایک آتشین نیزہ لیا اور اپنے خاوند کا پیٹ پھاڑ کر اُس کی آنتوں میں سے جہنمی کنجی نکالی اور ابلیس کو دیدی - ابلیس نے اُسی خون آلود کنجی سے باب لعنت کا پھاٹک کھولا اور جہنم سے باہر نکل آیا اور یہ جاوہ جا غائب ہوگیا

ابلیس آسمانوں سے گزرتا ہوا کرۂ آفتاب پر پہونچا - وہاں سے اُس نے باغ عدن کا پتہ لگایا جہاں آدم اور اس کی بیوی حوا رہتی تھی - وہ ہر مقام پر خداوند عالم کے خلاف زہر اگلتا گیا اور بہت سی ہستیوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے خلاف بھکانے میں کامیاب ہوگیا - اور آخر کار باغ عدن میں پہنچ گیا

پانچواں سین ——— باغ عدن

عدن ہو بہو ابلیس کے پُرانے مسکن باغ فردوس کا نمونہ تھا - وہاں کے دلفریب مناظر، پھولوں کی روشیں، مرمر کے فوارے، زبرجد کے محل، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض، شراب طہور کی بوتلیں، رنگ رنگ کے پرند، طرح طرح کے جانور، اور صبح و شام کی رنگینیاں دیکھ کر ابلیس کا دل بھر آیا

اس نے چاہا کہ توبہ کرلوں اور پھر فردوس میں جاکر آرام و راحت کی زندگی بسر کروں - مگر پھر اُسے اپنی فوجوں کا خیال آیا جو جہنم میں سڑ رہی تھیں - اور اس کا ارادہ پلٹا - اس نے کہا

نہیں نہیں - میں اپنی عالی حوصلہ ذریات سے غداری نہیں کروں گا - یہ جنت کا عیش و عشرت کم‌ ظرفوں اور بدبختوں کے لئے ہے - میں کسی بزرگ تر ہستی کا دامن پکڑ کر جنت میں داخل نہیں ہوں گا - یہ میرے لئے ننگ و عار ہے

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

میرے لئے تلواروں کی چھاؤں اور بجلیوں کی بوچھار میں جنتوں کی راحتیں ہیں

دکھادوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانہ نے
مرا ہر داغ دل اک سرو ہے بخم وچراغاں کا

وہ مسلسل اپنے تیز چاندی کے پروں سے اُترتا رہا یہاں تک کہ آدم کے موتی محل میں جا پہونچا۔ آدم اور حوّا آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاموش سنتا رہا

آدم ——— سب تعریف اللہ عزّ اسمہٗ کے لئے ہے۔ آج تم اُداس کیوں ہو ؟

حوّا ——— میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ اللہ عز اسمہٗ اپنا فضل کرے۔ آج باغ کی ہوا کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے

آدم ——— خوب یاد آیا۔ ابھی وادیٔ ایمن میں جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور انھوں نے اللہ عزّ اسمہٗ کی طرف سے خبر دی ہے کہ ابلیس لعین یعنی ایک راندہ ہوا فرشتہ بغیر اجازت کے باغ عدن میں داخل ہو گیا ہے اور عنقریب ہم دونوں کو بہکانے والا ہے۔ لہذا اللہ عز اسمہٗ نے ہدایت کی ہے کہ ابلیس لعین کے دھوکے میں نہ آئیں اور شجر ممنوع جو علم و روشنی کا درخت ہے اس سے ہمیشہ دور رہیں۔ کیونکہ اس درخت کا پھل کھانے سے ہم پر اللہ عز اسمہٗ کا غضب نازل ہوگا

حوا ——— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ ہم لوگ ہرگز خداوند عالم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور ابلیس کے بہکانے میں نہیں آئیں گے

حوّا گہرے سوچ میں پڑ گئی اور بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آدم باہر چلا گیا۔ ابلیس موقع پاکر اندر داخل ہوا۔ اور خواب میں حوا پر ظاہر ہوا

ابلیس ——— اے جنت کی رہنے والی۔ تو کیوں غفلت کی نیند میں پڑی ہے۔ کیا تو نے شجر علم کا پھل نہیں کھایا جو تیری غفلت کو دُور کر دے گا۔ اور تیری آنکھوں سے یک قلم جہل و نادانی کے پردے اٹھا دے گا

حوا ——— سب تعریف اللہ عز اسمہٗ کے لئے ہے۔ میں شجر علم کا پھل ہرگز نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ اللہ عز اسمہٗ نے وہ پھل چکھنے کی ممانعت کی ہے۔ اور میں اللہ عز اسمہٗ کی نافرمان نہیں ہوں۔ آج ہی جبرئیل علیہ السلام نے خداوند عالم کے حکم کی تجدید کی ہے۔ میں اُس پھل کے قریب نہیں جاؤں گی

ابلیس ——— اے نادان عورت۔ اے علم و دانش کے نور سے بے بہرہ نازنین۔ میں تجھے اور تیرے خاوند کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم دونوں سخت دھوکے میں ہو۔ تو جب تک علم کے درخت کا پھل نہیں کھائے گی تجھے کیونکر معلوم ہوگا کہ تیرا دوست کون ہے اور دشمن کون۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ نادان عورت۔ علم ہی وہ نعمت ہے۔ جو کرۂ عالم کی تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ خود جبرئیل بھی اس جنتی پھل کی لذت سے بے نصیب ہے۔ وہ بھلا تجھے اور تیرے خاوند کو کیا نیک مشورہ دے سکتا ہے۔ میں البتہ علم کے درخت کا پھل کھاتا ہوں اور تمام فرشتوں کا استاد ہوں۔ میرا لقب معلم الملکوت ہے۔ میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ ضرور علم درخت کا میوہ کھا یا کر اور اپنے خاوند کو کھلایا کر

حوا ــــــ تیرا کیا نام ہے ؟
ابلیس ــــــ ابلیس
حوا ــــــ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ معاً حوا کی آنکھ کھل گئی اور ابلیس اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا

عدن کا ایک اور منظر

ابلیس حوا کے محل سے کوئی سو قدم پر گیا ہوگا کہ سامنے سے جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے

جبرئیل ــــــ تو یہاں کیوں آیا ؟
ابلیس ــــــ تاکہ تیری کوتاہ فہمیوں کا پردہ فاش کر دوں
جبرئیل ــــــ تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ؟
ابلیس ــــــ اجازت - میرے لئے کسی کی اجازت ضروری نہیں - اجازت تو صرف تیرے جیسے غلام رذیلوں کے لئے ہے - میں خود اپنی اجازت سے آیا ہوں
جبرئیل ــــــ اچھا - تو اب فوراً چلا جا - ورنہ تجھے دردناک سزا دوں گا

ابلیس نے اپنا بے پناہ نیزہ اٹھایا اور قریب تھا کہ جبرئیل کے سینہ میں اتار دے کہ اُس کا ہاتھ خود بخود شل ہو گیا - دوسرے ہاتھ سے اُس نے تلوار اٹھانا چاہی - مگر وہ ہاتھ بھی معطل ہو چکا تھا - اُس کے سارے بدن پر فالج گر گیا -

جبرئیل نے اپنا عصا زور سے ابلیس کے سر پر مارا - اور وہ شہاب ثاقب کی طرح لڑھکتا اور ٹھنیاں کھاتا ہوا باغ عدن سے نیچے گرا - اور ساتوں آسمانوں سے ہوتا ہوا - ایک لق و دق مقام پر پہونچا جسے زمین کہتے ہیں

اس مقام پر آدم و حوا بھی موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں علم و دانش کے دو روشن پھل تھے - دونوں شرمانے لگے کیونکہ بالکل ننگے تھے - اور رونے لگے کہ اپنی خطا پر نادم تھے اور ڈرنے لگے کہ خدا کا غضب قریب تھا

ابلیس ــــــ اے نادان انسانو ! - نہ ڈرو - نہ روؤ اور نہ شرماؤ - میں تمھارے ساتھ ہوں اور تمھارے ساتھ رہوں گا - کیا ہی مُبارک ہیں وہ ہستیاں جو علم و دانش کا پھل ہاتھوں میں لئے ہیں

دفعتاً آسمان پھٹ گیا - بجلیاں چمکیں - ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق پڑ گیا - اور وہ ایک رینگتا ہوا سانپ بنگیا اُس کی ذریات بھی اسی زمین پر آگئی - اور ساری زمین پر تاریکی چھاگئی

محمد اسحاق (امرتسری)

ملکۂ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

اور

علی قلی استجلو کے قتل کا راز

"قوم و ملک کی تاریخ ، گذشتہ واقعات کا آئینہ ہوا کرتی ہے ، اور تاریخ کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے ، کہ آنیوالی نسلیں گذشتہ دور کے صحیح و مستند واقعات سے باخبر ہوں ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں ، کہ زیادہ تر تاریخیں کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جاتی ہیں ، جب صورت حال یہ ہو ، تو پھر کس طرح امید کی جاسکتی ہے ، کہ تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات درج ہیں ۔ وہ واقعتاً صحیح بھی ہیں یا نہیں ۔ اس بیسویں صدی میں مہذب قومیں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس کا دعوی کرتی ہیں کہ انھوں نے فن تاریخ کو اتنی ترقی دیدی ہے کہ مُردہ قومیں آج زندہ ہو گئی ہیں ۔

لیکن آج ، جب کوئی انگریز اسلام کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے قلم کا سارا زور اس میں صرف ہوتا ہے ، کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ۔ اسلام کے ماننے والے تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں ۔ اور بانی مذہب (صلعم) کی شان میں اپنی ساری ہذیان گوئی دیکھ اس ختم کر دیتا ہے ، اُس کی ساری تحقیق صرف اس لئے ہوتی ہے ، کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل و خوار دیکھیں

اسی طرح جب کوئی مسلمان یا ہندو ، ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے ، تو وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی ، یا "تاریخ دانی" اسی میں سمجھتا ہے ، کہ وہ ایسے واقعات ایک جا کر دے ، جس سے خواہ مخواہ کا بھی آپس میں بغض و عناد پیدا ہوئے ۔ جب کوئی ہندو عالمگیر ، محمد تغلق ، محمود ، میر قاسم کے حالات پڑھتا ہے ، اور یہ معلوم کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ہندوؤں ، اور ان کے مذہب پر ، کس کس طرح کا ظلم کیا ہے ، تو رواداری سے روادار ہندو ، کا دل بھی دُکھ جاتا ہے ۔ اسی طرح جب کوئی مسلمان ، سیواجی اور دوسرے ہندوؤں کے حالات پڑھتا ہے ، تو اس کی "اسلامی رگوں" میں بھی خون دوڑنے لگتا ہے

ظاہر ہے، جب اس قسم کی تاریخیں ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جائیں گی، تو ملک کی فضا کا حال کیا ہوگا؟ یہ ایک نہایت اہم اور ضروری سوال ہے، جس پر ہمیں نہایت غور و فکر کے ساتھ تھوڑی دیر سوچنا چاہئے۔ ان دنوں میرے پیش نظر، رومیش دت سی، آئی، ای (Romesh Dutt C. I. E.) کی تاریخ (India under British Rule) ہے، رومیش بابو نے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے، کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی تجارت، وصنعت وحرفت کو برباد کیا ہے۔ میرے خیال میں، بالکل اسی طرح انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی مسخ کر ڈالا ہے۔ اسکول و کالج کے غریب لڑکوں کو، درسی کتابوں کے انبار سے اتنی فرصت کہاں رہتی ہے، کہ وہ ہر تاریخی واقعہ کی تحقیق کریں، کہ آیا یہ صحیح ہے یا غلط،

آج ہندوستان کی ذہنیت جو اس قدر خراب و پست ہے، ایک قوم دوسری سے دست و گریباں ہے، ایک کو ایک پر اعتماد و بھروسہ نہیں ہے، بلاشبہ اس کی سب سے بڑی وجہ "ہندوستان کی غلط تاریخ" ہے، ہم ان غلط تاریخوں میں صرف یہی نہیں پڑھتے ہیں، کہ ہندو یا مسلمان حکمراں متعصب و تنگ نظر تھا، بلکہ عیاش، نااہل و بزدل تھا۔ اس میں حکمرانی کی ذرا صلاحیت نہ تھی۔ اُس کا سارا وقت شراب وکباب، ناچ وگانے، میں صرف ہوتا تھا۔ پھر ان مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی، کہ وہ عنان حکومت کو سنبھالتا

میں نے تمہید میں بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ میرا اصل موضوع شہنشاہ جہانگیر و ملکہ نورجہاں کے صحیح حالات کی تحقیق ہے۔ انگریز مؤرخوں نے جہانگیر کے متعلق وہ سب کچھ لکھ ڈالا ہے، جو ایک عیاش و بزدل، ناکارہ و نااہل، حکمراں کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اور "حکمراں مؤرخ" کی پیروی ہمارے ہندوستانی مؤرخوں نے بھی نہایت فراخ دلی سے کی ہے۔ ان کے مؤرخانہ دل و دماغ نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنا گوارہ نہ کیا کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، اُس کا کتنا حصہ صحیح ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جب انگریز انگلستان کی تاریخ لکھتا ہے، تو اُسے اپنے حکمراں کی کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، اور اگر واقعتاً کچھ ہوتی بھی ہے، تو اُس کو نہایت خوش اسلوبی سے نباہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا اہم مقصد یہ ہوتا ہے، کہ وہ اپنی قوم و ملک کی تاریخ، بہترین نقش و نگار کے ساتھ پیش کرے، اُس کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ اُس کے حکمراں کی سیرت نوجوانوں کے لئے (Ideal) کا کام دے۔ لیکن اگر کبھی غریب جہانگیر کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ:۔

"میں نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بخشدی، مجھے ایک سیر شراب اور نیم سیر گوشت کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے"

تو صرف اتنی سی بات پر، مؤرخوں کا قطعی فیصلہ ہو گیا، کہ جہانگیر شرابی اور عیاش تھا، اس کو امور سلطنت سے کسی قسم کا کوئی واسطہ اور لگاؤ نہ تھا۔ جو کچھ کرتی تھی وہ نورجہاں۔ سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں تھی، وہ جسے اور جس طرح چاہتی تھی موڑتی تھی

جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے، اوس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے، کہ ہماری تاریخیں کس روشنی میں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جارہی ہیں۔ اُس کا اثر ہم پر کیا ہوا ہے، اور آئے دن ہو رہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی فضا مسموم ہو گئی ہے، ہماری ذہنیت خراب ہو گئی ہے۔ دل و دماغ معطل و ماؤف ہو گئے۔ صحیح و غلط واقعات کی تمیز جاتی رہی ہے آپس میں نفرت و حقارت کے جذبات بھڑک اٹھے ہیں

بہرکیف جہانگیر و نورجہاں کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ اور یہ تمام کی تمام کہانیاں انگریز مورخوں کی خود ساختہ ہیں۔ میں اپنے اس مضمون میں حسب ذیل واقعات سے بحث کروں گا

(۱) جہانگیر و نورجہاں سے ملاقات کس طرح ہوئی،

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کو محض اس لئے قتل کرایا تاکہ وہ نورجہاں کو حاصل کر سکے،

(۳) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی اور امور سلطنت کی ساری ذمہ داری نورجہاں پر تھی جہانگیر کا صرف ایک مشغلہ ناچ و رنگ و شراب و کباب تھا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے چھوٹے بڑے واقعات ہیں جن سے اس مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے گی اور یہ بتلایا جائے گا کہ خود مؤرخین کے بیانات کس قدر غیر مربوط ہیں "

قبل اس کے کہ شیر افگن کے قتل، یا نورجہاں کے اثر و اقتدار کے متعلق کچھ کہا جائے، سب سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیئے۔ کہ جہانگیر کی یہ فریفتگی کب سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی تاریخیں بھی میری نظر سے گذری ہیں۔ تقریباً ہر ایک نے اس کو ایک نئے واقعہ سے شروع کیا ہے

منوچی لکھتا ہے کہ ایک روز جہانگیر ٹہل رہا تھا۔ اس کی نظر ایک نہایت سجی سجائی خوب صورت کشتی پر پڑتی ہے۔ اوس میں.... ایک حسین و جمیل عورت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اوس سے ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ فوراً حکم دیتا ہے کہ لوگ بہترین تحائف لے کر کشتی میں جائیں، اور شاہزادے کی طرف سے اوس کو محل میں آنے کی دعوت دیں۔ مہر النساء جہانگیر کے تحفہ کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیتی ہے، کہ اوس کا شوہر زندہ ہے، اور اسے فخر ہے کہ حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ ملازم ہے اس کی زندگی میں اوس کا ایسا کرنا (یعنی شاہزادے کی طرف سے کسی تحفہ کا قبول کرنا، یا اس کی دعوت پر محل میں آنا) کسی طرح جائز نہیں سمجھتی، اور نیز وہ اوس کو بُرا سمجھتی ہے [1]

اس فاضل مؤرخ نے صرف یہی نہیں کیا ہے، کہ اوس نے سلیم کو اوباشوں اور بدمعاشوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، بلکہ اوس نے مہر النساء کی عصمت کو بھی داغدار بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ مہر النساء ایک معمولی درجہ کی عورت تھی، اوس کے پاس تحفہ تحائف نہایت آسانی سے پہونچ سکتے تھے

---

[1] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ۱۱۵

بدترین سے بدترین کریکٹر کے انسان سے بھی یہ جرأت ناممکن ہے کہ وہ اس طرح یک بیک کسی شریف عورت سے سلسلہ جنبانی شروع کر دے۔ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی کہ سلیم شرابی تھا عیاش تھا کیا کوئی باوجود ان تمام برائیوں کے ایک منٹ کے لئے بھی یقین کرے گا کہ سلیم نے ایک شریف عورت کے ساتھ، جس کو وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا، یا اگر جانتا ہوگا، تو دیکھا نہ تھا۔ ایسی ہمت کرے گا ہ

اسی سلسلہ میں فاضل مؤرخ کا ایک جملہ نہایت قابل غور ہے آپ فرماتے ہیں :۔

"میرا شوہر زندہ ہے، اور دربار میں ایک ادنیٰ ملازم ہے، اس کی زندگی میں ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں سمجھتی"۔ [1]

اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے، کہ اگر شیر افگن مر جائے، یا مار ڈالا جائے، تو مہرالنساء ہر طرح حاضر ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے بادشاہ فوراً شیر افگن کو لکھتا ہے، کہ وہ حکم نامہ پاتے ہی صوبہ دار سے ملے، اور صوبہ دار کو لکھ دیا جاتا ہے کہ جب شیر افگن تمہارے پاس آئے، تو اس کو قتل کر دو۔ شیر افگن قتل ہوتا ہے، لیکن اپنے ساتھ بہتوں کو قتل کرنے کے بعد

جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے، اوس کی پوری پوری تصدیق منوچی کے اُن سطور سے ہو جاتی ہے، اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے کہ شیر افگن کا قتل مہرالنسار کی ایماء سے ہوا

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ قتل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ؟ قاتل کون ہے ؟ جہانگیر یا مہرالنساء ؟

فاضل مؤرخ کی تاریخ دانی ابھی ختم نہیں ہوتی ہے، لکھتا ہے کہ شیر افگن کے قتل کے بعد، مہرالنساء سلیم کے حضور میں پیش کی جاتی ہے، لیکن مہرالنسار کی برہمی کا یہ حال تھا، کہ شادی بیاہ تو کجا اوس نے جہانگیر سے باتیں کرنے سے بھی قطعی انکار کر دیا، اس طرح مہرالنساء کی خفگی میں ایک سال گذر جاتا ہے، سلیم چھپ چھپ کر اوس کے پاس جاتا ہے، لیکن اوس کی رسائی نہیں ہوتی! آخر ایک سال بعد چند شرائط کے ساتھ نکاح کے لئے راضی ہوتی ہے

شرائط :۔

(۱) بادشاہ کی تمام بیویوں پر اوس کو فوقیت حاصل ہو،

(۲) اس کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے،

(۳) اوس کے بھائی اور دوسرے قرابت دار حکومت میں اعلےٰ عہدوں کے حقدار تصور کئے جائیں،

جب شیر افگن کا قتل خود مہرالنساء کی منشا اور ایماء کے مطابق ہوا تھا، تو پھر اس رنج و غصہ کے کیا معنی ؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ مہرالنسار کا مکر اور اس کی عیاری تھی، تو پھر آخر اس کی ضرورت ؟

[1] تاریخ مغلیہ از منوچی صفحہ ،، ا

جب ایک سلطنت سے دوسری سلطنت میں شادی ہوتی ہے، یا ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جب اس قسم کا کوئی رشتہ ہوتا ہے، تو بعض سیاسی مصالح کے لحاظ سے ایک دوسرے کی شرطیں منظور کرتے ہیں، لیکن یہاں کیا تھا؟ ایک شہنشاہ ایک معمولی عورت سے شادی کرتا ہے۔ پہلی شرط کہ اوسے تمام بیبیوں پر فوقیت حاصل ہو، حالانکہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نورجہاں حسن و جمال میں سب میں ممتاز تھی، اگر یہ تمام واقعات صحیح ہیں، تو جہانگیر تو خود ہی مہرالنساء کا دیوانہ و فریفتہ تھا۔ وہ بلا کسی عہد و پیماں کے بھی اوس کو اوروں سے زیادہ محبوب رکھتا

دوسری شرط یہ تھی کہ مہرالنساء کا باپ اعتمادالدولہ بنایا جائے، حالانکہ وہ جہانگیر و مہرالنساء کے اس جدید رشتہ سے پہلے ہی اعتمادالدولہ کے خطاب سے ملقب ہوچکتا ہے [۱] ظاہر ہے یہ دوسری شرط بھی کتنی مہمل بلکہ غلط ہے اور یہ تمام "شرائط" کس قدر لغو اور مضحکہ خیز ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مؤرخ نورجہاں کو جہانگیر کا سب سے زیادہ محبوب و منظور نظر دیکھ کر، اور غیاث بیگ کے اس طرح اعتماد کو دربار میں دیکھ کر، اور نیز آصف خاں کے اثر و اقتدار کو دیکھ کر، اوس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ کسی شرط ہی کے ماتحت ہوا ہوگا۔ اور ظاہر ہے یہ شرط نورجہاں نے اپنی شادی کے وقت جہانگیر سے کی ہوگی! یہ ہے ہمارے "فلسفی مؤرخ" کی جدت دماغ! کہاں سے کہاں جاکر کڑی ملاتا ہے!

مرزا غیاث بیگ اعتمادالدولہ کے متعلق پروفیسر بینی پرشاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

یہ فرض کر لینا نہایت سخت غلطی ہوگی غیاث بیگ اپنی بیٹی (نورجہاں) کے ہاتھوں میں کھلونا تھی۔ اوس کے سالہا سال کے تجربات اس کا ذوق سلیم اوس کی صلاحیت و قابلیت ان تمام چیزوں نے مل کر اوسکو دربارشاہی کا ایک نہایت اہم رکن بنا دیا تھا [۲]

آصف خاں کے متعلق پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:-

وہ ایک زبردست محاسب تھا اور امور سلطنت کا بہترین سلیقہ رکھتا تھا [۳]

باپ اور بیٹے کے باوجود ان گوناگوں خوبیوں کے جہانگیر پر یہ الزام کس طرح عائد ہوسکتا ہے۔ کہ اوس نے صرف نورجہاں کی خاطر یا متوجی کے خود ساختہ شرائط کے ڈر سے ان لوگوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں سے سرفراز کیا؟ اس وقت تک متوجی کے متعلق جو کچھ کہا گیا اوس سے نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے "مورخین" کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ڈو (Dow) ایک مزے کی بات لکھتا ہے کہ:-

سلیم ایک روز غیاث بیگ کے یہاں دعوت میں گیا ہوا تھا۔ آخر میں جب سب لوگ رخصت ہوگئے اور صرف چند مخصوص مہمان باقی رہ گئے (جن میں ایک سلیم بھی تھا)، تو غیاث بیگ نے مہرالنساء کو

---

[۱] اقبالنامہ جہانگیری صفحہ ۳۷ [۲] ایضاً صفحہ ۱۸۸ [۳] ایضاً صفحہ ۱۸۹

جو فن موسیقی میں یکتا تھی، بلایا، مہرالنساء نے خوب خوب اپنا ہنر دکھلایا، اور کچھ اس طرح پُر نازی اور رنگائی " کہ اوروں کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوا۔ سلیم پر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سحر کر دیا ہے۔ وہ خود رفتہ اور مبہوت ہو رہا تھا، پہروں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ رہا ہے۔ مہرالنساء اور سلیم کی " محبت " یہیں سے شروع ہوتی ہے

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوس زمانہ میں ایسا دستور تھا کہ شریف زادیاں آج کل کے یورپ کی شریف زادیوں کی طرح عیش ونشاط کی محفلوں میں آکر گایا اور ناچا کرتی تھیں ؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اوس وقت شریف گھرانوں میں موسیقی کا چرچا ہو ظاہر ہے شریف لڑکیاں گانا یا ناچنا نہیں سکھائی جاتی تھیں۔ تو پھر یہ سوال کیا جاسکتا ہے۔ کہ آخر اس فاضل مورخ نے یہ لکھا کس طرح معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سلیم غیاث بیگ کے یہاں اکثر جایا کرتا ہوگا۔ اس طرح اس کو کبھی مہرالنساء کو دیکھ لینے کا موقع مل گیا ہوگا رنچی (Ritchie) لکھتا ہے :-

قبل اس کے کہ نورجہاں اپنے باپ (غیاث بیگ) کا تعارف سلیم سے کرائے وہ خود اپنی ذاتی قابلیت و لیاقت سے اکبر کے دربار میں عزت و وقار کی جگہ حاصل کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ خود سلیم اوس کے یہاں مدعو ہو کر جایا کرتا تھا [1]

اب بالکل واضح ہو گیا کہ سلیم اکثر و بیشتر غیاث بیگ کے یہاں مہمان بنکر جایا کرتا تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ اوس نے آتے جاتے ہوئے کبھی مہرالنساء کو دیکھ لیا ہو اور یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے

مہرالنساء اور سلیم کی ملاقات کے متعلق جو سب سے زیادہ مشہور روایت ہے وہ یہ کہ مہرالنساء اپنی ماں کے ساتھ اکثر محل میں آیا کرتی تھی اس طرح سلیم کو اکثر اس کے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع مل جاتا تھا [2]

اس قسم کی ملاقات کا واقعہ انارکلی کے متعلق بھی مشہور ہے، اور انارکلی کی موت کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر نے خود سلیم اور انارکلی کو اشاروں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور سلیم اور انارکلی کی اس گستاخی کو وہ برداشت نہ کر سکا اور فوراً انارکلی کے سنگسار کا حکم دے دیا

درحقیقت اس قسم کے واقعات شاہی حرم کو بدنام کرنے کے لئے مورخین نے گڑھے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شاہزادے ایسے بدکار اور بداطوار ہوا کرتے تھے کہ شریف بہو بیٹیوں کا شاہی محل میں آنا مشکل تھا۔ بلا کسی ادنیٰ و اعلیٰ شریف در ذیل کی تمیز کے جو آئی اس پر آنکھ گڑ گئی۔ بلاشبہ شاہزادے بے باک و آزاد ہوا کرتے تھے، لیکن اتنا نہیں جتنا ہمارے یہ مورخین رنگ و روغن کے

---

[1] صفحہ ۴۰ ۔ ۴۳ الفنسٹن (Mool mandaloka) صفحہ ۲۴۳ بعض مورخین کا یہ خیال ہے۔ کہ مہرالنساء کی ماں ہندوستان نہیں آئی تھی بلکہ یہاں آنے سے پہلے راہ میں اوس کا انتقال ہو گیا تھا۔

ساتھ دکھلاتے ہیں۔ باوجود ان تمام برائیوں کے جو بادشاہ وشاہزادے اور شاہی محل کے متعلق مشہور ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں کی عصمت وشرافت ہمیشہ محفوظ رہا کرتی تھی

انگلستان کے ایک مشہور ناول نویس (Renold) کا یہ جملہ نہایت عبرت انگیز ہے :-

"تعظیماً واحتراماً میں اپنی ماں اور ملکۂ معظمہ کو معصوم سمجھتا ہوں"

جہاں خود یہ حال ہو وہاں اون مورخین کا مسلمان بادشاہوں کی عیش ونشاط کی محفلوں کے ان افسانوں کو سُن کر اُن کے دماغی توازن کا کیا حال رہا ہوگا - خود اندازہ کیجئے !!

(Petro Della Vella) لکھتا ہے :-

اوس کے (مہرالنسا) شوہر کے انتقال کے بعد سلیم نے اوس کو دیکھا تھا، اور اسی وقت سے وہ اوس سے محبت کرنے لگا تھا

اب تک جتنے واقعات بھی میں نے لکھے ہیں ۔ ان جو کچھ نورجہاں اور جہانگیر کے متعلق مشہور ہے اس میں یہ سب سے زیادہ عجیب ہے - حالانکہ اگر ہم اس کو تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھیں تو اتنا "عجیب" نہ معلوم ہوگا اب یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حقیقت واصلیت کیا ہے - شیرافگن کے متعلق جو کہانیاں مشہور ہیں ان کی روشنی میں جانچنا ہوگا - اس کے بعد پھر ہم نہایت آسانی سے معلوم کرلیں گے کہ مہرالنسا کو سلیم نے کب دیکھا - اور شیرافگن کے قتل کی اصلی وجہ کیا ہے ؟

عام طور پر شیرافگن کے قتل کے متعلق جو واقعہ مشہور ہے، اور جس سے ہماری تاریخیں بھری پڑی ہیں - وہ یہ کہ سلیم مہرالنسا سے شادی کرنا چاہتا تھا - لیکن چونکہ اکبر نے انکار کردیا - اور بجائے سلیم کے اس کی شادی شیرافگن سے کردی گئی [1]

کنیڈی (Kannady) لکھتا ہے :-

جہانگیر تخت نشین ہوتے ہی صوبہ دار کو یہ ہدایت بھیجتا ہے کہ مہرالنسا کو شیرافگن سے طلاق دلوادو اور اسکو (مہرالنسا) دربار میں بھیجدو، لیکن شوہر (شیرافگن) نے اعتراض کیا، اور اسکا یہ اعتراض جائز تھا - ایک ملاقات کے دوران میں اس نے صوبہ دار کے پیٹ میں چھری بھونک دی اور خود بھی چھری بھونک کر مرگیا، اب مہرالنسا دربار میں بھیجدی گئی لیکن اس نے جہانگیر سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے صاف انکار کردیا، کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل ہے اور اسکا یہ خیال حق بجانب تھا [2]

الفنسٹن (Elphinston) بھی صرف الفاظ کی الٹ پھیر کے ساتھ تقریباً سب کچھ یہی لکھتا ہے -

---

[1] ڈو (Dow) صفحہ ۲۴، ۲۵ [2] کنیڈی جلد دوم صفحہ ۱۷ .

دوسرا حصہ گرم پتھریلا ہے اور مشتمل ہے میگنیشیم اور چقماقی قسم کے پتھر پر، اس کی دبازت ۹۰۰ میل ہے، اس کے بعد زمین کا وہ مرکزی حصہ ہے جس میں زیادہ تر لوہا اور نکل نیم گداختہ حالت میں پائے جاتے ہیں، اس کی دبازت ۴۲۰۵ میل ہے

کرۂ زمین آفتاب ہی کا ایک ٹکڑا ہے جو دوران گردش میں اس سے علٰحدہ ہوگیا تھا، اور کروروں برس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سرد ہوکر اس قابل ہوا کہ جاندار اس پر سانس لے سکے۔ پھر جس طرح پگھلی ہوئی چیز کا بالائی حصہ پہلے خشک ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اندرونی حصہ میں انجماد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اوّل اوّل زمین کی وہ بالائی سطح خشک ہوئی جس پر انسان آباد ہے اور اندرونی حصہ ہنوز پوری طرح خشک نہیں ہوا بلکہ اب تک گرم و نرم ہے۔ لیکن زمین کی بالائی سطح بالکل یکساں دبازت کی نہیں ہے کسی جگہ اس کی موٹائی کم ہے اور کہیں زیادہ، اس لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ زمین کا یہ خشک خول جس پر ہم آباد ہیں ایک ایسے ناہموار لکڑی کے تختے کی طرح ہے جو پانی پر تیر رہا ہو اور جس کا دباؤ نیچے کی طرف کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو

اس خول کے نیچے جو مادہ پایا جاتا ہے وہ بالطبع دباؤ سے متاثر ہونے والا ہے یعنی جس جگہ اس پر دباؤ زیادہ پڑجاتا ہے وہ دب جاتا ہے اور جہاں دباؤ کم ہوجاتا ہے وہ اُبھرنے لگتا ہے۔ پھر اگر یہ مادہ پانی کی طرح رقیق ہوتا تو اس دباؤ کا نتیجہ جلد ظاہر ہوجاتا لیکن چونکہ اس کا قوام بہت گاڑھا ہے اس لئے بہت کافی زمانہ کے بعد اس پر دباؤ کا اثر ہوتا ہے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ زمین کے بالائی خشک خول کا دباؤ بہت تغیر پذیر ہے کیونکہ ہوا، پانی، گرمی و سردی کے اثرات سے یہ سطح کسی جگہ پہاڑوں کی سی صورت اختیار کرلیتی ہے، کہیں پتھریلا حصہ پس پسا کر غبار بن جاتا ہے اور پانی میں مل کر سمندر کی سطح کے دباؤ کو بڑھاتا رہتا ہے۔ الغرض زمین کا سمٹ کر پہاڑ بن جانا اور پہاڑ کا سطح میدان ہوجانا۔ کرۂ زمین کی تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو وقت نامعلوم سے جاری ہیں اور معلوم نہیں کب تک جاری رہیں گے

چنانچہ زمین کا وہ حصہ جسے سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں کسی وقت ۲۰۰ میل کا بالکل سطح میدان تھا، لیکن اب وہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور بجائے ۲۰۰ میل کے اس کی پیمائش صرف ۱۲۰ میل رہ گئی ہے

اس قدر معلوم کرلینے کے بعد غالباً یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ زمین کے اندرونی حصہ پر بالائی خول کا دباؤ فطری امر ہے اور اس دباؤ سے اندرونی مادہ کا کسی جگہ دب جانا اور کسی جگہ ابھر جانا یقینی ہے۔ فرض کیجئے آپ کسی کشتی پر بیٹھے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ اور اس کے کسی کنارہ پر زیادہ دباؤ پڑجاتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جدھر دباؤ پڑا ہے اس طرف کا کنارہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا اونچا ہوجائے گا، لیکن یہ عمل اسی جگہ ختم نہ ہوجائیگا بلکہ پانی اپنی اصلی سطح اختیار کرنے کے لئے پھر متموج ہوگا اور کشتی میں متواتر ادھر اُدھر ہچکولے پیدا ہوں گے۔ بالکل

یہی صورت زمین کی سمجھئے کہ جب بالائی خول کے کسی حصہ کا دباؤ اس کی اندرونی سطح پر زیادہ پڑے گا تو وہ حصہ دب جائے گا اور دوسری طرف کا ابھرنے لگے گا یہاں تک کہ توازن قائم رکھنے کے لئے متواتر ہچکولے اس کو کھانا پڑیں گے، اور یہی ہے زلزلہ اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں حصۂ زمین اس قدر بلند ہوگیا اور فلاں اس قدر پست

اب آپ حال کے زلزلۂ صوبۂ بہار کو دیکھئے اور اس پر اس نظریہ کو منطبق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ دامن ہمالیہ سے لے کر خلیج بنگال تک کا حصۂ زمین ایک لکڑی کا تختہ ہے جو پانی پر تیر رہا ہے اور خلیج بنگال کی طرف اس کا دباؤ زیادہ ہوگیا، اس لئے لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمالیہ کی طرف زمین کا اندرونی مادہ ابھرے گا

پھر مظفرپور، پٹنہ، مونگیر وغیرہ میں جو زمین جابجا شق ہوئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا کہ خلیج بنگال کی طرف دباؤ زیادہ پڑگیا اور صوبۂ بہار کی طرف مادۂ زمین نے ابھر کر ہلچل ڈال دی۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں وادی کانگڑا کی طرف زیادہ دباؤ پڑا تھا اور اس کا مقابل حصہ سرزمین یو۔پی کا زیادہ متاثر ہوا تھا

پھر چونکہ اس دباؤ کی وجہ سے اندرونی مادہ کا توازن خراب ہو جاتا ہے، اس لئے اُس کے اصلی توازن پر آنے کے لئے کچھ عرصہ تک تموج کی کیفیت باقی رہتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ۱۵ جنوری کے بعد بھی ہلکے ہلکے جھٹکے برابر محسوس ہو رہے ہیں اور اس وقت تک محسوس ہوتے رہیں گے۔ جب تک اندرونی مادہ اپنی اصلی سطح پر نہ آجائے

آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مقامات جو سمندر کے ساحل پر آباد ہیں وہاں اکثر و بیشتر زلزلے آتے رہتے ہیں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ سمندر میں پہاڑوں اور زمین کا ایک حصہ کٹ کٹ کر دریاؤں کے ذریعہ سے پہونچتا رہتا ہے اور اس لئے سمندر کی سطح کا دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے زمین کے اندرونی مادہ میں تموج پیدا ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات سمندر کا پانی رِس رِس کر مرکزِ زمین کی طرف پہونچتا ہے اور وہاں گرم مادہ پر پڑ کر بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اوپر کی طرف بلند ہو کر باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اس طرح زمین میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے

اب رہا جوتشیوں اور نجومیوں کا یہ کہنا کہ سات سیاروں کا قِران اس کا باعث ہوا ہے، سو اس کی علمی توجیہ ان کی طرف سے یہ کی جاتی ہے کہ ان سیاروں کی کشش سے زمین جنبش میں آئی، لیکن تنقیدِ صحیح کے بعد ان کی یہ توجیہ پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سات سیاروں کا قِران منطقۂ جدی (Zodiac of Capricorn) میں ہوا تھا جو خطِ استوا سے ۲۳½ درجہ جانب جنوب واقع ہے، اس لئے اصولاً ان کی کشش کا اثر کرۂ زمین کے جنوبی حصہ پر زیادہ ہونا چاہئے تھا۔ اور آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں زلزلہ محسوس ہونا ضروری تھا، نہ کہ صوبۂ بہار میں جو خطِ استوا سے مابین ۲۶ و ۲۹ درجہ جانب شمال واقع ہے۔ اور جنوبی حصہ سے ۳۵۰۰ میل کا بُعد رکھتا ہے

علاوہ اس کے یہ سات سیاروں کا قِران چند منٹ تک تو رہا نہیں۔ بلکہ کئی دن تک رہا ہے۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ دورانِ قِران یہ مصیبت صرف ایک بار ظاہر ہو کر کیوں ختم ہوگئی

پھر اگر یہ معاملہ صرف سیاروں کی کشش کا تھا تو اس کا بہت زیادہ اثر سمندروں پر ہونا چاہئے تھا جو رقیق ہونے کے لحاظ سے کشش کو زیادہ قبول کر سکتے ہیں نہ کہ صوبۂ بہار کی سرزمین پر جو یقیناً پانی کے مقابلہ میں زیادہ ٹھوس اور جامد ہے جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ ہے حال کی تحقیق زلزلہ کے متعلق، لیکن اس کو آخری لفظ قرار دے کر یہ باور کر لینا کہ ترقی علوم کی آیندہ منزل اس میں کوئی اور اضافہ نہ کر سکے گی، یا کچھ اور اسباب اس کے دریافت نہ ہو سکیں گے، صحیح نہیں ـــــ مگر ہاں یہ بالکل یقینی ہے کہ زلزلہ کا سبب وہ فرشتے نہیں ہیں جو کوہِ قاف کے گرد زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں اور جب وہ اسے پکڑ کر ہلا دیتے ہیں تو ساری زمین پر جنبش پیدا ہو جاتی ہے

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب شبیر احمد خاں صاحب وکیل لودھیانہ)

محترم بندہ جناب مولانا نیاز صاحب

السلام علیکم،

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء کے "نگار" میں "ملاحظات" کی تحت میں "عیش یا مسرت" کے عنوان سے آپ کا دلچسپ مضمون میری نظر سے گذرا، آپ نے اس مضمون میں نہایت خوب صورت الفاظ میں "عیش یا مسرت" کی حقیقت پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اسی ضمن میں مذہب، وطنیت، قومیت ہر سہ تحریکات کے مضر اثرات و نتائج پر بھی تنقید کی ہے، "امن وسکون" کا واحد ذریعہ" کے ضمنی عنوان میں آپ نے یوں مشورہ دیا ہے کہ "اگر دنیا کو واقعی امن وسکون کی ضرورت ہے، تو اس کا حصول نہ تجارتی مفاہمت سے ہو سکتا ہے، نہ تخفیف اسلحہ کی کوشش سے، بلکہ صرف اس طرح کہ تمام ممالک کے اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر، حکومتوں کے اختلاف کو مٹائیں اور تمام ممالک کو اصول فیڈریشن پر ایک نظام حکومت سے وابستہ کردیں" اگر آپ کے اسی مشورہ کے مطابق عمل نہ کیا گیا، تو "—— یقین رکھنا چاہئے، کہ دنیا کو ایک بار ضرور تباہ ہونا ہے خواہ وہ تباہی اس کو پھر عہد وحشت کی طرف لیجا کر کسی اور تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کرے، یا قیامت کبریٰ" قائم کر کے نظام شمسی میں ایک اور ویران غیر آباد کرہ کا اضافہ کرنے والی ثابت ہو"

جس "عیش یا مسرت" کا آپ نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، وہ عیش یا مسرت" ہرگز منتہائے مقصد حیات انسانی نہیں، اس کی تلاش انسان پر فرض، اور اس کے بغیر انسان کی زندگی اجیرن نہیں ہو جاتی۔ انسانی زندگی بلند مقاصد کی جستجو میں ہے اور وہ بلند مقاصد "عیش و مسرت" کی آغوش میں نہیں، "عیش و مسرت" کی آغوش خواب آور اور آرزو کُش ہے، انسان اس دنیا میں اپنی عشرت کے لئے خلق کیا گیا عیش و مسرت" کے حصول کے لئے نہیں کوئی مذہب انسان کو دُنیا میں حصول عیش و مسرت کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ ہی مذہب طلسم ہوش ربا، اور تخیلی فردوس کا نام ہے، اگر مسرت کہیں ہے۔ تو وہ انسانی فرایض کو بہ طریق احسن ادا کرنے کے اطمینان قلبی

ہیں۔ دنیا نے امن و سکون کی بیہودہ تلاش میں کئی خونیں قلزم عبور کئے، مگر اب تک اُسے وہ امن و سکون نصیب نہیں ہوا، اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی ایسے امن و سکون کے ظہور کی توقع کی جا سکتی ہے، زندوں کی بستی میں کبھی امن و سکون نہیں رہ سکتا، البتہ مُردوں کی دنیا یعنی قبرستان میں ہمیشہ خاموشی پُر ہیبت سکوت، اور امن ہر وقت مسلط رہتا ہے، دنیا کو قبرستان کے امن و سکون کی ضرورت نہیں ——— مذہب پر سب سے بڑا الزام جو آپ نے عائد کیا ہے وہ یہ ہے، کہ "مذہب نے خون ریزی، اور خونفشانی کے سوا، کوئی خدمت سرانجام نہیں دی" حق و باطل کی آویزش فطرت کا ایک عالمگیر، اَن مٹ، قانون ہے، جس کی سرتابی میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے (کم از کم میں اپنے متعلق ضرور کہہ سکتا ہوں آپ شاید اپنے کو مستثنیٰ کر دیں) دن اور رات کا انقلاب، روشنی اور تاریکی، گرمی اور سردی، بہار اور خزاں، سورج اور چاند کی گردش قانون قدرت کے یہ عالمگیر مظاہر سے اس امر کے مقتضی ہیں، کہ حرکت نہ ختم ہونیوالی، حرکت فطرت کی ہر شے میں حکمراں رہے، اور ہر لحہ بدلنے والی دنیا کا ہر انقلاب پذیر ذرہ امن و سکون کے خلاف علم جہاد بلند کئے ہوئے ہو۔ جد و جہد اور ہر حرکت "بقاء اصلح" کے جہاں گیر اصول کی زندہ تشریح ہے۔ جب تک سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، اس وقت تک انسانوں کی بستی میں آپس میں محبت اور پیار، جنگ و فساد، صلح و آشتی، نفاق اور فراق کے رنگین مناظر آنکھوں کے سامنے اسی طرح رقصاں رہیں گے۔ جدال و قتال، بربادی و آبادی، لازمۂ حیات انسانی ہیں۔ یہ ابتدائی اصولی غلطی ہے، اگر کوئی کسی تحریک یا مذہب سے یہ توقع رکھے، کہ وہ دنیا میں بہشت قائم کرے۔ اور پھر بہشت بھی وہ جس کے متعلق یہ کہا جائے ع

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

دنیا کا یہ وسیع کارخانہ قبرستان کے امن و سکون کے لئے مرتب نہیں کیا گیا۔ جو لوگ اسی دنیا میں ایسی بہشت کی متلاشی ہیں، وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور اک سراب کے تعاقب میں اپنی زندگیاں ضائع کر رہے ہیں۔ انسان کا جسم صحت، اور بیماری کے عوارضات کا تختۂ مشق اسی طرح بنتا رہے گا۔ اس کا دل اسی طرح بڑھتی ہوئی امنگوں، اور پُر جوش آرزؤں کا مسکن رہے گا، اور جہد للبقا کا لازوال نہ مٹنے والا قانون کائنات کے ہر ذرہ پر اسی طرح حکمراں رہے گا، خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں، چاہیں یا نہ چاہیں، یہ جنگیں، یہ فسادات یہ خوں ریزیاں اور خوں آشامیاں اسی طرح دنیا کے چہرہ کو بدنما کرتی رہیں گی، انسان فرشتہ تو ہونے کو رہا۔ حرص و آز، ہوس اور خود غرضیاں جو انسانی اعمال کے محرکات ہوں ان کا نتیجہ بدیہی تباہی، اور فساد ہے، مذہب اک جادہ اعتدال کا نام ہے، جس جادہ اعتدال پر گامزن ہو کر: انسان۔ دنیا کی فلاح و بہبود کا اور بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں باہمی اخوت و پیار کا باعث بن سکتا ہے، انسان میں جو درندگی اور حیوانیت پائی جاتی ہے، وہ مذہب کے اصلاح کُن اثر سے، اطاعت، اور شفقت کے پاکیزہ جذبات میں بدل سکتی ہے، تنہا مذہب وہ مقدس تحریک ہے، جس نے انسان کی درندگی اور بہیمیت کو اخوت۔ اور اطاعت میں بدل کر دربار خداوندی میں عبدیت کی قبا کے ساتھ خلافت الارض کی خلعت پہنا دی ہے۔ باقی رہیں وہ جنگیں، جو دنیا میں مذہب کے

نام پر کی گئی ہیں، ان میں سے بعض تو محض جوع الارض اور بادشاہوں کی اپنی انانیت کا نتیجہ تھیں، اور وہ جنگیں جو خالصاً اللہ کے راستہ میں... لڑی گئیں، وہ نسل انسانیت کی صحیح نشوونما اور تربیت کے لئے عین ضروری تھیں، جراثیم زدہ اعضا کا کاٹ دینا ہی دیگر اعضار کی تندرستی، اور صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے ہر تخریب میں تعمیر، ہر بربادی میں آبادی، اور ہر ویرانہ میں بستی کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں، ہر نئی تعمیر کے لئے قدیم تعمیر کا گرایا جانا ضروری ہے، الفاظ کی بہشت تو آپ ساجاد ونگار ہر وقت پر قائم کر سکتا ہے۔ مگر انسانی اعمال سے ایسی بہشت دنیا میں نہ کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ کبھی قائم ہوگی۔ دنیا فرشتوں کی بستی نہیں بن سکتی، اور نہ ہی دنیا مہاتماؤں کا مندر ہے، انسانی زندگی میں قہقہے بھی ہیں، اور آہیں بھی، جدوجہد کی صعوبتیں بھی، تحمل و برداشت کی آذیتیں بھی، ناکامیابیوں کی تلخ کامیاں بھی۔ ع

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

موجودہ برسر اقتدار حکومتیں جو دنیا میں امن وسکون قائم کرنے کی کوششیں کبھی تخفیف اسلحہ کی صورت میں، اور کبھی تجارتی مفاہمت کی صورت میں کر رہی ہیں، یہ محض ان کی سیاسی چالیں ہیں، ان کی ان کوششوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مغلوب اقوام اپنا سر نہ اُٹھائیں، اور اپنے غصب شدہ حقوق اُن سے طلب نہ کریں، وہ اب جنگ اس لئے نہیں چاہتے۔ کہ کہیں دوسری جنگ میں وہ سب کچھ کھو نہ بیٹھیں، جو انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا ہے۔ وہ امن اب اس لئے چاہتے ہیں، کہ گذشتہ جنگ کی تھکان دُور کرلیں، اور جو کچھ انھوں نے گذشتہ جنگوں میں حاصل کیا، اُس مال غنیمت کو اطمینان کے ساتھ اب بیٹھ کر اچھی طرح ہضم کر لیویں، وہ دوسروں کے غصب شدہ حقوق اُگلنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی موجودہ تقسیم دولت، وحکومت پر وہ مطمئن ہیں، اور اس تقسیم میں کسی مزید تبدیلی اور انقلاب کو اب وہ نہیں چاہتے، امن وسکون کی یہ کوششیں اگر کامیاب ہوگئیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مغلوب اقوام ہمیشہ کے لئے مغلوب رہیں گی، اور وہ کبھی بھی حریت کی حیات آفریں فضا اور زندگی حاصل نہ کریں گی

اختلافات مادی ہوں یا اعتقادی، ہمیشہ سے چلے آئے ہیں، اور اسی طرح قائم رہیں گے۔ میری اور آپ کی مساعی آنے والی "قیامت کبریٰ" کو روک نہیں سکتیں۔ اور اسی "قیامت کبریٰ" کے لپٹ جانے میں درحقیقت مظلوم اور بے دست وپا اقوام کے لئے کوئی فلاح وبہبود مضمر نہیں ہے۔ جنگیں ہمیشہ مظلوم کو ظالم کی دستبرد سے نجات دلاتی ہیں اور اکثر غاصبوں کیلئے تازیانہ عبرت کا حکم رکھتی ہیں۔ (War is a biological process) ایک انگریزی مقولہ ہے۔ جنگ بھی افزائش نسل کے لئے ضروری ہے۔ انسان تحفظ نفس کے لئے اپنے گردوپیش کے حالات

سے برسرِ پیکار رہنے پر مجبور ہے، انسان دنیا میں کائنات ارضی پر حکمرانی کے لئے خلق ہوا ہے اس لئے اُسے پانی، ہوا، اور زمین کو اپنے زیرنگیں کرنا ہے، مذہبی اختلافات بالکل مٹ نہیں سکتے، البتہ کم شاید ہو جائیں، نیکی اور بدی، کفر اور ایمان دونوں کی زندگیاں پہلو بہ پہلو جاتی ہیں۔ ان کی باہمی آویزش سے گریز جبث اور بزدلی ہے۔ البتہ اس جنگ میں بلند ہمتی سے شرکت، صحیح فتح ہے، جنگل کو سبزہ زار بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اُسے خس و خاشاک سے پاک صاف کیا جائے۔ کپڑا انسان کے جسم پر اس وقت راست آتا ہے جب درزی اسے پہلے کاٹ دیتا ہے، انسان کو فقط کھلونا نہ جانئے، جو محض کھیلنے کودنے اور ہنسنے کے لئے دنیا میں آیا ہو۔ محبت، نفاق اور دشمنی انسانی قلب کی یہ سہ گونہ کیفیات ازلی اور ابدی ہیں، اسی بنی نوع انسان کی وسیع برادری میں ہمیشہ سے مومنوں، منافقوں اور منکروں کے گروہ قائم رہے ہیں

دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کا درس نہیں دیتا۔ البتہ جو شخص ننگ انسانیت ہو، اس کے عدم کو وجود سے بہتر ضرور سمجھتا ہے۔ اگر اس کے متعلق اصلاحی قوتیں بیکار ثابت ہو چکی ہوں

باقی رہا اس ملک کی فرقہ پرستی، اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

باہمی بدگماں نتیجہ ہیں، قوموں کے باہمی عدم توازن کا، جو قوم اپنے کو کمزور سمجھتی ہے۔ وہ اپنی بقا، کے لئے تحفظات کے تعیین کے لئے فطرتاً مجبور ہے، تحفظات کے مطالبہ کو اقلیت بھی اس حالت میں ترک کر سکتی ہے، اگر اکثریت اور بالخصوص طاقتور اکثریت اپنی روش اور اپنے سلوک سے اقلیت کے دل میں اپنے لئے اعتماد پیدا کر دے۔ فرقہ وارانہ ذہنیت ہمیشہ قوموں میں باہمی بداعتمادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اکثریت کا اقلیت کے حقوق اور مفاد کے ساتھ غیر مشفقانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک اقلیت کو ہمیشہ اکثریت سے بدگمان کر دیتا ہے۔ جس ملک یا بستی میں بداعتمادی کی فضا مسلط ہو، ایک طرف سے تحفظات حقوق کی طلب ہو، اور دوسری طرف سے اس طلب کا جواب اغماض، اور گریز سے دیا جا رہا ہو اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کی قوموں میں منافرت کی خلیج وسیع ہوتی چلی جائے۔ ایسے ناخوشگوار حالات کے اصلی اسباب کا تعین کبھی مفید نتیجہ کا باعث نہیں ہوا، ہندوستان کے مسلمان لاکھ قربانیاں کریں، اور اپنی زندگیاں استخلاص وطن کی مقدس تحریک کے لئے وقف کر دیں، مگر اکثریت کے قلوب میں ان کے لئے کبھی ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا نہ ہوں گے۔ غلط یا درست وہ اس ملک کو تنہا اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہیں، اور انھیں ہر مسلمان محمود غزنوی نظر آ رہا ہے، باہمی مصالحت اور مفاہمت کی ساعی ہمیشہ مبارک ہیں، اور ہر شریف انسان باہمی اعتماد کو بداعتمادی پر ترجیح دے گا، لیکن ہر مبارک سعی کی کامیابی یقینی نہیں ہے،

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ از سرِ نو مرتب اگر ہو سکتی ہے تو شاید پھر باہمی مصالحت کی مساعی بھی مشکور ہوں، اور البتہ یہ امر یقینی ہے کہ اگر دونوں اقوام کو آپس میں یہاں مل جل کر رہنا ہے، تو انھیں ایک نئی تاریخ مرتب کرنی ہوگی اور تاریخ ہند

میں "مسلمانوں کا باب" جس انداز، اور ترتیب سے اب مرتب ہے، وہ یقیناً بدلنا پڑے گا۔ اور شاید ہندوستان کی تمام گزشتہ تاریخ کو ایک سفید ورق کی صورت میں تبدیل کرنا ہو

خدارا اپنے مضامین میں الفاظ کی بہشت قائم کرکے مسلمان نوجوانوں کو محض شاعر اور نگار پرست نہ بنائیے۔ میں نے آپ کے رسالہ کے اکثر نوجوان قارئین کو محض بیکار دیکھا ہے۔ بیشک وہ آپ کے مضامین۔ شگفتہ تراکیب اور بلند تخیلات کو مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ مگر علمی اعتبار سے محض اینٹ اور پتھر کی طرح جامد ہیں۔ نیت تو یقیناً آپ کی مبارک اور نیک ہے، مگر بدقسمتی سے نتائج خطرناک پیدا ہو رہے ہیں، کاش آپ میرے ساتھ یہاں ہوں تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ اس "نگار پرستی" نے کتنے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ، بیکار، اور گستاخ کر دیا ہے۔ خدا اُس علم سے محفوظ رکھے، جو شر اور گمراہی پھیلائے

(نگار) اُن تمام صریحی اختلافاتِ بیانی کو نظر انداز کرنے کے بعد جو جا بجا آپ کی تحریر میں نظر آتے ہیں، اس کی تلخیص یہ کر سکتا ہوں کہ :-

(۱) دنیا میں امن و سکون کی تلاش، جستجوئے محال ہے

(۲) مذاہب عالم کا مقصد کبھی "عیش و مسرت" کا حصول نہیں تھا بلکہ صرف "عبدیت" کی کیفیت انسان پر طاری کرنا تھا

(۳) مذاہب عالم کی خونریزی و خون آشامی عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے

(۴) دنیا میں کوئی مذہب انسان کو انسان سے نفرت کرنے کا درس نہیں دیتا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے

(۵) ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مصالحت ناممکن ہے جب تک تاریخ ہند میں "مسلمانوں" کا باب بالکل نہ بدل دیا جائے

(۶) نگار کی تحریریں ملک کے نوجوانوں کو گمراہ، بیکار اور گستاخ بنا رہی ہیں ——— اور یہ کہ

(۷) خدا اُس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلائے

آخری دو باتیں حذف کرنے کے بعد جن کا تعلق صرف نگار یا صاحب نگار سے ہے اور جن کا جواب دینا چنداں ضروری نہیں، باقی تمام امور یقیناً غور طلب ہیں لیکن افسوس ہے کہ فاضل مراسلہ نگار نے جو تشنج و ہرج کی ہے اسے ژولیدگی و تناقض کے لحاظ سے کسی کامیاب قانون پیشہ شخص سے منسوب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا

قبل اس کے کہ میں فاضل مراسلہ نگار کی تصریحات پر تنقید کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں دسمبر کے "ملاحظات" کا مفہوم یہاں مختصر طور پر ظاہر کر دوں جس کے خلاف صاحب مضمون نے احتجاج کیا ہے

میں نے دسمبر کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا کہ عیش و مسرت دو بالکل علٰحدہ چیزیں ہیں عیش نام ہے جسم کی آسایش کا حواس ظاہری کی لذت کا اور مسرت نام ہے اطمینانِ نفس اور راحتِ روح کا، اس لئے اگر دنیا واقعی امن و سکون کی طلبگار ہے تو اُسے اسبابِ عیش کی جستجو نہ کرنا چاہیئے بلکہ حصولِ مسرت کے درپے ہونا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اس کے حصول میں اس وقت تک نہ مذاہب عالم کامیاب ہوئے ہیں، نہ جذبۂ قومیت و وطنیت کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ علم و حکمت کی ترقی اس جنس گرانمایہ تک دسترس پاسکی ہے۔ اس لئے اب اگر تجربہ باقی رہ گیا ہے تو صرف یہ کہ تمام مذاہب کو صرف ایک مرکز پر لایا جائے جسے " انسانیت پرستی " کہتے ہیں اور جملہ حکومتوں کو صرف ایک نظامِ حکومت سے وابستہ کیا جائے۔ جو تمام سلطنتوں کے تمائف و مواخاۃ سے حاصل ہوسکتا ہے

یہ تھا میرا مفہوم جس سے مراسلہ نگار نے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا ہے، بلکہ بعض نئی باتیں ایسی پیش کی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے مجھے خود استفسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

(۱) و (۲) دُنیا میں امن و سکون کی تلاش جستجوئے محال ہو یا جستجوئے ممکن، لیکن غالباً اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہے وہ بالکل فطری چیز ـــــ نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور اور نباتات بھی اسی چیز کی جستجو میں ہیں اور مخلوقات کا فطری خود غرض پیدا کیا جانا اسی مصلحت کے ماتحت ہے کہ وہ اس کی جستجو میں لگے رہیں پھر چونکہ امن و سکون انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے فطری اقتضا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ دُنیا میں حقیقی مسرت کوئی چیز نہیں بلکہ اصل شئے " عبدیت " ہے اور اسی کی اشاعت کے لئے مذاہب عالم وجود میں آئے بالفاظ دیگر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مذاہب کا تعلق مسرت یا اطمینانِ نفس سے نہیں بلکہ کسی اور چیز سے ہے جس کا نام فاضل مراسلہ نگار نے " عبدیت " رکھا ہے مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے، لیکن غالباً قابل معترض نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جس چیز کو وہ " عبدیت " سے تعبیر کرتے ہیں، وہی میرے نزدیک سکونِ نفس و اطمینانِ ضمیر ہے

" عبدیت " کسے کہتے ہیں؟ اگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ایک انسان اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھ کر صرف رشتۂ عبد و معبود پر اعتماد کرے اور عبادت و نیایش کے مروجہ طریقوں پر کاربند ہوکر اپنے فرایض عبدیت سے عہدہ برآ ہو جانے کا یقین رکھے، تو یہ ایسی ادنیٰ درجہ کی تعبیر ہوگی کہ انسان و حیوان کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا کیونکہ انسان کا خدا کے مُقابلہ میں صرف اپنے آپ کو عاجز اور بندۂ بیچارہ سمجھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، ایک جانور بھی انسان کے ہاتھ میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہے۔

فرض کر لیجئے ایک انسان خدا سے ڈر کر رات دن اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے تو اس سے مدعا کیا ہے یعنی وہ کس امر سے خایف ہو کر اس کی پوجا کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل کسی غرض سے خالی نہیں ہوسکتا، یعنی وہ یا تو اپنی دنیاوی فلاح و ترقی کی امید پر ایسا کرتا ہے یا اخروی نجات کی ترقی پر۔ اگر مقصود وہ ہے تو محض یہ " خوفِ عبدیت "

بیکار ہے جب تک وہ دنیا کے اصول پر نہ چلے اور اگر مدعا دوسرا ہے تو ایسا انسان دنیا اور دنیا والوں کے لئے بیکار ہے ـــــــــ میرے نزدیک "عبدیت" کا صحیح مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھے اور دوسروں کے احساسات کی پامالی پر اپنے جذبات کی کامیابی کی بنیاد قائم نہ کرے۔ اسی کا میں نے دوسرا نام "انسانیت پرستی" رکھا ہے اور یہی مقصود مذہب کا ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ تجربہ اس کے خلاف ثابت ہوا ہے۔ اور اس وقت تک مذاہب اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے لامحالہ ہم کو "مذہب" کا کوئی اور بلند مفہوم قائم کرنا پڑے گا اور وہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ "لا مذہبیت" مذہب قرار دیا جائے جسے دوسرے الفاظ میں (morality without religion) بھی کہہ سکتے ہیں

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ " مسرت نام ہے انسانی فرایض کو بہ طریق احسن ادا کرنے " کا اس لئے کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا انسانی فرایض میں اہم ترین فرض یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی خواہ وہ کسی قوم و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمدردی کی نگاہ سے دیکھے اور اُن کے ساتھ رشتۂ اخوت و محبت قایم کر کے تنگ نظری و عصبیت کو دُور کر دے۔ پھر اگر اس کا جواب آپ اثبات میں دیں گے (اور یقیناً دیں گے) تو آپ کو میرے اس قول سے کیوں اختلاف ہے کہ انسان صرف قیام مسرت کے لئے وضع ہوا ہے نہ کہ اسباب عیش کی فراہمی کے لئے۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ " مذہب طلسم ہوشربا اور تخیلی فردوس کا نام نہیں ہے " سو اس کے جواب میں بجز اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر

میں، کہ سرے سے اس قسم کی فردوس و بہشت کا قائل ہی نہیں ہوں، کیونکر موردِ الزام قرار پا سکتا ہوں، یہ تو آپ اپنے انھیں برادرانِ مذہب سے کہئے جنھوں نے فردوس کو طلسم ہوشربا کیا، اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز بنا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ

وشتان ما بین خلق و خمر

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ " مذاہب عالم کی خونریزی و خوں آشامی عین فطرت کے مطابق ہے، کیونکہ حق و باطل کی جنگ فطری قانون ہے " ـــــــــ یہ غالباً آپ نے صرف اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اور اسلام ہی سچا مذہب ہے ـــــ لیکن بندہ نواز، جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب والے بھی کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو کہ راستی پر کون ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف دعوؤں میں باہمدگر اختلاف و تضاد ہوگا تو ہم کو جانچنے کے لئے کوئی معیار قائم کرنا پڑے گا اور مذاہب

حقیقی باپ کی بجائے ایک غیر شخص کو باپ سمجھے اور اس کی احترام کرے تو کیا [illegible]
[illegible] نہیں ہوگا [illegible] آپ سمجھنا چاہئے [illegible]

کے تناقض و نزاع کے باب میں یہ معیار صرف "عقل و فطرت" ہی ہو سکتا ہے --- پھر غور کیجیے کہ اس وقت کون سا مذہب اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے ؟ غالباً کوئی نہیں اور اس لئے لامحالہ تمام موجودہ مذاہب کو علٰحدہ کرکے کوئی اور نئی صورت اختیار کرنا پڑے گی جو " مذہب انسانیت پرستی " کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی

اسٹرنڈ برگ (Strindberg) کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جس میں ایک عیسائی عورت کسی فوجی کپتان کو جو منکر خدا ہے مذہب کی طرف مائل کرتی ہے اور خدائی محبت کی داستان سُنانے لگتی ہے۔ کپتان سب کچھ سننے کے بعد کہتا ہے "ٹھیک اسی وقت جب تم خدا اور اس کی محبت کا ذکر کرتی ہو، تمھاری آواز میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور تمھاری آنکھوں سے جذبۂ نفرت و اکراہ ٹپکنے لگتا ہے، ایسا کیوں ہے؟"

چنانچہ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس کی بنا پر اسے کہنا پڑا کہ

The world would be more religious place if all the religions were removed from it.

یعنی اگر آج دنیا سے تمام مذاہب محو ہو جائیں تو دنیا زیادہ مذہبی جگہ ہو جائے "

Baron Von Hogel کا قول ہے کہ

Religion is an "Isness" and not an "Oughtness"

مذہب کا تعلق ہمیشہ " ہے " سے رہا ہے " چاہئے " سے نہیں۔ یعنی وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ صرف اسی کو صحیح سمجھتا ہے جو بظاہر اسے نظر آتا ہے --- یعنی اگر وہ یہ سکھاتا ہے کہ آپس میں محبت رکھو، فتنہ و فساد سے علٰحدہ رہو تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کو صرف ایک مخصوص حلقہ میں محدود رکھا جائے اور دوسرے مذہب والوں کو اس سے خارج سمجھا جائے، پھر ظاہر ہے کہ جب تمام مذاہب ... اس خیال کے حامی ہوں گے تو ان کا باہمد گر کشت و خون میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے اور اس وقت تک جو خونریزیاں مذاہب کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ ہر مذہب والا اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسرے کو باطل اور بقول ہمارے فاضل مراسلہ نگار کے حق و باطل میں جنگ ہونا بالکل فطری امر ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مذاہب عالم کا درس محبت بھی حد درجہ قاتل و خونریز درس ہے اور کسی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

Religion engenders a great love to a great hate.

(۴) آپ کا جو تضاد دعوٰے یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی مذہب انسان سے انسان کو نفرت کرنے کا درس نہیں دے گا مگر جو شخص ننگ انسانیت ہو اُسے ضرور فنا کر دینا چاہتا ہے --- اُس دعوٰی کا پہلا حصّہ بالکل واقعہ و حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایک انسان نے دوسرے انسان سے نفرت کرنا، مذہب ہی سے سیکھا اور کافر و مشرک کی

اصطلاح میں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ کیا آپ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہندوؤں سے اس لئے متنفر نہیں ہیں کہ وہ رام و کرشن کے ماننے والے ہیں اور کیا ہندو آپ کو اس لئے ناپاک نہیں سمجھتے کہ آپ کا مذہب بُت شکنی سکھاتا ہو اور پھر ایک ہندو یا مسلمان ہی پر کیا موقوف ہے، گبر و ترسا، یہود و نصاریٰ ابھی اس عذاب میں مبتلا ہیں اور ایک کا دوسرے سے نفرت کرنا مذہبی اختلاف ہی کی وجہ سے ہے

اب رہا یہ خیال کہ جو ننگ انسانیت ہو اس کو ضرور ہلاک کر دینا چاہئے، سو براہِ کرم بتائیے کہ اس سے زیادہ انسانیت کی کیا توہین ہو سکتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مذہب کے شعائر کے خلاف خدا کی پرستش کرتا ہے۔ یعنی سوال خدا کی نافرمانی کا نہیں بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کیوں ایک مخصوص و متعین طور پر اس کی پوجا نہیں کی جاتی

پھر جب حالت یہ ہے تو آپ ہی کے فیصلہ کے مطابق اس وقت تمام اہل مذاہب کو فنا کر دینا چاہئے، کیونکہ وہ سب کے سب ننگ انسانیت ہیں

۵) آپ کا یہ فرمانا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ناممکن ہے جب تک ہندوستان کی تاریخ سے مسلمانوں والا باب بالکل نہ بدل دیا جائے۔ اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ہندو صرف اس لئے مسلمانوں کی طرف سے صاف دل نہیں ہو سکتے کہ وہ فاتحانہ حیثیت سے یہاں آئے اور بت شکنی کی، تو یہ ایک حد تک اصولاً درست ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اب جبکہ مسلمانوں میں اُن کے اسلاف کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی، وہ کیوں اب تک "پندار فاتحانہ" میں مبتلا ہیں۔ اور وہ کیا چیز ہے جو ان میں ملک و وطن کی محبت پیدا ہونے نہیں دیتی۔ کیا ہندوؤں کی طرح ہندوستان ان کا وطن نہیں ہے۔ اور کیا اب وہ یہاں سے نکل کر کسی اور مُلک میں فاتحانہ و ملوکانہ زندگی بسر کرنے کی توقع قائم کر سکتے ہیں — پھر جب یہ نہیں ہے تو کب اُن کی سمجھ میں آئے گا کہ جب سوال اقلیت و اکثریت کا پیدا ہوتا ہے تو اقلیت کی کامیابی "کم" کے مقابلہ میں ہمیشہ "کیف" سے ہوا کرتی ہے۔ مگر سنی شیعہ کی نزاع، وہابی و مقلد کا جھگڑا کب انھیں یہ سمجھنے کی مہلت دیتا ہے — انھیں اپنے ہی پاؤں پر کلھاڑی مارنے سے کہاں فرصت ہے کہ وہ درخت کی طرف متوجہ ہوں

۶ و ۷) رہ گئے آپ کے دو آخری حقائق کہ نگار کی تحریریں مُلک کے نوجوانوں کو گستاخ، گمراہ و بیکار بنا رہی ہیں اور خدا اس علم سے محفوظ رکھے جو شر اور گمراہی پھیلانے والا ہے۔ سو ان کے متعلق میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

نقطۂ نظر کا اختلاف ہے، کارگاہِ عمل کا اختلاف ہے، تعبیر و استنتاج کا اختلاف ہے۔ آپ جس چیز کو گستاخی سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک آزادیِ ضمیر ہے۔ جو ہر انسان کا فطری حق ہے اور جسے آپ گمراہی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک وہی راہ

"کعبۂ مقصود" تک پہونچانے والی ہے
اگر میرا یہ مسلک کہ

میانِ کعبہ و بتخانہ راہے ست

واقعی فتنہ و فساد پھیلانے والا ہے تو میں صرف یہ عرض کروں گا

خدا گواہ اگر جرم ما ہمیں عشق ست
گناہِ گبر و مسلماں بہ جرم ما بخشند

امن و سکون کا درس دینے والے حضرات کا بھی حال مجھے معلوم ہے اور اُن علمبرداران مذہب کا بھی جو اپنے آپ کو "حاملانِ عرش" باور کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کیوں مجھے اس بزم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں جہاں بقول عراقی

"ہمہ یافتم دغائی"

کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ آہ

مرہم از لبہاش می جویند بر جانِ فگار
وائے بر ریشے کہ آں را از نمک مرہم کنند

ز۔خ (پٹیالہ) سے

۱۶ فروری کو تحریر گرامی فردوس نظر ہوئی ـــــ لیکن حیران ہوں جواب کیونکر دوں۔ نگار میں اس کی اشاعت مناسب نہیں اور پتہ غیر معلوم !

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ نگار کے ذریعہ سے اس کے پہونچ جانے کی اطلاع آپ کو دے دوں اور اس وقت کا منتظر رہوں جب مراسلت کے لئے آپ اپنے پتہ سے آگاہ فرمائیں۔ تاہم فی الحال اس قدر کہدینے میں کوئی حرج نہیں کہ

تو پندار کہ ایں زمزمہ بے سازے ہست
گوشش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

نیاز

انسان

پر افشاں سرمدی نغمے مرے بربط کے تاروں میں نشاطِ جاوداں میرے گلستاں کی بہاروں میں
مری منت کشِ احساس ہے آسائشِ گیتی ہوائیں تازگی ، رقصِ مسلسل آبشاروں میں
مری موجِ تبسم ، جلوہ دیتی ہے گلستاں کو مری برقِ تجلّی ، مسکراتی ہے ستاروں میں
مرے ابرِ کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی وہ موجِ رنگ محوِ رقص ہے جو لالہ زاروں میں
زمیں کیا، آسماں کیا، اور ان کی داستاں کیسی!! یہ میرا ذکر فطرت کر رہی ہے استعاروں میں
غلط کیا ہے، جو خود بینی مرا آئینِ ہستی ہے کہ ہے خود حُسنِ پنہاں بھی تو میرے بیقراروں میں
مری عظمت کو یہ خاکِ پریشاں کیا سمجھ سکتی! فلک پر بھی تو کوئی تھا نہ میرے رازداروں میں

امینِ سرِ پنہاں ، آرزوئے قلبِ دَوراں ہوں
فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں، میں وہ انساں ہوں

اجل کیا ہے ، فضائے زندگی کا بے کراں ہونا خزاں، یعنی نئے جلووں سے نظمِ گلستاں ہونا
پہنچ سکتا نہیں دستِ حوادث ، میرے داماں تک سکونِ موج ہے، بیتاب رہنا، پرفشاں ہونا
بنی سرنامۂ تکمیل پروانوں کی بیتابی ! نشاطِ روح ہے اس بزم میں آتش بجاں ہونا
مری تعمیر ہے کاشانۂ ہستی کی ویرانی شبک روحی کا اک عنواں ہے میرا سرگراں ہونا
جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی کہاں میں اور کہاں سرگشتۂ سود و زیاں ہونا
ترا اک کھیل ہے جوشِ ہجومِ جہل و نادانی ابھی باقی ہے اسرارِ حقیقت کا عیاں ہونا
تباہی کے علم لہرا چکے پہنائے گیتی میں یہ موجِ ناتواں اب چاہتی ہے بیکراں ہونا

تغیر کے مناظر ذرّے ذرّے سے نمایاں ہیں
زمیں سے آسماں تک مستقل آثارِ طوفاں ہیں

ارادہ ہے کہ اسرارِ نہاں کو برملا کر دوں جہاں کو جاودانی عشرتوں سے آشنا کر دوں
سنواروں اک نئے انداز سے بکھری ہوئی زلفیں عروسِ دہر کے جلووں کو پھر صبر آزما کر دوں

بہت فرسودۂ ایام ہے ترتیب گیتی کی — اب اجزائے کہن کو نذرِ سیلاب فنا کر دوں
اُٹھاؤں پہلے طوفاں جس سے عالم خاک ہو جائے — پھر اس طوفانِ بربادی کو جولانِ صبا کر دوں
محبت عہدِ نو میں نامۂ ہستی کا عنواں ہو — شبوں کو صبح کے مانند رنگیں ماجرا کر دوں
ہر اِک ذرّے سے پھوٹیں سرمدی انداز کے چشمے — فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو رہا کر دوں
مٹا کر تفرقے مزدوری و سرمایہ داری کے — علم حریتِ کامل کے دُنیا میں بپا کر دوں

رگِ افسردۂ ہستی میں روحِ بے قرار آئے
گلوں کی طرح ذرّے مسکرائیں وہ بہار آئے

علی اختر (اختر)

مجموعۂ استفسار و جواب

ایکہزار صفحات کا گنجینۂ علم و ادب طیّار ہو رہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ عہ/ جسکی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا۔ چونکہ اعلان کی میعاد ختم ہوگئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب عہ/ بھیجکر اپنا نام درج نہ کرائیں

طیاری کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایکروپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا۔ کم از کم پانچروپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

منیجر نگار لکھنؤ

خوابستان محبت

کیطرف

بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں
جہاں سراب کو موجِ شمیم کہتے ہیں
جہاں ، نگاہ کو برقِ کلیم کہتے ہیں
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
وہ شہر جس کی زمیں آسماں کا دل چھینے !!
ہر ایک راہ گذر — کہکشاں کا دل چھینے!
فضا ، جہاں کی بہارِ جناں کا دل چھینے !
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل !
وہ صبح — آہ ، وہ ناظورۂ نشاط فروش
وہ شام - آہ ، وہ لیلائے میکدہ بردوش
وہ شہر — آہ وہ فردوسِ نارِ نوشانوش
بس ایک بار خدا کے لئے ——— وہیں لے چل !
وہ نذرگاہِ تمنا ——— وہ آستانِ مراد
ہے ذرہ ذرہ جہاں ——— خضرِ کاروانِ مراد
جہاں کی خاک بھی ہے نقشِ گلستانِ مراد
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل !
جہاں "شباب" کو آئینہ دارِ نور کہیں !
جہاں "شراب" کو نوبادۂ طہور کہیں
جہاں "خمار" کو تقدیسِ چشمِ حور کہیں !
بس ایک بار ——— خدا کے لئے وہیں لے چل
جہاں — نشاط کو اندیشۂ مآل نہیں !!
جہاں — خوشی کبھی شرمندۂ زوال نہیں !!
جہاں — حنائے کفِ پا بھی پائمال نہیں !!
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل
جہاں رواں ہیں شرابِ طہور کے چشمے
نشاطِ قدس کے دریا - سرور کے چشمے
جہاں ہیں رقص میں صہبائے نور کے چشمے
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل
وہ ارضِ قدس جہاں پر فنا کا نام نہیں
جہاں طرب کے لئے غم کا التزام نہیں
جہاں کی شمع کو افسردگی سے کام نہیں
بس ایک بار ——— خدا کے لئے ——— وہیں لے چل
سوادِ جس کا نمودِ وفائے لیلیٰ ہے
ہر ایک ذرہ جہاں کا دلِ زلیخا ہے
جہاں روش نے محبت کا خواب دیکھا ہے
بس ایک بار خدا کے لئے وہیں لے چل

رہ روش (صدیقی)

ملکہ نورجہاں تاریخ کی صحیح روشنی میں

(بسلسلۂ ماسبق)

درحقیقت شیر افگن کے قتل کا واقعہ یوں ہے

یہ تو ہم کو معلوم ہے کہ شیر افگن بنگال کا جاگیردار تھا شاہ اسمٰعیل صفوی کی وفات کے بعد علی قلی خاں قندھار کے راستہ سے ہندوستان آتا ہے اور خانخاناں کے دربار میں رسائی پیدا کرتا ہے رفتہ رفتہ دربار شاہی میں رسوخ ہوتی ہے۔ جہانگیر "شیر افگن" کا خطاب دیتا ہے اور بنگال میں جاگیر دے کر سرفراز کرتا ہے یہاں یہ نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ سنہ ۱۶۱۱ء میں بنگال میں افغانوں کی بغاوت زیر سرکردگی عثمان خاں شروع ہوتی ہے [۱]

بینی پرشاد اپنی کتاب جہانگیر میں لکھتے ہیں :۔

اس وقت بنگال میں بغاوت و سازش کا بازار نہایت گرم تھا، افغان سرکشی اور شرارت پر اتر آئے تھے (جہانگیر) کو شبہ ہوتا ہے کہ شیر افگن بھی باغیوں کے ساتھ شریک ہے، [۲]

---

[۱] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۲۶ و ۱۲۷ تاریخ ہند مولانا ذکاءاللہ جلد ششم صفحہ ۵۸

[۲] جہانگیر صفحہ ۱۳۲

نوٹ:۔ سرجدوناتھ سرکار اس مضمون کے سلسلہ میں میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر بینی پرشاد کی یہ دلیل کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ رامیشوری پرشاد (جنکی تاریخ ہند ہمارے صوبہ کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے)، نے بھی لکھا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ شیر افگن افغانوں کی بغاوت میں شریک تھا، میں ایک دوسرا مضمون "عثمان خاں کی بغاوت" پر لکھ رہا ہوں میرے اس مضمون کے پڑھنے کے بعد نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیا شیر افگن بغاوت میں شریک تھا یا نہیں

ظاہر ہے یہ شبہ جہانگیر کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا کہ وہ جس کو اوس نے جاگیر و خطاب دیا ہو عزت بخشی ہو سرپرستی کا ذمہ لیا ہو خود اوس سے باغی ہو جائے !!

جیمس برگس (James Burguss) لکھتا ہے :-

"۱۲ اکتوبر ۱۶۰۶ء کو قطب الدین بنگال بشمول بہار کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا ہے" اوس کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ شیر افگن علی قلی استجلو (مہر النساء کے شوہر کو دربار میں بھیجدے --- شیر افگن جانے سے صاف انکار کرتا ہے ، آخر کار آپس کی ایک جھڑپ میں ایک دوسرے کی جان جاتی ہے [1]

معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اس شبہ پر کہ شیر افگن باغیوں سے ملا ہوا ہے - اس کا بنگال میں رہنے دینا مناسب نہیں سمجھا ، اس لئے اس کو بلواتا ہے - اقبال نامہ جہانگیری کے بیان سے (James Burguss) (جیمس برگس) کے بیان پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ قطب الدین بنگال کیوں بھیجا گیا ؟ شیر افگن کی طلبی کی کیا وجہ تھی ؟ شیر افگن کی ہندوستان میں آمد ، اکبر کے دربار میں رسائی ، جہانگیر کا اس کو خطاب اور جاگیر کا دینا ، بیان کرتے ہوئے مصنف اقبال نامہ لکھتا ہے :-

" مگر معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت کا خمیر فتنہ جوئی اور شورش پسندی سے مرکب ہے " [2]

قطب الدین بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوتا ہے ، جاتے وقت جہانگیر ہدایت کرتا ہے :-

" اگر وہ (شیر افگن ، راست کرداری پر قائم رہے ، تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے ، ورنہ ہمارے پاس بھیجدیا جائے ، اور ، اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے " [3]

قطب الدین بنگال پہونچ کر شیر افگن کو طلب کرتا ہے ، وہ حاضری سے انکار کر دیتا ہے ، قطب الدین کو اُس کی اس حرکت سے " شبہ " ہوتا ہے ، اس کی اطلاع دربار میں کی جاتی ہے ، جہانگیر کا دوبارہ حکم آتا ہے :-

" اوس کو روانہ کریں اور اگر اس کے اطوار سے بد اندیشی کا اندازہ کریں - تو جس طرح رخصت ہوتے وقت ہدایت ہوئی تھی اوس ناہنجار کو سزا دیں " [4]

قطب الدین دوسرا حکمنامہ پاتے ہی شیر افگن کے یہاں خود جاتا ہے ، تاکہ اوس کو " گرفتار " کرے - گورنر کی آمد کی خبر

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۱۷

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً صفحہ ۱۸

سُن کر شیر افگن دو جلادوں کی معیت میں آتا ہے، موقع پاکر قطب الدین کے پیٹ میں تلوار بھونک دیتا ہے قطب الدین لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ منیر خاں کاشمیری آتا ہے، شیر افگن پر وار کرتا ہے، اور خود غریب کاشمیری ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس عرصہ میں قطب الدین کے آدمی موقع پر پہونچ جاتے ہیں۔ اور شیر افگن کو اوس کے کئے کی سزا دیتے ہیں [1]

جہانگیر کو جب قطب الدین کے مارے جانے کی خبر ملتی ہے تو وہ شیر افگن کو اس طرح پر یاد کرتا ہے :۔

مردم ہجوم آوردہ و اورا پارہ پارہ ساختند و بجہنم فرستادند امید ہمیشہ در جہنم جائے آں بدبخت روسیاہ بودہ باشد [2]

یہ ہے شیر افگن کی قتل کی ساری داستان ! باغی اور سرکش کی سزا ہمیشہ قتل و پھانسی ہوا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ شیر افگن کے متعلق خود جہانگیر اور گورنر دونوں کو "صرف شبہ" تھا، اس لئے جہانگیر قطب الدین کو تاکید کرتا ہے :۔

(۱) اگر خیر خواہی و راست کرداری پر قائم رہے تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے،

پھر تاکیداً کہہ دیتا ہے اگر ایسا نہ کرے،

(۲) تو ہمارے پاس بھیجدیا جائے،

پھر حکم دیتا ہے،

(۳) اگر آنے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے،

اس ساری تفصیل کے بعد ظاہر ہے کہ کون سی سزا مقصود تھی ؟ بلاشبہ یہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ شیر افگن قتل ہوا، لیکن کیوں اور کس لئے ؟ کیا اس لئے کہ جہانگیر کو مہرالنساء سے محبت ہوگئی تھی اور وہ اسے اپنی شریک زندگی بنانا چاہتا تھا یا اس لئے کہ شیر افگن نے اپنی بیوی کو جہانگیر کی مرضی کے موافق طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا ؟ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ شیر افگن کا جو بھی حشر ہوا وہ اوس کے کئے کی سزا تھی۔ بغاوت و سرکشی، فتنہ و فساد، سازش و ریشہ دوانی، اور سب سے بڑھ کر شہنشاہ کے حکم کی نافرمانی، شیر افگن کا سب سے بڑا جرم تھا۔ جیسا کہ جہانگیر نے لکھا تھا اگر وہ راہ راست پر آجاتا تو نہ وہ قتل ہوتا نہ جہانگیر غریب کو نئے نئے قسم کے افسانے گھڑ کر سارے زمانے میں رسوا و بدنام کیا جاتا !

اب میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ جہانگیر نے نورجہاں کو شیر افگن کے قتل کے بعد دیکھا، جیسا کہ Pietro Della Vella (پیٹرو ڈیلا ویلا) نے لکھا ہے، یا اگر اوس سے پہلے دیکھا بھی ہو تو یہ کوئی ضرور نہیں ہے، کہ اوس سے اوس کو عشق بھی ہو گیا ہو، اگر ایسا تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ جہانگیر جس کسی خوبصورت

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۱۶ و ۱۷

[2] ایضاً صفحہ ۵۶

عورت کو دیکھتا تھا۔ اوس سے اوس کو عشق و محبت ہو جاتی تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا

نورجہاں شیر افگن کے قتل کے بعد دربار میں بھیجدی جاتی ہے۔ جہانگیر اس کو اپنی سوتیلی ماں رقیہ سلطانہ کے سپرد کردیتا ہے [1] شیر افگن کے قتل کے بعد نورجہاں دربار میں بھیجدی جاتی ہے، قطب الدین کے مارے جانے کا جہانگیر کو بے حد ملال تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر شیر افگن تعمیل حکم میں بے اعتنائی و تغافل سے کام نہ لیتا، تو آج اوس کے مرحوم بھائی کو موت کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا

> ایک مدت تک یہ لڑکی (مہرالنساء) رقیہ سلطانہ کے پاس ناکامی و کس مپرسی کے ساتھ بسر کرتی رہی، جب اختر مراد کے طلوع، اور کوکب بخت کی ضیا پاشی ہوئی، اقبال نے استقبال کیا، طالع خواب گراں سے بیدار ہوا، سعادت نے مُنہ دکھایا، دولت جلوہ آرا ہوئی، دامن مرف مشاطگی ہوا۔ ہوس مچلنے لگی۔ اُمیدیں بڑھنے لگیں، آرزوئیں ہر طرف سے گھیرنے لگیں، در ہائے بستہ کی کلید مل گئی، دل ہائے بستہ نے دوا پائی۔ الحاصل کرشمہائے آسمانی سے ایک دن جشن نوروز میں جہاں پناہ کی منظور نظر ہوئی۔ پرستاران حرم سرائے کے گروہ میں شامل ہوکر، عزت و مراتب ارتقاء میں عروج حاصل کرتی ہوئی، علوی منصب کے آخری منزل پر پہونچ گئی پہلے "نورمحل" نام رکھا گیا پھر چند روز بعد "نورجہاں بیگم" کا خطاب عطا ہوتا ہے [2] و [3]

عشق، ماں، باپ، بھائی، بہن، عزیز و اقارب، کی محبت سے کہیں بلند و بالا ہوا کرتا ہے۔ اگر واقعی (جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں) سلیم کو مہرالنساء سے محبت ہوگئی تھی، اور یہ دیوانگی و عشق کا اثر تھا کہ وہ مہرالنساء کو ہر جائز و ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا چاہتا تھا، تو قطب الدین کے مارے جانے کے صدمہ کو، مہرالنساء کے عشق پر غالب نہ آنا چاہئے تھا۔ نورجہاں کے ساتھ جہانگیر کا تغافل، اور اس کی بے اعتنائی، صاف بتا رہا ہے۔ کہ سلیم کو مہرالنساء سے عشق تو کجا اُنس تک نہ تھا۔ اور یہ غصہ و رنج تو اوس وقت ہوسکتا تھا جب یہ معلوم ہوتا کہ قطب الدین کے قتل میں اُس کا بھی کوئی ہاتھ تھا۔ شیر افگن کے قتل کے متعلق جتنی تاریخی شہادتیں بھی میں نے پیش کی ہیں اُن سے اشارتاً و کنایتاً بھی یہ پتہ نہیں ملتا، کہ قطب الدین کے

---

[1] مہرالنساء، اور اس کی لونڈیوں کے لئے روزینہ خرچ کے لئے صرف ۱۴؍ مقرر کیا جاتا ہے تاریخ ہندوستان (History of India by Dow) صفحہ ۶

[2] اقبال نامہ جہانگیر صفحہ ۱۵ و ۱۶

[3] ۱۶۱۱ء میں نورمحل و مارچ ۱۶۱۶ء میں نورجہاں۔ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد

مارنے میں مہرالنساء کی بھی کوئی سازش تھی، ایسی حالت میں جہانگیر کے غصہ ورنج تغافل و بے مہری کی یہ ساری داستانیں کتنی مہمل دبے سروپا ہیں

درحقیقت یہ سب کچھ صرف اس لئے گھڑھا گیا ہے تاکہ ڈرامے کے تمام سین پوری طرح مکمل ہوجائیں

بیان کردہ واقعات کی تصویر میں، اگر آپ غور سے دیکھیں گے، تو آپ کو صاف معلوم ہوجائے گا، کہ جہانگیر کا عشق و محبت اوس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے شوہر کے قتل کے بعد مستقلاً دربار میں آکر رہ جاتی ہے۔ نورجہاں حسن وجمال میں یکتا تھی اوس میں اس کے دیکھنے والوں کیلئے کشش وجاذبیت تھی .... سلیم سب کچھ سہی، لیکن ذوق سلیم رکھتا تھا، وہ اگر مہرالنساء کی ان تمام خوبیوں کے باوجود اس سے لاپروائی برتتا اور اسے گوشۂ گمنامی میں چھوڑ دیتا تو آج ہم اوسے بدذوق کہتے

اس وقت تک جہانگیر و نورجہاں کی ملاقات اور شیر افگن کے قتل کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اوس سے پوری طرح یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سلیم نے مہرالنساء کو جب بھی اور جہاں کہیں بھی دیکھا ہو اس سے اس کو عشق یا اس کا شیدائی نہ تھا۔ اور شیر افگن اگر قتل ہوا تو اس لئے نہیں کہ بدقسمتی سے وہ مہرالنساء کا شوہر تھا بلکہ وہ مجرم تھا اور مجرم کی سزا جو ہونی چاہیئے تھی وہ اس کو ملی

اب میں اپنے مضمون کے تیسرے حصہ سے بحث کروں گا۔ اور دلیل وثبوت کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس الزام کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔ کہ جہانگیر نااہل و ناکارہ امور سلطنت سے بے سروکار تھا، اور سلطنت کی ساری ذمہ داری نورجہاں پر تھی۔ اور وہی سیاہ وسفید کی مالک تھی، جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی

چونکہ جہانگیر کے حسن وعشق کے افسانے کو اسقدر طول دے دیا گیا تھا اس لئے اس کی ضرورت پڑی کہ جہانگیر کو نااہل وناکارہ امور سلطنت سے بے سروکار عیاش و آرام طلب سب کچھ بنا دیا جائے، تاکہ آنے والی نسلیں جب جہانگیر کے متعلق کچھ پڑھیں تو صرف یہ ہی نہیں جانیں کہ وہ شرابی وکبابی عیاش و آرام طلب بدکار و نااہل تھا بلکہ اپنے لائق باپ کا نالائق بیٹا تھا، اس میں حکومت وحکمرانی کی قطعی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اور ان باتوں کو ہمارے مؤرخین نے نہایت آب ورنگ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے

اس سلسلے میں تین سوالات یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فقدان صلاحیت کب سے شروع ہوا؟، کیا جہانگیر شروع ہی سے حکمرانی کا نااہل تھا، یا نورجہاں کے آنے کے بعد سے اس کی ابتدا ہوتی ہے؟ ۱۶۰۵ء؁ میں جہانگیر تخت نشین ہوتا ہے

اور ۱۶۱۱ء[۸] میں نور جہاں اس کی شریک زندگی بنتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس چھ برس کے عرصہ میں اس نے حکمرانی کس طرح کی اگر واقعتاً اس کا ثبوت مل جائے کہ جہانگیر تخت نشینی کے بعد سے نور جہاں سے شادی تک نہایت تدبر ہوشیاری اور جس طرح ایک لائق بادشاہ کو حکومت کرنی چاہئے کی تو پھر یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۱ء تک وہ "لائق حکمراں" تھا

"اس شاندار اور لائق حکمراں کی سلطنت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی، تخت نشین ہوتے ہی، سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ کہ (Transit duties)، ہندوؤں پر سے (Pol tax) (جزیہ) نیز یتیموں کی جائداد سے، سمندر، اور کانوں کی پیداوار سے تقریباً ہر قسم کا ٹیکس اٹھا دیا۔"[۹]

"اس کی سب سے پہلی کارروائی نہایت منصفانہ اور کارآمد تھی، اس نے اپنے والد (اکبر) کے وقت کے تقریباً تمام وزرا کو اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا، اس نے اُن تمام (Taxes) کو موقوف و بند کر دیا جو نہایت قابل اعتراض اور تکلیف دہ تھے۔ اور جو اکبر کے زمانہ میں بھی موجود تھے، ہر شخص کو اجازت تھی کہ جب اور جس وقت چاہے، سلیم سے آ کر اپنے درد و دکھ کی شکایت بیان کرے۔ لیکن یہ اطمینان و سکون اور خوش حالی و فارغ البالی خسرو کی بغاوت کی وجہ سے درہم برہم ہو گئی"[۱۰]

ایک شخص جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت و قابلیت ہو، وہ بلا کسی وجہ و سبب کے حکومت دوسروں کے سپرد کر دے، عقل کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے میں کام کرنے کی اہلیت نہ پا کر دوسروں کے سپرد کر دے، لیکن ایسا کرنا انسانی فطرت کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان اپنے میں کام کرنے اور اس کو باحسن وجوہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو دوسروں کے سپرد کر دے۔ ایسا وہی لوگ کرتے ہیں اور اس کی آئے دن بیشتر مثالیں ملا کرتی ہیں کہ جب کسی ناکارہ و نااہل کے سپرد کسی قسم کی ذمہ داری کر دی جاتی ہے۔ تو وہ اپنی ہر ممکن کوشش سے اس سے علیحدہ ہی رہنا چاہتا ہے۔ جہانگیر اُن عیاش و نفس پرست حکمرانوں کی طرح نہ تھا، جن کا تنہا مشغلہ ناچ و رنگ، شراب و کباب، عیاشی و بدکاری تھا۔ بلا شبہ وہ زاہد خشک نہ تھا۔ وہ زندہ دل، اور صاحب ذوق تھا۔ وہ شراب پیتا تھا، ناچ و رنگ کی

بہ سلسلہ صفحہ (۱۳) [۸] تاریخ اسمتھ (Smith) ۱۲ر اکتوبر ۱۶۰۵ء

[۹] ایضاً

[۱۰] وقائع اسد بیگ صفحہ ۳،

[۱۱] مارشمین (Marshman) صفحہ ۶۳

محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کا تنہا مشغلہ نہ تھا وہ ان تمام چیزوں کا دلدادہ و شیدائی ہونے کے باوجود بھی ایک بیدار مغز، رحم دل، اور منصف مزاج حکمراں تھا

خسرو بغاوت کرتا ہے، دربار میں خبر پہونچتی ہے، امیر الامرا جہانگیر سے آکر دریافت کرتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے دیکھئے بادشاہ کن الفاظ میں حکم دیتا ہے:-

"اگر وہ راہ راست پر نہ آئے تو مجرم کی جو سزا ہوتی چاہیئے اس کے دینے میں تمہیں ذرا تامل نہ ہونا چاہیئے۔ ملوکیت باپ و بیٹے کے رشتہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتی اور یہ سچ کہا گیا ہے ایک بادشاہ اس قسم کے جھگڑوں سے بالاتر ہوتا ہے" [1]

ان جملوں کو بار بار پڑھیئے اور اندازہ لگائیے کہ کیا اس قسم کے الفاظ کسی ناکارہ و نااہل، عیاش و آرام طلب حکمراں کی زباں سے نکل سکتے ہیں؟ جواب نفی میں ہوگا

اب نورجہاں کی شادی اور اس کے اثر و رسوخ کے بعد سے جہانگیر کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ ۱۶۱۱ء یعنی شادی کے بعد سے اس نے حکومت کس طرح کی؟ اگر یہ صحیح ہے کہ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۱ء تک وہ نہایت بیدار مغز، منصف مزاج، اور رحم دل حکمراں تھا۔ تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر جہانگیر میں اس قسم کی تبدیلی کیوں پیدا ہو گئی؟ جہانگیر خود لکھتا ہے:-

"میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو گمراہ کن مشورہ کے قبول کرنے سے باز رکھا، میری ساری کارروائی، میری اپنی ہی سمجھ، اور میرے اپنے ہی تجربے پر مبنی رہی ہے، میرے دماغ میں والد مرحوم، اور میرے مذہبی پیشوا (شاہ سلیم چشتی) کا یہ مشورہ ہمیشہ جاگزیں رہا کہ بادشاہ اور شاہزادے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری ہیں ایک پیش بینی و دانائی اور دوسری کامیابی و فتح یابی" [2]

لوگوں کا یہ گمان بلکہ یقین کہ جہانگیر نورجہاں کے آنے کے بعد سے سلطنت کی تمام ذمہ داریوں سے علیحدہ و سبکدوش ہو گیا تھا، کہاں تک صحیح ہے؟ منقول الاخبار کے ذیل کے سطور سے اس کی پوری پوری تحقیق ہو جاتی ہے

"اس وقت یعنی ۱۰۲۰ھ [3] میں غریب و امیر، ادنیٰ و اعلیٰ سب یکساں طور پر خوشحالی

---

[1] واقعات جہانگیری صفحہ ۲۹۲

[2] تاریخ سلیم شاہی الیٹ جلد ششم صفحہ ۲۶۸

[3] مطابق ۱۶۱۱ء

فارغ البالی، اطمینان وسکون کی زندگی گذار رہے ہیں اور لوگ اندرونی اور بیرونی
تمام خطرات سے محفوظ ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ خدا کی درگاہ میں بادشاہ کے عروج و
ترقی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں جو ان کی نظر میں سلطنت کا محافظ اور خدا کا سایہ ہے[1]

ملک کی یہ حالت نورجہاں سے شادی کے ساتھ سات برس بعد (۱۶۱۸ء) کی ہے۔ پھر یہ الزام کس طرح عاید ہو سکتا ہے کہ جہانگیر نورجہاں سے شادی کے بعد ہی سے، سلطنت کے جھگڑوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ جہانگیر کی زندگی میں (موت سے کچھ دن پہلے) ایک دَور ایسا بھی آتا ہے، جب وہ تھک گیا تھا، اور سلطنت کے بارِعظیم کو تنہا نہیں اٹھا سکتا تھا، اور اس کی ضرورت ہوگئی تھی کہ امورِ سلطنت کی انجام دہی میں وہ اپنے خیرخواہوں اور ہمدردوں سے بھی مدد لے، یہ دَور اس کی ضعیفی اور بڑھاپے کا ہے، اس وقت وہ کوئی کام بغیر آصف خاں، نورجہاں اور دوسرے مُدبران سلطنت کے مشورہ کے نہیں کرتا تھا لیکن اس وقت تک جب تک اوس کے قویٰ مضمحل نہیں ہوئے تھے۔ اس کی صحت اچھی تھی، اور جب تک وہ تنہا سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کو کسی کی محتاجی نہیں ہوئی۔ علامہ شبلی "جہانگیر و تزک جہانگیری" میں لکھتے ہیں:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ مہمات پر فوجیں بھیج رہا ہے۔ کبھی ایک غریب بڑھیا کی ایک طاقت ور درباری کے مقابلہ میں دادرسی کر رہا ہے، کبھی علاقہ کی پیمائش میں مصروف ہے، کبھی صوبجات کے گورنروں کے نام احکام جاری کر رہا ہے، کبھی ملکی تحقیقات میں مصروف ہے، کبھی سرحدی حکمرانوں سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کبھی علماء کی مجلس میں شریک ہے، کبھی غیر مذہب والوں سے علمی مباحثے کر رہا ہے، ایسی حالت میں جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو ارباب نشاط و نغمہ و سرود سے بھی دل بہلا لیتا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو سب کو اس جرم کا مرتکب ہونا چاہئے!

ماہ سے می خور و نہ ماہ پارسا می باش"

جہانگیر کے متعلق مؤرخین کی یہ غلط فہمی، درحقیقت ذیل کی تین باتوں کی وجہ سے پیدا ہوئی،

(۱) جہانگیر کی نورجہاں سے غایت محبت،

(۲) سکوں پر نورجہاں کا نام، اور اس کی تصویر، اور نیز شاہی فرمان پر اس کے دستخط،

(۳) نورجہاں کی بیٹی (لاڈلی بیگم) کی نسبت پہلے فرخ (شاہ جہاں) سے، لیکن بعد کو بجائے فرخ سے اس کی شادی شہریار سے ہوتی ہے،

---

[1] الفضول الاخبار صفحہ ۲۴۹

اسی سلسلہ میں یہ بتا چکا ہوں، کہ جہانگیر نورجہاں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اوسے وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ ہولڈن (Holden) لکھتا ہے کہ جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کے بعد ایک مرتبہ کہا تھا کہ:۔

" اُس سے (نورجہاں) شادی سے قبل میں شادی کے اصلی مفہوم سے بالکل ناآشنا تھا " [۱]

جہانگیر کی یہ فریفتگی اوس وقت تھی جب کہ نورجہاں کی عمر پینتیس برس (۳۵ برس) [۲] تھی لیکن باوجود اس کے کہ اس کا سن زیادہ ہو چکا تھا اس کی کشش و جاذبیت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں پیدا ہوا تھا وہ اس وقت بھی جہانگیر کے لئے جوان تھی، خوبصورت تھی، حسین تھی، اس کی ہر ہر ادا اوس کے لئے ایک خاص اثر و کیفیت رکھتی تھی، نورجہاں پر اس کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب کبھی بیمار پڑتا تو طبیبوں کو یہ کہکر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیتا کہ:۔

" نورجہاں میرے لئے کافی ہے "

لیکن باوجود اس دیوانگی و عشق کے جو جہانگیر کو نورجہاں سے تھا ایک مرتبہ جب نورجہاں ایک شخص کو اپنے ماہتابی سے گولی مار دیتی ہے اور قاضی کا فیصلہ نورجہاں کے خلاف ہوتا ہے تو جہانگیر حکم دیتا ہے کہ نورجہاں کشاں کشاں دربار میں لائی جائے لیکن کسی طرح مقتول کے وارثوں کو ایک کثیر خون بہا دے کر اپنی برات کرا تی ہے اس واقعہ کے بعد جہانگیر محل میں جاتا ہے اور بے ساختہ نورجہاں کے پاؤں پر گر پڑتا ہے اور کہتا ہے:۔

" تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من " [۳]

گو اس واقعہ کو بہت سے لوگ صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے اس واقعہ کو صرف " ضرورت شعری " کے لئے " تصنیف " کیا تھا، خواہ تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط لیکن اس سے دو اہم نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہانگیر صحیح معنوں میں منصف مزاج تھا اور دوسرے یہ کہ اس کو نورجہاں سے بے حد محبت تھی، اس کا پیروں کو پکڑ کر یہ کہنا صاف بتا رہا ہے کہ جہانگیر نورجہاں کا شیدائی و دیوانہ تھا۔ اس سے اس کو سچا عشق تھا اور یہ حقیقت ہے کہ نورجہاں سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا ہونا اُس پر شاق گذرتا تھا [۴] اکثر وہ نورجہاں کو سامنے بٹھا کر پہروں

---

[۱] (The Moghal Emperor of India by Holden) صفحہ ۲۴۶ و ۲۴۷

[۲] Indian History by Rameshwary Prashad صفحہ ۴۹۳

لیکن لین پول (Lainpool) لکھتا ہے کہ اوس وقت نورجہاں کی عمر ۳۴ برس کی تھی صفحہ ۳۱۷ و ۳۱۸

[۳] جہانگیر و تزک جہانگیری از علامہ شبلی

[۴] جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۱۳۹

دیکھتا رہتا تھا۔ اور جب دربار کرتا تھا تو نورجہاں اس کی پشت پر پردہ میں بیٹھی ہوتی تھی۔ جہانگیر شراب بہت پیتا تھا، جب تک نورجہاں خود سے ڈھال کر اسے پیش نہ کرتی تھی وہ نہ پیتا۔ اس طرح نورجہاں کو اس کا موقع ملا کہ وہ جہانگیر کی شراب کی کثرت کو کم کرے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ جہانگیر اپنی آخری عمر میں بہت کم پینے لگا تھا یہ تھا جہانگیر و نورجہاں کی محبت کا عالم!

جہانگیر بیمار ہو کر کشمیر جا رہا تھا راستہ میں آصف خاں اور مہابت خاں سے ایک جھڑپ ہوتی ہے۔ آصف خاں کو شکست ہوتی ہے اور وہ بنارس میں پناہ لیتا ہے۔ اور مہابت خاں بادشاہ کا محاصرہ کرتا ہے اور جہانگیر گویا مہابت خاں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا ہے، نورجہاں بھی ساتھ گرفتار ہوتی ہے لیکن موقع پا کر نکل بھاگتی ہے اور تھوڑی سی فوج اکٹھا کر کے، مہابت خاں سے جنگ کرتی ہے، اور خوب لڑتی ہے، اور خوب خوب اپنا ہنر دکھاتی ہے، اور اس طرح جہانگیر کو ذلت و مصیبت سے نجات ہوتی ہے [۱] نورجہاں کا مہابت خاں اور اس کی فوج سے لڑنا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا صاف بتا رہا ہے کہ نورجہاں کو جہانگیر کا کتنا خیال تھا اور اس سے اس کو کس قدر محبت تھی، لیکن اگر ان حالات کے ماتحت جہانگیر نے کبھی نورجہاں کے نام پر سکے جاری کرا دیے، شاہی کاغذات پر کبھی اس کے دستخط ہو گئے تھے، تو اتنی سی بات پر ہمارے مؤرخین کا یہ فیصلہ کہاں تک درست ہے، کہ جہانگیر عضو معطل تھا اور نورجہاں جز وکل تھی، اور جو چاہتی تھی، اور جیسے چاہتی تھی کرتی تھی [۲]

جو لوگ عشق و محبت کے نفسیاتی پہلو سے واقف ہیں، وہ نہایت آسانی سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب صحیح معنوں میں کسی سے خلوص و محبت ہوتی ہے تو پھر آپس میں کسی قسم کا امتیاز و فرق باقی نہیں رہتا، اور یہ کوئی اعجوبہ بات نہیں ہے، اس قسم کی بیشتر مثالیں ہمیں آئے دن روزمرّہ کی زندگی میں ملا کرتی ہیں۔ میں خود دو دوستوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ جانتا ہوں کہ ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا۔ تو اگر شہنشاہ جہانگیر نے کبھی نورجہاں بیگم کے نام سے سکہ جاری کر دیا، شاہی فرمان اور کاغذات پر بجائے خود دستخط کرنے کے اس سے دستخط کرا دیا، تو کون سا جرم ہو گیا، اور اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عنان حکومت بھی نورجہاں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ درحقیقت یہ سب کچھ جہانگیر کی غایت

---

[۱] تاریخ ہندوستان آرٹسلیر و العقول اخبار صفحہ ۲۴۸

[۲] مورلینڈ (Jahangir's India by Morland) لکھتا ہے کہ شہنشاہ کے احکام اور عطیات پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہوتا تھا جب تک کہ ملکہ کی منظوری نہ ہو جاتی تھی۔ صفحہ ۵۰　لیکن فرنسس برنیر (Francis Bernir) نورجہاں کے (Extraordinary Domination) کے متعلق نہایت زوردار الفاظ میں لکھتا ہے لیکن اس قسم کی ایک مثال بھی ثبوت میں پیش نہیں کرتا۔ جہانگیر از بینی پرشاد صفحہ ۱۳۶

محبت کا اثر تھا کہ وہ اپنے اور نورجہاں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں پسند کرتا تھا۔ اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جب سے نورجہاں کی شادی ہوئی تھی اوس وقت سے لے کر جہانگیر کی موت تک برابر ملکہ ہی کے نام پر سکے جاری ہوتے رہے۔ اور شاہی فرمان و کاغذات پر برابر اوسی کے دستخط ہوا کئے

پروفیسر بینی پرشاد لکھتے ہیں :-

"کبھی کبھی اوس (نورجہاں) کے نام سے بھی سکے جاری ہوئے اور بعض فرامین پر اس کے دستخط بھی پائے جاتے ہیں" لہ

پروفیسر موصوف اسی سلسلہ میں نوٹ دے کر لکھتے ہیں :-

"معتمد خاں کہتا ہے کہ تقریباً تمام فرامین پر نورجہاں ہی کے دستخط ہوا کرتے تھے لیکن یہ بالکل غلط ہے بعض فرامین جن کا میں نے خود پتہ لگایا ہے اس پر نورجہاں کے دستخط نہیں ہیں اور بہت سے سکے جن کی تصویریں لین پول (Lainpol) نے دی ہیں نہ اون پر اوس کا نام ہے" لہ

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی شہنشاہ محل میں ہوں گے اور ملکہ نورجہاں ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی ہوں گی ایسی حالت میں اگر کوئی فرمان دستخط کے لئے پیش کیا ہو گا تو انھوں نے نورجہاں کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا ہوگا:-

"بیگم اس فرمان پر بجائے میرے تم دستخط کر دو"!

اسی طرح پر کبھی نورجہاں کے دستخط فرمان پر ہو گئے ہوں گے اسی طرح کبھی عالم سرور میں یہ کہدیا ہوگا کہ بجائے اس کی تصویر کے نورجہاں بیگم کی تصویر بنا دی جائے

نورجہاں کے اس خودساختہ اثر و اقتدار کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوئی، اوس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ شیر افگن سے اسے ایک بیٹی (لاڈلی بیگم) تھی جس کی شادی وہ شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) سے کرنا چاہتی تھی اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اس نے اپنے ہونے والے داماد کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ پروفیسر بینی پرشاد لکھتے ہیں :-

"کہ جب وہ خرم کی دوست تھی تو اس نے اس کو شاہزادگی کے انتہائی عروج پر پہونچا دیا، اور جب وہ اُس کی دشمن ہوگئی تو اس نے اس کو ذلیل و خوار کر دیا" لہ

لہ جہانگیر از بینی پرشاد صفحہ ۱۹۳

لہ ایضاً

لہ ایضاً طلطھا صفحہ ۱۸۵

واقعہ یوں ہے کہ نورجہاں اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی شاہزادہ خرم سے کرنا چاہتی تھی، اور آصف خاں بھی اپنی بیٹی ممتاز محل کی شادی خرم ہی سے کرنا چاہتا تھا۔ خرم بلند خیال، حوصلہ مند، اور دوراندیش تھا۔ اوس نے سوچا کہ اگر وہ لاڈلی بیگم سے شادی کرتا ہے تو اس کو سلطنت کے حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد نہیں ملے گی۔ برخلاف اس کے اگر وہ آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل سے شادی کرتا ہے تو آصف خاں سے مدد کی بہت زیادہ توقع ہے اور یہی ہوا خرم کی شادی ممتاز محل سے ہوگئی۔ نورجہاں کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اب اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا، کہ وہ لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کردے۔ نورجہاں خوب جانتی تھی کہ شہریار جہانگیر کے تمام بیٹوں میں سب سے زیادہ نااہل و ناکارہ، جاہل و بدسلیقہ تھا۔ آخر مجبوراً [1] لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے ہوگئی فطرتاً نورجہاں کی محبت و ہمدردی خرم کی طرف سے شہریار کی طرف منعطف ہوجانی چاہئے تھی اور ہوئی۔ اور اُس کی ساری کوشش اب اس میں صرف ہوتی تھی کہ وہ جہانگیر کو خرم کی طرف سے بدظن و بدگمان کردے۔ اور بجائے خرم کے ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث شہریار کو بنادے۔ ایک عورت اپنے حصول مقصد کے لئے جو کچھ کرتی ہے یا کرسکتی ہے وہ نورجہاں نے بھی کیا۔ اپنے داماد شہریار کے لئے شاہزادہ خرم کی دشمن ہوگئی۔ اور بھائی سے ہمیشہ کے لئے بگڑ گئی اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے وہ شہریار کی مدد و پاسداری کرنا چاہتی تھی اور اس نے کی

ایک شخص جس میں تھوڑی بہت بھی صلاحیت و اہلیت ہوتی ہے وہ تھوڑی سی مدد کے بعد خود سے اپنی راہ نکال لیتا ہے لیکن جو غریب خود ہی عقل و سمجھ سے معذور ہو۔ اور اسمیں اہلیت و صلاحیت کا فقدان ہو اس کی لاکھ ہمدردی کیجئے، مدد کیجئے، اس کو راہ بتلائیے، وہ جہاں اور جس جگہ پر ہے اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی حال غریب شہریار کا تھا۔ جتنی کچھ مدد نورجہاں نے اس کے لئے کی تھی اگر شہریار کی جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اپنی بہتری و بھلائی کی راہ خود نکال لیتا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی نورجہاں نے کیا اوس سے بھی لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ جہانگیر پر حاوی تھی اور سلطنت کے نظم و نسق کا دار و مدار اسی پر تھا۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے وہ جہانگیر کو اس بات پر مجبور کرتی کہ وہ خرم کو مجبور کرے کہ وہ لاڈلی بیگم ہی سے شادی کرے اور جہانگیر سے یہ کہتی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں شہریار کے حق میں وراثت کا اعلان کردے۔ لیکن اُس میں اتنی عقل و سمجھ تھی اور وہ شہریار اور لاڈلی بیگم کی محبت میں اسقدر پاگل نہیں ہوگئی تھی کہ ان باتوں کے آئندہ نتائج پر غور نہ کرتی اس لئے اس نے جہانگیر کو کبھی بھی اس کے لئے مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں وراثت کا اعلان کردے

اب ان تمام تفصیلات کے بعد ہر شخص اپنی اپنی عقل و سمجھ کے مطابق جہانگیر کی اہلیت و نااہلیت اور نورجہاں کے اثر و اقتدار کے متعلق خود فیصلہ کرے

شاہ محمد زُہیر (زبیری)

[1] ۱۶۳۱ء میں

کتنوں ہی نے اس سے بھاؤ کیا "
وہ ایک چڑیا دو پیسہ میں بیچتا تھا اور اس سے کم میں وہ کسی کو نہ دیتا تھا۔ جو لے سکتے وہ لیتے اور جو نہ لے سکتے وہ بھی مسوس کر رہ جاتے "
یکایک کسی نے رامو کو پکارا " ارے او چڑیا والے "۔ رامو لوٹ پڑا
دروازے پر ایک بیوہ کھڑی تھی اور پاس ہی ایک پانچ سال کی بچی ماں کے سہارے سے کھڑی ہوئی تھی
رامو کے پہنچتے ہی وہ سسکنے لگی، اس کا چہرہ شگفتہ ہوگیا اس نے کہا " نانی وہی وہ ادھر والی لال لال سی "!
" اچھا ٹھہر دو تو "! کہتے ہوئے بیوہ ضعیفہ نے رامو سے پوچھا !
" بول بھیا کے کے پیسے یہ چڑیاں دیں !
" دو دو پیسے مائی "؟ رامو بولا
" ٹھیک بتاؤ تو لے لوں ایک اس بچی کے لئے !"
بچی کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کاش چڑیا والا مان جائے۔ اُمید و یاس، یقین و شک۔ خوشی اور رنج کی لہریں اس کے چہرے پر تیزی سے آجا رہی تھیں۔ وہ منتظر تھی اور رامو کی طرف متجسانہ نظریں جمائے منتظر تھی کہ دیکھئے وہ کیا کہنے والا ہے ! یہ اس کے لئے انتہائی دلچسپ انتظار تھا اور گویا اس کی قسمت کا فیصلہ۔ اس کی نظریں رامو کے ہونٹوں پر جمی تھیں
رامو نے کہا " نہیں مائی کم زیادہ نہ ہوگا دو دو پیسے سبھی کو دیتا ہوں "
بیوہ بولی " اچھا تو تمھاری مرضی دو دو پیسے تو بہت ہیں "

(۳)

رامو لوٹا، لڑکی کا چہرہ اتر گیا۔ وہ نڈھال ہوگئی۔ اس کی روح چلا رہی تھی " مائی دو دو پیسے کیا بہت ہیں "
" رامو کیا تجھے ایک پیسہ کم کرنا مشکل تھا " اس کے جذبات میں ہیجان برپا تھا، معصومیت کے جذبات اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں سے نمایاں تھے، آخر کار وہ مایوس ہو کر مضمحل ہوگئی
ضعیفہ نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا۔ " جانے دے مرا بیٹا مرا لال جانے دے، دوسرا کوئی آوے گا تو تجھے بہت اچھی چڑیا لے دوں گی !
اس بے معنی ڈھارس کو بچی نے سنا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لئے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی

(۴)

آج خدا جانے کیا بات تھی کہ رامو کے قدم آگے نہ اٹھتے تھے۔ اور وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی گنگا کے کنارے

تک جاکر بغیر نہائے لوٹ آئے

گو اس نے اس خیال کو بھلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن نہ معلوم کیوں وہ خود اپنے آپ کو بھولنے لگا اس کی حالت گرتی جا رہی تھی وہ خود کو سنبھالنا چاہتا تھا ادھر اُدھر کی باتیں سوچتا طرح طرح کے جی بہلانے کے بہانے پیدا کرتا لیکن اس کے دماغ سے وہ معصوم نظریں دور نہ ہوئیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اپنی پُرنم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے آج راموایک گہری ندی میں ڈوب رہا تھا، اس کی ایسی حالت کبھی نہ ہوئی تھی وہ خود بخود کہہ رہا تھا کہ "نہیں میں ٹھیک نہیں کر رہا ہوں اس بے چاری بچی کے نازک دل پر میں ایک سخت پتھر مار کر چلا آیا ہوں اس کا چہرہ کیسا اتر گیا تھا اور اس کی آنکھ اُف ! ! کس طرح دیکھ رہی تھی . . . . . نہیں نہیں . . . . . . یہ ٹھیک نہیں۔ روزگار کے معنی یہ تھوڑے ہی ہیں کہ میں اس طرح سخت دل ہوجاؤں ایسا بیدرد بن جاؤں ارے رام رام ! کیا ہوتا اگر میں ایک ہی پیسے میں اسے دیدیتا . . . . . کوئی گھاٹے کا پہاڑ تو نہ ٹوٹ پڑتا نہ سہی ایک وقت تمبا کو نہ پیتا نہ سہی۔ خیر ساگ ہی روٹی کھا لیتا . . . . . . بچوں کا دل توڑنا رام رام بھگوان کی مورت توڑنا ہے جاؤں دے آؤں۔ مگر اب تو اتنی دُور چلا آیا۔ ہوگا بھی۔ دنیا کے یہی کارخانے ہیں۔ روزگار میں رحم سے کام نہیں چلتا۔ کوئی نہیں لے سکتا تو نہ لے "

(۵)

اس خیال نے راموکی روح کو جھنجھوڑ دیا وہ چونک پڑا اس نے گھبرا کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور دل کو مضبوط کرکے پھر وہی آواز لگانے لگا

لیکن اب بھی اسے معلوم ہو رہا تھا کہ دل کے اندر کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ اور اس کے تمام کاروبارانہ دلائل پست ہوتے جارہے ہیں،، اس کی حالت بدل رہی تھی اور وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت پا رہا تھا جو اب سے پہلے کبھی اس پر طاری نہ ہوئی تھی

راموں نے دیکھا کہ خاموش رہنے سے جذبات کا طوفان اور امنڈتا چلا آرہا ہے اور جس چیز کو وہ دبانا چاہتا ہے، زیادہ ابھرتی جاتی ہے اس لئے اس نے ہمت کرکے پھر آواز لگائی "للا کی چڑیاں . . . .

اُس کی آواز بیٹھ سی گئی تھی۔ الفاظ اس کے گلے میں پھنستے جا رہے تھے۔ اس کا جی بولنے کو چاہتا ہی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بغیر بولے ہی اس کی چڑیاں بک جائیں۔ تو اچھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہے

آخر کار راموں لوٹ پڑا۔ اُس نے سوچا کہ بچوں کے خون سے سینچ سینچ کر وہ اپنا باغ نہیں لگانا چاہتا۔ ان کے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا محل اٹھانا اسے پسند نہیں۔ اُسی دروازے پر پہونچ کر اس نے پکارا مائی۔ مائی !

غالب کا ایک شعر

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

حکیم ٹیگور فرماتے ہیں :-

"میں جاتی ہوں - رات کو
چپکے چپکے - دھیرے دھیرے
چھپ چھپ کر
اکیلی تنہا
یہ کون ؟ میرے ساتھ
قدم ملاتا آتا ہے
آہیں بھرتا رُک رُک کر
خاک اڑاتا پیروں سے
آہ

یہ میرا بدن
میرا ساتھ نہ چھوڑے گا
کہ وہاں جاؤں - اور اُس سے ملوں
اور اس کو دیکھوں - اور اُس کو دیکھوں
اور اُس کو دیکھوں
اکیلی تنہا -"

وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے ساتھ ہو - خود اُسے اپنا بدنی چولہ بھی اجیرن ہو گیا ہے - وہ خود اپنے تن من سے الگ

ہو کر اکیلی اُس کی خدمت میں جانا چاہتی ہے خدارا بتاؤ ، وہ کیونکر جائے اور کیونکر ملے ، اور کیونکر دیکھے اُس بت کو اکیلی تنہا

جسم خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا
کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

کیا غالب کا بھی یہی مقصد ہے ؟ نہیں - غالب اس سے بھی بلند جاتا ہے - وہ کہتا ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غیر تو غیر میں خود بھی نہ دیکھوں - نہ میری آنکھیں - نہ میرا دل - نہ میرا کوئی - نہ خود میں - وہ یہ نہیں کہتا " اکیلی تنہا " وہ تو اکیلا بھی اُسے دیکھ نہیں سکتا

یہ کیوں ؟ شاید اس لئے کہ داب حسن سے مرعوب ہے - شاید اس لئے کہ خود اس کے دل میں اپنی نگاہوں سے رشک کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے جو مانع ہے - شاید اُس کے نظارہ سے جو سرور پیدا ہوتا ہے اُسے برداشت نہیں کر سکتا وہ کہتا ہے یہ کم بخت " میں " بھی اُسے کیوں دیکھے - لہٰذا آنکھیں بند کئے پڑا ہے - تصور جاناں کئے ہوئے - مگر شاید تصور میں بھی نہ دیکھ سکتا ہو

یہ گتھی سلجھائے کون ؟

اس میں شک نہیں یہ عجیب و غریب رشک ہے جو بغض و حسد کے بھی کان کاٹتا ہے - بلکہ یوں کہئے اپنی ناک کٹا کر دشمن پر فتح پاتا ہے - راوی کہتا ہے کہ صبح سویرے بہتا ہوا خون دیکھنا شگون بد ہے - کسی کاٹھیاواری بزرگ کو اپنے ہمسایہ سے رقابت تھی - رقابت کی آگ تیز ہوتے ہوتے غالب مرحوم کے درجہ تک پہونچ گئی - ایک روز انھوں نے دیکھا کہ صبح تڑکے ہمسایہ سودا لینے منڈی جا رہا ہے - دل میں کہا یہ منڈی کیوں جائے ؟ مگر اُسے روک کیونکر سکتے تھے - بیوی سے چھری مانگی - " چھری لا - چھری لا - ابھی اس کا راستہ روکے دیتا ہوں " چھری لئے دوڑے دوڑے گئے اور ہمسایہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ناک کاٹ ڈالی - ہمسایہ بہتا ہوا خون دیکھ کر ڈر گیا - گھر واپس لوٹا کہیں مصیبت نہ آ پڑے - یہ بزرگ بھی کٹی ہوئی ناک ہاتھ میں لئے بال بچوں میں تشریف لائے - کامیاب و بامراد

فلسفی کہتے ہیں " میں " کی دو قسمیں ہیں - اصلی میں یعنی روح اور نقلی میں یعنی نفس - غالب کے شعر میں یہی اصلی میں شاید نقلی میں پر رشک کرتا ہو کہ یہ اُسے کیوں دیکھے ؟ یہ دیکھنے والا کون ؟ مگر یہ توجیہ درست نہیں - شاعر کہتا ہے - میں اُسے سرے سے نہ دیکھوں - نہ میرا اصلی میں نہ میرا نقلی میں - نہ میرا کوئی میں - میرے دل میں رشک کی جو آگ دہک رہی ہے وہ اجازت نہیں دیتی کہ اُسے دیکھوں - غیر تو غیر خود میں بھی نہ دیکھوں - کسی حال میں نہ دیکھوں کسی رنگ میں نہ دیکھوں

حکیم ٹیگو ناٹیگرا کے آبشار دیکھنے امریکا گئے - یہ آبشار دنیا کی سب سے بڑی آبشار ہے جو میلوں کی بلندی سے

پہاڑی چٹانوں پر گرتی ہے۔ دودھ سے زیادہ سفید اور چاندی سے زیادہ چمکیلی شفاف پانی کی چادریں جن پر صبح و شام سورج کی لہراتی ہوئی کرنیں رنگین ساڑیاں پہنے رقص کرتی ہیں اور قوس قزح کی رنگینیوں کو اس حسن سیّال کی نیرنگیوں پر نچھاور کرتی ہیں

اس منظر کا سامنے آنا تھا کہ ٹیگور کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو اُبل پڑے اور وہ بے اختیار چلا اُٹھے

"واپس لوٹو۔ میں نہیں دیکھوں گا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ آبشار۔ یہ منظر۔
یہ قیامت۔ ہرگز نہیں۔ واپس چلو۔ قسم ہے آبشاروں کے دیوتا کی میں دیکھ نہیں سکتا
مجھ میں یہ قوت کہاں کہ اس حسن و سرور کے سمندر کا تماشا کروں۔ واپس چلو"

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اب شعر کی بلاغت ملاحظہ ہو کہ رشک و رقابت کا سارا الزام "قسمت" کے سر رکھا ہوا ہے۔ شاعر خود بری الذمہ ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

"قسمت" کا لفظ گویا اس اقلیم معانی کا جام جمشید ہے جس کے اندر سے حقایق و معارف کی کائنات شیشہ کی طرح روشن نظر آتی ہے۔ غالب یہ نہیں کہتے کہ میں اُسے نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ جب وہ جنت نگاہ ہے تو اُسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ مگر کیا کروں اس بدبخت "قسمت" کے ہاتھوں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے بڑھکر میرے لئے کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ دیکھ سکوں مگر نہ دیکھ سکوں۔ رشک کی آگ سے جل بھن کر کباب ہو جاؤں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

محمد اسحاق (امرتسری)

(نگار) ہمارے دوست محمد اسحاق صاحب نے غالب کے جس شعر سے متاثر ہو کر اظہار خیال فرمایا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ میرزا کی "رشکیہ" شاعری کی نہایت اچھی مثال ہے، لیکن اس سے بہتر مثال ایک اور ہے جس میں اُس نے صرف لفاظی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ایک حقیقی جذبہ کو حقیقی زبان میں ادا کیا ہے لکھتا ہے :-

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

محبوب کو دیکھ کر خود اپنے آپ پر رشک آنا، محض اک شاعرانہ حسن بیان ہے اور حقیقت سے دُور، لیکن محبوب کا دوسرے کے ساتھ ہونا یقیناً نہایت رشک انگیز بات ہے اور اس لئے دوسرے شعر میں واقعیت کی جھلک پیدا ہو جانے سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے

تغزل میں جن جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق صرف جذباتِ فتادگی سے ہے اور جو خالص عشقیہ کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن میں استدلال و حجت سے کام لے کر عاشق اپنے حقوق ثابت کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں رشک و حسد، طعن و تشنیع بھی کچھ معرض بیان میں آجاتے ہیں،

پھر جس طرح اول الذکر جذبات کے لئے میر و درد کا تغزل معیاری چیز سمجھا جاتا ہے، اسی طرح موخر الذکر بیان کے لئے مومن و غالب کا کلام خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ان دونوں میں افضلیت کس کو حاصل ہے تو میں بلا تامل مومن کا نام لے دوں گا

اس میں کلام نہیں کہ غالب کے یہاں رشک و طنز کی بعض عجیب و غریب مثالیں نظر آتی ہیں، لیکن اس کے بیان میں وہ بالکل نمایاں طور پر جارحانہ انداز سے کام لیتا ہے اور رشک کے جذبہ کو کھلم کھلا رشک ہی کے الفاظ میں ظاہر بھی کرتا ہے، برخلاف اس کے مومن کے یہاں یہ کیفیت نہ جارحانہ ہے اور نہ مدعیانہ، بلکہ اس میں وہی فتادگی پائی جاتی ہے جو "خصوصیات محبت" میں داخل ہے۔ غالب منہ پھوڑ کر صاف صاف کہدیتا ہے کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مومن بھی غیر سے محبوب کا تعلق پسند نہیں کرتے، لیکن اس کو ظاہر کرتے ہیں اس انداز سے :۔

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

مقصود تو یہی ہے کہ رقیب کی طرف نہ دیکھو لیکن منع کرتے ہیں اس طرح گویا کہ اس کے بڑے خیر خواہ ہیں اور محبوب کے جذبات کی رعایت ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے

رشک کی ایک اور نہایت لطیف مثال ملاحظہ ہو

رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل نامہ بر راہبر نہ ہو جائے

صورتِ حال یہ ہے کہ مومن نامہ بر کے ذریعہ سے اپنا پیام محبوب کے پاس بھیج رہے ہیں، لیکن اس کے جانے کے بعد جذبۂ رشک ابھر آتا ہے اور سوچتے ہیں کہ راہبر یوں سامنے جائے گا، ان کا نظارہ کرے گا، وہ بدگفتگو کی لذت اُسے حاصل ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خود بھی پیچھے پیچھے چل پڑنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں۔ لیکن ان خیالات کو جس خوبی سے ظاہر کیا ہے اور ایک لفظ راہبر لاکر جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں

مومن نے اگر اس جذبہ کو صاف صاف الفاظ میں بغیر کسی تعبیر شاعرانہ کے کبھی ظاہر بھی کیا ہے تو فتادگی عشق کی شان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا مثلاً :۔

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

یعنی وہ "جلی کٹی" سے کبھی کام نہیں لیتا اور متاثر ہو کر خود اپنی ہی پامالی پر قناعت کر لینا پسند کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔

جذبۂ رشک کی ایک نہایت پاکیزہ مثال اور ملاحظہ ہو

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

میرا مدعا اس تحریر سے غالب کی تنقیص نہیں، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ لوگوں کو مومن کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے جو تغزل کے لحاظ سے اپنا مثل نہیں رکھتا، اور جس کو لوگوں نے بالکل بھلا رکھا ہے

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ء		سنہ ۲۶ء		سنہ ۳۰ء		سنہ ۳۲ء	
ستمبر	۴ر	مئی	۴ر	اگست	۸ر	جون	۴ر
اکتوبر	۴ر	جون	۴ر	ستمبر	۴ر	جولائی	۴ر
سنہ ۲۳ء		اکتوبر	۴ر	اکتوبر	۴ر	اگست	۴ر
مئی	۶ر	نومبر	۴ر	نومبر	۴ر	ستمبر	۴ر
جون	عہ	دسمبر	عہ	دسمبر	۶ر	اکتوبر	۴ر
سنہ ۲۴ء		سنہ ۲۷ء		سنہ ۳۱ء		نومبر	۴ر
جنوری	۴ر	مارچ	۴ر	جولائی	۳ر	دسمبر	۴ر
فروری	۴ر	اپریل	۴ر	اگست	۳ر	سنہ ۳۳ء	
مارچ	۴ر	مئی	۴ر	ستمبر	۴ر	فروری	۴ر
اپریل	۴ر	جون	۴ر	اکتوبر	۳ر	اپریل	۸ر
مئی	۴ر	سنہ ۲۸ء		نومبر	۳ر	جولائی	۴ر
جون	۴ر	دسمبر	۸ر	دسمبر	۳ر	ستمبر	۴ر
جولائی	۲ر	سنہ ۲۹ء		سنہ ۳۲ء		اکتوبر	عہ
اگست	۴ر	مارچ	۸ر	جنوری	۱۳ر	دسمبر	۴ر
ستمبر	۶ر	اکتوبر	عہ	فروری	۴ر		
سنہ ۲۶ء		نومبر	عہ	مارچ	۴ر		
جنوری	۴ر	سنہ ۳۰ء		اپریل	۸ر		
اپریل	۸ر	مئی	۴ر	مئی	۴ر		

مینجر نگار لکھنؤ

سادھو کی بط

(نذرِ صنفِ نازک)

جنسِ لطیف کی بے شمار ساحرانہ ادائیں ایک نوجوان تارک الدنیا کے لئے دنیا کی تمام حسین وجمیل چیزوں سے زیادہ دلفریب ہیں۔ اگر اُس نے اپنی زندگی کے معصوم دَور میں تم کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ ضرور مہر وماہ کی خیرہ کن چمک اور تابناکیوں کو تمھارے حُسن کے آگے ہیچ سمجھتا۔ جونہی اس کی نگاہ تم پر پڑی اوس کا دل زخمی ہوگیا۔ اس کو تمھارے حُسن کی قوت کا اعتراف کرلینا پڑا، جن چیزوں کو دیکھ کر اُس کا معصوم دل پہلے لطف اندوز ہورہا تھا اُن کی دلفریبی تم کو دیکھنے کے بعد یکسر معدوم ہوگئی، تمھارا حُسن ان سب پر سبقت لے گیا۔ مناظرِ فطرت، لہلہاتے کھیت، سرسبز وشاداب مرغزار، خوبصورت چڑیاں، ان کے مسحور کن نغمے، پُرشکوہ عمارتیں، خوبصورت حوض اور فوارے غرض ہر چیز غیر دلچسپ، بے مزہ، پژمردہ اور بے اثر معلوم ہونے لگی۔ صرف تم اور تمھاری صنف ہی تمام شوخیوں، رعنائیوں اور دل آویزیوں سے معمور نظر آئی گویا تم ایک مرصع تاج ہو۔ تمھارے ایک جلوے نے اس کے دل کی گہرائیوں میں بلکہ اُس کی روح میں درد، اثر، سوز وگداز پیدا کردیا

یہ نوجوان ایامِ شیر خوارگی سے جنگل میں پلا اور وہیں بڑا ہوا۔ اُس کی ماں کے انتقال کے بعد اُس نے اس بچے کو انسانی نظروں سے پوشیدہ کردیا۔ اور برسوں معصوم بچے کو خیال تک پیدا نہ ہوسکا کہ جنگل کے علاوہ بھی کوئی دنیا اور ہے؟ اُس کے تصور میں سوائے وحوش وطیور کے کسی اور ذی روح کا وجود تھا ہی نہیں

اس کے والد نے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کرکے اپنا مسکن صحرا میں کیوں بنایا؟ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انسانوں سے اُس کو نفرت تھی، اور دوسرا سبب اُس کی رفیقۂ حیات کی موت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد سے وہ نوعِ انسان اور انسانی معاشرت کو ملعون تصور کرتا تھا۔ اور اسی لئے اُس نے ترکِ دنیا کرکے اپنے لڑکے کو رہبانیت کی تعلیم دینے کا دل میں عزم کرلیا اور اپنی ساری دولت تقسیم کرکے، اپنے شیر خوار بچے کو گود میں لے، تن بہ تقدیر صحرا کی طرف چل کھڑا ہوا اور جنگل کے ایک نہایت تیرہ وتار حصے میں خلوت گزین ہوگیا۔

اس مقام پر اُس نے سینکڑوں باتیں اپنے کم سن بچے سے پوشیدہ رکھیں۔ ہرچند وہ بے رحم وحشی نہ تھا۔ اور اُس کا دل پیار و محبت کے جذبات سے معمور تھا۔ تاہم وہ سختی سے اس امر کا کوشاں تھا کہ اس کے لڑکے کے کان میں کوئی ایسا لفظ نہ پڑنے پائے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ کوئی رنگین، دلفریب، مسحور کُن دنیا اور بھی ہے اور اس میں کوئی ذی روح مخلوق ایسی بھی ہے جسے "عورت" کہا جاتا ہے۔ اس گوشہ نشینی کی زندگی میں وہ اپنے بچے کے دماغی نشو و نما کے لئے یہ خاص طور پر درس دیا کرتا تھا۔ جب اس کی عمر پانچ سال کی تھی تو اُس کے والد نے پھولوں، جانوروں اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے نام سکھائے۔ موقع و محل کے اعتبار سے وہ کبھی کبھی شیطان کا بھی تذکرہ کرتا تھا جو بقول اُس کے "ایک پُر ہیبت، ڈراؤنی شکل کا منحوس جانور" تھا

جب لڑکا دس برس کا ہوگیا تو اُس کو فطرت کی نسبتاً دقیق اور پیچیدہ چیزوں کی تعلیم دی گئی اور بعض ایسی باتیں ذہن نشین کرائی گئیں جن کا تعلق دوسری دنیا سے تھا۔ لیکن صنفِ نازک کا نام تک اس درس و تدریس کے سلسلے میں کبھی نہ آنے پایا

جب اُس نے عمر کی پندرہ منزلیں طے کرلیں تو وہ تمام باتیں جو اُس کی چھوٹی عقل میں آسکتی تھیں ذہن نشین کردی گئیں۔ اُس کو دنیا اور دنیا کی ساری اشیاء کے پیدا کرنے والے "خدا" کا نام بتایا گیا۔ لیکن کائنات کی سب سے زیادہ حسین و دلفریب مخلوق، قدرت کی لطیف و نازک پنکھڑی کے متعلق اُس نے اشارتاً یا کنایتاً کوئی لفظ مُنہ سے نہ نکالا۔ وہ ذکر کرتا کیونکر؟ جنسِ لطیف کا تذکرہ کرنا ایک راہب کے نزدیک جو دنیا اور دنیوی زندگی سے الگ تھلگ، صحرانشین ہوکر جوگ میں زندگی بسر کر رہا ہو بیکار تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا سراسر فضول تھا۔ اُس کی زندگی زہد و قناعت، استغنا و بے نیازی کی زندگی تھی

لڑکا اب بیس سال کا ہوگیا، اب اس کا والد اُس کو قریب کے شہر میں لے جانا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ اُس کو ضعف و نقاہت نے آن گھیرا اور تکمیل ضروریات کے لئے اب چلنا پھرنا دو بھر ہوگیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس فکر میں کھویا سا رہنے لگا کہ "میرے بعد میرا لڑکا کیا کرے گا؟ وہ دنیا کے لئے اور دنیا اس کے لئے ناآشنا تھی! تنہا کیا وہ اپنا پیٹ پال سکے گا؟ میرا بچہ بھیڑیوں اور وحشی جانوروں کو جانتا ہے، لیکن اُن میں بھلا انسانی ہمدردی کہاں؟" اس کو بخوبی علم تھا کہ اُس کے بعد لڑکے کو جو کچھ ورثہ ملے گا وہ صرف اُس کی ایک جھولی اور ایک عصا ہوگا، جس کا ملنا اور نہ ملنا برابر تھا

شہر میں بہت کم آدمی تھے جو اُس کو ایک آدھ روٹی نہ دیدیتے ہوں۔ اگر وہ حرص و آز کا بندہ ہوتا تو اُس نے ڈھیروں دولت جمع کرلی ہوتی۔ شہر کے سارے چھوٹے بڑے اُس کو جانتے تھے، جب کبھی اُس کا گذر ہوتا تھا تو وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلایا کرتے تھے "ٹھیرو سائیں ٹھیرو، یہ لیتے جانا!" کیونکہ وہ شہر میں بہت ہر دلعزیز تھا، لوگ اُس پر ترس

کھاتے تھے، اُس سے محبت کرتے تھے۔ لیکن ان ترس کھانے والوں میں کوئی عورت شامل نہ تھی کیونکہ وہ ان سے دُور رہا کرتا تھا

جب اس کو یقین کامل ہو گیا کہ اُس کی تعلیم نے اُس کے بیٹے کے دل و دماغ میں گہرے نقوش اختیار کرلئے ہیں اور اُس کے اثرات زائل نہیں ہوسکتے تو اُس کو شہر لے گیا

یہاں نوجوان راہب کو ایسی ہزاروں چیزیں نظر پڑیں جن کو اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا، اور جنسے وہ بالکل ناواقف تھا معصوم نوجوان فرطِ حیرت وانبساط سے ایک ایک چیز کے متعلق پوچھنے لگا " وہ جو سامنے نظر آرہا ہے کیا ہے ؟" اُس کے والد نے شفقت سے کہا " بیٹا ! اُسے محل کہتے ہیں ا" " اور وہ جو دوسری طرف ہے ؟" " وہ — فوارہ ہے !" " یہ ؟" " بت ہے — بیٹا !" ان چیزوں کو وہ نہایت شوق سے دیکھ رہا تھا کہ چند حسین وجمیل، کنواری لڑکیاں اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی گذریں۔ وہ فوراً اُن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب اُسے محل حسین نظر نہ آتا تھا، فوارہ کی دلفریبی غائب ہو چکی تھی، بت میں دلآویزی نام کو نہ رہی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو دیکھ کر خوشی سے چلّا اُٹھا " ابّا وہ کیا ہے، وہ ! جو اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس کا کیا نام ہے ؟" ضعیف راہب نے جس کو اس سوال سے انتہائی نفرت تھی بدمزہ ہو کر جواب دیا " یہ — یہ ایک پرند ہے بیٹا ! اس کو بطخ کہتے ہیں !" " کیسی خوبصورت چڑیا ہے !" نوجوان راہب نے سرور وانبساط کے عالم میں جھومتے ہوئے کہا " اے دل نواز طائر ! مجھے اپنے مسحور کُن نغمے سناتا جا ! کیا تو مجھ سے بات نہیں کرے گا ؟ ابّا ! پیارے ابا ! اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو اس طائر کو اپنے ساتھ لے چلئے، میں اس کو خود دانہ پانی دیا کروں گا "

(ڈاٹ فانٹین فرانسیسی فسانہ نگار) احسن (حیدرآبادی)

مطبوعات موصولہ

پردیس کی باتیں سفرنامہ میں جناب مرزا حسین احمد بیگ ناظم عدالت حیدر آباد کا جو ممالک اسلامیہ اور یوروپ کے دوران سیاحت میں مرتبہ کیا گیا ہے

ادب میں تاریخ و سفرنامہ کو تقریباً ایک ہی مرتبہ حاصل ہے، لیکن چونکہ سفرنامہ میں صرف ذاتی تجربات ایک خاص اسلوب سے بیان کئے جاتے ہیں اس لئے اس میں نسبتاً زیادہ شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اور لوگ اسے زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں علی الخصوص اس وقت جب سیاح نے اسے شگفتگی کے عالم میں مرتب بھی کیا ہو

مرزا صاحب کا یہ سفرنامہ میرے نزدیک اسی تحت میں آتا ہے اور مفید ہونے کے ساتھ ساتھ کافی دلچسپ بھی ہے۔ تصاویر وغیرہ بھی جابجا نظر آتی ہیں اور طباعت و کتابت بھی بنایت پسندیدہ ہے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے بہ اختلاف جلد تین روپیہ اور چار میں مل سکتا ہے

گاندھی نامہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مہاتما گاندھی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے لیکن نظم میں۔ اس کے مصنف میاں محمد رفیق ام۔ اے اُن لوگوں میں سے ہیں جو ملک و قوم کے خدمات کا سچا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس تصنیف کو حمد درجہ عقیدت و ارادت کے ساتھ پیش کیا ہے

اس میں مہاتما گاندھی کے بعض اہم سوانح حیات کو سامنے رکھ کر فاضل مصنف نے ایسے ایسے پہلو درس بصیرت کے پیش کئے ہیں کہ ایک شخص داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ مصنف ایسی خشک باتوں کو کیونکر ایسی پاکیزہ نظموں میں منتقل کر سکے۔ نظمیں مختلف بحروں میں ہیں اور طرز ادا کے تنوع نے ان میں بہت دلکشی پیدا کر دی ہے

راون کی رُوح کا گیت ملاحظہ ہو:۔

انجمن حیات میں　　محفل کائنات میں

عالم ممکنات میں

میرے شرار سے تپش　　میرے نفس سے جوش ہے

شعلۂ بیقرار سے　　ولولہ و خروش ہے

دہر کی ہر جمیل شے مجھ سے نمو پذیر ہے — بن کی اجودھیا پری مجھ سے خراج گیر ہے
مجھ سے نجوم تابدار تابش مستعار لیں — پھول جمال و حسن کا خرقۂ زرنگار لیں

شاخ نہال گلفشاں — مجھ سے بہار در بہار
حسن فروغ در فروغ — عشق شرار در شرار

خونِ رگِ حیات ہوں
میں نہ ہوں گر تو کچھ نہ ہو

نرگس خوابناک کو مژدۂ تم مری صدا — غنچۂ ناشگفتہ کو موج نسیم جانفزا
مجھ میں جہانِ زیست میں ربط ہو مثل جان و تن — ہم آثار وبودِ کار شاہد حق کا پیرہن

سوز درونِ خاک اگر — ایک شرر بھی کم ہوا
پھر سے دل کی خاک سے — اخگرِ تازہ دم ہوا

برق دل حیات ہوں
میں نہ ہوں گر تو کچھ نہ ہو

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظم و شعر کے لحاظ سے اس مجموعہ کا کیا مرتبہ ہے۔ تقریباً ۲۰۰ صفحات کا یہ بیش بہا رسالہ عمر میں فاضل مصنف سے باغبانپورہ لاہور کے پتہ پر مل سکتا ہے

نغمۂ روح جناب اختر انصاری بی۔اے بدایونی کے کلام کا مجموعہ ہے ——— جناب اختر انصاری کے کلام سے ہمارے ناظرین ناآشنا نہیں۔ ان کے قطعات گاہے گاہے نگار میں شائع ہوتے رہتے ہیں،

جناب اختر ملک کے ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کی موجودہ فکر سے اُن کے درخشاں مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ پاکیزہ خیال کے ساتھ پاکیزہ زبان استعمال کرنا۔ یہ ہے خاص معیار نظم کی خوبی کا اور ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ جناب اختر کے کلام میں دونوں کی کمی نہیں

اس مجموعہ میں قطعات بھی ہیں اور منظومات بھی، غزلیں بھی ہیں اور متفرق اشعار بھی، لیکن ایک ذہن خلاق اور فکر صحیح کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔ چونکہ اختر فطرتاً حسن پرست واقع ہوئے ہیں اس لئے آرٹ کی پسندیدگی کے ساتھ ساتھ جو جذبات قلب انسانی میں پیدا ہوتے ہیں وہ بہ کثرت ان کے کلام میں نظر آتے ہیں ——— ذیل کے چند اشعار سے اُنکے رنگِ تغزل کا پتہ چل سکتا ہے:-

کون ہے بے قرار میرے لئے — آج کچھ بیقرار سا ہوں میں

ہائے مدہوش رات کا افسوں میں زمیں پر ہوں روح تاروں میں

وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

غم کے جرعات ملتے ہیں جوں جوں عیش کی پیاس بڑھتی جاتی ہے

مٹ گئے وہ نظارہائے جمیل لیکن آنکھوں میں عکس چھوڑ گئے

ہر چند جناب اختر کا موجودہ رنگ کوئی مستقل رنگ نہیں کہلایا جاسکتا اور یقیناً مطالعہ و تجربات کے بعد اس میں کچھ نہ کچھ تغیر ہونا ہے، لیکن ہمیں ان کی فطرت سے توقع ہے کہ یہ تغیر مائل بہ پستی نہ ہوگا۔ ابتدا میں دو صفحات کا ایک مختصر سا دیباچہ بھی بہ اتباع آسکر وائلڈ درج کیا گیا ہے۔ جس میں آرٹ پر آسکر وائلڈ ہی کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے ——— اس کتاب کی قیمت عہ رہے اور مولوی محمد افضل خاں صاحب سے محلہ ناہر خاں بدایوں کے پتہ پر مل سکتی ہے

شعرستان و گلبانگ یہ دونوں رسالے مجموعہ ہیں جناب فہمی ترمذی کی ادبی و اخلاقی، قومی و وطنی نظموں اور غزلوں کے۔ جناب فہمی گو ادبی دنیا میں وسیع شہرت نہ رکھتے ہوں، لیکن اُس مخصوص حلقہ میں جہاں وہ زندگی بسر کرتے ہیں یا ان لوگوں میں جنھوں نے ان کے کلام کا بامعان نظر مطالعہ کیا ہے بہت عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں ——— مجھے خود جناب فہمی سے ملنے اور ان کا کلام سننے کا بارہا اتفاق ہوا ہے، اس لئے اگر میں اُن کا اور اُن کے کلام کا معترف ہوں تو اس کو میرا شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ فہمی جن صفات کا انسان ہے وہ واقعتاً بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور جو پاکیزہ قوت فکر انھیں نصیب ہوئی ہے، وہ کم لوگوں کو میسر آتی ہے

فہمی "ولولہ و جوشش" کی شاعری نہیں کرتے، بلکہ غور و تامل، فکر و تدبر کو پیش کرتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی اخلاق کا بلند پہلو ہمیشہ اُن کے سامنے رہتا ہے اسی لئے ان کے کلام میں ابتذال کا کہیں پتہ نہیں۔ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ فنی غلطیاں بھی بہت کم پائی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ فہمی اپنی فطرت کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ سرزمین بھوپال سے باہر ان کا نشو و نما ہوتا اور قدرت کی اس پاکیزہ ودیعت سے بہتر کام لینے کے لئے انھیں زیادہ بلند سوسائٹی نصیب ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ معیشت و معاشرت کی مجبوری نے انھیں بھوپال سے باہر قدم نہ نکالنے دیا اور اس طرح ان کا مستقبل تباہ

ہو کر رہ گیا

یہ دونوں مجموعے علے الترتیب ۸؍ اور ۶؍ میں جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتے ہیں

نقش آخر ڈرامہ ہے جناب اشتیاق حسین قریشی کا جسے جامعۂ ملیہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ جناب اشتیاق کے متعدد ڈرامے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں اور نگار میں ان پر ریویو بھی ہو چکا ہے۔ میں اشتیاق صاحب کی ڈرامہ نگاری کا معرف ہوں اور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی جو اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں کی طرح اس کو اختیار کریں۔

"نقش آخر" ان کا تازہ ترین ڈراما ہے جس میں تعلیم جدید کے نقائص کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر چند میں نے اسے بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن چونکہ اس سے قبل ان کے بعض ڈراموں کو دیکھ چکا ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے متعلق بھی وہی رائے نہ قائم کروں، جو دوسرے ڈراموں کے متعلق قائم کر چکا ہوں —— اس کی قیمت ۱۰؍ ہے

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں حصۂ دوم جناب محوی لکھنوی نے ان کہانیوں کو مرتب کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کا مطالعہ بچوں کے لئے فائدہ سے خالی نہیں لیکن زبان کے محاظ سے اس میں ہنوز ترقی و اصلاح کی گنجائش باقی ہے اور صحت تاریخی کے لحاظ سے بھی حذف و اضافہ ہونا چاہئے، تاہم ناشر و جامع کی نیت و خدمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب جامعۂ ملیہ دہلی سے ۸؍ میں مل سکتی ہے

بچوں کی نظمیں جناب سعید انصاری نے مختلف شعراء کی منظومات اس نام سے مرتب کی ہیں۔ اور انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ بچے متاثر ہوں —— شاعری کے لحاظ سے بعض نظمیں یقیناً قابل انتخاب نہ تھیں، لیکن فاضل جامع نے شاید اس کا لحاظ نہیں کیا اور صرف موضوع کی شگفتگی کو کافی سمجھا

اخیر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کرائے گئے ہیں۔ قیمت ۵؍ ہے اور ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی

نفسیات مذہب یہ مختصر سا مقالہ ہے جو سید وہاج الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے جامعۂ ملیہ دہلی کے جلسۂ اُردو اکاڈمی میں پڑھا تھا اور اب کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے

فاضل مقالہ نگار نے جس خوبی کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے وہ لائق صد ہزار تحسین ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس بحث میں مطلقاً تنگ نظری سے کام نہیں لیا اور "حاسۂ مذہبی" کی ضرورت کو جس انداز سے ثابت کیا ہے۔ وہ دوسروں کے "حاسۂ مذہبی" کا بھی احترام پیدا کرنے والا ہے

ہر چند مجھے اصولاً اکثر مباحث سے اختلاف ہے، لیکن پھر بھی میں فاضل مصنف کی کاوش و جستجو کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس تصنیف کی اس کی زبان ہے۔ جس نے ایسے خشک علمی مسئلہ کو ادب و شعر کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کیا۔ اس کی قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے

جمال الدین افغانی
یہ مقالہ بھی جامعہ ملیہ کے اُردو اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ قاضی عبد الغفار صاحب اس کے مرتب ہیں اور مکتبۂ جامعہ ملیہ ناشر۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قیمت ۸؍

فروغ اُردو
اسلامیہ کالج لاہور میں ایک بزم "فروغ اُردو" کے نام سے ۱۹۳۲ء سے قایم ہوئی ہے جس کے جلسوں میں پروفیسر اور طلبہ اپنے اپنے مقالے پڑھتے ہیں۔ انھیں مقالات کا مجموعہ اب اس نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں گیارہ مضامین ہیں جن کی فہرست یہ ہے :-

اقبال اور وطنیت ــــ اُردو شاعری میں ہجو ــــ ریختی ــــ اُردو میں سیاسی شاعری ــــ حسرت موہانی
غالب کی قنوطیت ــــ اردو شاعری میں حفیظ کا پایہ ــــ غالب کی رجائیت ــــ سائنس کے جدید نظریے
تجزیۂ نفسی ــــ خود تاثری ــــ اس فہرست کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادبی مقالات کے ساتھ ساتھ علمی مضامین بھی بزم میں پڑھے گئے ہیں اور میرے نزدیک اُردو کی صحیح خدمت یہی ہے

مقالات اچھے ہیں اور ان کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ یہ مجموعہ سکرٹری بزم فروغ اُردو اسلامیہ کالج لاہور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ قیمت ۱۲؍ زیادہ نہیں ہے

افسانہائے عشق
سات افسانوں کا مجموعہ ہے جنھیں حامد علی خاں صاحب بی۔ اے جائنٹ اڈیٹر ہمایوں نے دوسری زبانوں سے منتقل کیا ہے۔ ان سات افسانوں میں سے تین ٹگور سے لئے گئے ہیں، دو فسانے سنتا دیوی اور سیتا دیوی کے ہیں اور ایک زونا گیل کا

ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اصل زبان کا زور بیان باقی رہے اور ترجمہ بھی نہ معلوم ہو۔ اور اس باب میں حامد علی خاں صاحب کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ نظر آسکتی ہے

کتاب نہایت خوبصورت سائز میں شایع ہوئی ہے اور کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ جابجا تصاویر کے اضافہ نے اور حسن پیدا کر دیا ہے

یہ مجموعہ عہ؍ میں دفتر ہمایوں لاہور سے مل سکتا ہے

لاش اور دوسرے ہیبتناک افسانے
حجاب اسمٰعیل کے چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے دار الاشاعت پنجاب لاہور نے بہترین طباعت وکتابت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے

حجاب اسمٰعیل ہندوستان کی مشہور اہل قلم خواتین میں سے ہیں اور مُلک کے مختلف رسائل میں اُن کے افسانے شایع ہوتے رہتے ہیں۔ زبان وتخئیل دونوں حیثیت سے وہ کامیاب فسانہ نگار ہیں اور اتنی کامیاب کہ اس وقت ہم دو ایک میں بھی صرف چند اس مرتبہ کے ملیں گے۔ یہ مجموعہ ؎؍ میں مل سکتا ہے

میری ناتمام محبت اور دوسری رومان یہ بھی حجاب اسماعیل کے چار محبت بھرے افسانوں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے - قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ دہی دار الاشاعت پنجاب لاہور

نوادر لطائف وظرائف کا مجموعہ ہے جسے ہمارے لکھنؤ کے مشہور اہل قلم مرزا محمد عسکری بی-اے نے مرتب وشایع کیا ہے - اس موضوع پر اُردو میں متعدد کتابیں پائی جاتی ہیں، لیکن جو ترتیب مرزا عسکری صاحب کے پیش نظر تھی وہ غالباً کسی اور میں نہیں پائی جاتی - اس میں موضوع کے لحاظ سے بھی تقسیم کردی گئی ہے اور طبقہ کے لحاظ سے بھی

کتاب بہت دلچسپ ہے اور ایک روپیہ میں مؤلف سے حکیم عبدالعزیز روڈ لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے

سرگزشت اسیر فرانس کے ادیب شہیر وکٹر ہیوگو نے ایک فسانہ لکھا تھا جس کا نام "The last days of condemned" ہے - اس فسانہ سے اس کا مُدعا سزائے موت کی تنسیخ تھا - وکٹر ہیوگو جس مرتبہ کا لکھنے والا تھا وہ اہل نظر سے مخفی نہیں - اور موضوع جتنا اہم ہے وہ بھی محتاج بیان نہیں اس لئے ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ اُردو میں کیا جاتا - اور مُلک کو اُردو بُک اسٹال لاہور کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس نے اس ضرورت کو پورا کیا

اس کا ترجمہ کسی صاحب مسٹر سعادت حسن صاحب نے کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت صاف وسلیس ہے

قیمت عہ طباعت وکتابت کی خوبی کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے -

صدائے مشرق جناب فائق کرتپوری کے نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے - نظموں کا رنگ زیادہ تر اصلاحی ہے - قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ رام سوامی کوارٹر کراچی

حسن کار مختصر سا مجموعہ ہے چند ادبی تنقیدی مقالات کا جو محمد صادق صاحب ضیا کے فکر دماغ کا نتیجہ ہیں جناب ضیا ابھی طالب علم ہیں لیکن مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی طرف سے بہت ذہین دماغ لے کر آئے ہیں - اگر ان کی یہ مشق جاری رہی تو ہم کو اس سے بہتر نتائج فکر کی توقع رکھنا چاہئے - یہ مجموعہ ۸ر میں قصر الادب آگرہ سے مل سکتا ہے

دو آتشہ لالہ دیوان چند گڈھوگ نے فارسی، اُردو اور بھاشا کے متعدد ہم مضمون اشعار اور دوہے اس رسالہ میں یکجا کردیے ہیں اور کافی کاوش سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیا ہے۔

دیوان چند صاحب ایبٹ آباد میں نقشہ نویس کچہری ہیں اور انھیں سے ۸ر میں یہ کتاب مل سکتی ہے

مسلمانان موریشس کی تعلیمی ومعاشرتی حالت پر تبصرہ لوئس ماریشس کی مسلم ایجوکیشنل

سوسائٹی نے یہ رسالہ شائع کیا ہے تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کے حالات سے آگاہی حاصل ہو اور باہم برادرانہ تعلقات قائم ہو سکیں۔ ضرورت ہے کہ یہاں کے مسلمان اس کا مطالعہ کریں

پیغامِ فطرت جاذب دہلوی بی۔اے کی ایک نظم ہے جو جیبی سائز کے ۲۴ صفحات کو محیط ہے۔ نظم کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسانی مصائب کی ذمہ دار موجودہ تہذیب ہے۔ ۱۰/ قیمت ہے اور کتب خانہ علم و ادب دہلی سے مل سکتی ہے

گلدستۂ تبلیغ لاہور میں ایک ادارہ " اصلاح نوجواناں " کے نام سے قائم ہے، جس کا مقصود نوجوانوں میں صحیح مذہبیت پیدا کرنا ہے۔ اس گلدستہ میں اسی مقصد کے لئے وہ مختلف مضامین و مقالات جمع کر دیے گئے جو اس ادارہ کے ذریعہ سے شائع ہوئے۔ یہ مجموعہ ۸/ میں ادارۂ مذکور سے مل سکتا ہے

علی اور کعبہ امامیہ مشن کا چودھواں تبلیغی رسالہ ہے جسے مولانا سید آغا مہدی صاحب نے تصنیف کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کتب اہل سنت سے جناب علی کی ولادت کعبہ کے اندر ثابت کی جائے۔ ایک آنہ میں دفتر امامیہ مشن حسین آباد۔ لکھنؤ سے مل سکتا ہے

غریبوں کی دُنیا۔ امیروں کی دُنیا جناب دیوان امرناتھ صاحب محسن امرتسری کے دو مسدس ہیں جن میں ان دونوں طبقوں کی معاشرتی و اخلاقی زندگی کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو کچھ لکھا ہے وہ یکسر واقعہ و حقیقت ہے۔ زبان سادہ، الفاظ مؤثر، نیت مخلصانہ اور نتیجہ اخلاق آموز۔ اس رنگ کے مسدس میں اور کیا چاہئے۔ جس حد تک شاعری کا تعلق ہے اس کا اندازہ ذیل کے دو بندوں سے ہو سکتا ہے:۔

وہی فصل گل کی زرافشانیاں ہیں وہی جانِ بلبل کی دل سوزیاں ہیں
صبا کی وہی راحت افروزیاں ہیں وہی ابر کی عشرت آموزیاں ہیں
غرض دستِ قدرت کے شہکار سارے
غریبوں کی دنیا کے ہیں یار سارے

نہ پوچھو یہ کیا ہے کہ میروں کی دُنیا ہوا و ہوس کے اسیروں کی دُنیا
یہ ہے زہر آلودہ تیروں کی دُنیا بہ القصّہ یہ سخت گیروں کی دُنیا
مروت جسے کہتا ہے کل زمانہ
یہاں پائمال اس کا ہے آستانہ

یہ دونوں مسدس غالباً مفت ملتے ہیں

پردیسی کی فریاد

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں کی خاک بھی ہے آنکھوں سے لگانے کے قابل   وہ دیس جہاں کا ہر ذرّہ، ہے ایک عبادت خانۂ دل
وہ میرے خیالوں کی جنت، وہ میری امیدوں کا حاصل   وہ میری مرادوں کا مرکز، وہ میرے ارادوں کی منزل

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس، جہاں طفلی کی بہاریں دشت و رقصاں گزری ہیں   وہ دیس، جہاں غم کی گھڑیاں، صد رنگ بداماں گزری ہیں
وہ دیس، جہاں میری راتیں، سرشار و غزلخواں گزری ہیں   وہ دیس، جہاں میری صبحیں، مسرور و درخشاں گزری ہیں

اے موجِ صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس، جہاں ندی کے کنارے پہروں کھیلا کرتا تھا   کس شوق سے پانی کی لہروں کے رقص کو دیکھا کرتا تھا
مہتاب سُلانے آتا تھا، خورشید جگایا کرتا تھا   ہستی کے ستم سے ناواقف، جینے کی تمنا کرتا تھا!

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس، فضاؤں میں جس کی سرشار جوانی آئی تھی   وہ دیس جہاں دل میں اُلفت کی پہلی کرن تھرائی تھی
وہ دیس، جہاں اِک شوخ نظر پیغامِ جراحت لائی تھی   رگ رگ میں نہاں اِک درد سا تھا، اِک چوٹ سی دل پر کھائی تھی

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں بیکار تھیں سب ہستی کی ستم پرور گھاتیں دلچسپ وہ باغوں کی سیریں، دلکش وہ سہانی برساتیں
گھنگھور گھٹاؤں کا اُٹھنا، ساغر کی کھنک، سرخوش باتیں اللہ کدھر پنہاں ہیں وہ دن، اللہ کہاں ہیں وہ راتیں
اے موجِ صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

ہاں کچھ تو سنا اے روحوں کو پیغام طرب دینے والی مانا کہ فضائے گیتی میں ہے کھیل دلوں کی پامالی
مانا کہ زمانہ ہے یکسر انوارِ محبت سے خالی مانا کہ نہیں دنیا میں گراں یاروں پہ کسی کی بے حالی
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

للہ بتا! مجھ بیکس کو یارانِ وطن کیا بھول گئے پردیس کا عالم ہوتا ہے کس درجہ غم افزا بھول گئے
مدت سے ہے اک آوارہ وطن محروم تمنا بھول گئے آتا ہوں کسی کو یاد بھی میں سب مجھ کو وہاں یا بھول گئے
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

کہنا کہ تمہارے ساتھی کو دنیا کے ستم نے لوٹ لیا پردیس میں ہیبم ناکامی کے رنج و الم نے لوٹ لیا
ہستی کی متاعِ عشرت کو بے مہریٔ غم نے لوٹ لیا اُمید کو نا اُمیدی کے احساسِ اتم نے لوٹ لیا
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اس دیس کے رہنے والوں کا

گھنگھور گھٹائیں آتی ہیں، وہ منہ اشکوں سے دھوتا ہے غنچے متبسم ہوتے ہیں، وہ سر دُھنتا جاں کھوتا ہے
تم محوِ فغاں پاؤ گے اُسے، جب ذرہ ذرہ سوتا ہے روتوں کو ہنساتا تھا جو کبھی، دن رات پڑا اب روتا ہے
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اس دیس کے رہنے والوں کا

علی اختر (حیدرآباد دکن)

اعتبار

تجھے پاسِ عشق نہیں نہیں
مگر آہ مجھ کو یقتین نہیں

تری ہر نگاہ غرور سے
کششِ نمودِ غرور ہے
تری ہر نمایشِ تمکنت
کہیں عرش ہے کہیں طور ہے
ہیں گواہ تیری خموشیاں
کہ تو سنگدل بھی ضرور ہے
یہ سہی کہ میری ہر اک نظر
ترے التفات سے دور ہے

تو ہزار مجھ سے خفا سہی
تو ہزار مجھ سے جُدا سہی
تو عدوئے ذوقِ وفا سہی
مگر آہ مجھکو یقین نہیں

تجھے ایک نغمۂ بے اثر
ہے شکستِ رابطِ آرزو
ترے ابتسام سے شکوہ گر
خلشِ جراحتِ بے رفو
ترے لالہ زارِ نشاط میں
نہیں سوزِ مہر و وفا کی بُو
یہ سہی کہ تیری نگاہ میں
نہیں آنسوؤں کی کچھ آبرو

تجھے بیکسوں کی دعا سے ضد
تجھے التجائے وفا سے ضد
تجھے رسم و مہر و ولا سے ضد؟
مگر - آہ! مجھ کو یقیں نہیں

روشن (صدیقی)

"عہدِ حاضر کے فسانہ نگار"

افسانہ کے متعلق مشہور انگریزی شاعر ڈرائیڈن لکھتا ہے کہ " افسانہ شاعری اور مصوری کا نچوڑ ہے "
مادام نیکر کا خیال ہے کہ " افسانہ ادب کی شاعری ہے "
سٹلنگ فلیٹ کہتا ہے ۔ " کم از کم دل کو خوش کرنے کے لئے کہانی سچی معلوم ہونی چاہئے ۔ وہ برمحل، دلچسپ مختصر اور انوکھی بھی ہونی چاہئے ۔ اور جب کبھی وہ ان اصول سے انحراف کرتی ہے تو عقلمند سو جاتے ہیں اور بیوقوفوں کو واہ واہ کے لئے چھوڑ دیتے ہیں "
سر والٹر اسکاٹ کہتا ہے ۔ " میں حقیقت کے رُخ سے نقاب نہیں اٹھا سکتا ۔ میں تو تمہیں افسانہ سناتا ہوں کہ میں نے خود اُسے یونہی سنا ہے "
ہومر کی رائے ہے ۔ " افسانہ ایزدی نغمہ کی مانند نرم رو ہے "

دنیا کی ہر زبان کے علم و ادب پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ " افسانہ " کا وجود ہر ملک ہر قوم اور ہر زبان میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پایا جاتا ہے خواہ وہ زبان اور ملک اپنی معاشرت اور علم کی وجہ سے ترقی کے اعلےٰ مدارج پر گامزن ہو یا پستی کی ادنیٰ ترین منزلوں میں ہو ۔ چنانچہ ۔ امریکہ ، افریقہ ، اسٹریلیا ، چین ، جاپان ، روس ، جرمنی ، ترکی ، انگلستان ، مصر ، عرب ، اسپین ، اطالیہ ، فرانس اور ہر دوسرے ملک میں ، " افسانے " اپنی مختلف صورتوں میں موجود ہیں ۔ کسی ملک میں افسانہ نگاری اوجِ کمال پر پہونچی ہوئی ہے تو کسی زبان میں ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے مختلف ممالک میں " افسانہ نگاری " نے ، وہاں کے تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں ۔ اور یہ بات افسانوں کو پڑھنے سے خاص طور پر واضح ہوتی ہے ۔ مثلاً چینی افسانے ، جو اپنی افسانویت کے لحاظ سے دنیا میں بہترین سمجھے جاتے ہیں اپنی توہم پرستی کے لحاظ سے ممتاز ہیں ۔ کیونکہ چینیوں کی معاشرت میں " توہم پرستی " کا بہت بڑا عنصر شامل ہے ۔ اسی طرح عربی فسانوں میں وہاں کی معاشرتِ قدیم کا لحاظ کرتے ہوئے " عشقیہ فسانے " خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ ترکی فسانوں میں حریت اور جنگی جوش و خروش کا عنصر غالب ہوتا ہے ۔ مصری فسانوں میں " عریانی " کی جھلک نظر آتی ہے " روسی فسانے " انقلاب اور اشتراکیت پسندی کی کسی نہ کسی طرح تعبیر کرتے ہیں ۔ اور عموماً روزمرہ کی سادہ زندگی کا خاکہ ہوتے ہیں

امریکی افسانوں میں " شہر اغرسانی " کی بہتات ہوتی ہے اور اسی طرح ہندی فسانوں میں ، توہم پرستی اور اصنام پرستی دونوں ملی ہوئی پائی جاتی ہیں

جہاں تک میرے مطالعہ کو دخل ہے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دنیائے ادب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ چینی افسانے، اپنی افسانویت کے لحاظ سے بہترین اور بیحد دلکش ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ چینی افسانے عجیب غریب اور مافوق الفطرت واقعات اور حالات کی تصویر ہوتے ہیں ۔ اور انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ عجیب وغریب اور غیر فطری باتوں کو زیادہ دلچسپی سے سنتی .... اور پسند کرتی ہے ۔ اگر چینی افسانوں سے " توہم پرستی " کا جز نکال دیا جائے ۔ تو پھر ان میں کچھ نہیں رہ جاتا ۔ سارا افسانہ ، بے جوڑ اور غیر موزوں جملوں کا ایک بخیر بن جاتا ہے ۔ یہی بات ہندی فسانوں میں بھی پائی جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف اگر روسی یا عربی فسانہ نگاری کو لیا جائے ۔ یا انگریزی اور فرانسیسی فسانہ نگاری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ۔ وہ عین فطرت کے مطابق ہوتے ہیں یا ہوسکتے ہیں ۔ اور ان فسانوں کے کردار (Characters) ہمیں اپنے ہی جیسے انسان معلوم ہوتے ہیں ۔ قطع نظر اس کے اگر چینی فسانوں یا ہندی فسانوں کے کرداروں کو دیکھیں تو مقدم الذکر میں یا تو طوفان نوح سے قبل کے آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ جب ان کی عمریں پانچ پانچ سو برس کی ہوتی تھیں یا مؤخر الذکر میں انسان دیوتا بن جاتے ہیں

یہ خصوصیات جو میں نے بیان کی ہیں عہد قدیم کی فسانہ نگاری میں عموماً پائی جاتی ہیں موجودہ دور میں ، ہر زبان کے فسانوں میں ، انقلاباتِ زمانہ نے بہت کچھ تغیرات پیدا کر دیے ہیں ۔ اور ہر زبان میں فسانے فطرت کے مطابق ڈھالے جا رہے ہیں ۔ اور " فسانوں " سے " توہم پرستی " کا عنصر رفتہ رفتہ مٹتا جا رہا ہے

اُردو کے ، عہدِ طفلی کے اس صنف پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کہانی اور قصوں کی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں محیّر العقول اور عجیب وغریب باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ اور وہ واقعات درج کئے گئے ہیں ۔ جو بڑی حد تک کیا بالکل ناممکنات میں سے ہیں ۔ چنانچہ " الف لیلہ " کی داستانیں اور " طلسم ہوشربا " اور " حاتم طائی " کے فسانے ، سب عالمِ انسانی کے علاوہ ، کسی اور دنیا کے واقعات پیش کرتے ہیں ۔ جو اس دنیا میں رونما نہیں ہوتے ۔ نہ جن کے ہونے کا امکان ہے

فسانے میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے ۔ (۱) پلاٹ (۲) کردار نگاری (۳) طرزِ بیان ۔ جس افسانے میں یہ خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہوں وہی بہترین فسانہ کہا جاسکتا ہے اور جو فسانہ نگار ان امور کا لحاظ رکھتے ہوئے فسانہ تحریر کرتا ہے وہ بہترین فسانہ نگار کہلاتا ہے ۔ لیکن ایسے فسانہ نگار ہر ملک اور ہر زبان میں گنتی ہی کے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اردو فسانہ نگاری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ جس کے متعلق مجھے یہاں کچھ عرض کرنا ہے

اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ کہ اعلیٰ اور ادنیٰ معیار کے فسانے ہر زبان میں پائے جاتے ہیں ۔ مگر اُردو " فسانہ نگاری " اس وجہ سے اور زیادہ غیر اہم اور مہمل ہوتی جا رہی ہیں کہ جو شخص مضمون نگاری کی طرف توجہ کرتا ہے وہ

پہلے " فنِ افسانہ نگاری " کو تختۂ مشق بناتا ہے ـــــ حالانکہ مضمون نگاری شروع کرنے سے قبل مبتدی کو اپنے ذوق صحیح اندازہ کر لینا چاہئے کہ وہ کس " صنفِ ادب " کی طرف مائل ہے ـــــ اور ایڈیٹر، اس پر غور و خوض کئے بغیر، کو اپنے رسالوں میں تعریف اور شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں - ان کا مقصد اس سے مضمون نگار کی ہمت افزائی کرنا ہو ہے لیکن اس ہمت افزائی سے " اُردو فسانہ نگاری " پر جو بُرے اثرات مسلط ہوتے ہیں ان کو دور کرنا محال ہو جا ہے - حالانکہ ہمت افزائی کے اور بہت سے طریقے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اُردو میں جو فسانے لکھے جاتے ہیں - وہ عموماً عیو سے آلودہ اور بہت کم اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں

اگر کسی فسانے میں کوئی بات موجود ہو تو طرزِ نگارش نہایت بھونڈا اور استعارات اور تشبیہیں نہایت غیر موزوں ا مہمل ہوتی ہیں - کسی فسانے میں " عریانی " کا طوفان سا موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے تو کسی میں بے جا تفصیل کا ایک طوما باندھ دیا جاتا ہے - کہ پڑھنے سے دل گھبراتا ہے - اگر کسی فسانے میں " افسانویت " کا لحاظ بہ مشکل تمام رکھا جاتا ہے ا الفاظ اس قدر موٹے موٹے جمع کر دیے جاتے ہیں - اور طرزِ بیان اس قدر سنجیدہ، اور بعض اوقات اس قدر غیر دلچسپ ہوتا کہ سارا " فسانہ " اپنی خشکی کے لحاظ سے " ریگستان " بن جاتا ہے

بہرکیف، فسانہ نگاری پر اس مختصر تمہید کے بعد، اب میں نفسِ مضمون کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں - یعنی اُردو کے عہدِ حاضر کے فسانہ نگار، کس پایہ کے ہیں - اس مضمون میں نہ تو میں افسانوں پر تنقید کرنا چاہتا ہوں نہ تنقیص، نہ تعریف لکھنا چاہتا ہوں نہ تبصرہ - بلکہ چند فسانہ نگاروں کا (کیونکہ میرے نقطۂ نظر سے اُردو میں چند ہی فسانہ نگار موج ہیں - ورنہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ہر اُردو لکھنے والا افسانہ نگار ضرور ملے گا - اور اس لحاظ سے فسانہ نگاروں کی تعد ہزاروں تک پہونچ جائے گی) ایک مختصر سا تذکرہ پیش کرنا مقصود ہے جس میں یہ دکھایا جائے گا کہ ان کی فسانہ نگاری میں کیا خصوصیات موجود ہیں اور ان کا طرزِ نگارش کن خوبیوں کا حامل ہے - اور ان کے فسانوں سے عوام کو اور " اردو ادب " کو کیا فائدہ پہونچ رہا ہے

دَورِ اوّل

(خ)

خواجہ حسن نظامی

آپ کے فسانے عموماً غدرِ دہلی سے متعلق ہوتے ہیں - اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں - مغلیہ سلطنت کے زوال کے واقعات آپ اپنے افسانوں میں اس قدر دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں - کہ آدمی کے آنسو نکلنے لگیں زبان دہلی کی صاف اور شستہ ہوتی ہے قدیم دہلی کی زبان اور محاورات کا بہت کم استعمال کرتے ہیں - پلاٹ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا - کیونکہ زندگی کے کسی ایک واقعہ کی تصویر پیش کرتے ہیں - طرزِ بیان، اس میں کوئی شک نہیں،

اثر، موثر ہوتا ہے لیکن دیرپا نہیں۔ کردار نگاری کی طرف خاص توجہ رکھی جاتی ہے، واقعات، انسانی فطرت کے بالکل مطابق ہوتے ہیں۔ تصنع اور مبالغہ سے کام نہیں لیتے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

"اب تو کوئی امید دلی آسکنے کی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں پر بہت سے برُے وقت آچکے ہیں۔ حضرت بابر پر ہم سے زیادہ مصیبتیں پڑچکی ہیں۔ مگر وہ اتنے مایوس نہیں تھے جتنے ہم مایوس ہیں۔ کیونکہ اُن کی ہمت کے سامنے ساری دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے، ہزاروں، لاکھوں آدمی ان کی حمایت کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور ان کی مصیبت دُور ہو جاتی تھی۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہوتا۔ اور دنیا میں ہمدردی جب ہی ہوتی ہے کہ ہمدردی کرنے والے کو کسی سے کچھ امید اور توقع ہو۔ ہم سے کسی کو کیا امید ہوگی۔ اور کیا توقع ہوگی۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومت ختم ہو چکی۔ ہمارے اقبال کا چراغ گل ہو چکا، ہمارے سب حمایتی مرچکے۔"

"قسمت بیگ کی موثر اور مسلسل اور برجستہ تقریر کا ایک دوسرا اثر پیدا ہوا۔ اور مہاراج اپنے مہمانوں سمیت، پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا "کیا تم تیموری شہزادہ ہو؟" قسمت بیگ کو جوش آگیا۔ اور اس نے کہا۔ "شاہزادہ نہیں ہوں۔ آہ زادہ ہوں۔ دنیا کی مصیبتوں کی سب اذیتیں میں نے اٹھائی ہیں۔ تیموری خاندان تو اب مٹ چکا، جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی اور غلام بنالیا تھا"

راشد الخیری

آپ ایک کہنہ مشق فسانہ نگار ہیں۔ اور آپ کے فسانوں میں "غم" کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا خطاب "مصورِ غم" نہایت موزوں و مناسب ہے۔ آپ کے پلاٹ بیحد دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور کردار نگاری پر بھی آپکو کافی دسترس حاصل ہے۔ آپ کے فسانے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان بیحد مؤثر اور دلدوز ہوتا ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی آپ کے فسانوں کو پڑھ کر آنسو بہائے بغیر رہ سکے۔ زبان خالص دہلوی، صاف اور شستہ ہوتی ہے، قدامت کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ جس کو ہر بچہ اور بڈھا آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ آپ کے فسانوں میں عہد قدیم کی اسلامی معاشرت اور موجودہ خواتین کی معاشری اور سماجی اصلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے افسانوں میں ایک عیب اور سخت عیب ہے کہ ٹریجڈی پیدا کرنے میں وہ حد درجہ غلو سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر غیر فطری صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اسی کے ساتھ دوسرا عیب یہ ہے کہ اُن کے فسانے

یکساں انداز کے ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی تنوع نہیں ہوتا۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

"تم نے پڑھ لکھ کر، تعلیم کو بھی بدنام کیا۔ تم جیسی آزاد عورت سوسائٹی کے لئے باعث ننگ ہے ۔ ڈپٹی صاحب۔ تمہارے والد ، اباجان کے دوست ضرور تھے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اپنی تمام ضروریات تمہاری خواہشوں پر قربان کردوں تم اپنے اس طرزِ عمل سے اپنی بہنوں کو سخت نقصان پہونچا رہی ہو۔ اور قدرت نے عورت کا جو اعتماد مرد کے دل میں پیدا کیا ہے تمہاری حرکات سے مجروح ہو رہا ہے ۔ تم اپنے ساتھ اپنے صنف کی وقعت خاک میں ملا رہی ہو"

" پانچ بجے کے قریب مرزا فخر کی حالت بالکل بدتر ہوگئی ۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ تیمار دار خاموش ہوگئے باپ جس کا کلیجہ پہلے ہی چھلنی تھا۔ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ فخر کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا۔ اس کے قدم چومتا، منہ پر ہاتھ پھیرتا۔ سینہ کو بوسہ دیتا۔ اور الگ ہو کر چیخیں مارتا۔ اور پھر چمٹ جاتا۔ موت سے تھوڑی دیر پہلے جب بادشاہ کو پورا یقین ہوگیا کہ یہ عمر بھر کی کمائی لٹ رہی ہے۔ آنکھیں اس صورت کو ترسیں گی ، اور کان آواز کو تڑپیں گے ، تو بآوازِ بلند کلمۂ طیب پڑھا۔ مرزا فخر پر مذہب اس قدر غالب تھا۔ یا اُسے مذہب سے اس قدر تعلق تھا۔ کہ شہر کے اکثر نہیں بیشتر آدمی اس کو وہابی کہتے تھے ۔ وہ نذر و نیاز وغیرہ کا قائل تھا اور نہ اس قسم کے عقائد پر کاربند۔ مگر صوم و صلوٰۃ کا سختی سے پابند تھا۔ اور باوجود دولت وعزت، شباب و احباب کے درود و وظائف میں مصروف تھا "

" رات کے تین بجے ، جب افروز ، سلطان ، کو کلیجہ سے چمٹائے ۔ بے خبر پڑی سوتی تھی۔ دفعتاً سلطان کسمسایا ۔ اور اس نے دو دفعہ ٹھنک کر ، اونہہ ، اونہہ کی ۔ بچے کے ساتھ ہی افروز بھی اُٹھ بیٹھی اور چمکارنے لگی ۔ اس وقت بچے نے رو کر نہیں۔ کچھ بسور کر اماں ، اماں کہا۔ اَم کے ساتھ میم کی تشدید کو دونوں مرتبہ اتنا کھینچا کہ گھبرا گئی ۔ کچھ آج سلطان کا رات کو اٹھنا ۔ انوکھی بات نہ تھی وہ بارہا اٹھتا تھا۔ آج تو صرف ٹھنکا ۔ ورنہ کئی دفعہ رویا ، چیخا ، چلایا ، مچلا ، مگر اس نے کبھی پانی پلا کر ، کبھی سر سہلا کر سُلا دیا۔ اس وقت نہ معلوم "اس ام —— ماں اور دونوں کے بیچ میں ایک اونہہ کیا طاقت رکھتی تھی ۔ سر ، پاؤں ، ہاتھ ، پیٹ ۔ سینہ ، سارا بدن لپیٹ گود میں لے کر بیٹھ گئی ۔ جوانی کی نیند ، رات کا آخری وقت ، برسات کے دن ، جھونکے خود بھی آرہے تھے ، مگر اس کی اذیت کے خیال سے نیند وبند سب اُڑ گئی ۔ بچہ رو اب بھی نہیں رہا تھا۔ مگر اسی طرح رک رک کر ام —— ماں ۔ ام ۔ ماں کہہ رہا تھا "

" فرق بیّن یہ تھا کہ اس کا بخار اُتر چکا تھا اس کو بخار چڑھا ہوا۔ اس پر طرہ ، طارق ماشاءاللہ پورا جوان ، چیر و چار نکھار و پانچ۔ فرزانہ غریب دھان پان ، عمر بھر کی روگی ، بارہ مہینے کی بیمار ، جس کو گرمی دانہ بھی موت کا بہانہ تھا۔ وہ گھر کا

رئیس تھا تو یہ بھی کچھ گری پڑی نہ تھی - مانا کہ سردار پور میں طارق کا راج تھا، مگر فرزانہ بھی وہ عورت تھی جو سردار پور والوں کی لاج رکھ گئی - ایسی حالت میں طارق کا یہ حکم، کہ فرزانہ اٹھ کر پانی ہلائے - اور شبانہ پاس سے اٹھ جائے سراسر بیجا تھا مگر خدا کی مار ہندوستان کے اس طرز معاشرت پر، جس نے عورت کو لونڈی اور ماما سے بدتر بنا دیا، بیچاری دونوں ایک جیسا انسان وہ، ویسی انسان یہ "

سجاد حیدر یلدرم

آپ اپنے ترکی افسانوں کے ترجمے کے لحاظ سے دنیائے افسانہ میں ممتاز شخصیت کے مالک ہیں - ترکی زبان و ادب میں آپ کافی دستگاہ رکھتے ہیں - آپ کی تحریروں اور ترجموں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ترکی ادب کا عمیق مطالعہ کیا ہے - چنانچہ آپ کے فسانے عموماً ترکی زبان سے ماخوذ وملخص ہوتے ہیں - طبعزاد فسانے بھی آپ لکھتے ہیں - لیکن ان میں بھی ترکی رنگ غالب ہوتا ہے - طرز بیان سلیس، عام فہم، دلچسپ اور لطف آگیں ہوتا ہے - سادہ، صاف اور عام فہم عبارت میں جو دلکشی آپ کے یہاں پائی جاتی ہے وہ اور کسی کے یہاں نہیں پائی جاتی - کردار نگاری بھی فسانوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے - سلاست، روانی اور جوش کے علاوہ آپ کے بعض فسانوں میں مزاحیہ رنگ بھی جھلکتا ہے - چونکہ آپ طبعاً شاعر واقع ہوئے ہیں - اس لئے عبارت میں بھی شعریت پیدا کر دیتے ہیں - فسانوں کو پڑھنے سے یہ امر بھی منکشف ہوتا ہے کہ آپ گرد و پیش کے حالات اور واقعات پر غائر نظریں ڈالنے اور ان سے نہایت اہم نتائج برآمد کرنے کے عادی ہیں فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ بھی آپ کے بعض کرداروں میں مستور ہوتا ہے - لیکن ترکی فسانوں کا ترجمہ کرنے میں ثقیل و غیر مانوس ترکیبوں سے آپ احتراز نہیں کرتے - نمونہ ملاحظہ ہو:-

" دوسری حسین اور خوبصورت چیز، جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا - وہ شمع تھی یہ نور عریاں مجھے گھنٹوں محو حیرت رکھتا تھا - اور کہیں قریب ہوا تو میں اس سے ملنے کے لئے بے اختیار، اس کی طرف بڑھتا تھا " " لیکن یہ کیا؟ مجھے روکتے تھے کیوں؟ کیوں مجھے اس حسین شئے سے ملنے نہیں دیتے تھے - اس لئے کہ پہلے کی طرح، ہر حسین شئے، شفیق نہیں - یہ حقیقت - یہ دلشکن حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی، اچھا ہوتا، جب ہی معلوم ہو جاتی "

" آجکل پردے کی سخت مخالفت چھڑی ہوئی ہے تمھاری اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ جدید خیال ہو یا کہنہ خیال ہو؟ کہنہ خیال ہوگے، کیونکہ پردہ کی مخالفت تو تم سے قیامت تک بھی نہیں ہونے کی؟

میں نے کہا - " بیشک، پردے کی مخالفت کون صاحب عقل کر سکتا ہے؟ "

" تو پھر یہ شکایت بھی چھوڑ دیجئے - کہ ہماری زندگی میں دلچسپی نہیں "

" اس کو پردے سے کیا تعلق ؟ "

" قیس کا باپ ، اپنے " دنیا کی نظر میں دیوانے " بیٹے کی حالت سے مایوس ہو کر اجابتِ دعا کی اُمید میں مکہ آیا۔ وہاں آیا جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنائے کر آتا ہے۔ اور جہاں ، جس در کے سامنے ، جس چھت کے نیچے ، سب سے زیادہ صمیمی ، سب سے زیادہ دلی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یا زیادہ صحیح یہ کہ ہر جگہ سے زیادہ قوی ، اُمید اجابت کے ساتھ تختِ سماوی کی طرف جاتی ہیں۔ (ورنہ صمیمیت تو دنیا کے ہر گوشہ میں فریادِ قلب کر رہی ہے) ، وہاں وہ اسے لے کر پہونچا۔ خود خضوع و خشوع سے دعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابلِ رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دعا اٹھائے "

اور قیس نے دستِ دعا اٹھائے۔ اور انتہائے صمیمیت ، غایت تضرع سے ، اعماقِ دل سے نکلنے والی صدا سے دعا مانگی۔ مگر کیا ؟ وہی جو اس نے سیکڑوں برس پہلے مانگی تھی۔ اور جو ہر قیس طبیعت ، چاہے وہ کہیں ہو اور کسی زمانہ میں ہو۔ مانگے گا۔ " میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں ، خدا کرے وہ کبھی کم نہ ہو "

ق

قاری سرفراز حسین

آپ بھی ایک کہنہ مشق فسانہ نگار ہیں۔ زبان سلیس ، عام فہم ، اور دلی کی ٹکسالی ہوتی ہے۔ اصلاحی رنگ نمایاں ہوتا ہے ، سوشل اور معاشری نقائص کو بخوبی بیان کر کے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کردار نگاری سے خاص ذوق ہے۔ اور حتی الامکان ہر کردار کو اس کے فطرتی رنگ میں ظاہر کرتے ہیں۔ محاوروں کا استعمال اور تشبیہ و استعارات سے بھی عبارت کو سنوارتے ہیں۔ البتہ تحریر تاثیر سے یکسر معرا نظر آتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے دل پر کوئی اثر نہیں چھوڑتی۔ پلاٹ دلچسپ ہوتا ہے۔ طوالت پسند بیحد واقع ہوئے ہیں۔ اندازِ بیان میں ایک حد تک سوقیت بھی ہے ، نمونہ ملاحظہ ہو :-

" کیا آپ پر پھر مجھے گنہگاری میں پھنسانے اور اس معصوم بچی کو بدنامی اور بے عزتی کے داغ کے ساتھ دنیا میں لانے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کیا آپ کے دین نے یہی تعلیم دی ہے۔ اور کیا آپ کے خاندان کی شرافت کا یہی مقتضا ہے۔ کہ ایک معصوم بچی کو دُنیا میں لاکر بالکل بیچ دھڑے میں چھوڑ دو۔ تم نے ذرا اس کی صورت تو دیکھی ہوتی۔ آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ ماتھا کیسا چوڑا ہے۔ ناک نقشہ کس قدر درست ہے "

" ڈراما ہی کے متعلق نہیں ہم جملہ فنونِ لطیفہ ، مثل موسیقی ، رقاصی ، مصوری ، سنگتراشی وغیرہ کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ اگر دنیا کی ذہنی ترقی انھیں لائنوں پر ہوتی رہی جو ترقی کرنے والی دنیا کر رہی ہے تو خواہ مذہب کتنی ہی مخالفت

کیوں نہ کرے جملہ فنونِ لطیفہ کا رواج یا تالیقینی امر ہے"

دورِ ثانی

(الف)

اختر شیرانی

آپ نہ صرف شاعر ہیں، بلکہ فسانہ نگار بھی ہیں۔ اسی لیے آپ کی شاعری کا رنگ آپ کے فسانوں میں بھی جھلکتا ہے اور نہ صرف جھلکتا ہے بلکہ بہت حد تک آپ نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ آپ کی تحریروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ "حسن و عشق" کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ تشبیہ و استعارات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کو بار بار استعمال کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ یوں تو ایک لفظ کی تکرار عموماً زیادہ دلچسپ نہیں سمجھی جاتی، لیکن آپ ایک لفظ کو جب دو یا تین بار استعمال کرتے ہیں۔ تو طبیعت پر بار نہیں گذرتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ طبعزاد افسانے بہت کم ہوتے ہیں۔ عموماً ماخوذ یا انگریزی اور عربی کا ترجمہ ہوتے ہیں۔ مگر ترجمہ بہت شستہ اور صاف ہوتا ہے اور بالکل اوریجنل (طبعزاد) معلوم ہوتا ہے تحریر کے مختلف نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"یونان۔ تاریخی عظمتوں اور اصنامی رفعتوں سے لبریز یونان ——— کے آغوشِ عاطفت میں اس نے آنکھ کھولی۔ وہ دیویوں کی طرح حسین تھی۔ اور پھولوں کی طرح نازک۔ ستاروں کی مانند درخشاں تھی۔ اور پریوں کی طرح دلفریب۔ ہیلن کا، کافر ماجرا حسن اور محشر طراز شباب۔ بالآخر رنگ لا کر رہا۔ محبت کے شریر و حسین، مگر اندھے دیوتا کی ایک دن اس پر نظر پڑ گئی۔ اور شاید بلا سوچے سمجھے اس نے ایک تیر، ایک دلگداز مگر لذت آفریں تیر، اس پر صرف کر دیا۔ جو معصوم ہیلن کے نازک دل میں گھر کرتا ہوا۔ سمندر کی دیوی کے لختِ جگر، نوجوان شہیل کے جگر میں جا پیوست ہوا۔"

"اٹھو یا اخی! ——— آخر تمہاری نیند کبھی ختم بھی ہوگی۔؟ ذرا دیکھو تو تمام شہر میں کیسا ہنگامہ سا برپا ہے چاروں طرف لوگوں کے ہجوم بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اٹھو۔ اٹھو جلدی کرو۔ اپنے خنجر کو لے کے بھاگو ——— !"

"بھاگو ——— کہاں؟ کیوں۔ کیا بات ہے؟ کیا قاہرہ کو بھی قسطاط کی طرح آگ لگا دی جائے گی۔ ہمارے سر کوئی نیا ٹیکس منڈھا جائے گا۔ . . . . . غضب خدا کا۔ قاہرہ کی تمام سراؤں کو چھوڑ کر یہاں آ کر ٹھہرا تھا کہ یہ جگہ "باب الفتوح" سے باہر ہے۔ یہاں تو ترکوں اور کردوں کے ظلم سے نجات ملے گی! ——— مگر ———"

اعظم کریوی

آپ کے فسانے دیہاتی معاشرت و تمدن کے علمبردار ہوتے ہیں دہقانی زندگی کی صحیح روح اور معصوم کیفیات اپنے اندر مستور رکھتے ہیں۔ کردار نگاری میں بھی اچھا خاصا ملکہ ہے آپ انگریزی کے مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس (Charles Dickens) کی طرح عموماً پست یا اوسط طبقہ کے افراد، کرداروں کے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اور ان کو بہت خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ پلاٹ بھی دلچسپ ہوتا ہے۔ اور زبان میں، عربی یا فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کی بجائے سادہ، سلیس اور عام فہم ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ طوالت پسند نہیں ہیں۔ محاورے زیادہ اور تشبیہ و استعارات کم استعمال کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ ایک خاص نوعیت کے فسانے لکھتے ہیں جن میں بیشتر ترجمہ اور بہت کم طبعزاد ہوتے ہیں۔ آپ کی تحریر کے نمونے ملاحظہ ہوں

" بسنتا نے دانتوں سے اپنی زبان دبا کر کہا۔ " نانا یہ تم کیسی بات کہہ رہے ہو ؟ تمھارا جو کچھ ہے وہ سب جھنوا کا ہے۔ کھیت، مکان، سب پر اُسی کا حق ہے۔ اس کا حق چھین کر نرگ میں نہ جاؤں گا۔ رام رام یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بیاہ کا معاملہ تو میں اس سے دور بھاگتا ہوں۔ میں بیاہ کروں گا ہی نہیں "

بوڑھے نے مایوس ہو کر کہا۔ " کیوں ؟ "

بسنتا نے دھان کوٹتے ہوئے جواب دیا۔ " نانا تم بوڑھے ہو کر اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ بیاہ ہوتے ہی میں تم کو پرایا سمجھنے لگوں گا۔ یہی میرے چچا پہلے مجھ کو بہت پیار کرتے تھے لیکن جب سے ان کا بیاہ ہوا اور " چاچی " آگئیں تب سے ——— اور کیا کہوں ——— اور کچھ ڈر نہ ہوتا تو مجھے کچا ہی کھا جاتیں "

" لیکن راما نے ماں کا کہنا نہ مانا۔ اس وقت اس کے سامنے گذرا ہوا زمانہ تھا۔ پریما کی بچپن کی بے لوث محبت، اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اس نے تلسی سے سیدھا کی تھالی منگوائی اور اُسی وقت دُرگا کے دروازہ پر پہونچ کر آواز دی۔ دُرگا نے دروازہ کھول کر کہا۔ " کون ہے ؟ " راما نے جواب دیا۔ " میں ہوں راما "

" ہمارے دھن بھاگ۔ آئیے۔ اندر آئیے۔ کہیئے۔ آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آگئے ؟ " راما کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔ " ایشور جانتا ہے کہ میں گھر کے کاروبار میں پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی "

اس کا کچھ جواب نہ دے کر دُرگا نے پریما کو آواز دی۔ " بیٹی ذرا دیا جلا دے۔ مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں "

" جگن کو آج تک کسی نے جگن بابا کہکر نہیں پکارا تھا۔ وہ فرطِ جوش سے بیتاب ہو گیا اور دوڑ کر دیوان جی کا پاؤں چھو لیا۔ مصریا نے مہاراج کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ اس وقت دیوان جی یا مہاراج کو اس بات کا خیال بالکل

نہیں تھا کہ چماروں نے ان کا پاؤں کیوں چھولیا - اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ آنسو خوشی کے تھے رنج یا حقارت کا ان میں کوئی نشان نہ تھا - اس وقت پنچ اور اونچ کا سوال نہ تھا یہ پریم ملاپ تھا - سمتا پاسی کے ساتھ ہی سب لوگ یکبارگی چلا اٹھے - " جگن بابا کی جے ! "

آغا حیدر حسن دہلوی

آپ دہلی کی نسائی زبان لکھنے میں بہ نسبت اور فسانہ نگاروں کے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور آپ کو عورتوں کے محاورات استعمال کرنے میں کافی دسترس حاصل ہے - اکثر واقعات تاریخ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں - روسی فسانوں کی طرح آپ کے فسانوں میں بھی پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ، کسی ایک واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے لیکن جو کچھ بیان کیا جاتا ہے مکمل ہوتا ہے - طرز ادا بے حد دلکش اور ساتھ ہی ساتھ نقادانہ ہوتا ہے - کردار نگاری کسی حد تک اور منظر نگاری زیادہ حد تک پائی جاتی ہے آپ کی تحریر کے نمونے ملاحظہ ہوں

" ساون کا مہینہ - بلا کا حبس - کلو کو دھیانگی اٹھانے کی ملا توپ پڑی - پندرہ دن کا میلا چو پاکرتا پسینے میں شور بشور - گریبان کھلا - بازوؤں تک آستین بنی ہوئی چڑھیں - ننگے سر ، جوڑا بندھا - آڑا گنگابی پائجامہ - مارے پسینہ کے جگہ جگہ دھبے پڑے - موریاں کہیں گھیر کہیں - پنڈلیوں پر کی نیچے کی سیون گھوم کر اوپر آئی - کان میں کندلے کی ایک لیک بالی - جس میں سوکھے پھول مولسری کے بھرے - خیلہ خبطیوں کی سی وضع ، کارخانے پہ بیٹھی - سامنے بادلے کے تار تنے - جھپا جھپ ، جھپا جھپ ہاتھ چل رہا - اور دونوں پاؤں کے انگوٹھے باری باری سے اوپر ، نیچے ہوتے جاتے - جیسے بھی ہو چراغوں جلے تک تھپے کا تھان اتارے - کراتے ہیں ، کھڑکی والی ہمسائی نے کوٹھے پر سے آواز لگائی " وی بوا صدرحمت ! بھلا یہ بھی کوئی کام کا وخت ہے "

" جب اس شہدین اور دھینگا مشتی سے تھک کے ہلکان ہوگئیں - شربت کے لوٹے ڈال ، پاک وصاف ستھرے کپڑے پہن ، دروں دالانوں میں جا بیٹھیں - چھت کی کھڑکیوں ، بلیوں ، قلابوں میں جھولے پڑے ، کوئی تکیہ رکھ ، کوئی پٹڑی ، ان پہ جا ٹنگیں - ننھی نیندانوں نے گانا شروع کیا

" ماں آڑو جامن کھلے دھرے - ماں میں نئیں کھاتی میری ماں - ماں کپڑوں کی بقچی کھلی دھری ، ماں میں نئیں پہنتی میری ماں - ماں تتا پانی گرم دھرا - ماں میں نئیں نھاتی میری ماں ، ماں مسّی کی ڈبیا کھلی دھری ، ماں میں نئیں ملتی میری ماں ، ماں سرمہ دانی کھلی دھری ، ماں میں نئیں لگاتی میری ماں ، ماں ساجن آئے لینے کو - ماں میں نئیں جاتی میری ماں "

امتیاز علی تاج

آپ طبع زاد افسانے شاذ و نادر ہی لکھتے ہیں - طرز بیان سادہ ، عام فہم اور سلیس ہوتا ہے جہاں تک میرے

مطالعہ کو دخل ہے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تقریباً جتنے افسانے آپ کے اب تک شائع ہوئے ہیں - ان میں معدودے چند ہی طبعزاد ہیں - اور ان کو دیکھ کر آپ کے کسی خاص طرزِ نگارش (Style) کا پتہ نہیں چلتا - چونکہ فسانے ترجمہ ہوتے ہیں اس لئے ان میں اصل مصنف کا رنگ موجود ہوتا ہے - طبعزاد افسانوں کی عبارت موثر اور کسی قدر دلچسپ ہوتی ہے لیکن پلاٹ بہت ہی معمولی اور دلچسپی سے خالی ہوتا ہے - کردار نگاری میں آپ کی نظر زیادہ وسیع نہیں معلوم ہوتی - آپ کی تحریر کے نمونے حسب ذیل ہیں

" اس طرح وہ انتقام اور خون اور قوت اور جنون کی دنیا میں سانس لے لے کر جوان ہوئی تھی - اور اسے کبھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کے متناسب اور بھرے بھرے جسم کی دلفریبیاں ، ریشم کے رنگین اور باریک پیرہن میں کیا عالم افروز شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں - اور معطر بستر پر ، صرف اپنی دوشیزگی کے سوچ میں نیم دراز ہوجانے اور سیاہ اور رقیق آنکھوں کو جھپکا لینے سے کیسی قیامتیں بپا کر سکتی ہے - اس کو جھجکنے اور شرمانے ، مان لینے اور پسینہ پسینہ ہو جانے کی تعلیم نہ دی گئی تھی - اس کے باپ نے اس کے شباب کو لوہے اور شعلوں میں ڈھالا تھا - اور کچل دینے اور مسل ڈالنے کا سبق پڑھایا تھا صحرا کے وسیع میدانوں میں اس کا بیقرار گھوڑا ، ہنہناتا اور قبیلہ کے شمشیر آزماؤں کی تلواروں پر اس کی تلوار سے چنگاریاں جھڑتیں اور ہر روز ، جب وہ اپنے کارناموں میں کسی تازہ فتح کا اضافہ کر کے گھر لوٹتی ، تو اس کا باپ ایک فخریہ تبسم سے خود اس کو گھوڑے پر سے اتارتا - اور مسکرا کر اس کے کان میں کہتا - " صحرا کا لڑکا اب چپ رہتا ہے : اور غیادر کا نام سن کر ، اس کی زبان اپنے الفاظ بھول جاتی ہے " اور پھر اس کی خون آلود - تلوار اس سے لے لیتا - اور پھر اس پر سے خون پونچھا کرتا اور اُسے اتنا چمکا دیتا - کہ اس کے دانتوں کا عکس اس میں نظر آنے لگتا "

اب ایک بھیانک خیال نے اس کے دماغ پر قابو پا لیا - میرے پاس دو لاکھ فرانک نوٹوں میں ہیں - بے ایمانی سے آئے سہی - ہیں تو میرے - اور میں انھیں نہیں لے سکتا - ان کے پیچھے پانچ سال کی قید بھگتی - اب انھیں چھو نہیں سکتا - لوٹ میری راہ تک رہے ہیں - ایک لفظ صرف ایک جو یاد نہیں آتا - مجھ میں اور ان میں دیوار بن گیا ہے "

ب
پریم چند

آپ اُردو کے چند بہت بلند پایہ فسانہ نگاروں میں ہیں - آپ کی تحریروں میں اوریجنلیٹی (Originality) اور جدت ہوتی ہے - طرز بیان ، سادہ ، سلیس ، عام فہم ہونے کے علاوہ جادو کی طرح اثر کرنے والا ہوتا ہے پلاٹ نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوتا ہے جس پر فسانہ کی تعمیر کی جاتی ہے - محاورے نہایت موزوں اور برمحل ہوتے ہیں - تشبیہ اور استعارات بھی رنگین ہوتے ہیں - کردار نگاری میں مہارت تامہ حاصل ہے - عموماً دیہاتی زندگی اور معاشرت آپ کے فسانوں

کا مقصد ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس معاشرت اور اس زندگی میں جو نقائص ہیں ان کی اصلاح بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ یہی آپ کے فسانوں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مشرقی اور خصوصاً ہندوستانی تہذیب و تمدن کے پرستار معلوم ہوتے ہیں اور انھیں کو فسانوں میں بھی سراہتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں

" کنور صاحب کے دل میں پنڈت جی کی طرف سے جو بدگمانی اور کدورت تھی وہ بہت کچھ مٹ گئی، مگر انھوں نے ہمیشہ سختی اور ظلم سے کام لینا سیکھا تھا۔ انھیں اصولوں کے وہ قائل تھے، انصاف اور سچائی اور ملائمت کی انھوں نے کبھی آزمائش نہیں کی۔ اور ان پر ان کا بالکل اعتقاد نہ تھا۔ مگر آج انھیں صاف نظر آرہا تھا کہ سچائی اور نرمی میں بڑی طاقت ہے "

" وسودھا نے اسی انداز سے پھر پوچھا۔ " اگر وہ تجھے بٹھا کر کھلاتا تب تو، تو اس کی دھونس سہتی " کمیا جیسے لڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ بولی۔ " بٹھا کر کوئی کیا کھلائے گا سرکار۔ مرد باہر کام کرتا ہے تو ہم بھی گھر میں کام کرتے ہیں۔ یا گھر کے کام میں کچھ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ باہر کے کام سے تو رات کو چھٹی مل جاتی ہے۔ گھر کے کام سے تو رات کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ مرد یہ چاہے کہ مجھے گھر میں بٹھا کر آپ سیر سپاٹے کرتا پھرے تو مجھ سے تو برداشت نہ ہوگا "

" ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ " نہیں بابو جی۔ رہنے دیجئے۔ میں گریب (غریب) ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں "

" یہ بھیک نہیں ہے۔ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لئے ہے "

" نہیں بابو جی! "

" مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو "

" نہیں بابو جی۔ جس سے بیاہ ہوا۔ اس کی مرجا بھی تو میرے ہی ہاتھ ہے بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ۔ نہیں دیر ہو جائے گی "

میں دل میں اتنا خفیف کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باطن، بیخبر سمجھتا تھا اسی طبقہ کی ایک معمولی عورت میں یہ اعلےٰ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل۔ اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہوگیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیبِ نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں۔ تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہونچی ہوئی ہے "

جلیل قدوائی

آپ اُردو کے وہ تنہا فسانہ نگار ہیں، جنھوں نے روسی طرزِ نگارش (Style) اختیار کیا ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ اس رنگ میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے "چیخوف" کا بہت عمیق مطالعہ کیا ہے اور "موپاساں" کا بھی۔ چنانچہ آپ کے طبعزاد فسانوں میں بھی۔ انھیں دونوں مصنفوں کا رنگ جھلکتا ہے

"جلیل اپنی کہانیوں میں چیخوف کے بہت قریب پہونچ گئے ہیں"۔ جیسا کہ مولوی عبد الحق صاحب، بی۔ اے مدیر "اُردو" نے فرمایا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے پلاٹ ایک سرے سے مفقود ہوتا ہے البتہ کردار نگاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ طرزِ بیان، نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم ہوتا ہے آپ کے فسانے بھی چیخوف کی طرح روزمرہ زندگی کے کسی خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان میں مسرت اور غم دونوں شامل ہیں۔ آپ کے فسانوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور آپ انسانی فطرت کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں

"اُسے یاد تھا کہ اس کے باپ کے گھر میں کبھی ایک دیہات کی چڑیا کمرے کے اندر آجاتی تھی اور باہر نکلنے کی کوشش میں، وہ شیشہ دار کھڑکیوں سے ٹکرا ٹکرا کے کمرہ کی تمام چیزوں میں انتشار اور گڑبڑ پیدا کر دیتی تھی —— اسی طرح یہ عورت بھی، اس کی زندگی کے کمرہ میں ایک غیر خاندان سے اڑکر چلی آئی تھی۔ اور اس نے اس کے مکانِ عافیت میں ابتری پیدا کر رکھی تھی۔ اس کی زندگی کے بہترین ایام گویا جہنم میں گذارے گئے تھے۔ اس کی حوصلہ اور مسرت سے بھری ہوئی اُمیدیں منہدم ہوگئی تھیں۔ اس کی تندرستی برباد تھی۔ اس کے کمرے، بے ترتیب، اور گڑبڑ پیدا کرنے والی فضا، طوائفوں کے کمروں کا نمونہ تھے۔ اپنی دس ہزار کی سالانہ آمدنی سے، وہ اپنی ماں کے لئے، جو ضعیفی کے ایام گاؤں میں کاٹ رہی تھی۔ دس روپے بھی نہ بچا سکتا تھا۔ اور پندرہ ہزار سے زاید اس کا قرضہ تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کے گھر میں ڈاکوؤں کا ایک مستقل گروہ رہتا تو بھی اُسے اتنا نقصان نہ پہونچتا جس قدر بربادی اس نے اس عورت کے ہاتھوں اٹھائی تھی"

"کچھ قدم کے فاصلے پر وہ دیوار سے لگا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی ناک پر ایک مچھر بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ لیکن اُسے سوتے میں کچھ خبر نہ تھی۔ اس کا چہرہ بشاش معلوم ہوتا تھا شاید وہ خواب میں دیکھ رہا تھا کہ بستی کے تمام لوگ کھانسی میں مبتلا ہیں۔ اور اس کی دوکان سے دوا خریدنے آئے ہیں"

(ح)
حامد اللہ افسر میرٹھی

آپ کے فسانے عموماً ماخوذ اور ترجمہ ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان عام فہم اور سادہ ہوتا ہے۔ مگر کوئی دلکشی نہیں ہوتی۔ پلاٹ کسی قدر دلچسپ ہوتا ہے لیکن کردار نگاری میں بہت نقص پائے جاتے ہیں۔ محبت کی چاشنی بھی عموماً ہر فسانے میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے فسانوں میں نہ تو کوئی جدت ہوتی ہے نہ آپ سماجی اصلاح مدِ نظر رکھتے ہیں، نہ زندگی کے کسی خاص فلسفہ کو بیان کرتے ہیں، یعنی روزمرّہ زندگی کے واقعات سے اس قدر گہرے اور مفید نتائج نکالنے کی اہلیت نہیں رکھتے جو بعض اور فسانہ نگاروں میں موجود ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

"آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے شراب پینی چاہیئے، شاید اسی سے غم غلط ہو جائے۔ شاید میں خالدہ کو بھول جاؤں مگر یہ بھی میں نہ چاہتا تھا۔ میں تو اس تاریکی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ جو میرے حواس پر مسلط ہو گئی تھی۔ خالدہ سے اگر مجھے محبت تھی۔ تو اس محبت کو میرے دل کے لئے ذریعۂ شادمانی و مسرت بننا چاہیئے تھا۔ پس میرے موجودہ رنج و ملال کا سبب خالدہ کی محبت نہ تھی، بلکہ نعیم کی رقابت اور چچا میاں کے انکار سے اپنی تذلیل کا احساس تھا ان دونوں چیزوں کا ازالہ کرنا ضروری تھا اور مجھے پختہ یقین تھا کہ شراب مجھے اس مصیبت سے نجات دلائے گی"

"اس وقت ان کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ آنکھیں اُبل آئی تھیں منہ خشک ہو کر کھُل گیا تھا، ایسی عجیب ہیئت کس کی نظر اپنی طرف نہ کھینچ لیتی۔ اب گاڑی پاپنچی سے گزر چکی تھی۔ اور گذشتہ شب قتل کا واقعہ پاپنچی اور ہاپوڑ کے درمیان ہی ہوا تھا۔ درجہ کا دوسرا مسافر ذرا سنبھل کر بیٹھا۔ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ پھر بیگ بند کر دیا۔ داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت گنیش بہاری کے حواس قطعاً معطل ہو چکے تھے، انھیں چند منٹ سے زیادہ اپنی زندگی کی امید نہ تھی۔ وہ ہر لحظہ اس انتظار میں تھے کہ اب کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر میری روح کو تن سے جدا کیا جائے گا"

(خ)
خواجہ مسعود علی ذوقی، بی۔ اے

"آپ کے تمام افسانوں میں اوریجنیلٹی ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر اپنے ہی واقعات اور مشاہدات بیان کرتے ہیں پلاٹ عموماً دلچسپ ہوتے ہیں۔ فسانوں میں روزمرہ زندگی کے ساتھ ساتھ سوسائٹی اور معاشرت پر نقادانہ نظر ڈالتے ہیں۔ طرزِ بیان بہت دلکش ہوتا ہے کردار نگاری کی طرف بھی خاص توجہ رکھتے ہیں۔ آپکے فسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت منظر کشی ہے۔ ہر موقع اور مقام کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے اصل چیز، اصل موقع اور مقام پھرنے لگتا ہے، محاورات اور تشبیہات سے بھی عبارت کو رنگین بنانے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

" اس کے علاوہ ، آزادی ، انسان کا پیدائشی حق ہے ، خواہ وہ روحانی آزادی ہو ۔ خواہ جسمانی ، خواہ مذہبی ، اچھا ۔ سے جانے دیجئے ۔ یہ جو عجیب وغریب قانون تراشے گئے ہیں ۔ کہ فلاں مذہب کے لوگ صرف فلاں مذہب کے لوگوں سے شادی کر سکتے ہیں ۔ یہ بھی کتنی مہمل اور لغو بات ہے ۔ میرے نزدیک تو یہ رکاوٹ سراسر ظلم ہے ۔ ایسا ظلم ، جسے کھینچ تان کر مذہبی اصول کے حدود میں گھسیٹ لیا گیا ہو ۔ یہ خیال کرتے کرتے ، مجھے ہندو مسلمانوں کی موجودہ خانہ جنگیوں پر ایسا شدید صدمہ ہونے لگا جیسے کسی نے تان کر دل پر زور سے گھونسہ رسید کر دیا ہے ۔ ان جھگڑوں پر میرا دل ہمیشہ دکھتا تھا ۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ جتنا رنج مجھے اس وقت ہوا ۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا "

" میں نے زہر پی لیا ہے " اسد نے جھنجھلا کر کہا ۔ " مجھے اس کمرہ میں تنہا چھوڑ دو ۔ خدا کیلئے مجھے سکون اور اطمینان سے مرنے دو " اسد کی بیوی کے چہرہ پر سفیدی چھا گئی ۔ وہ اپنے بال نوچتے ہوئے دھڑام سے فرش پر ڈھیر ہو گئی ۔ چھوٹے بچوں نے کمبل کی تہوں میں اپنا منہ چھپا لیا ۔ طلعت اور احمد صدمہ کی وجہ سے اپنے باپ کی چارپائی پکڑتے ہوئے ، گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑے ۔ ماماؤں اور چھوکروں نے ڈھاڑیں مار مار کر سارا کمرہ سر پر اٹھا لیا ——— عین اسی وقت جبکہ یہاں یہ ہنگامہ برپا تھا ۔ برآمدہ کے چبوترے پر فوجی بوٹ کے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ میں ایک لانبا تڑنگا ، مضبوط اور تنومند جوان ، جو فوج کی پوری وردی پہنے ہوئے تھا ، چاندی کی شام کا ایک چھوٹا سا بید ہلاتا ہوا ، بے پروائی کے انداز میں اندر داخل ہوا ، اسے دیکھتے ہی اسد کی بیوی لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور دوزانو ہو کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی

" انھوں نے زہر پی لیا ہے " اس نے رو رو کر سسکیاں لیتے ہوئے کہا ۔ " انھوں نے اپنی جان دینے کی ٹھان لی ہے ——— دیکھو میں نہ کہتی تھی ۔ انکے ہوش وحواس ٹھیک نہیں ۔ للہ انھیں بچاؤ ——— شاہد بھائی ، ڈاکٹر ——— کسی ڈاکٹر کو بلاؤ "

" اسی کے بعد میں ، ایک پرغور فلسفی کی طرح عورتوں کی ناقص تعلیم کے اسباب وعلل پر نظر ڈالنے لگا ۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس میں بیچاری عورتوں کا کیا قصور ہے ۔ ساری خطا تو ان تاریک خیال متعصب مردوں کی ہے جو اپنی عورتوں کو صحیح تعلیم وتربیت دلانیکے بجائے ، انھیں پالتو چڑیوں کی طرح گھر کے پنجرہ میں بند رکھتے ہیں کیا اندھیر ہے کہ جہالت کے ہاتھوں سیکڑوں بے تکے رواج روز بروز پیدا ہوتے جائیں لیکن کوئی کروٹ تک نہ لے "

(۳)

رفیق اجمیری

آپ عہدِ حاضر کے نوجوان فسانہ نگاروں میں اچھے اور کامیاب فسانہ نگار ہیں یعنی آپکے فسانوں میں " افسانویت " زیادہ حد تک پائی جاتی ہے ۔ فسانوں کے پلاٹ بہت دلچسپ اور خصوصاً نتیجہ خیز ہوتے ہیں ۔ آپکا طرز بیان دلکش اور موثر ہوتا ہے ۔ عبارت عام فہم ہونیکے ساتھ ساتھ رنگینیوں سے لبریز ہوتی ہے جدت آپکی سرشت میں پائی جاتی ہے ، اور اس لحاظ سے ہر فسانہ کسی نہ کسی " جدت " کا ضرور حامل ہوتا ہے اور ادبی خوبی کے لحاظ سے بھی آپ بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔ کردار نگاری میں آپ کو خاص ملکہ ہے ۔ آپ کے فسانے تمام تر مشرقی

جذبات و تمدّن اور تہذیب سے معمور ہوتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارات کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن یہ کثرت لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ فارسی اور اُردو اشعار سے عبارت میں شعریت پیدا کرتے جاتے ہیں۔ طرزِ بیان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اور آپ کے تقریباً تمام فسانے اپنے اندر "حُسن و عشق" کے مناظر مستور رکھتے ہیں۔ مگر اس "محبت" کے پردہ میں آپ زندگی کے بڑے بڑے فلسفے اور رموز بیان کر دیتے ہیں۔ جن میں اصلاحی عنصر بھی جھلکتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ کے فسانوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک خالص مشرقی فسانہ نگار ہیں۔ جو نہ صرف مشرقی تہذیب و تمدّن کا شیدائی ہے بلکہ اس کی تبلیغ بھی کرنا چاہتا ہے۔ اکثر فسانوں میں اشتراکیت کی حمایت کرتے ہیں۔ اور زر پرستی کے خلاف احتجاج بھی ہوتا ہے

ایک اور خصوصیت آپ کے افسانوں میں "تکرار" ہے اور اس "تکرار" میں آپ جو لُطف پیدا کرتے ہیں، وہ قابل ستائش ہے۔ ہندوستانی "فلسفۂ محبت" کو جس خوبی سے بیان کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ منظر کشی پر بھی کافی عبور حاصل ہے۔ آپ کی تحریر کے مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

" عشق و محبّت کے واقعات اکثر و بیشتر رشتہ داروں ہی میں ہوتے ہیں۔ عام طور پر چچا زاد، خالہ زاد، بہن بھائیوں میں پردہ نہیں ہوتا۔ اور اصلی خرابی کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے "محبت بہ یک نظر" کی شاذ و نادر صورت کو چھوڑ کر، عموماً محبت، روزانہ کے میل ملاپ، نشست برخاست، دید باز دید سے بڑھتی ہے۔ اور پرورش پاتی ہے اور یہ موقعہ صرف عزیزداری کی صورت میں میسر آسکتا ہے۔ اگر سوسائٹی محبت کو ایسا خفیف جرم سمجھتی ہے تو اسے چاہئے کہ ان عزیزوں سے سخت پردہ کا قانون رائج کرے۔ ممکن ہے، یہ رائے اس زمانہ میں، جبکہ خود پردہ ہی اعتراض کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، عجیب معلوم ہو، لیکن اگر محبت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ تو پھر یہ پابندی سخت ناگزیر ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ نہ یہ پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ نہ محبّت کی اجازت ملتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس محبت میں سوائے ناکامی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے دو معصوم زندگیاں ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ زمانہ کی ہَوا بدل رہی ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں جدید تعلیم سے بہرہ یاب ہو رہی ہیں۔ تعلیم نے ان کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچا دی ہیں۔ سوسائٹی نے یہ اجازت تو دی ہے لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ محبت کا راستہ ابھی تک ان کے لئے مسدود ہے "

" دو معصوم شرارت آب آنکھیں، لبوں کا ایک شوخ تبسّم، بشرہ کا رم خوردہ انداز ——— اور نعیم کے سینے میں دفعتہً ایک ہنگامہ خیز ہلچل مچ گئی۔ اس کے تمام دبے ہوئے جذبات، اس کے تمام سوئے ہوئے حسیات ایک دم سے بیدار ہو گئے۔ بھڑک اٹھے۔ افقِ خیال پر دو آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں، ہونٹ قاتل انداز

میں سکڑ رہے تھے۔ اور دنیا کے سارے شور و غل کو سکوت مطلق میں تبدیل کرتی ہوئی یہ آواز آرہی تھی "واہ اب یہ میرا ہو چکا" آفتاب کی تمازت، فضائی تپش، گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ، راہروؤں کی گفتگو، خرید و فروخت کی چیخ پکار، سڑک کا شور و غل، اور پھر آخر میں دفتر کی خاموش فضا، سب مل کر، سب ایک ہو کر، ایک ہی مختصر جملہ بناتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ "واہ یہ اب میرا ہو چکا"

"صد حیف" حامد نے مزاحی سنجیدگی سے قطع کلام کیا۔ "وہی سرمایہ پرستی، خدائے زر کی پرستش، بنائے کعبہ کو ڈھا دینے پر آمادہ ہوتی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے، اسی نے بندہ و خواجہ، غریب و امیر، مزدور و آقا، شریف و رذیل کا فرق پیدا کیا ہے۔ اور ایک انسان کو اس کے ہی جیسے دوسرے انسان پر، برتری دیدی ہے، حالانکہ بارگاہِ خداوندی میں "محمود و ایاز" دونوں کو ایک ہی درجہ حاصل ہے۔ دنیا کی ساری خرابیاں اسی سرمایہ نے پیدا کی ہیں"

(۳)

سُدرشن

آپ کے فسانے تمام تر طبعزاد ہوتے ہیں۔ پلاٹ بنانے میں مہارت رکھتے ہیں معمولی سے معمولی فسانے کا پلاٹ، دلچسپ اور لطف آمیز ہوتا ہے اندازِ بیان بہت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ روزمرّہ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ عبارت میں رنگینی یا دلکشی نہیں ہوتی، نہ مؤثر ہوتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب پر زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ بعض اوقات ہندی اور سنسکرت کے بہت موٹے موٹے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو عام فہم نہیں ہوتے۔ کردار نگاری بہتر ہوتی ہے۔ عموماً سوشل و معاشری فسانے لکھتے ہیں۔ دیہاتیوں کی غلط اردو کا بھی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک نقص جو آپ کے فسانوں میں نمایاں ہے وہ یہ کہ اکثر فسانوں میں قومی تعصب کا رنگ نظر آتا ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

"گجری نے لسّی، چاول اور گنڈیریوں سے چاند کو ارگھ دیا۔ اور دونوں ہاتھ باندھ کر صدقِ دل سے شوہر کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کی۔ اس وقت اسے چاند مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے اسے اشیرباد دے رہا ہے۔ جیسے اس سے کہہ رہا ہے۔ تم ناحق گھبرا رہی تھیں۔ اب گجری کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہوا میں تیر رہی ہے۔ اس کے منہ سے ہنسی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی۔ گجری روک سکتی تھی، مگر ہنسی رُکتی نہ تھی"

"کھوشیا نے آنکھیں نچا کر کہا۔ "ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ دیکھ لینا کسی دن گرفتار ہو جائے گا۔" چودھری حقہ پی رہا تھا۔ کھانستے ہوئے ردّی کی طرف چلم بڑھا کر بولا۔ "یہ تمہاری کھام کھیالی ہے آدمی برا نہیں معلوم ہوتا۔ جرور بھاگوان ہے

اپنے کام سے ادھر آنکلا ہے چار دن رہ کر چلا جائے گا"

رونقی نے چلم پر کوئلہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "برا نہ ہوتا تو آتے ہی اس چھوکری کا منہ کیوں باندھ دیتا۔ ہمارا منہ تو کسی بھڑوے نے نہ باندھ دیا۔ کھو بصورت منہ دیکھ کر پھسل پڑا"

سلطان حیدر جوش

آپ کے فسانے عموماً طبع زاد ہوتے ہیں۔ پلاٹ دلچسپ اور عبارت بہت بلند پایہ ہوتی ہے طرز بیان نہایت رنگین اور بعض وقت بہت دلکش ہوتا ہے۔ محاورات اور تشبیہات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عربی اور فارسی ترکیبیں نیلوہ اور انگریزی ترکیبیں بھی ہر فسانے میں موجود ہوتی ہیں۔ جابجا اردو اور فارسی شعر لکھ کر مفہوم ادا کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ فسانوں میں، سیاسیات پر بھی ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں۔ کردار نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ مشکل نگار واقع ہوئے ہیں۔ عام فہم اردو نہیں ہوتی۔ نمونے ملاحظہ ہوں

"سلیم اور جانکی میں، محویت شباب کے علاوہ کوئی چیز مشترک تھی تو صرف یہ کہ دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ اور دونوں مذہب کی ظاہر پرستی سے متنفر ایک قدآور سخت گیر اور سیماب طبع نوجوان تھا۔ تو دوسری سبک اندام، نازک حس، اور کم سخن نازنین۔ ایسی دو شخصیتوں کا اتصال مستقل، حلقۂ احباب و تعارف میں، اجتماع ضدین سمجھا جاتا تھا۔۔۔ مگر میکدۂ مجاز کو، ترتیب دینے والا ساقی حسن، ہمیشہ عقل آرائی کے تانے بانے کو محض ایک جرعۂ جذبات مخمور سے، تار عنکبوت کی طرح توڑ ڈالنے کا عادی و عامل رہا ہے۔ سلیم نے ہمیشہ کے لئے جانکی کو اپنی آغوش شوق میں لے لیا۔ اور جانکی بلا تامل اس کے سینے سے پیوست ہوگئی"

اس اجمال کی تفصیل میں، ایک تحقیقاتی کمیشن کی خدمات حاصل ہو جانے پر بھی ایک مالوی پنڈت اور لاہوری میاں کے باہم دست و گریباں رہنے کا سلسلۂ قوی باقی رہے گا۔ مختصر یوں سمجھئے کہ جس طرح آفتاب کی شعاع شبنم کو چن لیتی ہے اسی طرح سلیم اور جانکی بھی باہم دگر پیوست ہو گئے۔۔۔۔ یہ بھی تشفی بخش نہ ہو تو سلیم اور جانکی کے اتصال پر ہز ہائینس آغا خان یا مسٹر محمد علی جناح کی رائے طلب کی جا سکتی ہے۔ فی الحقیقت اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ ؎

پر پروانہ شاید بادبان کشتی مے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

"کیا اسی زائل ہو جانے والی خواہش نفسانی کو تم محبت کہتے ہو؟ کیا اسی ایک معمولی سے ہوا کے جھونکے سے ٹھنڈا ہو جانے والے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو تم شعلۂ محبت بناتے ہو۔ غلط بالکل غلط۔ محبت وہ درد ہے جو کسی دوا سے بھی زائل نہیں ہو سکتا۔ محبت وہ کشش ہے جو عالم تک کو، قوت کشش میں جذب کر دیتی ہے۔ یہ وہ حقیقی جذبہ ہے جو ہر دماغی اور جسمانی قوت کو سلب کرنے کے ساتھ، حبیب کو محبوب اور محبوب کو حبیب بنا کر بھی کم نہیں ہوتا۔ اپنی زوال پذیر خواہش

اور چشم زدن میں معدوم ہو جانے والے جوش کو محبت نہ کہو، یہ محبت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا "

(ع)

(میاں عبد العزیز فلک پیما)

اُردو فسانہ نگاروں میں، جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہی ایک وہ واحد فسانہ نگار ہیں، جن کی تحریروں اور فسانوں میں فلسفیانہ رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے - اور آپ جو کچھ تحریر فرماتے ہیں وہ بہت غور و تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، فسانوں میں پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا - صرف واقعات اور کردار نگاری قابلِ ذکر ہوتی ہے ، ہر کردار کو فلسفی اور ہر بات کو فلسفیانہ طرز سے بیان کرتے ہیں - ٹیگور کا رنگ بھی کہیں کہیں موجود ہوتا ہے، عبارت سادہ اور سلیس ہوتی ہے - لیکن ان کا مطلب اکثر پیچیدہ ہوتا ہے اور اس لئے عام فہم نہیں ہوتا - جو کچھ تحریر فرماتے ہیں کسی خاص مقصد کے تحت ہوتا ہے اور اس سے عوام الناس کو نصیحت دینا منظور ہوتا ہے، انگریزی طرزِ نگارش زیادہ غالب نظر آتا ہے اکثر اوقات بعض مطالب کو ادا کرنے کے لئے اُردو کے بجائے انگریزی الفاظ بھی استعمال کرنے سے عار نہیں کرتے، اس سے عبارت میں ایک بدنمائی پیدا ہو جاتی ہے، افسانوں میں عموماً اصلاحی اور معاشرتی پہلو کو لیتے ہیں، اور نقائص کو بیان کرکے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خیالات بہت عمیق ہوتے ہیں - زبان اکثر پنجابی ہوتی ہے - نمونے ملاحظہ ہوں

" جب دوسرے فریادی نے شہزادی کا یہ حکم سُنا تو وہ شہزادی کے پاؤں پر گرا اور اس نے عرض کی - کہ جان کی امان ہو تو تمام واقعہ بلا کم و بیش عرض کر دوں - پھر جو حضور کا مزاج چاہے حکم دیں - شہزادی بولی کہ اچھا تم اپنا قصّہ کہو - امیر نے عرض کیا کہ حضور میری ایک ہی بیٹی ہے - جو ہر طرح عقل میں، شکل میں اپنی نظیر نہیں رکھتی - میں سفر میں اس کو ہمراہ لے گیا - اور اس آدمی کے مُلک میں پہونچا - وہاں اس نے اور اس کے لڑکے نے ہماری نوکری کی - اور ہم ان دونوں کو ساتھ لے آئے - وہ لڑکا اگرچہ غریب ہے - مگر اس قدر شریف ہے کہ میری بیٹی کے دل میں اس کی محبت ہو گئی ہے - اور میں بھی سچے دل سے خوش ہوں - کہ یہ عقد ہو جائے - مگر یہ شخص نہیں مانتا - آخر میں اُسے دربار میں چوری کے الزام پر گھسیٹ لایا - اس کا عذر ٹھیک ہے - کہ میں نے اس کی اُجرت ادا نہیں کی - اس کا بیٹا ایسا سعادتمند ہے کہ باپ کی اجازت کے بغیر وہ نکاح کرنا پسند نہیں کرتا - دوسرا عذر اس کا یہ ہے کہ وہ شادی تب کرے گا جب وہ کافی دولت کمائے گا "

" میں - (رسمی طور پر) بندہ پرور، للہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہئے - بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں - وہ میرے دل پر نقش ہیں - اور کافر ہو جو یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا - ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈنکا بجے گا "

خیرات:۔ "آپ ہم مسکینوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کریں ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا سے

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تہذیب کے دام تزویر پھیلائے جاتے ہیں

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں :۔ معاف کیجئے۔ واقعی آپ کی حالت قابلِ رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فرمائیے۔ کہ قوم بیچاری خلافت والوں سے طلاق لینے کے بعد سیدھی تبلیغ تنظیم والوں کے گھر جا پڑی۔ اور وہ لوگ پیسے کے پیر ہیں۔ اب آپ کے لئے رقم آئے تو کہاں سے ؟

پیری مریدی:۔ تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے "

" ہاں اللہ میاں تو بات یہ تھی کہ میں نے کہیں کہہ دیا کہ بھئی مجھے تو پرانا بوسیدہ صدیوں کی ذمہ دار تلے دبا ہوا خدا درکار نہیں۔ بلکہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سکنڈ ہینڈ (Second hand) کپڑا پہن لیں مگر سکنڈ ہینڈ خدا ہرگز نہیں۔ تم تو بالکل نوجوان ہونا اللہ میاں ؟ کس قدر یہ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ تم وہی ہو جو تھے۔ اتنا نہیں سوچتے کہ جس میں خدا ہو کر بھی شباب نہ ہو اُسے خدائی کا کیا مزہ ؟ اللہ میاں کیا کہا کہ مجھے اس گستاخی کے بدلے پھونک دوگے ؟"

" اے دوست !

سورج اور تاروں کا، چاند اور بادلوں کا تو ذکر کر دوں۔ مگر زبان کہاں سے لاؤں ؟ کس خلوص، کس تپاک سے فطرت کے یہ معجزے انسان کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں ان تفاوت میں کیا رعنائی ہے ؟"

اے دوست !

کیا تم نے سورج کی (Courtesy) پر کبھی غور کیا ہے۔ سورج میرا اُستاد ہے تو چاند میرا بھائی جسے گھٹنے بڑھنے کا گلہ نہیں۔ جیسے نور اور سایہ برابر ہیں۔ اُستاد کو یا بھائی کو ترقی کی فکر نہیں، تنزل کا غم نہیں اور ہو تو کیوں ہو ؟ جو اپنے کام پر مستعد ہیں غمِ فردا ان کی بلا کو "

ل

لطیف الدین احمد (ل - احمد)

آپ کے فسانے بیشتر ترجمہ ہوتے ہیں اور کمتر طبعزاد۔ آپ کے ترجمہ "لالہ رُخ" نے "دُنیائے افسانہ نگاری میں" آپ کو دائمی شہرت بخش دی ہے - اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ آپ میں زبان دانی اور ادب فہمی کی اہلیت کس قدر ہے - آپ کے مترجمہ فسانوں سے اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ زبان اُردو باوجود اپنی بے بضاعتی کے غیر زبانوں کی تصانیف کو ان کے حقیقی مفہوم میں ادا کرنے کی کہاں تک اہل ہے "

آپ کا طرز بیان، بہت بلند پایہ بہت لطیف، بہت دلکش اور بیحد رنگین ہوتا ہے تحریر میں جدت اور کردار نگاری بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے - پلاٹ بھی دلکش اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارات کثرت سے استعمال کرتے ہیں - لیکن یہ کثرت لطف اور دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی - چونکہ ترتیب اور بندشیں زیادہ تر فارسی اور عربی طرز کی ہوتی ہیں۔ اس لئے عوام الناس آپ کے فسانوں سے زیادہ لطف اندوز اور مستفید نہیں ہو سکتے مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

" ہنوز وہ اسی فکر میں تھی کہ اس کی نظر خطۂ ہندوستان پر پڑی جہاں کی ہوائیں رُوح افزا ہیں۔ جس کے سمندر کی گہرائیوں میں عنبر کا فرش ہے - اس کے ساحلوں کی دیواریں مونگے کی ہیں - جہاں شعاعِ خورشید میں غسل کرنے والے پہاڑوں کے نیچے ہیرے کی کانیں جگمگاتی ہیں - اور جس کے چشمہ ہائے رَواں کی موجوں میں سونا حل کر دیا گیا ہے - لیکن آج اس کے دریاؤں کا رنگ قرمزی ہے انسانی خون سے چشمے رنگین ہو رہے ہیں - اور باغات سے اس وقت موت کی بُو آ رہی ہے - اور ہر اس سانس میں جو سطحِ زمین سے بلند ہو رہی ہے انسانی قربانی کی بو شامل ہے "

" شرافت و انسانیت، اُمید و رجا کے جو جذبات ایک زمانہ سے اس کے اندر نیم مُردہ حالت میں تھے - دفعتاً بیدار ہو جاتے ہیں - جوشِ گریہ سے اس کی آواز بلند ہو جاتی ہے وہ روتا ہے - اور آنسوؤں کا ایک طوفان جاری کر دیتا ہے - جو آنسو عمقِ دل سے ندامتِ گناہ میں نکلتے ہیں بے شبہ مقبول ہوتے ہیں - ایسی ہی قبول اور عفو طلب پشیمانی اشک میں ایک خاص قسم کی طمانیت کا اوّلین احساس ہونے لگتا ہے - اور یہ احساس ایک گنہگار ہی کو ہو سکتا ہے "

" ایک فوارۂ موسیقی نواز میرا مسکن ہے اور شب ماہ کے قطرہ ہائے گل نے مجھے یہاں کھینچ بلایا ہے - ایک چشمہ میرا مامن ہے - جہاں میں صبح و شام - اور روز و شب - امواجِ ترنم کے اندر راحت پذیر رہتی ہوں - جہاں کی ہوائیں بانسریوں کی لے سے ملی جُلی ہوتی ہیں - جہاں ہر وقت بارشِ نغمات ہوتی رہتی ہے - اور جہاں دل سے نکلنے والی ہر آہ ہونٹوں

سے جدا ہو کر گیت بنجاتی ہے "

" جہانگیر، الم زدہ جہانگیر، ان شرابوں کے جام پیہم پی رہا ہے ، کثرت مینوشی سے اپنے خلائے دل کو پُر کرنا چاہتا ہے کہ یہ سیلاب ناب ، اس کے دل میں اس درجہ طوفان خیز ہو جائے کہ پھر وہاں طائرِ محبت کی پرواز کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے ، مگر اس نے شاید بھلا دیا ہے۔ کہ محبت کا شہپر دلوتا تو ساغرمے کی لہروں پر بھی شناوری کرتا اور انھیں ابتسام دائمی سے تجلی ریز بنا دیتا ہے "

" مابیو نے مزار آبی کے اندر اپنے عشقِ ناکام کی سوزش والتہاب سے پناہ لینے کی ٹھان لی ، سان تحسین کی شادی کی خبر سُنکر ماتی کے جذبات و محسوسات کا تجزیہ تو دشوار ہے ۔ لیکن جب مابیو نے اس پر اپنے عزم وارادہ کا اظہار کیا تو وہ مابیو سے لپٹ کر رونے لگی ، اور جیسے وہ پہلے ہی سے فیصلہ کئے بیٹھی تھی مصر ہوئی کہ جس طرح وہ اس کی شریک مسرت اور شریک غم رہی ہے ، شریکِ مرگ بھی ہوگی "

(۴)

مجنوں گورکھپوری

آپ کے فسانے عموماً انگریزی اور خصوصاً ٹامس ہارڈی کے فسانوں کا چربہ ہوتے ہیں ۔ طبعزاد فسانے بھی آپ لکھتے ہیں ۔ زبان عام فہم اور سادہ ہوتی ہے اور طرزِ بیان بہت دلکش ہوتا ہے ۔ کردار نگاری میں اچھی مہارت رکھتے ہیں ۔ اور ہر افسانہ میں ہر کردار کی خصوصیتوں کے اظہار میں ابتدا سے انتہا تک بہت توجہ سے کام لیتے ہیں ۔ پلاٹ بہت عجیب بناتے ہیں ۔ طوالت پسند بیحد ہیں ۔ کوئی فسانہ ٹامس ہارڈی کے رنگ سے معرّا نہیں ہوتا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹامس ہارڈی کے فسانوں اور ناولوں کا مطالعہ آپ نے بہت عمیق نظروں سے کیا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کے خیالات اور اس کا فلسفۂ زندگی آپ کے خیالات میں سرایت کر گیا ہے ۔ ہر فسانے میں فلسفۂ زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اور عشق و محبت کے مناظر پیش کرنے کے عادی ہیں لیکن عشق و محبت کے اندازِ بیان میں مغربی رنگ غالب ہوتا ہے ۔ چونکہ ٹامس ہارڈی " مصورِ غم " مانا جاتا ہے اس لئے آپ کے فسانوں میں بھی غم کا پہلو نمایاں ہوتا ہے ۔ بدنصیبی ، حسرت و یاس ، ناکامی اور دردمندی کے دلگداز واقعات آپ کے فسانوں کی خصوصیات میں داخل ہیں ۔ اور ان میں تاثیر موجزن ہوتی ہے ۔ جو ہر دل کو کرداروں کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ آپ کے یہاں جدت مفقود ہے ۔ تقریباً ہر فسانے کا پلاٹ ابتدا سے انتہا تک ایک ہی رنگ میں رنگا ہوتا ہے یعنی عشق و محبت کی ابتدا ۔ پھر ہجر و فراق کی صعوبتیں اور مصائب کے بعد آخر میں غم آگیں انجام ۔ آپ کے فسانوں کو پڑھنے کے بعد اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ کہ آپ کے نزدیک خدا

ایک ظالم، بیدرد اور اندھی قوت کا نام ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

"مریم سے اب ضبط نہ ہو سکا، رؤف نے اس کے دل کے نازک ترین حصے کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ زار زار رونے لگی۔ رؤف سے نہ رہا گیا۔ اس نے بڑی جرأت کی اور مریم کو اپنے حلقۂ آغوش میں لے کر، اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ مریم نے اپنے کو رؤف کی گود سے الگ نہیں کیا۔ اس کو رؤف کے نرم و گداز بدن سے راحت مل رہی تھی۔ اسکے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ رؤف نے تسلی دینے کی لاکھ کوشش کی مگر سب بیکار"

"ادریس نے مسکرا کر کہا۔" میں نے اس معاملہ پر کافی غور کر لیا ہے۔ سکون و اطمینان ہر شخص کے حصہ کی چیز نہیں۔ یہ اپنا اپنا کردار اور اپنا اپنا چلن ہے۔ جو انسان کی زندگی بناتا اور بگاڑتا ہے۔ چنانچہ یہ میرا ہی کردار تھا جس نے مجھے برباد کیا اور میرے ساتھ دو معصوم اور بیگناہ عورتوں کو خاک میں ملا دیا۔ خدا کی بحث میرے سامنے نہ نکالو۔ جس چیز کو تم خدا کہتے ہو، میں اس کو ایک اندھی قوت سمجھتا ہوں۔ جو ایک ناقص العقل بچے کی طرح حسین چیزوں کے ساتھ پہلے تو کھیلتی ہے اور پھر ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ رہ گئی محبت، سو میرا خیال ہے کہ اس دنیائے حوادث میں اس کا وجود نہیں اس دنیا کی محبت کے متعلق آتش نے سچ کہا ہے ؎

واقعی کون کس کو چاہتا ہے ہر کوئی وہم میں مبتلا ہے ہے"

"عشق کی ابتدا انفرادیت سے ہوتی ہے اور شاید تمام ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی یہ انفرادیت باقی رہتی ہے۔ جب تک عشق کا نشہ آپ پر چھا نہیں جاتا۔ جب تک عقل و ہوش کا غلبہ ہے۔ جبتک آپ دہرم کا پرچار کیجئے، مذہب کی تبلیغ کیجئے۔ اخلاقیات کی اشاعت کیجئے۔ فلسفہ اور تصوف کی حمایت کیجئے۔ یا اور جو کچھ چاہئے کیجئے اور کیجئے۔ مگر جہاں آپ نے عشق کی دنیا میں قدم رکھا، آپ جو کچھ اب تک کہتے یا کرتے آئے ہیں۔ اس سے خجل ہونا پڑتا ہے۔ اور آپ "بر در کر بادۂ ما تلخ بہ از ہیں ہند است" کہہ کر سب کو حرفِ غلط سمجھنے لگتے ہیں"

"مریم نے لاکھ چاہا کہ اپنی ناکامیوں اور تلخیوں کو قدرت کے دلفریب مناظر میں بھول جائے لیکن اس کو بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ مناظر اب اس کے لئے دلفریب نہیں رہے۔ اس کے دل کی آواز دراصل دھوکہ کی آواز تھی۔ جو لمحے ایک بار گذر گئے وہ پھر نہیں آتے۔ جو زندگی ایک بار بسر ہو گئی اس کا اعادہ ناممکن ہے۔ یونان کے "رونے والے فلسفی" کا قول ہے۔ کہ " ایک ہی ندی میں کوئی دو بار نہیں نہا سکتا۔" جس دریا میں آپ نے ابھی غسل کیا ہے وہ دوسرے لمحے میں بالکل ایک دوسرا دریا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات فوراً محسوس نہیں ہوتی۔ زندگی کے بہاؤ میں کسی ایک حالت کو

اپنی جگہ قرار نہیں ہے جس چیز کو آپ ایک دفعہ کھو چکے اس کی بازیافت محال ہے جو بات ایک بار ہو چکی اس کی "بازگشت" قانونِ قدرت کے منافی ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ " رنجِ نومیدی " کی تاب نہ لا سکیں اور عمر بھر کفِ افسوس مل مل کر " تجدیدِ تمنا " کا عہد کرتے رہیں "

ایم ۔ اسلم

آپ کے فسانے عموماً طبعزاد ہوتے ہیں۔ کسی حد تک جدت بھی پائی جاتی ہے ۔ فسانوں میں عموماً گھریلو اور روزمرہ زندگی کے واقعات بیان کرتے ہیں ۔ فسانے مختصر اور دلچسپ ہوتے ہیں ۔ مزاحیہ رنگ میں بھی اچھے فسانے لکھتے ہیں کردار نگاری کے بڑے شائق معلوم ہوتے ہیں ۔ چنانچہ " مرزاجی " کے کردار کو خوب خوب پیش کیا ہے ۔ زبان عام فہم، روزمرہ، اور سادہ ہوتی ہے ۔ ترکیبیں، پنجابی، بھونڈی اور جملے اکثر بے جوڑ ہوتے ہیں ۔ بعض فسانوں کا پلاٹ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوتا ہے اور بعض میں پلاٹ مفقود ہوتا ہے ۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

" حسن :۔ غلطی، لیکن میری اپنی ہے ، تجھے خود جانا چاہئے تھا "

بیوی :۔ " تو جاؤ ۔ ہاتھ جوڑو ۔ منت کرو ۔ معافی مانگو "

حسن :۔ " بھائی سے معافی مانگنا ، یا اُس کی منت کرنا کوئی گناہ نہیں "

بیوی :۔ " کون کہتا ہے کہ گناہ ہے ۔ لیکن شرم اور غیرت بھی تو کسی جانور کا نام ہے "

حسن :۔ " شرم اور غیرت کیسی ؟ بھائی کے سامنے گردن جھکانے یا ندامت کا اظہار کرنے میں ہرگز عار نہیں آنی چاہیئے"

" منی کے دیئے سب کوٹھریوں میں جل رہے تھے ۔ اور ان کی دھیمی دھیمی لو ۔ میں عورتوں کی چمکتی ہوئی پوشاکیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں ۔ کچھ دیر کے بعد ننھے کی ماں جو اُسے دیکھنے کے لئے کوٹھری کی طرف گئی تو دو ایک اور بھی اس کے ساتھ ہو لیں ۔

ننھا مزے سے پاؤں پھیلائے کھاٹ پر پڑا سو رہا تھا اور اس کی بچی اس کے ننھے ننھے پاؤں سے گال لگائے روتے روتے سو گئی تھی ۔ دیئے کی ہلکی ہلکی روشنی میں سونے والے کے گوٹے کناری کے کپڑوں پر بھی اُداسی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی "

(مزاحیہ)

الیکشن کا وقت تو دس بجے تھا لیکن آپ بارہ بجے کے بعد کیمپ میں پہونچے ۔ آپ کے جاتے ہی لوگوں نے " مرزا زندہ باد " کے نعرے لگانا شروع کر دیے ۔ ووٹ تو وقت پر پڑنا شروع ہو گئے تھے ۔ آپ پہونچے ہی تھے کہ اتنے میں خبر

آئی کہ جنو والے اپنے کھاٹ کھٹولے اٹھا کر میدان چھوڑ گئے ہیں۔ بس اب کیا تھا۔ سلامی کے گولے چلنے لگے۔ کیمپ میں مُبارک سلامت کا غل بلند ہوا۔ مرزا صاحب نے اسی وقت واپسی کا اعلان کر دیا۔ اور کہا کہ ہمارا مقابلہ تو صرف جنو سے تھا زندہ رہے تو اگلے سال شیخ جی سے بھی نپٹ لیں گے "

(ن)

نیاز فتحپوری

آپ کے فسانے عموماً طبعزاد اور بہت بلند پایہ ہوتے ہیں۔ ترجمے بھی اپنی سلاست اور روانی کے لحاظ سے اوریجنل معلوم ہوتے ہیں۔ پلاٹ عموماً دلچسپ ہوتا ہے۔ کردار نگاری پر عبور حاصل ہے۔ طرزِ بیان بہت دلکش اور عبارت بہت بلند پایہ ہوتی ہے یعنی عربی اور فارسی کی بڑی بڑی ترکیبیں اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ جو موزوں تو ہوتے ہیں لیکن عام فہم نہیں ہوتے تشبیہات اور استعارات کی بہتات ہوتی ہے، لیکن یہ بھی دلکشی سے خالی نہیں۔ ایک خصوصیت آپ کے فسانوں کی یہ ہے کہ جس منظر کو جس حالت میں دیکھتے ہیں اُسے ویسا ہی بیان کرتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کے فسانوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ "عریاں" ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر فسانے "حسن و محبت" کے واقعات سے لبریز ہوتے ہیں۔ جن میں رنگینی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ بہت کم فسانوں میں اصلاحی درس اور گھریلو زندگی کے مناظر پیش کرتے ہیں فلسفۂ محبت اور فلسفۂ زندگی پر بھی اکثر اوقات تبصرہ کرتے ہیں۔ ہر فسانہ جدت سے مملو ہوتا ہے اس کے علاوہ بعض فسانوں میں نفسیاتی پہلو پر بھی نظر ڈالتے ہیں لیکن ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ مجموعی طور پر آپ کے فسانوں میں زندگی کے روشن پہلو، یعنی مسرت و عشرت کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

" مرانداے جس وقت راہب کی گفتگو سنی، اس کی برہمی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس وقت جبکہ وہ جام کو لبوں تک پہونچا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اپنی تشنہ کامی کے خیال سے دیوانی سی ہوگئی۔ اور انتہائے غیظ و غضب کی حالت میں کرسی پر بیٹھ کر راہب کو اپنے اوپر گرا لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اسی حالت میں اُسے مضبوط پکڑ کر بلند آواز سے چیخنے لگی۔ " دوڑو۔ دوڑو۔ مجھے راہب سے بچاؤ "

" سوشیلا سمجھتی تھی کہ حقیقت حال نہ تارا سے کہی جاسکتی ہے اور نہ رنجور سے۔ ممکن ہے تارا یہ معلوم کرنے کے بعد کہ مجھے بھی رنجور سے اتنی ہی محبت ہے، جتنی اس کو، جانبر نہ ہوسکے، اور رنجور یہ سُنکر کہ تارا اس پر فریفتہ ہے کوئی نازیبا خیال اس کی طرف سے دل میں پیدا کرلے۔ اس کے ساتھ جب وہ تارا کی حالت کو دیکھتی تھی۔ تو بیتاب ہوجاتی تھی۔ وہ اس کا ہر وقت کا سوگ۔ وہ اس کا ہر دم اندر ہی اندر سلگنا۔ وہ اس کا محبت کی آگ میں شمع کی طرح جل کر

پگھلتے رہنا، اک ایسا منظر تھا کہ سوشیلا کو اکثر اوقات اپنی محبت کی طرف سے دھوکا ہو جاتا تھا "

" شہاب تم مسئلہ ازدواج و محبت کو دُنیا کے اور مسائل میں کیوں شامل کرتے ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حصولِ مُدعا بری چیز ہے۔ لیکن خاص مسئلہ نکاح، اور نکاح بھی وہ جو نتیجہ محبت قرار دیا جائے۔ سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ایک شخص، مدعا اس چیز کو قرار دیتا ہے۔ جو حقیقتاً مدعا نہ ہونا چاہئے۔ اگر محبت کا نتیجہ صرف نکاح ہونا چاہئے تو میں کہوں گا کہ آگ کا کام بہا لیجانا، اور پانی کا کام جلا دینا ہونا چاہئے۔ محمود، افسوس ہے کہ تم سا ادیب اور تم سا لطیف الخیال شخص، محبت کی نزاکت کو نہیں سمجھتا۔ لوگ محبت کا نام کس آسانی سے لے لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ انھیں بھی خبر نہیں کہ اس کا نصب العین کیا ہے۔ اور اس کا اقتضا کیا۔ اگر محبت نام ہے صرف اس جذبۂ شہوانی کا جو چودہ پندرہ برس کی عمر میں شروع ہو کر تیس چالیس برس میں فنا ہو جاتا ہے۔ اگر محبت کا مفہوم تمھارے ہاں صرف وہ ہیجانِ عصبی ہے جو نتیجہ ہوتا ہے نشو و نما کی پختگی کا تو تمھیں اپنی محبت کی کامیابیاں مُبارک "

" جب کبھی وہ صبح، خانہ باغ کی روشوں پر ٹہلتی ہوتی اور آفتاب طلوع ہوتا تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ آیا آفتاب اس پر طلوع ہوا ہے یا یہ آفتاب پر۔ اور سورج کی کرنیں اس کے چہرہ کو منور کر رہی ہیں یا اس کے جسم کی شعاعیں آفتاب کو۔ مشہور تھا کہ کوئی متنفس ملکۂ ناہید کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس بجلی کی پھانس اس کے دل سے بہ آسانی نکل گئی ہو اس کا رنگ جسم یہ معلوم ہوتا تھا کہ نسترن زار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگ شفق ملا کر بلوریں جلد کے نیچے دوڑا دیا گیا "

مزاحیہ فسانہ نگار

(الف)

احمد شاہ بخاری، پطرس

آپ کے فسانے عموماً اوریجنل (طبعزاد) ہوتے ہیں۔ جن میں خوش مذاقی (Light humour) بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ مزاحیہ فسانہ نگاری میں آپ ایک ممتاز طرز نگارش کے مالک ہیں۔ زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ روزمرّہ میں ایسے ایسے تبسّم آفریں جملے لکھ جاتے ہیں کہ بغیر ہنسے رہا نہیں جا سکتا۔ ابتذال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ البتہ زبان کی غلطیاں کہیں کہیں موجود ہوتی ہیں۔ بعض فسانوں میں پلاٹ ہوتا ہے۔ اور بعض میں نہیں۔ مجموعی حیثیت سے پلاٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ طرز بیان بہت دلکش ہوتا ہے اور کردار

کو بھی خوب رنگ دیتے ہیں۔ آپ کے فسانے صرف تفریحی ہوتے ہیں۔ اور تفنن طبع کا باعث یعنی نہ تو ان میں سوشل اصلاح مدِ نظر ہوتی ہے۔ نہ معاشرتی نقائص پر کوئی تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں

"دوکاندار بڑھکر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے تالا لگا ہوا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں آخر بڑی سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے"

دوکاندار کہنے لگا۔ "پھر" میں نے کہا۔ "لوگے؟" کہنے لگا۔ "کیا مطلب؟" میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم"

دوکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟" ایسے سوالوں کا خدا معلوم کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کیا تم یہ پوچھتے ہو کر جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ مصرف کیا ہوگا؟" کہنے لگا۔ "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کا لے کر کرے گا کیا؟" میں نے کہا۔ "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟" کہنے لگا۔ "اچھا چڑھ گیا پھر؟" میں نے کہا۔ "پھر کیا۔ پھر چلائے گا اور کیا" دوکاندار بولا۔ "اچھا" ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے"

"لالہ جی۔ لالہ جی" جواب آیا "ہوں" میں نے کہا۔ "آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے" کہنے لگے۔ "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"

خدا کی قسم تین بجے کا نام سُنکر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے تین بجے ہیں؟" کہنے لگے۔ "تین۔ تین۔ کچھ سات۔۔۔ ساڑھے سات منٹ دو پر تین ہیں" میں نے کہا۔ "ارے کمبخت! خدائی فوجدار! بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا۔ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے۔ تو اس وقت دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے۔ ابے احمق کہیں کے۔ تین بجے اُٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق تھوڑا ہے۔ "لاحول ولاقوۃ" دل تو چاہتا تھا کہ تشدد اور عدم تشدد کو خیر باد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے، ہمیں اپنے کام سے غرض ہے۔ لیمپ بجھایا اور پھر بڑبڑاتے ہوئے سو گئے"

ش

شوکت تھانوی

آپ کے فسانے عموماً طنزیہ ہوتے ہیں اور ان میں مزاح پوری طرح موجود ہوتا ہے ابتدائی فنکاری سے آپ کی

تحریریں بھی پاک ہوتی ہیں۔ پلاٹ بعض فسانوں کا بہت خوب ہوتا ہے۔ عبارت رنگین، دلکش اور تبسم آفریں ہوتی ہے، عام فہم اور روزمرہ لکھتے ہیں۔ طرزِ بیان عام پسند ہوتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے واقعات میں مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن تحریریں اثر اور اصلاح سے خالی ہوتی ہیں۔ ان سے محض وقتیہ تفریح ہو سکتی ہے۔ کوئی خاص سبق نہیں ملتا۔ کردار نگاری کہیں کہیں بہت بہتر ہوتی ہے۔ مختلف نمونے ملاحظہ ہوں

"لیکن انھوں نے صرف یہ جواب دیا۔" کا جانی بھیا۔ ہم کا ناہیں مالوم۔" یہ خالص سودیشی ریل کے، سکنڈ کلاس کے معزز پاسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ "اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی۔ ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اس لئے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔" لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا۔؟" جواب ملا" جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔" ہم نے پھر پوچھا۔" لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا۔" جواب ملا۔" کہ ہو جایا کرے۔ جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے۔ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

"سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آگئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا۔ مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد للو فائرمین کوئلہ کی گٹھری لئے یہ کہتا ہوا آ پہونچا۔" آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں تمام دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دوکان پر اتنا سا کوئلہ تھا۔ وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنے میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آرہا ہوں۔ راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے۔ کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔" ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا۔ اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑی، گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا۔" روکو روکو۔ گارڈ صاحب رہ گئے"

"بیوی۔" اے اپنی گت تو دیکھو۔ ہائے میں لٹ گئی۔" بڈھن۔" گت کیا دیکھیں؟ عاشقوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ تم تو ماشاءاللہ پڑھی لکھی ہو۔ ذرا قصہ لیلیٰ مجنوں اٹھا کر دیکھو کہ مجنوں، جس کا آج ڈنکا بج رہا ہے کس شان سے رہتا تھا۔" بیوی۔" ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میں کہیں کی نہ رہی" بڈھن۔" اس میں لٹنے کی کون سی بات تھی ایک قمیص میں نے اپنے شوق کے لئے پھاڑ لی۔ تو یہ لٹ گئیں۔ تم کو میرا عشق ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو جانے دو۔ میں نہیں کروں گا عشق۔ لاؤ کوئی پاجامہ بکس سے نکال دو۔ مگر اب مجھے بیکاری کا طعنہ نہ دینا"

عظیم بیگ چغتائی

آپ ہمیشہ طبعزاد فسانے لکھتے ہیں جو زیادہ تر خود ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ طرز بیان سادہ، سلیس، عام فہم اور بیحد دلچسپ ہوتا ہے۔ عبارت بعض اوقات محاوروں اور استعارات سے بھی لبریز ہوتی ہے۔ مزاحیہ رنگ میں نسائی زبان خوب لکھتے ہیں۔ پلاٹ عموماً دلچسپ ہوتا ہے۔ گھریلو زندگی پر اکثر اصلاحی نظر ڈالتے ہیں۔ تحریر زیادہ مؤثر یا اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ عموماً تفریحی باتیں ہوتی ہیں یا جن سے وقتیہ فرحت حاصل ہوتی ہے۔ کردار نگاری خاصی اچھی ہوتی ہے بعض اوقات مبالغہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور فطرت تصنع سے بدل جاتی ہے۔ سنجیدہ فسانے بھی لکھتے ہیں جن میں پلاٹ کے علاوہ طرز بیان بہت دلچسپ اور معنی خیز ہوتا ہے اور اس میں اصلاحی رنگ خاص طور پر جھلکتا ہے۔ محاوروں اور زبان کے اکثر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مختلف نمونے حسب ذیل ہیں

"ایک دھندلکے کا سا عالم تھا۔ میں نے جھانک کر نیچے صحن میں دیکھا۔ تین چار پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ اور گھر والے غافل سو رہے تھے۔ یہ کچھری میں سررشتہ دار تھے جن کے مکان میں خاکسار جھانک رہا تھا۔ دبے پاؤں میں زینہ سے اتر کر نیچے پہونچا۔ اور سایہ کی طرح مکان کے دوسرے بازو کی طرف پہونچ کر میں نے اپنی "بھوت آفرینی" شروع کر دی۔ نعمت خانہ کھول کر دیکھا۔ دودھ رکھا تھا وہ پی گیا۔ کیونکہ مقوی چیز ہے۔ لڈو تھے وہ کھائے۔ تین انڈے تھے وہ جیب میں رکھے۔ اس کے بعد ہر وہ چیز جو سامنے نظر آئی۔ اس کو الٹا رکھ دیا۔ ہنڈیاں، گھڑے، برتن، پیڑھی وغیرہ وغیرہ سب کو الٹا رکھ دیا پھر جان پر کھیل کر صحن کی طرف آیا۔ بڑی ہوشیاری اور خاموشی سے میں نے سب کے جوتے اکٹھے کر کے بغل میں دابے اور پھر باورچی خانہ میں واپس آیا۔ ایک پتیلی میں پانی ڈال کر گھی اور مصالحہ تلاش کر کے نمک مرچ ڈال کر جوتے پکنے کو رکھ دئے۔"

ملاح نے ایک مرتبہ اور پانی میں پتوار ڈال کر زور سے چکر کی تیزی میں اضافہ کر دیا میری یہ حالت ہو گئی کہ سر پھٹا جاتا تھا۔ اور یقین ہو گیا کہ سر چکرا کر اب موت واقع ہو رہی ہے۔ چودھری صاحب نے اب دہائی اور تہائی دینا شروع کی۔ اور میں پڑے پڑے ان کی کوشش کی داد دے رہا تھا۔ وہ چلا رہے تھے۔ "اے نالایق شیخ ..... برحمتک ..... کم بخت اشدہ المن الرقص ...... ارے ...... اخرج ..... من الگرداب ...... ارے موذی ناؤ نکال" چکرا کر وہ پھر میرے اوپر گرے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ ساری دنیا گھوم رہی تھی۔ چودھری صاحب نے پھر دھاڑ کر کہا۔ "ایہا الشیخ ..... ابے الو ..... ابن الالو والخنزیر ..... رک ..... ارے نکال ...... واللہ ...... قسم خدا کی ..... ارے بھئی شیخ ...... ارے اشدۃ المن الرقص ..... ارے

مرے ..... ابے روک - روک ارے نکال ..... یا اللہ ..... اے ایہا الشیخ من الموذی اخرج من بلا گرداب ... نالائق بدمعاش والد بھی شیخ -" مگر توبہ کیجئے۔ بھلا ان باتوں سے کہیں ناؤ رکنے والی تھی"

(سنجیدہ)

نوری اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا نازکی، کا ہاتھ بدستور اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے عجیب پیرایہ میں کہا۔" میری، جو باتیں خود سمجھ میں نہیں آتی تھیں ان کو میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی طرف سے جو خیالات میرے دل میں تھے ویسے ہی میری طرف سے آپ کے دل میں بھی ہیں" "پھر آپ نے کیا پایا" "آپ کی اور اپنی حالت کو یکساں پایا - یہ ایک عجیب بات ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میں محبت کی بنیاد دراصل اسی وقت سے ہی استوار ہو گئی۔ جب ہم دونوں کو اس کا علم ہوا کہ یہ رشتہ قائم ہو گا"

(ف)

فرحت اللہ بیگ دہلوی

آپ ایک بہت کہنہ مشق مزاحیہ فسانہ نگار ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت آپ کے فسانوں کی یہ ہے کہ وہ اصلاحی ہوتے ہیں اور اکثر "پیروڈی" جن سے معاشری اور سماجی نقائص کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ زبان خالص دہلوی، محاورات اور استعارات سے مزین، بلند پایہ اور معنی خیز ہوتی ہے۔ طرزِ بیان بہت دلکش، عام فہم اور تبسم آفریں ہوتا ہے۔ اور بہ نسبت اور مزاح نگاروں کے آپ کی تحریریں کافی مؤثر اور ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ پلاٹ دلچسپ بناتے ہیں اور کرداروں کی خصوصیات کو پوری طرح روشن کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں ایک پختگی پائی جاتی ہے بعض فسانوں میں اخلاقی درس بھی موجود ہوتا ہے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

"آرسی مصحف کے لئے ہم کو بھی اندر بلایا گیا۔ ہماری بیوی بھی گود میں لدی ہوئی آئیں ہم دونوں کے بیچ میں آئنہ اور کلام مجید رکھا گیا۔ ادپر سے دوشالہ اوڑھایا گیا۔ ہم کو حکم ہوا کہ سورۂ اخلاص پڑھ کر آئنہ میں بیوی کا منہ دیکھو۔ ہم نے بیوی کی صورت دیکھنے کی خوشی میں الٹی سیدھی سورۂ اخلاص پڑھکر آئنہ پر جو نظر ڈالی تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ یا اللہ یہ عورت ہے یا۔" بی شادی " والدہ صاحبہ نے ان کی تعریف " آدمی کے بچے " سے کی تھی لیکن مجھے تو ان کے آدمی کا بچہ ہونے میں بھی شبہ ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ڈومنی نے کہا۔ میاں کہو بیوی میں تیرا غلام ذرا آنکھیں کھولو۔" میں نے اس پر " ہشت " اس زور سے کہا کہ ڈومنی بیچاری تو گھبرا کر پرے سرک گئی۔ اور ہماری والدہ صاحبہ نے اس کی جگہ لے کر وہی فقرہ کہا۔ ایک دفعہ کہا۔ دو دفعہ کہا۔ جب تیسری دفعہ کہا تو میں نے جواب دیا۔" سنئے صاحب میں ایسی خوبصورت بیوی کا غلام بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ چاہے

آپ بھلا مانیں یا بُرا مانیں۔" میرا یہ کہنا تھا کہ ساری مجلس " دھم " ہو کر رہ گئی "

" اس کے بعد تو میں نے ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو، عشق کر کے رہوں گا۔ میں نے پھر اپنے دل سے فیصلہ کرنا چاہا۔ بہت کچھ سوچتا بچارتا رہا۔ یہی سمجھ میں آیا۔ میاں عاشق حسین، تمھارے نام میں بھی اللہ نے کوئی نہ کوئی ضرور بات رکھی ہے نام تو عاشق اور ہے ہو اُسے کچھ بھی نہیں۔ وہی نہ، نام بڑا اور درشن تھوڑا۔ جیسا نام ویسا کام بھی کرو۔ خالی پیلی نام کے عاشق کیا۔ عشق کر کے عاشق بنو تو کوئی بات بھی ہو۔ بوڑھاپے کی ست تو آج کل کے چھوکرے بُرا بھلا کہتے ہی ہیں مگر سچ پوچھو تو انھیں تمیز بھی نہیں۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ روز بھی نہیں ہوئے کل کی بات ہے۔ ننگے پیر پھرا کرتے تھے۔ ان میں عقل و شعور کہاں سے آیا۔ لگے بڈھوں کو بے وقوف سمجھنے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ جوانی چند روزہ ہے۔ اور پھر عقل تو بڑھاپے میں پختہ ہوتی ہے "

" یہ تو ہوئی ہمارے لکچر کی تمہید۔ اما بعد۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس کرہ کی کتنی دیواریں ہیں (آوازیں آئیں چار) بالکل ٹھیک۔ کوئی عمارت بغیر چار دیواری کے قائم نہیں رہتی۔ اس لئے عقل کی بھی چار دیواریں ہیں۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ چار دیواریں کیا ہیں ؟ (خاموشی) ہت تیرے کی۔ وہ مارا پاپڑ والے کو۔ جب تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ عقل کی چار دیواریں کیا ہیں تو تم سمجھے میرا لکچر۔ اب تم خود ہی تسلیم کر لو کہ تم سب دیوانے ہو۔ میں لکچر ختم کئے دیتا ہوں حاضرین۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں، تمھاری دیوانگی کا یہ دوسرا ثبوت ہے۔ ہٹ دھرمی بے وقوفی کی خاص علامت ہے اور بے وقوفی دیوانگی کا دوسرا نام ہے۔ تو ہاں عقل کی چار دیواریں ہیں۔ مطالعۂ فطرت۔ متابعتِ فطرت، مشابہت فطرت اور بس (آوازیں آئیں یہ تو صرف تین دیواریں ہوئیں) تین دیواریں۔ اچھا تین ہی سہی۔ چوتھی دیوار ہم خود ہیں۔ یعنی نمونۂ فطرت۔ کہو اب تو چار دیواریں ہو گئیں یا نہیں "

طنزیہ فسانہ نگار

(۳)

رشید احمد صدیقی علیگ

آپ اپنے رنگ کے واحد فسانہ نگار ہیں۔ یا نیاز صاحب فتحپوری کی زبان میں۔" رشید صاحب کا طنز بانی رنگ حقیقتاً ایک بلند پایہ تنقید ہے، ایک پاکیزہ " انحلال جذبات " ہے اور حقیقی معنی میں اس " ادب لطیف " کا نمونہ ہے۔ جس کو اصولِ تربیت کے لحاظ سے " کنڈر گارٹن " طریق انشاء بھی کہہ سکتے ہیں۔" آپ کے فسانوں کی

سب سے بڑی خصوصیت "طنز نگاری" ہے جس کا نتیجہ سماجی اصلاح ہوتا ہے۔ آپ سوسائٹی کے نقائص اور عیوب پر اس قدر معنی خیز انداز سے تنقید کرتے ہیں کہ مزاح کا مزاح ہوتا ہے اور اصلاح کی اصلاح طرزِ بیان بہت بلند پایہ، معنی خیز، اور دلکش ہوتا ہے۔ پلاٹ آپ کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کردار نگاری قابلِ ذکر ہوتی ہے۔ آپ کی تحریروں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور ان کو پڑھنے کے بعد ایک شخص میں یہ احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ان کو پڑھ کر اصل واقعات سے ان کا مقابلہ کرکے کوئی نتیجہ نکالے۔ نمونے ملاحظہ ہوں

"دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے۔ الّا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے جب تک یورپ اور دولت حق قائم ہے۔ اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے۔ الّا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے۔ پناہ لیتا ہے اور کشاکشِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہوکر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن، جس کے لئے اس نے چوپائی اور اپالو تعمیر کیا ہے دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے۔ شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے ہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن غیرت و دیانت سے نہیں۔ بلکہ مکر و دولت سے۔ آج چوپائی اور اپالو دریا برد ہو جائیں۔ تو وہ جلد سے جلد کوئی اور اپالو تعمیر کرے گا۔ کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطحِ آب پر اپالو اور چوپائی کی خس و خاشاک یا گندگی نہیں آسکتی۔ بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر ــــــ چوپائی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے۔ یہ ایک لحظہ، تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہونے کے بعد بھی قائم رہتا ہے"

"اتفاقِ وقت کلکٹر صاحب اور ڈپٹی صاحب ساتھ ساتھ کہیں دورے پر تھے۔ بابو گنیش مل، پرانے زمانے کے ایک مختار وکیل، ایڈوکیٹ، بیرسٹر سب ہی کچھ تھے بوڑھے، قانون کے علاوہ سب کچھ پڑھے ہوئے، قدرے شاعر، نہایت طرار، حاضر باش، حکام رس، حاضر جواب، کسی مقدمہ کی پیروی میں کیمپ کے ساتھ ساتھ تھے۔ اور خانساماں وغیرہ کے ساتھ بیٹھے حقہ کے دو چار کش پی رہے تھے۔ قضا را دفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک طرف بیت الخلا تھا۔ لوٹا لئے ہوئے بدحواسی کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہاں جو دیکھتے ہیں تو ڈپٹی فتح علی خاں صاحب موجود ہیں ع

تو گوئی ہمہ تخت سہراب بود

لوٹا فوراً زمین پر رکھا یا۔ جھک کر سلام کیا۔ اور پھر لوٹا وہیں چھوڑ کر فرار ہوئے تو کہا جاتا ہے۔ کہ جب تک ڈپٹی فتح علی خاں صاحب اسی ضلع میں رہے۔ بابو گنیش لال کو کسی نے عدالت کے احاطہ میں نہیں دیکھا"

"فی الحال مجھے یہ بتائیے کہ اچھے سے اچھے کھانے سے علاج کرنا کس اصول پر مبنی ہے۔ اور پھر یہ اصول صحیح بھی ہو تو آپ بتائیے کہ ہندوستان ایسے مفلس مُلک میں آپ کا یہ علاج کس طور پر کامیاب ہوسکتا ہے۔ فرمایا۔ ہندوستان کے لوگ ڈاکٹر درنات کے علاج المامون بالسموں کے متحمل ہوسکتے ہیں تو پھر علاج بالغذا کے کیوں نہ متحمل ہوں گے؟ میں نے کہا۔ مرشد خوب یاد دلایا۔ اور یہ تو بتائیے یہ علاج بالغدود آپ کے نزدیک کیسا ہے۔ فرمایا علاج ہیمونی ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ علاج بالاعضار کرائیں گے اور آج سے کم و بیش سو سال کے اندر آپ دیکھیں گے کہ طبیبوں کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں"

"حمورابی"

رسالہ جن کے گزشتہ پرچے

بہ حساب ایک آنہ (ار) فی پرچہ ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔ رسالہ جن اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا پرچہ تھا جو اڈیٹر نگار کی ادارت میں دو سال تک نکلتا رہا

اِن پرچوں میں جس قسم کے مضامین نکل چکے ہیں۔ وہ اب کبھی میسّر نہیں آسکتے ——

بازی گر

رآلفو۔ مصری بازی گر کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔ تمام شہر میں اس کے کمالات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ضعیف الاعتقاد لوگ تو اس کے بعض کرتبوں کو معجزات سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ عقل میں نہ آنے والی باتیں ہمیشہ تحیر خیز ثابت ہوتی ہیں۔ اور یقیناً کمال اسی چیز کا نام ہے۔ کہ ایک مرتبہ اصحابِ عقل و دانش بھی اپنے دل سے یہ سوال کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟" بعض نقاد کی رائے تھی کہ وہ علمِ تنویم کا ماہر ہے۔ اور محض اپنی قوت مقناطیسی سے کام لے کر ناظرین کے احساسات عارضی طور پر مسحور کر دیتا ہے۔ اس طرح کہ ہر شخص کو وہی چیز نظر آتی ہے۔ اور وہی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس کا تصور وہ خود اپنے ذہن میں کر لے۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ ہفتہ کی رات میں، اور گرشن بھی دم بخود رہ گئے

ہم دونوں دوست جب تماشہ گاہ میں داخل ہوئے تو اسٹیج کے سامنے رنگین پردہ آویزاں تھا۔ کیونکہ وقت معینہ میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ تمام نشستیں بھر چکی تھیں۔ اور کہیں تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ پھر بھی شائقین کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے موسیقی کی ایک دلنواز لَے کے ساتھ پردہ اُٹھا۔ بوڑھا رآلفو اپنے اصلی لباس میں نقرئی اور طلائی تمغے آویزاں کئے ہماری نظر کے سامنے تھا۔ مختصر الفاظ میں اس نے تمام ناظرین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اس رات کا لائحۂ عمل بتا کر پسِ پردہ چلا گیا

دوسرا پردہ اٹھا اور اس کے کمالات کی نمائش شروع ہو گئی۔ تمام کام وہ خود کرتا تھا۔ صرف دو خواتین معمولی معاونین کی حیثیت سے شریک عمل تھیں۔ ہر کھیل کے بعد ایک منٹ کے لئے پردہ گرتا اور پھر اٹھ جاتا۔ پہلا شعبدہ ختم ہونے کے بعد ہم نے رائے قائم کی کہ شاید یہ اس بازی گر کا شاہکار ہے۔ مگر ہمیشہ دوسرے شعبدے نے ہماری توقع کو پامال کر دیا۔ تمام فضا خاموش تھی اور ہر شخص پر ایک سکوت طاری تھا

تفصیل اگرچہ خالی از دلچسپی نہیں مگر وقت طلب ضرور ہے۔ تاہم آخری شعبدہ کو جو بلاشبہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے نظر انداز کر دینا ناممکن ہے اس شعبدہ کو "نقاب پوش نشانہ باز" کے نام سے موسوم کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس قسم

کے کھیل سینکڑوں مرتبہ مشاہدہ میں آئے ہیں۔ مگر اس قدر مہارت کے ساتھ کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ کرشن تو اس درجہ متاثر ہوا کہ انتہائے استعجاب کے باعث دیر تک اس کی زبان کو جنبش نہ ہو سکی

پردہ اٹھنے پر ہم نے دیکھا کہ لکڑی کا ایک قدِ آدم تختہ سیدھا کھڑا ہے۔ اور اس کے بالکل قریب ایک خاتون دونوں ہاتھوں کو افقی حالت میں پھیلائے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ ایک دوسری خاتون نے اسٹیج پر آکر راآلفو کی آنکھوں پر موم جامہ کی پٹیاں اس کثرت سے لپیٹ دیں کہ دکھائی دینے کا کوئی امکان نہ رہا۔ پھر اس بازی گر نے کمر میں کسی ہوئی پیٹی میں سے چھریاں نکالیں اور تختہ کی طرف رُخ کئے بغیر نشانے مارنے شروع کئے۔ ہر بار چھری ایک مخصوص جگہ لگتی اور نرم تختہ میں پیوست ہو جاتی۔ حتےٰ کہ اس خاتون کا سراُن کے درمیان محصور ہو گیا۔ اس تمام دوران میں اس نے ایک دفعہ بھی تختہ کی طرف اپنے چہرے کا رُخ نہیں کیا۔ اور نہ ایک جگہ ساکن رہا۔ بلکہ ادھر اُدھر ٹہل کر چھریاں پھینکتا رہا۔ اس کے بعد ایک دوسری عورت نے آکر ان موم بتیوں کو روشن کر دیا جو ایستادہ خاتون کے جسم سے بالکل قریب تختہ کے چاروں طرف ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ بازی گر نے پستول نکالا۔ اور بدستور اپنی شانِ استغنا کے ساتھ کلائی کو نصف دائرے کی شکل میں گھماتے ہوئے فائر کرنے شروع کر دئے۔ پستول کی ہر آواز کے ساتھ ایک بتی گل ہو جاتی۔ یہاں تک کہ ایک بھی باقی نہ رہی

پردہ گر گیا۔ اور اختتام سے قبل راآلفو نے دوبارہ منظرِ عام پر آکر محض سر کی ایک خفیف جنبش سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا

دوسرے دن کرشن نے کہا کہ تماشہ ایک بار پھر دیکھا جائے۔ اور ساتھ ہی مصر ہوا کہ وقت معینہ سے ایک گھنٹہ قبل چل کر اس بوڑھے بازی گر سے مُلاقات بھی کی جائے۔ میرا بھی دل للچایا کہ ایسے شخص سے ضرور گفتگو کرنی چاہئے۔ لہٰذا ہم دونوں بہت پہلے تھیٹر پہنچ گئے۔ کیونکہ راآلفو اسی جگہ ایک مختصر کمرے میں مقیم تھا

ملازم کے ہاتھ کارڈ اندر بھیجے گئے۔ جس کے جواب میں ہم کو اندر طلب کر لیا گیا۔ ہمارے داخل ہونے پر راآلفو نے کرسی سے اٹھ کر استقبال کیا اور کرسیاں پیش کیں۔ کرشن نے بیٹھتے ہوئے کہا

" میں آپ کے کمالات کی خوبیوں کو شرمندۂ الفاظ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ گذشتہ رات ہم دونوں موجود تھے۔ اور آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ہال کی فضا کا سکوت، حاضرین کا استعجاب کیا معنی رکھتا تھا۔ فن کی صحیح تعریف کرنا صرف اربابِ فن کا حصہ ہے۔ عام لوگ محض اظہارِ پسندیدگی کر سکتے ہیں۔ آپ کی شریکِ کار خاتون بھی ہر لحاظ سے تعریف کی مستحق ہے۔ ایک خطرناک ماحول میں کھڑے ہو کر مسکرانا بڑے دل جگر کا کام ہے۔ کیونکہ بازی گر کو کتنی ہی مہارت ہو جائے مگر یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ ہاتھ کی خفیف سی لغزش معمول کی زندگی کو ختم کر دے "

راآلفو خاموش تھا۔ اور اس کے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ کرشن کی بات ختم ہونے پر اس نے کہا

"آپ نے جس قدر تعریف و توصیف کی وہ جناب کا حسن ظن ہے۔ میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ بہرحال ہیں عزت افزائی کا شکریہ۔ اب جبکہ آپ اظہار ہمدردی کر رہے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے دل کی درد بھری داستان آپ کے گوش گزار کردوں تا گران آلام کا بوجھ کسی حد تک کم ہو جائے جو عرصۂ دراز سے میری روح پر مسلط ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میرا یہ راز آپ پر منکشف ہوگا۔ لیکن بالکل رازدارانہ طریقہ پر آپ سے استدعا ہے کہ اس کو اپنے ہی تک محدود رکھیں۔ آپ کو اور شاید کسی کو بھی یہ علم نہیں کہ وہ خاتون جو تختہ کے قریب کھڑی ہوتی ہے خود میری شریک حیات ہے۔ اور میں یہ کھیل صرف اس کی جان لینے کی غرض سے کرتا ہوں۔ لیکن آج تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ قصّہ بہت طویل ہے۔ یہی مختصراً عرض کروں گا آج سے پانچ سال قبل میں ایک عظیم الشان سرکس کا مالک تھا۔ سیکڑوں کھلاڑی میرے ملازم تھے۔ ہم شہر در شہر ملک بہ ملک اپنے کمالات دکھا کر دولت جمع کرتے پھرتے تھے۔ پانچ سال ہوئے فرانس میں ہمارا قیام تھا۔ ایک روز حسب معمول کھیل سے فارغ ہو کر میں تبدیل لباس کی غرض سے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا ——— اُف! ——— کس زبان سے کن الفاظ میں کہوں ——— میں نے دیکھا کہ میری بیوی ایک غیر شخص کے ساتھ ہم آغوش ہے۔ چونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ ان کو اس کی خبر ہو کہ میں ان کی پوشیدہ سیاہ کاری سے واقف ہو گیا ہوں۔ اس لئے فوراً اُلٹے پاؤں باہر آ گیا۔ مگر معلوم نہیں۔ کس طرح میری بیوی کو اس کا علم ہو گیا۔ تاہم وہ خائف نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے دیدہ دلیر ہے۔ اور کسی بات کو مطلق اہمیت نہیں دیتی۔ میں نے اس روز سے آج تک اس کے سامنے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ اور نہ اپنے طرز عمل میں کسی قسم کی تبدیلی کی البتہ ایک زبردست مگر خاموش انتقام کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے اپنی بڑھی ہوئی شہرت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دیا تمام کھلاڑیوں کو برطرف کر کے سرکس کے شیرازہ کو بکھیر دیا۔ اب ہم صرف تین آدمی ——— میں۔ میری بیوی اور ایک قابل اعتماد ملازمہ تمام کھیل پیش کرتے ہیں۔ اس سانحہ سے قبل ایک جاپانی خاتون تختہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس خدمت کو انجام دیتی تھی جو اب میری بیوی کے ذمہ ہے۔ میں اس روز سے کوشش کر رہا ہوں۔ کہ اپنی بے وفا رفیقہ کو کھیل کے دوران میں تماشا بین حضرات کی نگاہ کے سامنے منظر عام پر ہلاک کر کے جذبۂ انتقام کو سرد کر لوں۔ میں صدہا ذرائع سے اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے منظور نہیں۔ صرف یہی طریقہ پسند ہے۔ تعجب ہے کہ مصمم ارادہ کر لینے کے باوجود آج تک مجھ سے یہ غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ میں دانستہ طور پر اپنے ہاتھ کو خلاف اصول گھما کر چھری پھینکنے اور بر متعینہ اوقات میں پستول کی لبلبی دبانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر بے سود۔ کہنہ مشقی کے باعث میرے تمام اعضا لوہے کی مشین کی طرح بے خطا کام کرتے ہیں۔ میری دیرینہ مہارت اُس درجۂ کمال تک پہونچ گئی ہے جب عامل سے لغزش ہونے کا امکان باقی ہی نہیں رہتا۔ شاید آپ یقین نہ کریں گے۔ ایک دن جان بوجھ کر میں نے اپنا ہاتھ جلا لیا۔ محض اس خیال سے کہ . . . . شاید اس کی سوزش و تکلیف سے غلطی کرنے کا موقعہ مل جائے۔ ایک دن سخت بخار کی حالت میں اپنا کھیل جاری رکھا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غلطی کرنا اب میرے لئے قطعی ناممکن

ہو گیا ہے۔ میری اس کمزوری کو میری بیوی خوب سمجھتی ہے۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے کہ مجھے اپنے اعضاء پر قدرت حاصل نہیں۔ آپ نے بجا ارشاد فرمایا کہ ایک خطرناک ماحول میں کھڑے ہو کر مسکرانا بڑے دل جگر کا کام ہے۔ لیکن وہ صرف آپ کے نزدیک خطرناک ہے۔ میری بیوی اس کو بچوں کا کھیل تصور کرتی ہے۔ اس کا تبسم بھی مصنوعی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص ایک ہی کیفیت کے ماتحت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں مسکرا سکتا۔ اس کے تبسم میں ایک طنز پنہاں ہے۔ جو میرے لئے سوہانِ روح ہے۔ میں غم و الم کی زندگی بسر کر کے خود اپنی ہستی کو تباہ و برباد کر رہا ہوں۔ درانحالیکہ اس بے وفا کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ کیا آپ دونوں میں سے کوئی صاحب ایسی تدبیر بتا سکتے ہیں۔ جس پر عمل کرنے سے میری مہارت کو ترقیِ معکوس حاصل ہو سکے۔ میرا فن انحطاط کے تمام مدارج کو طے کر کے ایسے نقطہ پر آجائے۔ جہاں سوائے لغزشں کے اور کچھ نہیں ہوتا"

"خدا آپ پر رحم کرے۔" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔" بہتر ہے کہ آپ اس ارادے ہی کو اپنے دل سے ترک کر دیں۔ اتنی طویل مدت میں تو آتشِ انتقام ویسے بھی سرد پڑ جانی چاہئے"

"بے شک!" اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔" یہ ایک نظریہ ہے کہ اسے سرد پڑ جانا چاہئے۔ لیکن عملی دنیا میں اگر ایسا نہ ہو تب؟"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا

کرشن نے کچھ دیر سکوت کے بعد کہا۔" اچھا! آپ اپنی شریکِ حیات سے چند لمحے ملاقات کرنے کا موقع دیجئے ممکن ہے۔ اس کو دیکھ کر ہم کوئی مفید مطلب مشورہ دے سکیں"

راکفو نے کچھ ایسے انداز سے آمادگی ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ خود اس چیز کا آرزومند تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک دروازے کے قریب بلا کر کہا

"دیکھو! اسٹیج کے عقبی حصہ میں اس وقت بھی وہ اسی انداز سے کھڑی ہے اس کا معمول ہے کہ کھیل شروع ہونے سے قبل وہ اپنے مخصوص طرزِ عمل کی مشق دُہرا لیتی ہے۔ تاکہ کھڑے ہونے میں خود اس سے غلطی نہ ہو جائے"

پھر اس نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔" زنوبیہ! دو شریف آدمی تم سے نیاز حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ چند لمحے کے لئے یہاں آجاؤ"

اس کا رُخ ہماری طرف تھا۔ وہ اسی بے پناہ شانِ استغناء کے ساتھ اپنے نقرئی بازوؤں کو افقی حالت میں پھیلائے کھڑی مسکراتی رہی۔ اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا

یکایک میرا دوست ایک قدم آگے بڑھا اور پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ کر پُرغضب نگاہوں سے بازی گر کو گھورتے ہوئے کہنے لگا

"تم مکار ہو۔ تم نے ایک گھنٹہ تک اپنے فرضی افسانے سے ہمیں دھوکا دیا۔ دیکھو! تمھاری بیوی کے دائیں پاؤں پر ایک چھوٹا سا سانپ چڑھا جا رہا ہے۔ اور اسے خبر نہیں۔ کھڑکیوں سے آنے والی ہوا کے باعث دروازوں کے پردے۔ چھت گیری کا کاغذ اور گلدستہ کی پتیاں وغیرہ جنبش میں ہیں۔ مگر تمھاری بیوی کا ملبوس حرکت نہیں کرتا یقیناً وہ کوئی زندہ عورت نہیں ہے بلکہ مجسمۂ غیر ذی حیات ہے۔

رالفو کے چہرے کا حزن و ملال فوراً مسرت و انبساط میں تبدیل ہوگیا۔ وہ کہنے لگا

"آخر کار! آپ حقیقت کی تہ کو پہونچ گئے۔ اچھا! آج رات آپ دونوں دوست اسٹیج کے ایک پوشیدہ مقام پر بیٹھ کے ہمارے کمالات دیکھیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہر چیز میں حقیقت کا شائبہ کس قدر کم ہے۔ اور جس چیز کو آپ کمالِ فن سمجھتے ہیں۔ وہ فریب نظر کے سوا کچھ نہیں"

طاہرہ دیوی (شیرازی)

"نیازمندانِ لاہور" سے

ہندوستان کو اگر یوروپ فرض کیجئے تو پنجاب اس کا جرمنی ہے اور افریقہ تصور کیجئے تو وہ اس کا مصر ہے - وہ زندگی اور زندہ دلی کا ایک مجسمہ ہے اور ہمارے ہر سوال کا جواب ہاں کی سرزمین میں موجود ہے - ٹیگور کا جواب اقبال سروجنی نیڈو کا جواب مسز شاہنواز اور سیٹھ برلا کا جواب عبدالقادر قصوری ہیں

آریہ سماج - کانگرس اور سیوا سمتی کی دوکان - قادیانیوں - احراریوں اور انجمن حمایت اسلام والوں کی سرگرمیوں سے سرد ہے

اُردو جو یو-پی میں ضیعف ہو کر دم توڑ رہی ہے - اور دکن میں ابھی شیر خوارگی کی حالت میں ہے - پنجاب میں جوان نظر آتی ہے "انقلاب" ہندو فرقہ وارانہ ذہنیت کا دنداں شکن جواب ہے، تو "ہمایوں" "نیرنگ خیال کے خاص نمبر" اور "کارواں کے سالنامے" وغیرہ اچھے سے اچھے مغربی رسائل کی صف میں رکھے جاسکتے ہیں

اور چونکہ یہ اُردو کا تذکرہ ہے نہ کہ ہندو مُسلم کا اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ پنجاب کے وسیع دامن میں پریم چند کا جواب "سدرشن" بھی موجود ہے

اس سلسلہ میں لالہ لاجپت رائے آنجہانی (ایک ہندو مگر نمازی باپ کے بیٹے) کرنل بھولا ناتھ اور اڈیٹر "پارس" کو بھی ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے - مختصر یہ کہ سارے ہندوستان میں یہی ایک خطہ ہے جہاں اُردو کو بحیثیت زبان عزت کی کرسی ملی

سر اقبال، جسٹس عبدالقادر، حکیم احمد شجاع، سید ممتاز علی (جنھوں نے سرسید ہی کی رائے سے مردوں کی "تہذیب الاخلاق" کے جواب میں عورتوں کے لئے "تہذیب النسواں" جاری کیا تھا) اور چغتائی سے کون واقف نہیں جو اُردو ہی کی خدمت کی وجہ سے خطاب یافتہ بنے

بس ہر وہ شخص جو کسی حیثیت سے بھی اُردو کا قدردان یا بہی خواہ ہے اُردو پر پنجابیوں کا مربیانہ حق ماننے کے لئے مجبور ہے

بھلا۔ مہر و سالک۔ تاج و پطرس۔ تاثیر و چغتائی۔ عبدالعزیز و حفیظ اور ظفر علی خاں وغیرہم کی مبارک سرزمین کی قدر وہ کون "کافر" ہے جو نہ کرے

اس صورت میں دہلی و لکھنؤ والوں کا (اُردو کے باوا آدم ہونے کی حیثیت سے) یہ فرض تھا اخلاقی و تنقیدی دونوں کروہ بیگانوں کی اس "یگانگت" کو سراہتے۔ ان کی اس محیرالعقل سعی و کاوش۔ جد و جہد اور عمل و ایثار کی بیش از بیش داد دیتے اور فخر کرتے نہ کہ خود تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا بنے بیٹھے رہیں اور اُن کے راستے میں روڑے اٹکائیں ——— یہی وہ طرزِ عمل ہے جس کے لازمی نتیجہ سے یو۔پی میں اُردو کے چشمے بقول شخصے خشک ہوگئے ہیں اور اب حالت یہ ہے کہ یہاں ادب اُردو صرف ایک سسکتا ہوا سانپ رہ گیا ہے جو ایک خفیف سی پھنکار۔۔۔ (یعنی تنقید) سے اپنی زندگی کا کبھی کبھی ثبوت دیتا رہتا ہے

قرناً قرن کے مقررہ قواعد اُردو کے ماتحت زبان کی وہ بلند بانگ تنقید جو سراسر تنقیص ہو کیا کبھی "نشتر زنی کی بے رحمی" سے تعبیر کی جا سکتی ہے، نہیں اس کے لئے سانپ کی پھنکار ہی مناسب تشبیہ ہے

یو۔پی کے تنقید نگاروں کی یہ حیثیت (نگار و نیاز سے قطع نظر کرکے) بالعموم ایک ہی سی ہے جس میں مشکل ہی سے کوئی استثنا نظر آسکتا ہے۔ الّا ماشاءاللہ

ان کے برعکس "نیاز مندانِ لاہور" کی شان ملاحظہ فرمائیے "کارواں" کی اسی اشاعت میں (جس میں یوپی والوں کے اس جارحانہ طرزِ عمل پر انھوں نے پروٹسٹ کیا ہے) جس خوبصورتی سے "نیاز مندانِ لاہور" نے "معراج" کے مذکر ہونے کی تائید اور مؤنث ہونے کی "تنسیخ" خود ناسخ کے شعر سے کی ہے وہ داد سے مستغنی ہے

اب گو تیر کمان سے نکل چکا ہے تاہم اس کی گنجائش اب بھی ہے کہ نام نہاد نقادانِ ادب شرمائیں اور گریباں میں منہ ڈال کے اپنے ان حریفوں سے عالی ظرفی کا سبق لیں

تصویر کا ایک رُخ تو یہ تھا

دوسری طرف نیاز مندانِ لاہور سے بھی دبی زبان سے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے

وہ یہ کہ یو۔پی کے تنقید نگاروں کے خراب عمل سے متاثر ہو کر یعنی جوش میں بیخود ہو کر خدارا آپ اعتدال کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑئیے

مجھے خوف ہے کہ آپ کا موجودہ پُرجوش اقدام، بطور ردِّ عمل کہیں کمال پاشا کا اقدام نہ ہو!

کمال پاشا، مسلمان ہیں اور ایسے مسلمان جن پر عالمِ اسلام کو فخر و ناز ہے

مگر چونکہ ترکی سلاطین کے افسوس ناک طرزِ عمل کے بعد ردِّ عمل ہونا ضروری تھا۔ اور ردِّ عمل اور بے اعتدالی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ردِّ عمل بھی ہوا اور بے اعتدالی بھی!!

ردِ عمل کا نتیجہ دنیا نے ہمیشہ نقصان و خسران کی صورت میں برداشت کیا ہے

عیسائیت، ایک تشنۂ تکمیل انسانیت تھی اس لئے راستے میں اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں حتیٰ کہ دنیا مذہب کے نام سے بیزار ہوکر دہریت کے استقبال پر تیار ہوگئی

اسلام، دہریت و مذہب کے اسی درمیانی شگاف کا پیوند اور انسانیت کے اسی زخم کا مرہم تھا۔ لیکن مولویوں کی بے اعتدالی سے وہ بھی درمانِ درد نہ ہوسکا

انقلابِ فرانس کی "جمہوریت" دراصل شہنشاہیت یا مطلق العنانی کا ردِ عمل تھی۔ مگر چونکہ اس ردِ عمل میں بے اعتدالی پیدا ہوگئی اس لئے صحیح راستہ پھر بھی نہ مل سکا۔ شہنشاہیت کا ایک انتہائی سرا چھوڑ کر دوسرا انتہائی سرا گلے کا ہار ہوگیا

یو۔ پی کے تنقید نگاروں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے نیاز مندانِ لاہور نے

تونے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی بجائے "مجھے" کے "تونے" کو بطور ایک پنجابی محاورے کے رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، ——— اس لئے کوئی شک نہیں کہ اہلِ پنجاب کو تصرفات کا پورا پورا حق حاصل ہے تاہم اتنا عرض کرنے کی اجازت ہونی چاہئے کہ صرف انفرادی رائے پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ البتہ اگر تمام پنجابی اہلِ قلم اس تصرف پر متفق ہوجائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ چشم ما روشن و دل ماشاد۔ اب رہی لطافت! سو اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں کہنا بجز اس کے کہ دہلی و لکھنؤ کا حریفانہ اختلاف اظہر من الشمس ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے محاورے پر مضحکہ اڑانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے

اس کی وجہ آپ سمجھے کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول اسوقت تک دہلی کی ماتحتی سے آزاد ہی نہیں ہوا جب تک اس کی ایجاد میں "اجتہاد" کی بو پیدا نہ ہوگئی

بھلا ملائی کو "بالائی" کہنے یا کم از کم ماننے سے کون نازک خیال انکار کرسکتا ہے۔ سچ ہے

نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

اس اعتبار سے کہ "مجھے کرنی ہے" کے بجائے "تونے کرنی ہے" عام محاورۂ پنجاب ہے نیز اس میں کوئی ثقالت یا کثافت بھی نہیں ہے۔ مخصوص حالات کی بنا پر یہ تصرف قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ طریقہ اختیار کرلینا ناعاقبت اندیشانہ بے راہ روی ہے

کتابی اُردو چھوڑ کے مقامی اُردو شروع کرلینے سے پہلے اس پر بھی غور کرلینا ضروری ہے کہ "میں جاتا ہوں" کے بجائے "میں نے جاتا ہوں" جائز کر کے آئندہ آگرہ والوں کے لئے "میں جاؤں ہوں" بریلی والوں کے

لئے" میں جا رہا ہوں" بھوپال والوں کے لئے " اپن جاتے ہیں" صاحب لوگوں کے لئے" ہم جانا مانگتا ہے" اور دیہاتیوں کے لئے " ہم جائت ہیں" وغیرہ کی بھی گنجایش اسی جادو کے بٹارے میں نکالنی پڑے گی

صورتِ حال کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے ایک ایسی عورت کا تصور کیجئے جو حسنِ صورت کا ایک اچھا نمونہ ہونے کے علاوہ ظاہری زیب و زینت اور تزئین و آرایش کے اعتبار سے بھی مکمل ہے۔ لیکن با ایں ہمہ خوبی ایک ذرا سا اس میں عیب بھی ہو............ یعنی صرف کانی"......... ہو

بعینہ یہی مثال زبان کی تمام معنوی خوبیوں کے خال پر" غلطی کے مسّہ" کی دی جاسکتی ہے البتہ زبان کی ظاہری صفائی اور پاکیزگی میں اس قدر غلو بھی نہ ہو جانا چاہئے کہ وہ ایک ایسا" خوبصورت مردہ" بن کے رہ جائے جس کے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان ناک وغیرہ تمام اعضا تو صحیح و سالم ہوں مگر روح نہ ہو

ہم یہ نہیں کہتے دہلی یا لکھنؤ اور لاہور کی زبان میں کوئی فرق نہ ہو۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ فرق بڑھتے بڑھتے فارسی اور سنسکرت یا زمین آسمان کا فرق نہ ہو جائے۔ فرق ہو اور شوق سے ہو مگر یہ فرق زیادہ سے زیادہ " فرنگی اور امریکی انگریزی" یا " حجازی اور مصری عربی" سے زیادہ نہ ہو

عقیل ناظر حسین جعفری (خیر آباد)

دُنیائے اسلام کا عظیم انقلاب

تاریخ کا مینارہ ۔ تمدن کا ستون ۔ قوموں کی زندگی کا اہم اصول اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف مذہبی اصول ہیں مذہبی اصول ہمیشہ قوموں کی زندگی کا نہایت اہم عنصر اور تاریخ کا نہایت نمایاں جزو رہے ہیں ۔ چنانچہ تاریخ کے عظیم الشان واقعات نے جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے ہیں ان میں مذاہب کے بننے اور بگڑنے کا نتیجہ سب سے زیادہ اہم ہے ۔ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں جو اساسی مسائل قرار دیے گئے ہیں ان میں پہلا اساسی مسئلہ یہی مذہب تھا

ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ تاریخ کے ابتدائی زمانے سے آج تک ہر نظام حکومت اور ہر نظام تمدن کا سنگِ بنیاد مذہبی عقائد کی سطح پر رکھا گیا ہے ۔ یہی معبود ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کا سب سے بڑا دور تمثیل کیا ہے ۔ مذہب اس برق رفتاری سے اخلاق پر اثر ڈالتا ہے کہ اس عالم میں عشق کے سوا کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ مگر عشق بھی تو ایک مذہب ہی ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ شخصی مذہب ہے اس لئے ہمیشہ قائم نہیں رہتا اگر تم اس قوم کی حالت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو جو صرف مذہب سے متاثر ہو کر بپھر گئی تو تم عروج اسلام کی تاریخ کو دیکھو

عروج اسلام تاریخ انسانی کا تعجب انگیز واقعہ ہے ۔ اس کی ابتدا ایسی سرزمین اور قوم سے ہوئی جو اولاً کسی شمار میں نہ تھی ۔ اسلام نے ایک ہی صدی میں نصف کرۂ زمین کو نورِ ایمان سے منور کر دیا ۔ اس نے بڑی بڑی سلطنتوں اور مدتوں کے مستقل مذہبوں کو تہ و بالا کر کے نفوسِ اقوام کو نئی ترکیب دی اور ایک مکمل نئی دنیا یعنی دنیائے اسلام کی تعمیر کی

اعتقادات کے اندر ایک ایسا مؤثر جادو پنہاں ہے جو مزاج عقلی کو بالکل بدل دیتا ہے جو مذہب خوف سے نہیں بلکہ اُمید سے پیدا ہوتا ہے اس کا اثر دائمی ہوتا ہے ۔ اسلام نے انسان کی عقل کے سامنے سعادت کا دروازہ کھول دیا ہے ۔ اور اسی بنا پر تمام مؤثرات سے ممتاز ہو گیا ہے ۔ اور فلسفہ اس منزل سے کوسوں دور ہے

اگر ہم سیاسی حیثیت سے بھی نگاہ ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ مذہبی عقائد کا اثر کس قدر شدید ہے ؟ مذہب کی عظیم الشان قوت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ایک زمانہ میں قوم کے فوائد قوم کے احساسات اور قوم کے خیالات کو متحد کر دیتا ہے - اس لئے وہ ان تمام عناصر کا جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے - دفعتہً قائم مقام ہو جاتا ہے - مذہبی قوت کے استیلاء سے تمام قوتوں کا رُخ صرف ایک مقصد کی طرف ہو جاتا ہے - مذہب کی عظیم الشان طاقت کا راز اسی اصول کے اندر مضمر ہے - یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے کارہائے نمایاں کئے ہیں اسی قسم کے مذہبی انقلاب کے زمانہ میں کئے ہیں اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی تاسیس اسی دورِ انقلاب میں ہوئی ہے - اسلام نے قبائل عرب کو متحد کر دیا اور اسلام کی قوت سے اقوام عالم کو زیر وزبر کر کے انھوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قایم کر لی

نفس اعتقاد کوئی چیز نہیں ہے - اصلی چیز وہ قوت ہے جو عقائد کو دل میں مرکز کر دیتی ہے - یہ قوت معبودِ حقیقی کا عطیہ ہے جو خدا اپنے مذہب کے قیام کے لئے عطا فرماتا ہے - خدا خود کہتا ہے لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم اگر تم زمین کی تمام دولت صرف کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں کو متحد نہیں کر سکتے چنانچہ اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی کی قوت نے دو ہی نسلوں میں چمکتے ہوئے ہلال - پیرنیز سے لے کر کوہ ہمالیہ تک اور صحرائے ایشیائے متوسط سے لے کر صحرائے افریقہ متوسط تک نصب کر دیا

جن مذاہب کے معبود خود ساختہ ہوتے ہیں ان کے پرستاروں کے عزم و ارادہ میں شدت و صلابت نہیں ہوتی اس لئے ان کو کامیابی آہستہ آہستہ اور بہت کشمکش کے بعد حاصل ہوتی ہے - اور آخر کار کسی زبردست بادشاہ کی امداد سے جو خود اس مذہب کا مقلد ہو جاتا ہے اُن کو عروج حاصل ہوتا ہے - مسیحی مذہب کے لئے قسطنطین بودھ کے لئے اشوک اور زرتشتیوں کے لئے کیخسرو ایسے سلاطین نے جنھوں نے اپنے اختیار کردہ مذاہب کو اپنی عظیم مادی و ذی قوت سے عروج کی منازل پر پہونچایا

ہر قوم کی سیاسی - اخلاقی اور صنعتی تاریخ اگرچہ اس کے مذہب سے پیدا ہوتی ہے - لیکن جس طرح مذہب نظام اخلاق پر اثر ڈالتا ہے اسی طرح خود نظام اخلاق سے متاثر ہوتا ہے - اس بنا پر ہر قوم کی زندگی کے رکن اعظم صرف دو ہیں - مذہب اور اخلاق - لیکن ہر قوم کا نظام اخلاق اپنے اصلی اوصاف کے لحاظ سے ہمیشہ قایم رہتا ہے اور اسی خصوصیت نے ہر قوم کی تاریخ کو متحد اور جامع و مانع بنا دیا ہے مگر مذہب اپنے اندر تغیر پذیری کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی تغیر کی بنا پر قوموں کی تاریخ میں بہت سے انقلابات کی سرگذشت نظر آتی ہے

معمولی مذہبی تغیر بھی مستقل و متواتر انقلابات کا پیش خیمہ ہوتا ہے - پہلی تین صدیوں سنہ ۶۵۰ء سے سنہ ۱۰۰۰ء تک بلادِ اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصے تھے - نصرانی مغرب سے جو از منہ مظلمہ سنہ ۴۷۶ء (انحطاط سلطنت روما) سے سنہ ۱۴۵۳ء تک (فتح قسطنطنیہ تک) کی تاریکی چھپائے ہوا تھا - اسلامی مشرق کا

کھلا ہوا مقابل بنا۔ دسویں صدی عیسوی سے انحطاط کے آثار نظر آنے لگے۔ اسلامی جمہوریت اور مذہبی شیفتگی کی جگہ خود مختاری اور دنیوی جاہ طلبی لینے لگی۔ عربی تمدن پر عجمی اثرات رفتہ رفتہ غالب آنے لگے۔ دنیاء اسلام کا وجود مسلمانوں کی قوتِ ایمان پر ہے کیونکہ قوت ایمان ہی اس عظیم الشان سلطنت کا سنگِ بنیاد ہے اس لئے جب قوتِ ایمان میں ضعف آنے لگا تو دنیاء اسلام کا انحطاطی دور شروع ہو گیا

۱۶۸۳ء میں جب ترکوں کی وائنا میں شکست ہوئی تو مسیحی یورپ کو یقین ہو گیا کہ دنیاء اسلام کی قوی ترین قوت دینی انتہائی کمزوری کو پہونچ گئی ہے اس وقت سے لے کر ترکی سلطنت پر بے رحمانہ مسیحی حملے متواتر ہو رہے ہیں۔ مگر اسلامی دنیا نے بہیئت مجموعی مسیحی حملوں کی ضرب کا احساس انیسویں صدی کے قبل تک نہیں کیا۔ اٹھارہویں صدی کے دوران میں مغرب نے اسلامی صفوں کے پہلوؤں میں پھر مشرقی یورپ اور انڈیز میں حملہ کیا لیکن دنیاء اسلام کا ایک بڑا حصہ مراکش سے لے کر ایشیاء متوسط تک محفوظ رہا۔ اس وقفہ سے اسلامی دنیا نے کوئی نفع نہیں اُٹھایا۔ اس وقت بھی اگر قوتِ ایمان کے کھوئے ہوئے سرمایہ کو جمع کر لیا جاتا تو آج صورتِ حال دگرگوں ہوتی اس وقت دنیائے اسلام کا مقابلہ ایسے یورپ سے تھا جس کی سرگرمیاں صنعتی انقلاب سے بڑھ گئی تھیں۔ اور جدید علوم سے مسلح تھا۔ جدید اختراعات نے قدرت کے اسرار کو منکشف کر کے اس کے حملہ آور ہاتھ میں ایسے ہتیار دیدیئے تھے جو وہم و گمان میں بھی نہ تھے نتیجہ ناگزیر تھا۔ قوتِ ایمان سے محروم اسلامی سلطنتیں مغربی حملوں کے سامنے یکے بعد دیگرے زیر ہو گئیں۔ اور کل اسلامی دنیا بہت جلد مسیحی قوتوں میں تقسیم ہو گئی۔ انگلستان نے ہندوستان و مصر تا کاروس نے کوہ قاف کے پار جا کر ایشیائے متوسط پر قبضہ کیا۔ فرانس نے شمالی افریقہ کو فتح کیا اور دیگر مسیحی اقوام نے اسلامی وراثت کے چھوٹے چھوٹے حصے پائے۔ ان فتوحات کا آخری درجہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر جو صلح نامہ کے شرائط لکھے گئے ان سے دنیاء اسلام کی مغلوبیت کاغذ پر مکمل ہو گئی

کاغذ پر اس لئے کہ عین ظاہری کامیابی کے وقت مسیحی قوتوں کو ایسا چیلنج دیا گیا کہ جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس مغربی فتوحات کے صد سالہ زمانہ میں دنیاء اسلام میں اہم اندرونی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مغربی تعدی کے روز افزوں سیلاب نے آخر کار خوابیدہ مشرق کو بیدار کر دیا۔ اور دنیاء اسلام پر آخر کار یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ " جب قوموں کے معبود پردۂ خفا میں چھپ جاتے ہیں تو وہ بہت دنوں تک زندہ نہیں رہتیں " اس حقیقت کے احساس نے پچیس کروڑ مسلمانوں میں مراکش سے لے کر چین تک اور ترکستان سے لے کر کانگو تک ایک ایسا ہیجان پیدا کر دیا ہے کہ جس نے اگرچہ خاص شکل ابھی تک اختیار نہیں کی ہے تاہم اس کی شدت اور قوت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ پہلی چنگاری صحراء عرب یعنی عہد اسلام میں روشن ہوئی " انیسویں صدی کے آغاز میں ایمان کے سرمایہ کے جمع کرنے کے لئے وہابی تحریک شروع ہوئی۔ جس نے فوراً حیات اسلامی کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ اور

اسی سے اپنے موقع پر اتحاد بین الاسلامی شروع ہوا

محمد بن عبدالوہاب تقریباً ۱۷۰۳ء میں صحرائے عرب کے وسطی علاقہ یعنی نواح نجد میں پیدا ہوئے۔ جب خلافت کی شکل خداداد جمہوریت سے مشرقی مطلق العنانی میں تبدیل کی گئی تو آزادی پسند عرب متنفر ہوکر اپنے صحراؤں کو واپس چلے آئے۔ اور یہاں انھوں نے اپنی بدوی آزادی کو قایم رکھا۔ بے شک ترکوں نے ساحل بحر قلزم اور بلادِ مقدسہ پر قبضہ حاصل کرلیا تھا۔ لیکن نجد یعنی اندرونی وسیع حصّہ آزاد تھا۔ مذہب اور سیاسیات میں نجدی عرب اپنے اجداد کے عقائد کے مقلد تھے۔ اسلام کی سادگی اور جمہوریت پر وہ فدا تھے۔ عبدالوہاب کے علم و تقدس کی شہرت بہت جلد ہوگئی۔ سالہا سال تک وہ اطراف عرب میں گھومتے رہے اور بالآخر انھوں نے قبیلہ سعود سے شیخ محمد کو جو نجد میں سب سے بڑے سردار تھے۔ اپنا ہم خیال بنالیا۔ اس سے عبدالوہاب کو اخلاقی طاقت اور مادّی قوت حاصل ہوگئی رفتہ رفتہ صحرائی عربوں میں آغاز اسلام کا سا سیاسی اتحاد قایم ہوگیا۔ ۱۸۰۰ء میں عبدالوہاب نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا سعود ان کے قابل جانشین ہوئے نجد کو مستحکم کرکے سعود نے دنیا ر اسلام کو فتح کرنے کی تیاری کی اوّل منزل بلادِ مقدسہ تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں بلادِ مقدسہ کو فتح کرلیا۔ ۱۸۱۴ء جبکہ سعود شام پر فوج کشی کررہے تھے فوت ہوگئے کچھ عرصہ کے لئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہابی کل مشرق کو خس و خاشاک سے صاف کرکے ایک ہی دور میں اسلام کو خرابیوں سے پاک کردیں گے لیکن تقدیر الٰہی یوں نہ تھی۔ سلطان ترکی نے اپنے مشہور و معروف طاقتور نائب محمد علی کو جو اس وقت حکومت مصر پر قابض تھے وہابیوں کے مقابلہ کے لئے تعینات کردیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مقامات مقدسہ واپس لے لئے گئے اور وہابی افواج ریگستان میں پسپا کردی گئیں۔ بڑھنے والی وہابی سلطنت سراب کی طرح غائب ہوگئی اور وہابیت کا سیاسی دَور ختم ہوگیا

لیکن وہابیت کے روحانی دَور کا اب آغاز ہوا۔ نجد اصلاحی جوشش کا مرکز رہا اور یہاں سے نئی روح کی تنویر اطراف عالم میں پھیلتی گئی۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے تمام دنیائے اسلام سے جو حجاج آئے وہ پرجوش مصلح بنکر واپس گئے۔ اس نئے مذہبی جوش نے دور دراز مقامات میں ہلچل ڈال دی۔ مثلاً شمالی ہند میں ایک وہابی جانباز سید احمد نے ایک مذہبی سلطنت قایم کرلی مگر ان کی ناگہانی موت سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۳۰ء میں برباد کردیا۔ اگرچہ سلطنت مٹ گئی لیکن اس کے اثرات قائم رہے۔ انھیں سنین میں مشہور سید محمد بن سنوسی اپنے وطن الجزائر سے مکہ آئے۔ اور اس نئے مذہبی جوش سے متاثر ہوکر اس عظیم بین الاسلامی اخوت کی بنیاد ڈالی جو ان کے نام سے موسوم ہے۔ فارس میں بابی تحریک اگرچہ اصولاً وہابیت سے بالکل بیگانہ تھی لیکن بلاشبہ یہ بھی وہابی اقتضا کا دوسرا پہلو تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی قرن میں خالص وہابی تحریک بڑھ کر ایک عام تحریک یعنی دنیا ر اسلام کے دَور جدید میں مبدل ہوگئی۔ اس میں بھی بجائے

خود مختلف صورتیں پیدا ہو رہی تھیں اور ان میں سے خاص تحریک وہ ہے جو اتحاد بین الاسلامی کہلاتی ہے۔ اس تحریک کا جو سیاسی پہلو ہے اس کا ذکر انشاء اللہ تعالے کسی دوسری صحبت میں ہوگا اس مضمون میں اسلامی بیداری کے دیگر پہلوؤں پر خصوصاً جنکا مذہب اور تمدن سے تعلق ہے غور کرنا ہے

وہابی تحریک صحیح معنوں میں خالص اصلاح تھی اس کا مقصد خرابیوں کی اصلاح ضعیف الاعتقادی کی رسومات کا انسداد اور ابتدائے اسلام کا احیا تھا۔ ہر مذہبی اصلاح کی اول منزل یہ ہے کہ وہ اپنے ابتدائی عقائد کی طرف عود کرے۔ مذہبی مصلح کے لئے بدعات مابعد سے بلا لحاظ ان کے اوصاف کے انکار کرنا ہی اصلاح کا واحد ذریعہ ہے

موجودہ زمانہ کی اسلامی حریت کی ابتدا اگرچہ وہابی تحریک سے ہوئی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کسی زمانہ میں بھی احرار سے خالی نہیں رہا۔ دنیائے اسلام کے انحطاطی اور زوالی دور میں بھی ظلمت و گمراہی و باطل کے خلاف اعلاءکلمتہ الحق کے لئے بلند ہوتی رہیں۔ مثلاً سولھویں صدی میں علامہ الغزالی نے لکھا تھا کہ یہ ذرا بھی ناممکن نہیں ہے کہ وہ ادراک جو خدائے تعالے نے ازمنہ ماضیہ کے لوگوں کو عطا نہ فرمائے ہوں آیندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھے ہوں۔ مبداء فیاض ہر قرن کے عقلا کے قلوب پر اپنے انعام اور تجلیات کی کسی تراوش کو کبھی بیکار نہیں کرتا۔ اسلام کے عہد زوال کی ان حق پرست صداؤں نے زمانۂ حال کے مصلحین کی ہمت بڑھائی اور انیسویں صدی کے وسط تک ہر اسلامی ارض میں احرار کی جماعتیں پیدا ہو گئیں بلاشبہ ان کی تعداد ابتدا میں ناقابل التفات تھی۔ مولویوں نے ان کی تکفیر کی اور عام جہال جو مولویوں کے زیر اثر تھے ان سے نفرت کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کا خلوص۔ نیک نیتی۔ فداکاری اور قومی و دینی خدمات نے مولویوں کے مکر و فریب کے جال کو توڑ دیا

جنگ کریمیا کے بعد سے عبدالحمید کی خود مختاری کے زمانہ تک احرار ترک حکومت کی روح رواں تھے رشید پاشا اور مدحت پاشا جیسے احرار ترکی وزراء نے سلطنت عثمانی کی تجدید و آزادی کی حقیقی مگر ناکامیاب کوشش کی۔ سلطان عبدالحمید کے مظالم بھی ترکی حریت کو فنا نہ کرسکے یہاں تک کہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے احرار ترکوں کو برسر اقتدار کر دیا۔ مصر میں حریت کی بنیاد مستحکم ہوگئی اور اس کے نمایندے شیخ محمد عبدہٗ رکن جامعہ ازہر ایسے آزاد خیال میدان عمل میں نظر آنے لگے

یہ احرار مصلحین بلاشبہ اسلامی تدریجی ترقی کے جزو ہیں یہ قدامت پسند بہترین معنی میں ہیں اور صحت بخش تبدیلی کے قبول کرنے والے ہیں تاہم وہ اپنے موروثی توازن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سچے مذہبی لوگ ہیں۔ اور ان کا ایمان ہے کہ اسلام زندہ اخلاقی قوت ہے اور قوت ایمان ہی نے انھیں میدان عمل

میں گامزن کیا ہے

عزیز احمد زبیری

(نگار) گفتگو اس امر میں نہیں کہ مذہب نے دنیا میں حکومتیں قائم نہیں کیں، یا اپنے متبعین میں مرکزیت و یک جہتی پیدا نہیں کی، بلکہ سوال یہ ہے کہ اس نے قیام امن و سکون میں کتنا حصہ لیا اور بنی نوع انسان کو کس حد تک ایک خیر ازہ سے وابستہ کیا

اگر آج تمام مسلمان ہم خیال ہو کر متفقہ قوت سے دوسری قوموں پر خروج کرکے ان کو تباہ و پامال کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کیا یہ کامیابی اس امر کی دلیل ہو سکتی ہے کہ مذہب اسلام سچا مذہب ہے، یا ایک مذہب کا انتہائی نقطۂ نظر صرف دنیاوی حکومت کا قیام ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مان لیا جائے تو اس وقت عیسوی مذہب سے زیادہ سچا کوئی دوسرا مذہب نہیں ہو سکتا

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا سبب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا۔ مدعا یہ کہ اس سے قبل کسی وقت جب وہ پابند مذہب تھے تو صاحب اقبال و عروج تھے، پھر آپ اس اقبال و عروج کا کوئی زمانہ متعین کیجئے یعنی دَور عباسیہ لیجئے یا دَورِ بنی امیہ، عہدِ خلفاء لیجئے یا کوئی اور زمانہ اس کا نمایاں ترین پہلو ملک گیری و وسعت حکومت کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا، جس کا نام آپ نے عروج و ترقی رکھا ہے، اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس سلسلہ میں کافی خونریزی سے کام لیا گیا

اس لئے جس حد تک محض نظریۂ مذہب کا تعلق ہے۔ آپ پاکیزہ سے پاکیزہ جذباتِ انسانیت و اخوت لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، لیکن دنیائے عمل میں مذہب نے سوائے خونریزی اور خون آشامی کے تاریخ کے صفحات پر کوئی اور نقوش نہیں چھوڑے

ایک مذہب کا انتہائی نقطۂ نظر اخلاقی حیثیت سے صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کو دنیا سے محو کر دے، لیکن آپ کسی مذہب کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی سب سے بڑا ذریعہ قیام سرمایہ داری کا بنا اور اسی لئے اس نے انسانی خون بہانے میں کبھی کوئی تامل نہیں کیا۔ اگر کہا جائے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ سب تعلیمات مذہب کے منافی تھا، تو پھر مذہب کا خیال ہی اک لغو و بیکار خیال ہے کیونکہ دنیائے عمل میں وہ اس لحاظ سے کبھی کامیاب نہیں ہوا اور کوئی ایک تجربہ بھی اس کی موافقت میں پیش نہیں کیا جا سکتا

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس وقت جبکہ مذہبی روح لوگوں میں بہت ضعیف ہو گئی ہے، کیوں وہ مدعا حاصل نہیں ہوتا، لیکن معترض نے اس پر غور نہیں کیا کہ بہ حالت موجودہ قومیت و وطنیت کا جو جذبہ کام کر رہا ہے۔ اور جس نے ایک کو دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے، وہ بھی مذہب ہی کے اثراتِ باقیہ میں سے ہے۔ یعنی اگر مذہب پہلے خدا کا نام لے کر خونریزیاں روا رکھتا تھا تو اب خدمتِ ملک و قوم کے بہانہ سے جائز قرار دیتا ہے۔ اور اخوت عامہ کو عملاً رواج دینے سے

باب الاستفسار

ابر و برق

(جناب سید فضل حسین صاحب - بلاری)

براہِ کرم مختصراً ابر و برق کی حقیقت سے آگاہ فرمائے، لیکن ایسے الفاظ میں جس کو عوام بھی سمجھ سکیں

(نگار) ابر نام ہے اُس بُخار یا دھوئیں کے دَل کا جو فضا میں تیرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جو پانی کے قطرات لئے ہوئے اکثر منجمد حالت میں پایا جاتا ہے

جب ہوا کا درجۂ حرارت اتنا گر جاتا ہے کہ اس میں جذب کی صلاحیت باقی نہیں رہتی (خواہ یہ ہوا کے زیادہ لطیف ہو جانے سے ہو یا کسی سرد رَو کے ساتھ مل جانے سے) تو بُخار کا ایک حصّہ اپنی گیسی حالت چھوڑ کر نہایت چھوٹے چھوٹے قطراتِ آب میں تبدیل ہو جاتا ہے، ڈاکٹر ایٹکین (Aitken) کا خیال ہے کہ بخار میں اس نوع کا تکاثف ہمیشہ خاک کے ذرات کے چاروں طرف ہوا کرتا ہے، یعنی بادل کا ہر قطرۂ آب ذرۂ خاک کے اِردگرد تکاثفِ بخار کا دوسرا نام ہے ——— اس لئے بادلوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بُخار ہی بخار ہے درست نہیں، بلکہ وہ مجموعہ ہے پانی کے نہایت چھوٹے چھوٹے قطروں کا - رہا یہ سوال کہ یہ قطراتِ آب کیوں دفعۃً زمین پر آکر نہیں گر جاتے اس کے متعلق پروفیسر اسٹوکس کا بیان یہ ہے کہ ذراتِ ہَوا کے تصادُم کی وجہ سے قطراتِ آب کی رفتار بہت سُست یا بالکل معدوم ہو جاتی ہے - اور ہرشل کا کہنا یہ ہے کہ ہَوا کی موجیں جو نیچے سے اوپر جاتی ہیں ان کی رفتار، قطراتِ آب کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے - اور اسی لئے وہ زمین پر گرنے نہیں پاتے - البتہ جب ہَوا کی موجوں کی رفتار کم ہو جاتی ہے (اور یہ اکثر رات کو ہوتا ہے) تو قطراتِ آب زمین پر گر جاتے ہیں -

آپ کا استفسار چونکہ مینہ یا باراں کے متعلق نہیں ہے اس لئے اس کی مزید تفصیل چھوڑ کر صرف ابر کے متعلق عرض کرتا ہوں

بادل اور کہر دونوں ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں۔ اور ان میں صرف یہ فرق ہے کہ کہر زمین پر چھاتا ہے اور بادل فضا میں۔ یہ زیادہ تر زمین سے ایک میل کے فاصلہ کے اندر پائے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ۶ میل کی بلندی پر پہونچ جاتے ہیں

بادل کی عموماً تین تہیں ہوتی ہیں۔ سب سے نیچی تہ ۲ ہزار سے ۶ ہزار فیٹ تک کی بلندی پر پائی جاتی ہے، دوسری ۱۲ ہزار سے ۱۵ ہزار فٹ تک اور تیسری ۲۰ ہزار سے ۲۷ ہزار فٹ تک بادل اکثر و بیشتر سطح زمین کے متوازی چلتے ہیں اور شاذ و نادر کبھی عمودی شکل اختیار کرتے ہیں

ماہرین فن نے بادلوں کی کئی قسمیں قرار دی ہیں —— ایک قسم تو اُن ہلکے اور بہت بلند بادلوں کی ہے جو اکثر غروب آفتاب کے بعد اور طلوع سے قبل آسمان میں نظر آتے ہیں، ان کی شکل بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے گھوڑے یا بلی کی دُم جن میں سفید خطوط پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں حلقے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ بالکل ایسے نظر آتے ہیں جیسے کسی دریا کے ساحل پر ریگ کی موجیں۔ ان میں برف کے نہایت چھوٹے چھوٹے بلورات پائے جاتے ہیں اور ہالہ وغیرہ پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں

دوسری قسم اُن گھرے بادلوں کی ہے جو سیاہ یا سُرمئی روئی کے گالوں کی طرح نمودار ہو کر مخروطی شکل میں پہاڑوں کا سا منظر پیش کرتے ہیں، یہ چار ہزار سے ۱۴ ہزار فٹ کی بلندی تک پائے جاتے ہیں یہ اکثر طلوع آفتاب کے بعد منتشر روئی کے گالوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ وسیع ہو کر سہ پہر تک تمام فضا میں چھا جاتے ہیں، ایسے بادل شام کے وقت زیادہ برستے ہیں

تیسری قسم کے بادل وہ ہیں جو لانبی لانبی چادروں کی شکل میں پھیلے رہتے ہیں ان کی دبازت مختلف ہوتی ہے اور ۴۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوتے۔ خزاں اور گرما میں اکثر نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ پھیل کر سمندر کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ چوتھی قسم ان چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑوں کی ہے جنھیں ہوا اُڑائے لئے پھرتی ہے۔ بادلوں کی ساخت اور ان کی بلندی منحصر ہے بخار کی مقدار پر، تموجات ہوا کی بلندی پر، موسم پر، درجۂ حرارت پر اور سمندر کی حالت پر۔

بلند سے بلند بادل قسم اوّل کا ہے جو ۴۳۸۰۰ فٹ تک اونچا ہو جاتا ہے —— بادلوں کے حلقے زیادہ تر خط استوا اور خط سرطان وجدی پر پائے جاتے ہیں —— بادلوں میں مثبت و منفی برقی رَو ہمیشہ پائی جاتی ہے

بجلی اس برقی رَو کا نام ہے جو بادلوں کے درمیان یا بادل اور زمین کے مابین پیدا ہوتی ہے۔ کڑک اور بجلی کا

آپ کا استفسار چونکہ مینہ یا باراں کے متعلق نہیں ہے اس لئے اس کی مزید تفصیل چھوڑ کر صرف ابر کے متعلق عرض کرتا ہوں

بادل اور کہر دونوں ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں - اور ان میں صرف یہ فرق ہے کہ کہر زمین پر چھاتا ہے اور بادل فضا میں - یہ زیادہ تر زمین سے ایک میل کے فاصلہ کے اندر پائے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ۶ میل کی بلندی پر پہونچ جاتے ہیں

بادل کی عموماً تین قسمیں ہوتی ہیں - سب سے نیچی تہ ۲ ہزار سے ۶ ہزار فیٹ تک کی بلندی پر پائی جاتی ہے، دوسری ۱۲ ہزار سے ۱۵ ہزار فٹ تک اور تیسری ۲۰ ہزار سے ۲۷ ہزار فٹ تک بادل اکثر و بیشتر سطح زمین کے متوازی چلتے ہیں اور شاذ و نادر کبھی عمودی شکل اختیار کرتے ہیں

ماہرین فن نے بادلوں کی کئی قسمیں قرار دی ہیں ـــــ ایک قسم تو اُن ہلکے اور بہت بلند بادلوں کی ہے جو اکثر غروب آفتاب کے بعد اور طلوع سے قبل آسمان میں نظر آتے ہیں، ان کی شکل بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے گھوڑے یا بلی کی دُم جن میں سفید خطوط پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں حلقے بھی پیدا ہو جاتے ہیں - اور کبھی یہ بالکل ایسے نظر آتے ہیں جیسے کسی دریا کے ساحل پر ریگ کی موجیں - ان میں برف کے نہایت چھوٹے چھوٹے بلورات پائے جاتے ہیں اور ہالہ وغیرہ پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں

دوسری قسم اُن گہرے بادلوں کی ہے جو سیاہ یا سُرمئی روئی کے گالوں کی طرح نمودار ہو کر مخروطی شکل میں پہاڑوں کا سا منظر پیش کرتے ہیں، یہ چار ہزار سے ۶ ہزار فٹ کی بلندی تک پائے جاتے ہیں یہ اکثر طلوع آفتاب کے بعد منتشر روئی کے گالوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ وسیع ہو کر سہ پہر تک تمام فضا میں چھا جاتے ہیں، ایسے بادل شام کے وقت زیادہ برستے ہیں

تیسری قسم کے بادل وہ ہیں جو لانبی لانبی چادروں کی شکل میں پھیلے رہتے ہیں ان کی دبازت مختلف ہوتی ہے اور ۴۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوتے - خزاں اور گرما میں اکثر نظر آتے ہیں - کبھی کبھی یہ پھیل کر سمندر کی طرح دکھائی دیتے ہیں - چوتھی قسم ان چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑوں کی ہے جنھیں ہوا اُڑائے لئے پھرتی ہے - بادلوں کی ساخت اور ان کی بلندی منحصر ہے بخار کی مقدار پر، تموجات ہوا کی بلندی پر، موسم پر، درجۂ حرارت پر اور سمندر کی حالت پر -

بلند سے بلند بادل قسم اوّل کا ہے جو ۴۳۸۰۰ فٹ تک اونچا ہو جاتا ہے ـــــ بادلوں کے حلقے زیادہ تر خطِ استوا اور خطِ سرطان وجدی پر پائے جاتے ہیں ـــــ بادلوں میں مثبت و منفی برقی رَو ہمیشہ پائی جاتی ہے

بجلی اس برقی رَو کا نام ہے جو بادلوں کے درمیان یا بادل اور زمین کے مابین پیدا ہوتی ہے - کڑک اور بجلی کا

خطابیہ

(جناب سید مجتبیٰ حسن صاحب - علی پور)

کیا آپ مطلع فرما سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں فرقہ خطابیہ کونسا ہوا ہے،
کیا اس کا تعلق جناب عمر خلیفہ ثانی سے ہے

(نگار) یہ ایک طبقہ ہے غالی شیعوں کا جو ابو الخطاب محمد بن ابی زینب الاسدی سے منسوب ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے پہلے امام جعفر صادق میں حلول کیا تھا اور پھر ابو الخطاب میں۔ ابو الخطاب نے کوفہ میں اپنے چند متبعین پیدا کر کے عیسیٰ بن موسیٰ پر (جو ۱۴۷ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا) حملہ کیا۔ لیکن یہ گرفتار ہو گیا اور قتل کر دیا گیا اس کے بعد اس جماعت کے بعض لوگوں نے یہ مشہور کیا کہ نہ ابو الخطاب قتل ہوا ہے اور نہ اس کے ساتھی مارے گئے ہیں، بظاہر ایسا دکھایا گیا درانحالیکہ وہ زندہ ہیں — ۳۰۰ھ میں اس جماعت کی تعداد نواح کوفہ و یمن میں ایک لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ ابو الخطاب کے بعد انھوں نے محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کو اپنا امام بنایا اور اسی لیے ان کو اسماعیلیہ جماعت میں بھی شامل کیا جاتا ہے

ان کا عقیدہ تھا رسول اللہ نے اپنے بعد حضرت علی کو منصب رسالت منتقل کیا تھا۔ اور امام جعفر صادق نے اپنے بعد ابو الخطاب کو

یہ لوگ جنگ کے باب میں سخت بیرحم تھے اور دشمنوں کے بچوں اور عورتوں سب کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ تناسخ کا عقیدہ بھی ان میں پایا جاتا تھا

باب الانتقاد

کارواں لاہور

یونتو لاہور میں متعدد رسایل ایسے ہیں جو سالنامے شایع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سال میں صرف ایک بار شا
ہونے والا رسالہ کارواں ہی ہے ،

جس کی پہلی اشاعت ۳۳ء میں ہوئی تھی اور دوسری ۳۴ء میں۔ پہلا رسالہ ۲۱۴ صفحات پر شا
ہوا تھا اور دوسرا ۳۵۲ صفحات کو محیط ہے۔ اُس میں ۲۳ تصاویر تھیں اور اس میں ۳۶ نقوش ہیں، و
پروفیسر تاثیر ام۔ اے کی ترتیب سے شایع ہوا تھا اور یہ جناب مجید ملک صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے۔ رہ گئے
مضامین سو ان کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا دشوار ہے ، کیونکہ اس میں بھی اچھے اچھے مضامین پائے
جاتے تھے اور اس میں بھی متعدد پاکیزہ مقالات نظر آتے ہیں — یہی حال طباعت وکتابت کی خوبی کا ہے

اہل پنجاب اُردو زبان کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور " کم وکیف
دونوں حیثیت سے ان کی اس خدمت کا اعتراف ناگزیر ہے۔ ممکن ہے یو۔پی اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کے اہ
اس سے اختلاف کریں اور اہل پنجاب کی اُردو میں زبان و محاورہ کی غلطیاں نکال کر اپنے تفوق کو ثابت کرنا چاہیں لیکن
میں اس کو صرف " حرکت مذبوحی " سے تعبیر کروں گا

اس میں کلام نہیں کہ پنجاب کی صحافت میں ہنوز بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجایش ہے ، لیکن فی الحال جو
خدمت وہاں کے اہل قلم انجام دے رہے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ نظرانداز کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک ایسے درخشا
مستقبل کا پتہ دے رہی ہے ، جو کسی نہ کسی دن تمام مُلک کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے گی۔ اور بالکل ممکن ہے کہ
اس تکمیل کا سہرا " کارواں " ہی کے سر رہے

ہم کارکنان " کارواں " کی اس ادبی و علمی کاوش کو حد درجہ نگاہِ تحسین سے دیکھتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں
کہ آیندہ اشاعتیں اس سے زیادہ بہتر و بلند ہوں گی

تصاویر و نقوش کے باب میں زیادہ توجہ کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور اسی طرح منظومات و غزلیات کے

کتاب میں بلند تر معیار قائم کرنے کی ــــــ باب الانتقاد بہت تشنہ و ناکام ہے، ضرورت ہے کہ کم از کم دو
تین جزو اس کے لئے وقف کئے جایں اور سال بھر کی تمام اہم تصانیف پر (خواہ وہ نظم ہوں یا نثر) فاضلانہ
تبصرہ کیا جائے - کارواں کی قیمت ۱۲؍ اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کچھ نہیں ہے

مختصر تاریخ عالم جناب سید حکیم احمد صاحب نقوی بی - اے - سینیر ممبر کورٹ آف وارڈس گوالیار کی
تالیف ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت برمحل تالیف ہے - اس پہلی جلد میں صرف عہدِ قبل
تاریخ کو لے کر فلکیاتی نظریئے اور طبقات الارض کے تحقیقات وغیرہ پر گفتگو کرکے نوع انسانی کے ظہور سے بحث کرتے
ہوئے عہدِ تاریخ کے آغاز تک پہونچے ہیں - اور اس میں شک نہیں کہ اس ۱۶۰ صفحات کی مختصر سی کتاب میں حد درجہ
ایجاز سے کام لے کر نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں

اردو میں اس وقت تک کوئی کتاب اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس خوبی سے مرتب نہیں کی گئی اور اس سلسلہ
کا مکمل ہوجانا ضروری ہے

فاضل مؤلف نے جابجا آیات قرآنی درج کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ قرآن بھی وہی کہتا ہے جو جدید تحقیقات
کا دعویٰ ہے - میرے نزدیک مؤلف کو اس سے احتراز کرنا چاہئے تھا - کیونکہ اول تو قرآن علوم و فنون کی کتاب نہیں کہ
اس میں ان مسائل کی جستجو کی جائے - اور اگر بربنائے فرطِ ارادت و عقیدت کوئی مسلمان اس کا دعوے کرے بھی
تو وہ کسی طرح اس کو ثابت نہیں کرسکتا، کیونکہ اس کوشش میں وہ خواہ مخواہ آیات کی کھینچ تان کرتا ویل کرے گا
اور جب عقلی تاویل کو اس طرح جائز قرار دیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ بعض آیات کی تو تاویل کی جائے اور بعض کو
علی حالہا چھوڑ دیا جائے اور اس طرح سخت دشواریوں کا سامنا پڑجائے گا، کیونکہ قرآن کا اکثر حصہ ایسا ہے جو انتہائی
کوشش کے بعد بھی کسی تاویل کو قبول نہیں کرسکتا اور اس کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ جو تاویلیں کی گئی ہیں وہ بھی ساقط
الاعتبار ہوجائیں گی ــــــ دوسری خرابی یہ پیدا ہوگی کہ غیر مسلم جماعت اس کتاب کو مذہبی پروپاگنڈا سمجھ کر
اس سے بے اعتنائی کرے گی

ایک مؤرخ، مؤرخ ہونے کی حیثیت سے کوئی مذہب نہیں رکھتا، اس لئے اس کی تالیف کو ہمیشہ اس قسم
کی تاویلوں سے پاک ہونا چاہئے جو مذہبی تبلیغ کا ادنےٰ سا شائبہ بھی رکھتی ہوں - نقشے و تصاویر بھی ناقص ہیں، لیتھو
طباعت اس باب میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی - اس لئے اگر کتاب ٹائپ میں شایع کی جاتی تو زیادہ مناسب تھا
اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مؤلف سے لشکر کے پتہ پر مل سکتی ہے

شیطان کی توبہ حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا افسانہ ہے جس میں نیکی و بدی کی کشمکش دکھا کر
نیکی کی کامیابی کو دکھایا گیا ہے - عام عشقیہ فسانہ نگاری سے ہٹ کر اس نوع کے افسانے

لکھنا یقیناً مفید ہے۔ زبان صاف و شگفتہ ہے اور انشا کی خوبیاں بھی اس میں کافی پائی جاتی ہیں، گو فن کے لحاظ سے کہیں کہیں خامیاں بھی ہیں۔ قیمت ۸؍ اور ملنے کا پتہ دفتر نیرنگ دہلی ہے

دل کی رانی

سید فرید جعفری مچھلی شہری کا فسانہ ہے۔ فرید صاحب ملک کے ذہین نوجوانوں میں سے ہیں اور صحافت کا فطری ذوق رکھتے ہیں۔ سیاسی عقاید کے لحاظ سے چونکہ وہ بڑی حد تک اشتراکیت پسند واقع ہوئے ہیں اس لئے اس فسانہ میں مسئلہ ازدواج کے متعلق بڑی حد تک اسی مقصد کی تبلیغ کی گئی ہے ——— فسانہ کی زبان پاکیزہ اور جذبات عاشقانہ ہیں۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ ملت بک ڈپو بلیماراں دہلی ہے

کافر اور کافر گر

خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ علی گڈھ کا رسالہ ہے، جس میں مولویوں کی کافر گری پر نہایت دلچسپ بحث کرکے مولویانہ ذہنیت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ رسالہ بہت دلچسپ ہے اور ہر مسلمان کے لائق۔ فاضل مصنف سے غالباً مفت مل سکتا ہے

خیالات مہاتما گاندھی

س۔ اف۔ اینڈریوز کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور نہایت صاف و شگفتہ زبان میں۔ اینڈریوز، جو عقیدت قرابت مہاتما گاندھی سے رکھتے ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل ہوگی۔ پہلی جلد میں مہاتما گاندھی کے مذہبی ماحول سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسری جلد میں اُن کی سیاسی زندگی پر بسیط تبصرہ کیا گیا ہے۔ دونوں جلدوں کی قیمت ۱۲؍ ہے اور رفعت یار خاں صاحب سے حکیم بلڈنگ تیسری منزل مومن پورہ بمبئی کے پتہ پر مل سکتی ہے

مجاہدۂ کربلا

امامیہ مشن لکھنؤ کا رسالہ ہے جس میں واقعۂ کربلا پر مؤرخانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ مسئلہ کہ جناب حسین نے یزید سے خود جنگ کی یا جنگ پر مجبور کئے گئے، نیز یہ کہ آپ کا خروج سیاسی حیثیت رکھتا تھا یا مذہبی، بہت مختلف فیہ ہے۔ فاضل مؤلف نے اس رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جناب حسین نے ہمیشہ امن و سکون کو پسند کیا اور فتنہ و فساد پھیلانے کو ہمیشہ برا سمجھا، اس لئے آپ کا یزید کے مقابلہ میں برسرکار ہونا انتہائی مجبوری کی حالت میں ہوا جس میں آپ کوئی غرض شامل نہ تھی

رسالہ بہت صاف و شگفتہ زبان میں لکھا گیا ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔۔۔۔ قیمت ۲؍ ہے اور سکرٹری امامیہ مشن لکھنؤ سے مل سکتا ہے

سخنور

ماہوار رسالہ ہے جو جناب آسی کی ادارت میں جنوری سے شایع ہو رہا ہے، رسالہ کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے شعر و سخن کی اصلاح و خدمت ہے، چنانچہ جنوری اور فروری کے رسالے اسی رنگ کے نکلے، لیکن مارچ کا پرچہ اس مقصد سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے اور اس میں دوسرے عام رسالوں کی

طرح تاریخ وحکایت تصوّف و مذہب سبھی کچھ موجود ہے - کاش آسی صاحب اس کو صرف اُسی موضوع کے لئے مخصوص رکھتے جو آغاز میں ان کے پیش نظر تھا

شعر وسخن کی خدمت صرف طرحی وغیر طرحی غزلوں کی اشاعت نہیں ہے بلکہ تنقید صحیح کا معیار صحیح پیش کرنا ہے اگر آسی صاحب کے رسالہ میں سوائے تنقید کے اور کچھ نہ ہو تو بھی وہ نہ صرف یہ کہ شاعری کی خدمت کریں گے بلکہ ایک کافی جماعت اس کی قدر کرنے والی پیدا کر سکیں گے

یہ رسالہ اوسط التقطیع کے ۴ جزو پر شایع ہوتا ہے اور سالانہ چندہ عہ/

غالب کا ایک شعر

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

خسرو فرماتے ہیں :-

صورتگر دیبائے چیں گو صورت یارم ببیں
یا صورتے برکش چنیں یا ترک کن صورتگری

چینی معشوقوں کی تصویر بنانے والے سے کہو کہ یہاں آئے اور میرے معشوق کی صورت دیکھے اور ایسی ہی صورت بناسکے تو بنائے ورنہ مصوری چھوڑ دے صورتگری کا نام نہ لے - مگر غالبؔ کا نظریہ یہ ہے کہ مصور و نقاش کیا معنی خود آئینہ میں بھی یہ قابلیت نہیں کہ اس حسن بے مثل کا مثل پیدا کرسکے - اور وہی رنگ و رعنائی جلوہ نما کردے جو اس بت طناز کا حصہ ہے - آئینہ صرف ایک ایسی تصویر بنا سکتا ہے کہ " تماشا کہیں جسے " تماشا اور محض تماشا - اس سے زیادہ کچھ نہیں

مومن فرماتے ہیں :-

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

اگر وہ اور تصویر بن جائیں گے تو بنا کریں - اس میں حرج ہی کیا ہے ؟ آپ کو تاب نظارہ نہیں آنکھیں بند کرلیں - اُسے کیوں اپنی آرایش سے روکتے ہیں ؟ اس کا تصویر بننا تو عین مطلوب ہے - جنت نگاہ ہے فردوس نظر ہے - بلکہ عشاق تو ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں :-

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

مشاطہ سے کہو کہ اس کے سامان آرایش میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ کردے تاکہ ہمیں اور بھی زیادہ لطف

حاصل ہو

اور غالب کہتے ہیں :۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مومن کا تصور یہ ہے کہ آئینہ دیکھ کر وہ اور تصویر بن جائیں گے یعنی ان کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔ اور غالب کا کہنا یہ ہے کہ

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہرِ آئینہ مثلِ ذرّہ روزن میں

یعنی اُسے دیکھ کر خود آئینہ کو چار چاند لگ گئے۔ خود آئینہ کا حسن دوبالا ہو گیا۔ اندھیرے کمرہ میں جب روشندان سے سورج کی کرنیں آتی ہیں تو کرنوں میں بے شمار چمکتے ہوئے ذرّے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ جب سورج چھپ جاتا ہے تو یہ ذرّے بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ "مہروش" آئینہ کے سامنے آتا ہے تو آئینہ چمک جاتا ہے اور اپنے حسن و جمال کے تمام جوہر اس کے رُخِ روشن پر نچھاور کر دیتا ہے اور جب وہ خورشید رو آئینہ کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو معاً آئینہ کے سارے جوہر روپوش ہو جاتے ہیں اور آئینہ کے چہرہ پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اندھیرے میں آئینہ سیاہ پوش ہو جاتا ہے اور عکس پذیر نہیں ہوتا

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمھیں غالب کا کونسا شعر بہت پسند ہے تو میں بے تامل یہ شعر سنا دوں

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں باندھا ہے :۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اور یہی غرور دُور کرنے کو میں نے آئینہ پیش کیا تھا۔ دیکھتے ہی سکتہ میں آگئے۔ مبہوت ہو گئے۔ تصویر بن گئے چکرا گئے اور "اپنا سا منہ لے کے رہ گئے"

مگر حق تو یہ ہے کہ اسی مضمون کو یونانی شاعر نے جس رنگ سے باندھا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے، بے مثل و بے بدل ہومر کا معشوق غالب کے معشوق کی طرح جہاندیدہ و پرکار نہیں۔ سیدھا سادھا، الھڑ، نادان، فریب خوردہ، ناتجربہ کار، صیدِ حلقۂ دامِ خیال، سرتاپا عالمِ جلوہ و رنگ، ناآشنائے رموزِ کیف و کم، وہ اُس زمانہ کے معشوق کا

حال لکھتا ہے جب آئینہ ابھی ایجاد بھی نہیں ہوا تھا اور دُنیا اپنی آفرینش کے ابتدائی دَور میں تھی

"شہزادۂ نرگس بلا کا نوجوان تھا۔ شوخ و شنگ، خوشرو و گلرنگ۔ بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں۔ جادوگری کی آسمانی پتلیاں پھول سے رخسار۔ سنہرے بال۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد۔ مردانہ بھیس میں جنت کی حور قاف کی پری

"نگاہوں میں چمکتی بجلیاں ہاتھوں میں شمشیریں"

ایک دنیا اس پر ہزار جان سے نثار تھی۔ بابل اور قاف کی پریاں، ونیس اور روم کی شہزادیاں اس کے عشق میں دین و دنیا کو خیرباد کہہ چکی تھیں۔ اس کے فراق میں سیماب وار تڑپا کرتی تھیں۔ مگر وہ کسی کو بھی خیال میں نہ لاتا۔ بے دھڑک دلوں پر چھریاں چلاتا اور عشاق کا قتل عام کرتا

نرگس کے غرور کا یہ عالم تھا کہ شہزادیوں کو کھڑے کھڑے اپنی چوکھٹ سے ہٹا دیتا۔ شہزادوں اور سپاہی زادوں کو بے تحاشا ٹھوکریں لگاتا اور دور باش کا حکم دیتا اور وہ سب یہی کہتے

نہ بود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حسن و شباب کے دیوتا "کیوپڈ" کو نرگس کا یہ غرور نہ بھایا۔ اس نے تاک کر اپنا سونے کا تیر اُس سینہ پر نشانہ کیا نرگس چاروں شانے چت گرا۔ یعنی عاشق ہو گیا۔ کس پر؟ اپنے آپ پر!

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن نرگس شکار کھیلتے ہوئے دُور جنگل میں نکل گیا۔ ساتھی بچھڑ کے پیچھے رہ گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ بڑی پیاس لگی۔ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہا تھا کہ دور پہاڑی کے دامن میں شفاف پانی کا چشمہ دکھا دوڑتا ہوا وہاں پہونچا۔ پانی پینے کو وہاں جھکا۔ سامنے میں آ گیا۔ چاند سا مکھڑا۔ گورے گورے گال۔ لمبے لمبے بال۔ ریشم کے لچھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پتلی سی ناک۔ ہنس کی سی گردن۔ دم بخود ہو گیا۔ "اپنا سا منہ لے کے رہ گیا"

معاً ایک خوشی کی لہر اُس کے دل سے اٹھی اور چہرہ پر دوڑ گئی۔ وہ مسکرانے لگا۔ معشوق بھی مسکرایا۔ وہ ہنسنے لگا۔ معشوق بھی ہنسا۔ وہ سمجھا کہ معاملہ طے ہو گیا۔ آگے بڑھا کہ معشوق کے ہونٹوں کا بوسہ لے لوں۔ جونہی اس کے ہونٹ معشوق کے ہونٹوں سے ملے، معشوق غائب ہو گیا۔ اُس کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں

"نہ جا۔ نہ جا۔ میرے پیارے نہ جا میری جان۔ تو کہاں چلا گیا؟"

معشوق پھر لوٹ آیا۔ اُس کی جان میں جان آئی۔ دل کو قرار آیا۔ سمجھ گیا کہ معشوق وہی نازک بدن ہے جس کی شان میں کہا گیا ہے کہ

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

بیچارہ کا دل اندر ہی اندر جلتا چور ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ موٹے موٹے دو آنسو ٹپ ٹپ معشوق کے رخسار

پر گر پڑے۔ وہ پھر غائب ہوگیا۔ یہ پھر گھبرا گیا کہ اب شاید نہ آئے۔ بلبلانے لگا۔ واویلا کرنے لگا۔ وہ پھر آ گیا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ دل کو قرار آیا۔ سمجھ گیا کہ معشوق گریہ وزاری کی اجازت نہیں دیتا

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

وہ چپ چاپ حسرت ویاس سے معشوق کو تکنے لگا۔ معشوق اُسے دیکھنے لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پیاری پیاری آنکھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ رس بھری آنکھیں

رات ہوگئی۔ معشوق چلا گیا۔ جاکے سو رہا۔ مگر نرگس وہیں آنکھیں کھولے انتظار میں پڑا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کہاں؟ وہ سونا لیٹنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سب بھول گیا۔ صبح وشام چشمہ کے کنارے پڑا رہتا، بے یار و مددگار۔ بے بس و ناچار۔ کبھی کبھار رات کو بھی اس کا معشوق چلا آتا۔ مگر صرف چاندنی راتوں میں۔ جب آسمان گرد آلود و غبار سے پاک اور موسم پر کیف ہوتا۔ نرگس کے لئے وہ معراج کی رات ہوتی۔ لیلۃ القدر ہوتی

یونہی ایک مدت گذر گئی۔ نرگس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ اس کا رنگ اُڑتا چلا گیا۔ وہ بالکل نحیف و زار ہوگیا۔ سوکھ کے کانٹا ہوگیا۔ اور مختصر یہ کہ مرگیا۔ مگر اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا

اے دریغا وہ رند شاہد باز

خداوند جوپیٹر کو نرگس کی موت پر بڑا صدمہ ہوا۔ آپ اس کی لاش پر تشریف لائے اور اپنے خاص دست مبارک سے اس کی لاش کو چھوا۔ چھوتے ہی لاش ایک شاداب پودا بن گئی۔ ہرا بھرا سرسبز پودا۔ رنگ رنگ کے پھولوں سے مالامال جنت کے طلسمی پھولوں کا پودا۔ نرگس کا پودا۔ لیکن نرگس کے پھول ایک ایک کرکے چشمہ کی جانب جھک گئے اور اپنے اپنے عکس کو دیکھ کر جھومنے لگے۔ کھلکھلانے لگے۔ محو تماشا ہو گئے

دیوتا خداوند نے فرمایا۔ "لاریب۔ عشق کا مرض لاعلاج ہے" اور مسکراتے ہوئے چلے گئے

آج تک نرگس کے پھول اسی طرح پانی کے کنارے اپنے معشوق کی طرف دیکھا کرتے ہیں اور ذرا نہیں تھکتے جب معشوق روپوش ہوجاتا ہے جب بھی ان کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور شام سے سویرا کر دیتی ہیں۔ اور زبان حال سے کہتی ہیں:-

مدت گذر گئی کہ نگاہیں ہیں سوئے در

وعدہ خلاف یار سے کہیو پیام بر

آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا

یہ یونانی شاعر کا کلام ہے اور یہ یونانی ادیب کی بلاغت

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک

اس کو کہتے ہیں "خامہ فرسائی"

دیوان امرناتھ محسن امرتسری

محدود رہا ذوقِ زاہد۔ صفِ مسجد تک رندوں کو تو کل دُنیا اپنی ہی نظر آئی
دل یاد میں ہو تیرے اور یاد تری دل میں میری یہی مجلس ہے میری یہی تنہائی
محسن میں کہوں کیسے جو نقش ہے باطل ہے مجھکو تو یہ کل دُنیا کچھ اور نظر آئی

کوئی بھی میرا نہیں تیرے سوا اس نہ ہونے ہی پہ مجھکو ناز ہے
علم نے محسن دیا سب کو فریب راز تھا جو کچھ ابھی تک راز ہے

تو رودادِ جوابِ خط سنانے سے نہ ڈر قاصد میں بختِ نارسا کا اپنے پہلے ہی سے قایل ہوں
نگاہِ ناز کے صدقے۔ نوازا کس تکلف سے ابھی میں ننگِ محفل تھا ابھی میں ننگِ محفل ہوں
قرار اک جا نہیں محسن کبھی بازارِ عالم کو متاعِ دست گرداں ہوں نمودِ جنسِ باطل ہوں

دل اُسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے اے بے خبر یہ پریشاں کیا ہوا۔ عالم پریشاں ہو گیا
عفو کر اے جوشِ رحمت یہ تری توہین تھی یہ خطا بیشک ہوئی احساسِ عصیاں ہو گیا

اُمید کی جھلک اب کچھ ہے تو اس طرح ہے عالم جو صبح کو ہو تاروں کی روشنی کا
کہنے کو تو میں کہدوں۔ کچھ سرگذشت اپنی ڈر ہے نہ نام لیگا پھر کوئی زندگی کا

اگر اسی رنگ سے ہے جینا۔ تو اور جی کر میں کیا کروں گا اُدھڑنے والے ہیں جب یہ بخیے تو ان کو سی کر میں کیا کروں گا
اٹھا لو آگے سے میرے ساغر۔ ہٹا دو آگے سے میرے مینا سرور قسمت میں جب نہیں ہے۔ تو اور پی کر میں کیا کروں گا

دستِ مطرب میں ہے رازِ زیر و بم تو سمجھتا ہے اسے حسنِ رباب
حُسن کیا اور حُسن کا معیار کیا اپنی اپنی آنکھ اپنا انتخاب

سنا مجکو نہ اے مطرب تو دردِ دل کا افسانہ بھرا بیٹھا ہوں محفل میں چھلک جائیگا پیمانہ

پیامِ تہنیتِ دل کہاں سے آتے ہیں مری جبیں کہ ترے آستاں سے آتے ہیں
کہاں وہ لطفِ تکلم۔ کہاں وہ رازو نیاز وہ اب جو آتے بھی ہیں تو گماں سے آتے ہیں

واقفِ دیر و حرم لاکھوں ملے تو کیا ملے کاش مل جاتا کہیں اک آشنائے دل مجھے
گر نہیں بادِ موافق جوشِ طوفاں ہی سہی کوئی تو پہونچا ہی دیگا تا لبِ ساحل مجھے

قدم راہِ محبت میں اٹھانے سے نہیں اٹھتے اگر تحریک ہوتی ہے تو خود منزل سے ہوتی ہے
نہ ہوتے امن سے کچھ کہتے نہ رسوائے جہاں ہوتے سمجھ لیتے اگر عرضِ تمنا دل سے ہوتی ہے

جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار

(ایک مخصوص دعوت علم و ادب)

نگار کی خصوصیت سالہا سال سے قائم ہے کہ جنوری کا پرچہ کسی خاص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے اور تقریباً دوچند ضخامت پر شایع کیا جاتا ہے، لیکن جنوری ۱۹۳۶ء کے نگار کے متعلق جو اہتمام پیش نظر ہے وہ غالباً بہت زیادہ اہم، حد درجہ دلچسپ اور بغایت مفید و کارآمد ثابت ہوگا

ارادہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری پر فنی، تاریخی، ادبی و تنقیدی حیثیت سے ایسا عمومی و جامع تبصرہ کیا جائے کہ اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کے دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مثلاً

دہلی و لکھنؤ اسکول کی خصوصیات —— زبان اور فن کی حیثیت سے دونوں کا تقابل —— زمانہ و ماحول کے اثرات —— ایک اسکول کا اثر دوسرے اسکول پر —— ہر اسکول کے بہترین نمایندے —— دونوں اسکولوں کے مختلف دور اور اُن کی خصوصیات —— مثنوی، غزل، قصیدہ اور رباعی میں ہر اسکول کے خاص خاص کارنامے اور اُن پر تبصرہ —— دونوں اسکولوں کی باہم نوک جھونک —— دونوں جگہ ہر دور کے بہترین تین شاعروں کے بہترین بیس بیس شعر —— دکن اور پنجاب کی خدمات اُردو شاعری۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ نگار کا یہ نمبر کئی سو صفحات کی ضخامت تک پہونچ جائے

میں مُلک کے تمام اہل قلم کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ متذکرۂ بالا عنوانات میں سے کسی عنوان کو لے کر یا اسی طرح کا کوئی دوسرا عنوان اپنی مرضی سے منتخب کرکے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مطبوعہ خطوط علیحدہ علیحدہ بھی جاری کئے جاتے ہیں، لیکن ممکن ہے کسی صاحب کا نام سہواً رہ جائے، اس لئے میں اس اعلان کے ذریعہ سے سب کو شرکت کی دعوت دیتا ہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ جو حضرات مضمون ارسال فرمائیں وہ اپنی ایک تصویر بھی بھیجدیں تاکہ اس کا بلاک طیار کرایا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

---

[1] دہلی و لکھنؤ اسکول سے تمام وہ شاعر متعلق ہیں جو ان کا تتبع کرتے ہیں خواہ وہ دہلی اور لکھنؤ کے رہنے والے ہوں یا نہ ہوں

رجونتی

یوں تو برسات کی ہر شام خوشگوار ہوتی ہے لیکن جب کئی روز تک مسلسل بارش ہونے کے بعد فطرت کا جوش کچھ کم ہوتا ہے تو کھیتوں اور میدانوں کی کشش دو چند ہو جاتی ہے، درخت اور پودے نہا دھو کر نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور شام کی تابناک شفق ہر چیز کو اپنے ساحرانہ لمس سے زرکار بنا جاتی ہے

سسئی ندی کے کنارے کشن پور کے علاوہ اور بھی کئی گاؤں آباد تھے۔ اور دوسری جانب مقابل میں ہوں آباد کا بازار تھا، جہاں دوشنبہ اور جمعہ کو جب خاص طور پر بازار لگتا تھا اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی، ـــــ برسات کے علاوہ ہر موسم میں دریا اس قدر پایاب رہتا تھا کہ لوگ آسانی سے ادھر ادھر آجا سکتے تھے البتہ جب بارش ہوتی تو سسئی ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلنے لگتیں

کشن پور میں سیتل اور شنکر دو ملاحوں کے مکان تھے، مچھلیوں کے علاوہ برسات میں یوں بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، شنکر کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں جنہیں سرجو سب سے بڑا تھا اس کی عمر اکیس سال کے قریب تھی اس کی شادی ابھی کہیں نہیں ہوئی تھی کیونکہ قرب وجوار میں کسی اور ملاح کا مکان ہی نہ تھا سیتل کے صرف ایک لڑکی رجونتی تھی جس کی عمر سولہ یا سترہ برس کے قریب تھی سیتل اور شنکر ماجھی نے تو خیر آپس میں طے ہی کر لیا تھا لیکن عام طور پر بھی سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور تھی کہ سیتل ماجھی کی کنول جیسی خوبصورت لڑکی کا بیاہ سرجو کے ساتھ ہوگا۔ سرجو اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا لیکن رجونتی اور زیادہ قابل ستائش تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد ہی گھر کا سارا کاروبار اس نے سنبھال لیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ہر شخص کسی نہ کسی خاص بات میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے، اور چونکہ لوگ کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ سرجو بہت ہونہار اور محنتی لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ اور رجونتی بھی فراوانی حسن کے ساتھ ساتھ فرمانبرداری کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی

کئی دن تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور لوگ گھر پر پڑے پڑے کاہلی اور سستی محسوس کرنے لگے، علاوہ ان لوگوں کے جن کی ضرورتیں نہایت اہم تھیں تمام لوگوں نے اپنا اپنا کام بارش کے بند ہو جانے پر اٹھا رکھا تھا سنیچر کے روز سے پانی برسنا شروع ہوا تھا گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے نہایت سنجیدگی اور یقین کے ساتھ حکیمانہ انداز

میں پیشینگوئی کردی تھی کہ پانی سنیچر کے پہلے بند ہو ہی نہیں سکتا...... اور ہوا بھی یہی! جب لوگ اتوار کی صبح کو سو کر اٹھے تو آسمان صاف تھا اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی حسین دوشیزہ بڑی التجاؤں کے بعد نقاب اٹھاکر مسکرا رہی ہے

سیتل کئی روز سے بیمار تھا اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کشتی نہ کھولے گا لیکن دوشنبہ کے دن اس قدر زیادہ لوگ رسول آباد بازار جانے کو تیار ہوئے کہ اس نے رجونتی کو بُلاکر کہا۔ "میرے کوئی بیٹا ہوتا تو آج میں بھی اطمینان سے بیٹھتا۔ آج آمدنی کی بہت امید ہے اور میرے بازوؤں میں دریا کی موجوں سے لڑنے کی قوت نہیں، دو چار کھیوے تو ہی اُس پار پہونچادے میں آج کل تیرے بیاہ کے لئے کوڑی کوڑی جمع کر رہا ہوں" رجونتی نے سر جھکالیا اور چلی گئی اس نے ایک منٹ وقت بھی ضایع نہ کیا، باپ کے لئے تھوڑا بہت کھانا تیار کرکے وہ گھاٹ کی طرف روانہ ہوگئی

رجونتی کو بانسری بجانے سے بڑا اُنس تھا، اور اُس کی فرصت کے لمحے اسی مشغلہ میں صرف ہوتے تھے، بانسری اُس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی، وہ اکثر شام کے وقت سرُو کی رنگین لہروں پر اپنی کشتی تیرادیتی اور بانسری کے نغموں سے شام کی غمگینی کو طرب ناک بنادیتی، ہوا میں سکون ہوتا اور کشتی کے ہلکے ہلکے ہچکولوں سے دریا میں چھوٹی چھوٹی موجیں اٹھتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رجونتی کے گیت سطح آب پر رقص کر رہے ہیں، اندھیری رات میں تو کم مگر شب ماہ میں اکثر مشتاق کان رجونتی کے گیتوں سے محظوظ ہوتے تھے، سرجو بھی کبھی کبھی کشتی میں بیٹھ کر اُسی وقت دریا میں تفریحاً نکلتا تھا اور اکثر دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیتا تھا

"رجون! ہمیں تمھارے گیت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں" اس جملہ میں نہ جانے کس قدر ہمت افزا اثر ہوتا کہ رجونتی اور زیادہ انہماک سے بانسری بجاتی اور اپنے سب سے زیادہ مسحورکُن گیت گاتی

باپ کے کہنے کے مطابق رجونتی نے کشتی کھولی اور بہت سے لوگوں کو رسول آباد پہونچا آئی جب تک لوگ بازار کی خرید و فروخت میں مشغول تھے رجونتی اپنی کشتی میں بیٹھی ہوئی اُس کا پانی جو تختوں کے اندر سے آگیا تھا نکال کر باہر پھینکتی رہی، سرو ندی سے ایک نالا نکل کر گاؤں کے اندر ہی کچھ دُور تک چلا گیا تھا، اُسی پر ایک پُل بنا ہوا تھا جس پر شام کے وقت لوگ تفریح کی غرض سے آتے تھے، بازار کی مشغولیت کی وجہ سے سوا دو چار بچوں اور لڑکوں کے پُل پر کوئی نہ تھا کہ یکایک کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی، بازار میں کافی شور و غل تھا اور یہ آواز کسی کو اپنی جانب توجہ نہ کرسکی، چھوٹے لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا کچھ لوگ دوڑ پڑے لیکن سب سے پہلے جو شخص دریا کے بہاؤ میں تیرتا ہوا نظر آیا وہ ایک عورت تھی۔ برسات کی وجہ سے نالے میں بہت زور تھا۔ لیکن رجونتی نے کچھ

ہی دُور پر لڑکے کو پانی کی متلاطم موجوں سے چھڑا لیا اور اطمینان سے پیرتی ہوئی کنارے پہونچ آئی

بچے کے پانی میں گرنے کی خبر بات کی بات میں رسول آباد کے گوشے گوشے میں گونج گئی، پردہ نشین ماؤں نے گھر کے اندر اور دروازوں کی آڑ سے اپنے بچوں کا جائزہ لیا، باہر نکلنے والی عورتیں چشم زدن میں پُل پر جمع ہو گئیں، لڑکے کا باپ مہادیو اور بڑا بھائی کوشل بھی پہونچ گئے، لڑکے کی حالت خطرناک نہ تھی صرف غشی طاری تھی جو دو تین دیہاتی ترکیبوں سے جاتی رہی۔ جب بچے کی حیات کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو لوگ رجونتی کی طرف مخاطب ہوئے۔ وہ ایک سیاہ ساری میں لپٹی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال حسین چہرے پر بکھرے تھے، اس کا لباس پانی میں تر ہو کر اُس کے جسم سے لپٹ گیا تھا اور اُس کے تناسب اعضاء کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ سارا بازار لوٹ پڑا تھا اور سب اسی کو دیکھ رہے تھے، وہ ساکت کھڑی تھی۔ اور سیکڑوں نگاہیں استفسارانہ انداز میں اُس پر پڑ رہی تھیں، لوگوں کے دو چار سوالات کا جواب دیکر رجونتی اپنی کشتی کی طرف چل دی، مجمع کا ایک حصہّ اس کے ساتھ ساتھ وہاں تک بھی گیا، اس نے اپنی ساری کا پلو نچوڑا اور کشتی میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر بیٹھ گئی، اُس کی شہرت میں اضافہ ہو گیا، کسی نے اس کی ہمت کی تعریف کی، کسی نے اس کی قوت کو سراہا، کسی نے اس کی پیراکی پسند کی، لیکن ان سب سے زیادہ لطیف اور مؤثر وہ ادا تھی جس کی دیکھنے والی صرف ایک نگاہ اور جس سے متاثر ہونے والا ایک ہی دل تھا

ہر ایک نے رجونتی کو اس لئے دیکھا کہ وہ عورت ہو کر اس قدر ہمت دکھا سکی لیکن کوشل نے اُسے اس لئے دیکھا کہ اس کی نگاہوں نے حُسن و نسائیت کا اتنا مکمل امتزاج کبھی نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے اُسے غیر کی نگاہوں سے دیکھا لیکن کوشل نے اُسے اپنی نگاہوں میں جذب کر لینے کے لئے دیکھا، لوگوں نے اُسے ظاہری نگاہوں سے دیکھا اور شام ہونے کے پہلے ہی چلے گئے لیکن کوشل دریا کے کنارے پر کھڑا ہوا کشتی کے چلے جانے کے بعد تک اسے دیکھتا رہا، دیکھنے والوں نے دو گھنٹے بعد اُسے بھلا دینے کے لئے دیکھا تھا لیکن کوشل نے اُسے ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے دیکھا۔ . . . . . . رجونتی نے آفتاب کے غروب ہوتے ہوتے اپنے تمام گاہکوں کو اس پار پہونچا دیا اور ساری کمائی بیمار باپ کے ہاتھ میں لاکر ڈال دی

کوشل بنارس ہندو یونیورسٹی کا ایم۔اے کا طالبعلم تھا، صحت کے لحاظ سے وہ ہمیشہ کمزور اور نازک رہا، محنت کی وجہ سے اس کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹروں نے ایک سال تک سلسلۂ تعلیم بالکل منقطع کر دینے کی رائے دی تھی، مکان پر رہ کر کوشل کی صحت درست ہونے لگی تھی۔ اب وہ روزانہ شام کو اُس طرف ٹہلنے جاتا جس طرف سے رجونتی کے آنے کی اُمید ہوتی، یوں تو کبھی کبھی لیکن دوشنبہ اور جمعہ کو اکثر رجونتی کشتی سے کر

رسول آباد آتی تھی، کوشل اُسے جس قدر بھی دیکھ سکتا تھا دیکھا کرتا، اُس کی خاموش محبت کوئلے کے نیچے دبی ہوئی چنگاری کی طرح اس کے سارے وجود پر چھائی جا رہی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب محبت کے شعلے بھڑک کر کوشل کو جلا دیں

رجونتی جب بانسری بجاتی اور اپنے محبت سے بھرے ہوئے نغمے چھیڑتی تو وہ خود تصور میں کسی ایسی ہستی کو ڈھونڈھتی جس پر پریم سے بھرے ہوئے گیت صادق آئیں۔ جب وہ سرجو کے پسندیدہ گیت گاتی تو تنہائی میں بھی سرجو کی حریص نگاہیں اپنی آنکھوں سے ملتے ہوئے دیکھتی تھی، ادھر جب سے کوشل بار بار اُسے نظر آیا تھا اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تمام گیت اُسی کے حضور میں پیش کر رہی ہے

ایک روز رجونتی اپنی ذاتی ضرورت سے کشتی لے کر رسول آباد آئی، کوشل حسب معمول آج بھی منتظر تھا، محبت میں عزائم کی تیاری اور شکست، منصوبوں کا بندھنا اور ٹوٹ جانا، تاویلات کا قائم ہونا اور مٹ جانا معمولی باتیں ہیں، جب تک محبوب نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُس وقت تک دل، دماغ اور آنکھیں سب محو نظارہ ہیں، لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا اور دل و دماغ فکر میں مشغول ہوئے، کوشل نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ کہ رجونتی کی کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر دریا کی تفریح کرے۔ لیکن اُسے کوئی قوت روکتی نظر آتی تھی، آج جبکہ بالکل سناٹا تھا کوشل ہمت کر کے ساحل آب کی طرف اضطراری طور پر بڑھا، قریب پہونچ کر ٹھہر گیا، جب تک رجونتی کشتی باندھتی رہی وہ اپنے جملے درست کرتا رہا جن کے ذریعہ سے وہ رجونتی سے مخاطب ہوگا، رجونتی کشتی باندھ کر کوشل سے ایک گز کے فاصلہ سے گذر گئی اور کوشل ایک بت کی طرح کھڑا رہ گیا، جب رجونتی بازار کی گلیوں کے پیچ و خم میں غائب ہوگئی اس وقت کوشل نے مُڑ کر جانے والی کی طرف نگاہ کی

مایوسی کا انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے اور امیدوں کا انتظار ایک شیریں خواب کی طرح پُر کیف، کوشل کو اطمینان سا تھا کہ رجونتی ابھی واپس آئے گی، اس لئے اس کے جذبات کی کوئی حد نہ تھی، وہ دریا میں اٹھتی ہوئی لہروں کو اپنے خیالات کے مدوجزر کے مقابلہ میں ہیچ سمجھ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دُور سے رجونتی آتی ہوئی نظر آئی اور کوشل کے تمام منتشر خیالات سمٹ کر صرف اس آرزو میں تبدیل ہوگئے کہ رجونتی کے ساتھ دریا کی سیر کرلے، وہ آئی اور کشتی میں بیٹھ گئی، ڈانڈ اٹھا کر چلنا ہی چاہتی تھی کہ کوشل کی تمنا اضطراری طور پر اُلجھے ہوئے الفاظ میں یوں نکل گئی۔ "میں بھی چلوں گا" بعض اوقات الفاظ احساساتِ عشق کے اظہار سے بالکل قاصر ہوتے ہیں محبت کی زبان ہی کچھ اور ہے اس کا راز گفتگو سے زیادہ خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے پھر بھی رجونتی نے کوشل کا مقصد پالیا، اُس نے ڈانڈ ہاتھ سے رکھ دیا کشتی سے اُتر کر ساحل پر آگئی اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہوگئی کوشل بغیر کچھ کہے ہوئے کشتی میں سوار ہوگیا اس کے بعد رجونتی بھی آئی اور کشتی ایک طرف روانہ ہوئی،

ہوا مخالف چل رہی تھی اور کچھ عرصہ سے تند و تیز بھی ہوگئی تھی لہٰذا رجونتی کی زیادہ تر توجہ اُسی جانب تھی، اس کا چہرہ بار بار سُرخ ہو جاتا تھا، ہوا اس کے بالوں کو منہ پر لا کر منتشر کر دیتی تھی۔ اور اس کی ساری کا آنچل بار بار سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ کوشل دیکھ رہا تھا اور مست رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ رجونتی کو کسی طرح یقین آجائے کہ وہ اس کی پرستش کرتا ہے اور پھر اس کے بعد کشتی دریا کی لہروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تاکہ پھر محبت میں ناکامی کی کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کی، گذشتہ بارش کے متعلق اظہار خیالات ہوتا رہا، فصل اور زراعت کے متعلق بات چیت ہوتی رہی اور وہی کوشل جسے فلسفہ کی کاہش میں اور نفسیات کی کتابوں کے سوا کوئی بات ہی پسند نہ آتی تھی۔ آج رجونتی سے دیہات کی معمولی باتوں پر زیادہ جوش اور مسرت کے ساتھ محو گفتگو تھا، وہ اس وقت محبت میں گم ہو کر خود کو تمام خیالات سے بیگانہ بنائے ہوئے تھا، اپنے بھائی کے بچائے جانے پر اُسے اب تک اظہار شکر کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اس نے جی کھول کر شکریہ ادا کیا، اظہار قبولیت میں رجونتی کی جھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ ہیجان پیدا کر رہی تھیں، اگرچہ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن کوشل نے کہہ دیا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں صرف اس لئے نہیں کہ تو خوبصورت ہے بلکہ اس لئے کہ تو صحیح معنوں میں عورت ہے، رجونتی کے خیالات کے عمق کا پتہ کون لگا سکتا ہے لیکن اس کی قوت گھٹتی ہوئی۔ اور کشتی دریا کے چڑھاؤ پر رکتی ہوئی نظر آئی تھی، ایک طرف امواج آب میں تلاطم تھا دوسری طرف کوشل اور رجونتی کے سینے کی لہریں ضبط اور صبر کا باندھ توڑ کر باہر نکلی جا رہی تھیں، اظہار محبت کے لئے یہی ٹھیک وقت تھا کیونکہ ہر چیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی، ہر طرف محبت کی بارش ہو رہی تھی　　رجونتی نے یکایک کشتی رسول آباد کی طرف پھیر دی اور بہت تیز چلانے لگی۔ کوشل نے گھبرا کر پوچھا "کیا واپس چل رہی ہو؟" رجونتی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "ہاں" کشتی دھارے پر تیزی سے روانہ ہوئی اور وہ وقت جسے کوشل ختم ہوتا ہوا نہ دیکھنا چاہتا تھا اور تیزی سے کٹنے لگا۔ گھبراہٹ میں کوشل کچھ بات چیت بھی نہ کر سکا۔ رجونتی نے وعدہ کیا کہ وہ اکثر ملا کرے گی۔ کشتی کنارے پر آگئی، کوشل اتر گیا اور جیب میں ہاتھ لے جا کر مزدوری نکالنی چاہی لیکن رجونتی کشتی لے کر کنارے سے دور جا چکی تھی، کوشل نے پکارنے پر اس نے صرف مڑ کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے کشن پور چلی گئی

اب کوشل اکثر رجونتی کے ساتھ سطح آب پر نظر آتا تھا دن گذرتے جاتے تھے اور دونوں میں محبت کے عہد و پیماں مستحکم ہوتے جاتے تھے...... رجونتی کی زندگی کا باب محبت قابلِ غور ہے، اُسے سرجو سے عشق تھا۔ اور کوشل سے محبت کرتی تھی، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ رنجیدہ دیکھنا نہ چاہتی تھی، اُسے یقین تھا کہ عنقریب اُس کی شادی سرجو سے ہو جائے گی۔ لیکن اس خیال نے کوشل کے التفات میں فرق نہ آنے دیا، وہ سرجو کو اپنا رفیق حیات سمجھتی تھی

اور کوشل کو محبت کئے جانے کے قابل جانتی تھی، لیکن اس نے کبھی یہ غور نہ کیا تھا کہ اگر سرجو اور کوشل ایک ہی وقت میں اس کے قریب ہوئے تو خود اس کی کیا حالت ہوگی یا اُن دونوں کے احساسات کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے لئے اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ایک روز جب رجونتی سرجو کے ساتھ سئی ندی کے کنارے پر نہایت محبت سے مچھلیوں وغیرہ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی کوشل بھی آگیا، سرجو نے تو اُسی روز کہہ دیا " رجون، تمھاری بات میرے ساتھ ہو چکی ہے اب تم کسی اور سے اس طرح نہ ملو نہیں تو لوگ کیا کہیں گے" یہ سنکر رجونتی چونک پڑی۔ اور دوسرے روز جب کوشل نے اُسے تنہا پاکر سرجو سے نہ ملنے کے لئے کہا تو رجونتی کے دل پر چوٹ سی لگی، اُسے محبت کرنا تو آتا تھا لیکن محبت کی ان پیچیدگیوں سے ناواقف تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو خوش نہیں رکھ سکتی، اس احساس نے اُسے تڑپا دیا لیکن مجبور تھی، دونوں کا دل رکھنے کے لئے اُس نے دونوں سے وعدہ کر لیا

سیتل کی بیماری نے طول پکڑا اُس نے شنکر کو بلا بھیجا اور رجونتی کی شادی جلد کر دینے پر زور دیا، رجونتی کو سوا اس کے کہ کوشل کو اس خبر سے تکلیف ہوگی اور کوئی رنج نہ تھا، سرجو کے ساتھ شادی ہونا اس کی دیرینہ تمنا تھی، شادی ہو گئی اور رجونتی قریب قریب ایک مہینے تک رسول آباد نہ جا سکی، کوشل اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھا اُسے معلوم تھا کہ رجونتی کی شادی سرجو ہی کے ساتھ ہو گی لیکن اس کے اس قدر جلد ہو جانے کا یقین نہ تھا۔ ایک مہینہ بعد رجونتی کشتی لے کر رسول آباد آئی کوشل سے ملاقات ہونے پر رجونتی نے نہایت معصومیت سے اس کا اقرار کر لیا کہ وہ اب سرجو کی ہو گئی ہے، لیکن کوشل کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں۔ کوشل اسے اپنی محبت کی ناکامی سمجھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے۔۔ ۔۔۔۔۔ یکایک اس نے رجونتی کا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا اور اُسے گھور کر دیکھنے لگا رجونتی سہم گئی اور اُس نے مسترحم نگاہوں سے کوشل کو دیکھا، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور آنسوؤں کے وہ قطرے جو اب تک پلکوں پر آکر تھرتھرا رہے تھے گر کر زمین میں جذب ہو گئے۔ ٹھیک اُسی وقت سرجو بھی آگیا اُس نے دونوں کو خوفناک نظروں سے دیکھا لیکن رجونتی کی حالت ہی کچھ عجیب تھی، جس طرح دو موٹر ایک ہی رفتار سے مخالف سمتوں میں گذر جائیں تو دونوں کے درمیان کی گرد اور سوکھی ہوئی پتیاں اپنی جگہ پر کانپ کر ساکت رہ جائیں گی اسی طرح رجونتی دونوں طرف کھنچ رہی تھی لیکن اُس کا سر نیچے سے اوپر نہ ہوتا تھا۔ سرجو نے بڑھکر اس کا بازو تھام لیا اور ندی کی طرف کھینچ لے گیا، کوشل اپنی جگہ پر ایک جسدِ بے روح کی طرح کھڑا رہ گیا، دور پہونچ کر رجونتی نے ایک دفعہ مڑکر اُسے دیکھا اور پھر ایک وفا شعار بیوی کی طرح سرجو کے قدموں میں گر کر رونے لگی

سیتل کا انتقال ہوگیا، باپ کی موت نے رجونتی پر بڑا اثر کیا وہ سُست رہنے لگی، سرجو اب خودکشی سے کر جاتا تھا اس نے رجونتی کو بہت کم تکلیف دی، دونوں کی ازدواجی زندگی نہایت پرمسرت تھی، اسی اثنا میں کوشل پر مرض کا سخت غلبہ ہوگیا، اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے وہ کچھ دنوں کے لئے پہاڑ چلا گیا، جب سردی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ واپس آیا اور دو چار مہینے اِدھر اُدھر رہ کر پھر منصوری چلا گیا، رسول آباد میں اس کا کوئی ایسا رازدار دوست نہ تھا جس سے رجونتی کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو اس لئے وہ ادھر سے بالکل بے خبر تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ کبھی رجونتی کے خیال سے غافل نہیں رہا

کشن پور میں سخت طاعون پھیلا، موت کا شکار ہونے والی ہستیوں میں سب سے زیادہ عبرتناک سرجو کی ذات تھی، اس کی جوانی کی موت نے سارے گاؤں کو صدمہ پہونچایا، رجونتی پر سخت اثر ہوا، اس کا دماغ ماؤف ہوگیا اس نے گاؤں میں رہنا ترک کر دیا اور دن رات سئی کے کنارے گزارنے لگی، وہ گیت جن سے کسی وقت سرجو پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور بعض اوقات وہ جوشِ محبت میں رجونتی کو سینے سے لگا لیا کرتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہی گیت اب اس کے جنون کو کچھ دیر کے لئے پسِ پشت ڈال دیتی۔ اور وہ تصور میں سرجو کے گلے میں باہیں ڈال دیتی جب تھک جاتی تو آہستہ آہستہ کسی سے باتیں کرتی، یہی اس کا دن بھر کا مشغلہ تھا، سرجو کے چھوٹے بھائی بہن کبھی کبھی کھانے پینے کے لئے کچھ لاتے تھے۔ اور وہ دوسرے تیسرے دن کچھ کھا لیتی تھی، جب لوگوں نے اُسے گھر میں آکر رہنے پر مجبور کیا تو ایک روز وہ کہیں غائب ہوگئی

کوشل تندرست ہوکر رسول آباد آیا اور سب سے پہلی فرصت میں کشن پور پہونچا۔ رجونتی کے متعلق تو کچھ دریافت نہ کر سکتا تھا لیکن اُس نے لوگوں سے سرجو کا حال دریافت کیا، اُسے مفصل کیفیت معلوم ہوئی۔ رجونتی کے پاگل ہوکر کہیں غائب ہو جانے کے خیال سے وہ کانپ اٹھا، محبت کی پہلی توہین بھول چکا تھا۔ اور وہ تمنائیں جو کوہستان کی محبت آمیز فضا میں اس کے سینہ میں پیدا ہوئی تھیں یک بیک مُردہ ہوگئیں اُسے خوب معلوم تھا کہ رجونتی سرجو کی ہے لیکن اُس چہرہ پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی تھا

گرمی بھی گذر گئی اور کوشل پھر بنارس واپس ہوا کہ اپنی تعلیم مکمل کرے۔ اُسے محبت کی دنیا میں سناٹا نظر آرہا تھا، اُس کی آنکھیں ہر وقت کسی کی جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں، جس روز طبیعت زیادہ اُداس ہوتی تھی اُس دن وہ گنگا کے کنارے بیٹھ کر اپنا وقت اُن دنوں کی یاد میں کاٹ دیتا جن میں رجونتی اس کے احساسات محبت کو لطیف سے لطیف تر بنایا کرتی تھی، دریا خوب بڑھا ہوا تھا، کوشل کو اس کی موجوں کی طرح سکون نہ

تھا، وہ کنارے ہی کنارے پر دُور تک چلا گیا، واپس ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم آگے ہی کی طرف اُٹھ رہے تھے، ...... دُور سے اُسے بانسری کی آواز سُنائی دی، وہ دیوانوں کی طرح بڑھتا چلا گیا اور آواز اُس کے وجود کے ہر ذرّے میں سرایت کر گئی، اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا، یہ رجونتی کی آواز تھی اور اُسی کے گیت! کوشل درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر رجونتی کے پیچھے آ گیا، رجونتی نے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے گیتوں میں منہمک ہو گئی، دو چار آدمی قریب کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے لیکن کوئی بھی خاص طور پر رجونتی کی طرف مخاطب نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرصہ سے اس کو اسی حال میں دیکھ رہے ہیں۔ کوشل نے خوشی اور تعجب سے ملی ہوئی آواز میں " رجونتی " کو آواز دی رجونتی پر کوئی اثر نہ ہوا، کوشل بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا " مجھ کو نہیں پہچانتی ہو رجونتی میں نے تجھ کو کہاں کہاں ڈھونڈھا " رجونتی نے کہا " پہچانتی کیوں نہیں " کوشل کی اُمیدیں بیدار ہونے لگیں اُس نے پوچھا " اچھا بتاؤ میرا نام کیا ہے؟ "

" میں نہیں جانتی، نہیں، نہیں، میں نہیں جانتی " رجونتی نے چیخ کر کہا کوشل گھبرا گیا اور کہنے لگا " رجونتی کیا کوشل کو بھلا دیا؟ " رجونتی بہت زور سے ہنسی اُس کے قہقہے میں دردناک ترنم تھا۔ اس نے کہا " کوشل! کوشل بھی مر گیا اور سرجو بھی ——— دونوں ——— ہاں کوشل بھی سرجو بھی ـ کوشل اور سرجو "

" رجونتی مجھے پہچان میں کوشل ہوں! "

" نہیں نہیں جھوٹ ہے۔ کوشل اور سرجو دونوں وہ ہیں " اُس نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ اور فوراً دریا کی موجوں سے ہم آغوش ہو گئی، کوشل بھی فوراً ہی کود پڑا لیکن گنگا کی لہریں اُسے دُور بہا لے گئیں، لوگ دوڑے اور بڑی کوششوں سے دونوں کو نکالا رجونتی سرجو سے مل چکی تھی اور کوشل بیہوش تھا

کوشل اب بیمار اور سُست رہتا ہے اور گنگا کی پرستش صرف اس لئے کرتا ہے کہ رجونتی اُس کی گود میں ہے

احتشام (رضوی)

انسان کی لازوال عظمت

"جب میں آکاش پر غور کرتا ہوں جو تیری قدرت کی کاریگری ہے، اور جب چاند اور ستاروں پر نظر ڈالتا ہوں جو تو نے منظم کئے ہیں، تو سوچتا ہوں کہ انسان کیا ہے جو تجھے اس کا خیال ہو، اور ابن آدم کیا ہے جو تو اس کو باریابی بخشے،

تاہم تو نے اس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے" (انجیل، حمد ۸: ۳: ۵)

قدیم عبرانی حمد کی یہ پاکیزہ شاعرانہ عبارت انسان کی بے بضاعتی اور نیز اُس کی عظمت کا خیال نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔ جب انسان رات کے وقت عالم بالا کی حیرت انگیز اور لامتناہی وسعت پر نظر ڈالتا ہے اور اس فضائے بسیط میں چاند اور ستاروں کو اس شان و شوکت کے ساتھ درخشاں دیکھتا ہے تو اس پر اپنی بے بضاعتی اور مناظر فطرت کے رعب و جلال کی ایسی کیفیت ... طاری ہو جاتی ہے کہ بے ساختہ اپنے عجز و نیاز کا اس طرح اقرار کرتا ہے۔ "انسان جو ایک ذرۂ بے مقدار ہے اس کا تجھکو کیوں خیال ہو، اور تو کیوں ابن آدم کو باریابی بخشے" یہ اُس کا جذبۂ اوّلین ہے، لیکن اس کے بعد ہی کوئی چیز اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے اس کی یہ ظاہری بے بضاعتی اور کم مائگی ستاروں کی عظمت سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس طرح اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے " تاہم تو نے اُس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے"

قدرت کی عظمت اور بالخصوص عالم بالا کی غیر محدود وسعت اور شان و شوکت کے مقابلہ میں انسان کی بے بضاعتی کا خیال ہر زمانہ میں زبان زد خلایق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آج جبکہ فلکیات کے متعلق جدید انکشافات نے فضائے بسیط کی وسعت و عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس کا عہد عتیق کے مفکرین تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اسوقت سے انسان کی بے بضاعتی اور زیادہ متوثق ہو گئی ہے

جس وقت قدیم عبرانی مصنف نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو کیا دیکھا ؟ ایک وسیع فضا جس کو وہ آسمان کہتا تھا، جو خیمہ کی طرح زمین پر چھایا ہوا تھا جس میں سورج، چاند اور ستارے کسی پُر اسرار طریقہ سے جڑے ہوئے تھے، جن کی

علت غائی صرف یہ تھی کہ وہ انسان کو موسموں کی تبدیلی کے نشانات بتلائیں اور زمین کو روشنی دیں، سب زمین کے چاروں طرف گھومتے تھے، اور زمین کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹے تھے اور عبرانی مفکر کے علم میں زمین کائنات کی سب سے بڑی چیز تھی اور وہ بھی اس کے تصور کے مطابق ہماری آج کی زمین کے مقابلہ میں بہت ہی محدود تھی

علم ہیئت کی جدید ترقی نے ان تمام خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے ۔ کیونکہ نہ تو وہ اجرام فلکی کا مرکز ہے اور نہ کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے بلکہ برعکس اس کے جسامت کے اعتبار سے موجودات میں اس کی نسبتی حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں ۔ خاموش، پُر اسرار اور تغیر پذیر یہ چاند ایک زرد آسمانی چراغ کے بجائے کرہ میں تبدیل ہوگیا، سورج زمین کے چاروں طرف گردش کرنے کی بجائے قائم ہوگیا اور زمین معہ دیگر سیاروں کے اُس کے گرد گھومنے لگی، ستارے مشعل شب کی بجائے عظیم الجثہ کرّوں میں تبدیل ہوگئے جن کے گرد بڑی بڑی دنیائیں چکر لگا رہی ہیں ۔ اگرچہ خود ہمارے نظام شمسی کی وسعت بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن وہ بھی خلاء کے ایک قلیل ترین گوشہ میں واقع ہے جبکہ اُس کے گرد و پیش لاتعداد اور لامحدود نظام شمسی پھیلے ہوئے ہیں

پھر اگر دنیائے قدیم کے انسان کو اپنی اُس قلیل کائنات کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی اور عجز کا اقرار تھا تو دنیائے جدید کے انسان کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو جدید علم ہیئت کی ظاہر کردہ کائنات کے درمیان رہتا ہے اور جس کو قدیم عبرانی کائنات سے وہی نسبت ہے جو آفتاب کو ذرّہ سے ہے

پھر جس طرح اس عہد میں انسان اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتا تھا بالکل اسی طرح آج بھی وہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا لامتناہی کائنات خالق اور ان تمام ستاروں اور کہکشاؤں کا تعمیر کنندہ انسان کی پرواہ کرتا ہے! کیا اس بات کے فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک ہماری ننھی ننھی جانیں قطرۂ شبنم یا حباب دریا سے زیادہ وقیع، اہم اور مفید ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کا تجربہ ہوا ہوگا ۔ آپ آدمیوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان سے گذرتے ہیں جن میں سے آپ نے نہ تو پہلے کسی کو دیکھا ہے اور نہ آیندہ دیکھنے کی توقع ہے ۔ آپ اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کھیتوں پر اڑنے والے پرندوں کے گروہ سے یا دھوپ میں مجتمع ہونے والے جراثیم سے کس بات میں ممتاز ہیں؟ اگر کرۂ قمر سے جو دوسرے کرّوں کے مقابلہ میں دنیا سے سب سے زیادہ نزدیک ہے خواہ کتنی ہی طاقت کی دُور بین لگا کر باشندگان زمین کو دیکھا جائے ۔ تو کوئی بھی نظر نہیں آسکتا اور یہ فاصلہ پرند، جراثیم اور انسان سب کو مساوی القامت بنا دیتا ہے

آپ کسی شہر میں ایک بلند مقام سے جہاں تک آپ کی نظر جائے اُن ہزارہا آدمیوں کو دیکھئے جو چاروں طرف پھر رہے ہیں تو وہ آپ کو فرش پر رینگنے والی چیونٹیوں سے زیادہ بڑے نظر نہ آئیں گے ۔ اور وہ شہر آپ کو دیمک کا ٹیلہ معلوم

ہوگا۔ اسی طرح سے آپ دوسرے تمام شہروں، قصبوں، اور دیہات کو قیاس کر سکتے ہیں کہ ان میں مختلف الاقسام چیونٹیاں آباد ہیں جو کسی دوسرے کرہ سے نہیں بلکہ اسی کرہ پر صرف چند میل کے فاصلہ سے ناقابل امتیاز ہیں
نسل انسانی کو اپنے ان کارناموں پر بہت بڑا فخر ہے جو اس نے اس دنیا میں کئے ہیں۔ اس کو اپنی زراعت پر، تجارت پر، برّاعظموں کا احاطہ کرنے والی ریلوں پر، سمندروں کو عبور کرنے والے عظیم الشان جہازوں پر، سربفلک کشیدہ عمارتوں والے شہروں پر، چشم زدن میں گردِ زمین خبریں پہونچانے والے لاسلکی پیغامبروں پر اور بلند پرواز طیاروں پر ناز ہے۔ لیکن اگر مریخ اور زہرہ پر آبادی ہے تو وہاں کے کسی باشندہ کو ان تمام باتوں میں سے ایک بات کا بھی علم نہیں۔ پس اس طرح سے ہماری دنیا کے اہم ترین واقعات صرف ہم ہی تک محدود معلوم ہوتے ہیں اور فضائے بسیط میں ہمارے قریب ترین ہمسایوں کو اُن کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی

پھر اگر ہم ایک ہی نظام کے دیگر اراکین سے اسقدر بے تعلق ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ نہ تو ان کو معلوم ہوتا ہے اور نہ اُن کے واسطے کوئی اہمیت رکھتا ہے، تو ان تمام دیگر نظاموں کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو ہمارے مختصر نظامِ شمسی کے حدود سے باہر یا غیر محدود فاصلوں پر واقع ہیں اور شب تار میں اقصائے عالم کو منور کر دیتے ہیں، اور پھر اس بے نیاز ہستی کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے جو ان سب کا خالق اور حاکم ہے؟ ایسے ایسے اہم اور غیر مختتم انتظام کی موجودگی میں اس خالق اکبر کو انسان جیسی بے ثبات مخلوق کا کیا خیال ہو سکتا ہے جو اس خاکرینہ پر آباد ہے جس کو دنیا کہتے ہیں اور جو آفرینش کے ایک دُور افتادہ اور حقیر گوشہ میں ایک دُھندلے نشان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟ کیا یہ فرض کر لینا حقیقت میں ایک نامناسب خودستائی نہ ہوگی کہ ہم اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کی توقع کر سکتے ہیں! علاوہ بریں کیا ایک ہم جیسی بے وقعت مخلوق کے لئے موت کے بعد ایک حیات ابدی کا خواب دیکھنا ایک بہت بڑا گستاخانہ قیاس نہ ہوگا،

اسی طرح سے علم ہیئت کے جدید انکشافات بہت سے دماغوں پر انسان کی ذلت و حقارت کا نقش جما دیتے ہیں اور اس سے قبل انسان کائنات میں جو کچھ اپنی وقعت اور اہمیت سمجھتا تھا اس کا استیصال کر کے اس کی بے بضاعتی اور مایوسی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے

یہ مسئلہ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ بہمہ وجوہ عملی ہے۔ دنیا میں اس قسم کے سوالات آج ہزاروں جگہ پوچھے جاتے ہیں اور ہمارے چاروں طرف پوچھے جا رہے ہیں اور بہت سے ذی فہم اور سنجیدہ لوگ ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی زندگیاں حقیقتاً تاریک ہو جاتی ہیں۔ اور کیا در حقیقت خود ہم میں سے بعض لوگوں پر ایسے لمحے نہ گذرے ہوں گے۔ جب اس قسم کے خیالات ان پر مسلط ہوئے ہوں۔ اس لئے ہمیں اس تاریک پردہ کو اٹھا کر حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اوّل یہ کہ کسی چیز کی اہمیت کا دارمدار محض جسامت پر نہیں ہوتا۔ ہماری دنیا کسی دوسری لاکھوں گنی بڑی دنیا سے لازمی طور پر اہمیت میں کسی طرح کم خیال نہیں کی جاسکتی اور انسان بھی محض اپنی جسمانی قلت کے باعث مادی حیثیت سے بھی لازمی طور پر غیراہم تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاتھی انسان سے بہ لحاظ جسامت کے بہت بڑا ہے لیکن اس کی جسمانی حیثیت اس کی اہمیت اور وقعت کو نہیں بڑھاتی دنیا کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے سے سیکڑوں گنا بڑے ملکوں سے اہمیت اور وقعت میں کہیں زیادہ ہیں ہزارہا ریگستانوں کے مقابلہ میں یونان کا چھوٹا سا ملک زیادہ وقیع ہے۔ اور لندن جو روئے زمین پر ایک خال کی مانند ہے قطبین کے ایک درجن بر اعظموں سے افضل ہے۔ ایک تنہا افلاطون، یا شکسپیر، یا یسوع، یا بودھ دنیا کی تاریخ میں افریقہ کی تمام وحشی نسلوں سے اسی طرح زیادہ قابل قدر ہے جس طرح ایک ہیرے کا ٹکڑا ایک کوہ پیکر تودۂ خاک سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح مختلف دنیاؤں کا موازنہ کرنے میں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ چھوٹی دنیا بڑی دنیا سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہو۔ ہمارا سورج باعتبار مادیت زمین سے تین لاکھ سولہ ہزار گناہ زیادہ ہے اور بلحاظ جسامت کے بارہ لاکھ بچاس ہزار گنا بڑا ہے تاہم زمین پر اعلےٰ قسم کی زندگی پائی جاتی ہے جبکہ سورج میں غالباً کسی قسم کی حیات موجود نہیں ہے اور گمان غالب ہے کہ فضائے بسیط میں جس قدر بڑے ثوابت ہیں۔ وہ عام طور پر اپنے سیاروں سے بہت کم ترقی یافتہ ہیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ نسل انسانی محض ایک ناچیز کرہ پر آباد ہونے کے باعث لازمی طور پر ناچیز اور غیراہم نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ایتھنز جیسے چھوٹے مقام پر رہنے والا انسان محض اس وجہ سے حقیر نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ تاتار جیسے وسیع ملک میں رہنے کی بجائے ایتھنز جیسی چھوٹی جگہ میں رہتا ہے۔ اعلیٰ فطرت والی ممتاز ہستیاں چھ فٹ کے جسم میں بھی اس خوبصورت چھوٹی سی دنیا پر اسی احسن پیرایہ میں بسر کرسکتی ہیں جس طرح کہ چھ ہزار فٹ کے جسم میں کائنات کے بڑے سے بڑے کرہ پر کرسکتی ہیں

بہرنوع اگر ایک طرف یہ بات مسلم ہے کہ علم ہیئت کی موجودہ تحقیقات انسان کو ایک مورِ ضعیف ثابت کررہی ہے تو دوسری طرف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ طبیعیات کے دیگر انکشافات کا فیصلہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ سطح انسانی سے نیچے ایک اور مکمل اور منظم کائنات معرض ظہور میں آرہی ہے۔ جو کائنات بالائی سے کسی طرح کم حیرت انگیز نہیں ہے، اسلئے اگر ایک علمی تحقیقات نے انسان کا رتبہ کم کردیا ہے تو دوسری علمی تحقیقات نے اسکو اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کردیا ہے۔ پس اسطرح سے دُور بین نے انسان کی قدر و منزلت میں جو کچھ کمی پیدا کردی تھی خوردبین نے اسکا ازالہ کردیا

تحت الانسان کائنات کی ترتیب و عظمت کے متعلق بعض حقایق کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر موسم گرما میں ایک تیتری کو پکڑلیں تو اُس کے پَروں سے ایسے ذرات چھوٹ کر ہمارے ہاتھ پہ لگے رہ جائیں گے

جن کو ہم معمولی خاک ریزوں سے تعبیر کریں گے اور چشم عریاں سے نہایت غور کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ہم ان کو خاکی ذرات سے متمیز نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر ہم ایک خوردبین سے اُن کا معائنہ کریں تو عجیب و غریب مناظر دکھائی دیں گے اب ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ وہی خاک ریزے مختلف الالوان و اوضاع پروں سے ایسے مکمل نظام کے ساتھ منظم ہیں جیسے کسی پرند کے پر ہوتے ہیں اور اس قدر چھوٹے .... کہ ایک مربع انچ میں ایک لاکھ آ سکتے ہیں

ایک قطرہ آب کی کیا بضاعت ہے لیکن یہی قطرۂ آب ایک جداگانہ دنیا ہے۔ ایک مکعب انچ آب ساکن میں قریب دس ارب کے متحرک اور زندہ مخلوق پائی جاتی ہے۔ نیویارک کے ایک ممتاز ماہر علم الحیات کا بیان ہے کہ "میں نے تھوڑا سا ارنڈی کا صاف اور جوشیدہ پانی ایک شفاف شیشی میں بھر کر کپڑے کے برش کے چند بال توڑ کر اس میں ڈال دیے، چار روز کے بعد شیشی بے شمار اور ناقابل تجزیہ زندہ مخلوق سے بھر گئی اور بلاخوف تردید یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ دو آؤنس کی شیشی میں اُن کا شمار اُن تمام انسانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھا جو زمانۂ آدم سے اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں"

اہرنبرگ ایک مشہور جرمن ماہر حیاتیات کا قول ہے کہ بوہیمیا میں آٹھ فٹ کی گہرائی تک چالیس مربع میل میں سلیٹ کا ذخیرہ موجود ہے جس کے ہر ایک مکعب فٹ میں خوردبینی پیمائش کے ذریعہ سے اکتالیس ارب کا پسماندہ دریافت کیا گیا ہے۔ جہاں چشم عریاں کو حیات کے آثار تک نظر نہیں آتے وہاں خوردبین کے ذریعہ سے نئی نئی دنیائیں آباد معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کل تک ایک ذی حیات بھی موجود نہ مانا جاتا تھا وہاں آج جدید سائنس نے ایسے حیرت انگیز عالمِ حیات پیش نظر کر دیے جیسے دُوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتے ہیں، اور جن میں انسان سے اسی قدر چھوٹی مخلوق آباد ہے جس قدر انسان ان اجرام فلکی سے چھوٹا ہے

درخت ایک کائنات ہے اور برگ درخت اس کی ایک دنیا ہے۔ آپ کی عریاں اور غیر مانوس آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی، لیکن اگر آپ ایک خردبین لیکر کسی ماہر طبیعیات کو اپنا رہبر بنائیں تو وہ آپ کی آنکھوں سے حجاب اٹھا کر ایسے ایسے عجیب و غریب رازہائے سربستہ کو بے نقاب کر دے گا کہ آپ کو اپنے گرد و پیش کھلے ہوئے دروازے نظر آئیں گے۔ جن میں داخل ہو کر آپ قدم قدم پر ایسی ہی لاانتہا اور تعجب خیز چھوٹی چھوٹی دنیائیں مشاہدہ کریں گے جیسی کہ دوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتی ہیں

خود انسان کا جسم بھی ایک کائنات ہے۔ انسانی خون کے ہر قطرہ میں دو کروڑ سے زیادہ جراثیم حیات پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے تمام قطرہائے خون ملا کر انسان ایک کائنات ہے اور اس کی شرائیں کہکشاں ہیں جن کے حلقوں میں ان سیارہائے احمر کے گروہ اپنے غیر مختتم دور لگا رہے ہیں

الغرض اگر ہم انسان کی روحانی حیثیت سے بھی کوئی سروکار نہ رکھیں اور اس کو محض ایک کرم مادی ہی تصور

کریں تب بھی وہ خدا کی مخلوق میں درجۂ متوسط کا مستحق ہے۔ اگر بالائے انسان اُس سے بدرجہا بڑے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں تو زیریں انسان اور اندرونی انسان میں بھی اس سے بدرجہا چھوٹے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں اگر ایک طرف فضائے بسیط کی بے پایانی اس کی وقعت کو گھٹاتی ہے تو دوسری طرف برگ درخت، قطرۂ خون اور خود اس کے مادۂ ترکیبی کی لاانتہائی اس کی منزلت کو بڑھاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی جسامت کی بنا پر ہماری تحقیر کرے اور انجم زار آسمان کی طرف اشارہ کرکے یوں طعنہ زن ہو کہ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ ان بعید از شمار دنیاؤں کا خدا آپ کی پرواہ کرتا ہے تو ہم اس کو ایک قطرۂ آب کے کروروں کیڑوں کی طرف اشارہ کرکے یہ جواب دے سکتے ہیں کہ وہ خدا جو ان کو فراموش نہیں کرتا ہم کو کیونکر فراموش کر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ انسان کی حقیقی عظمت مادی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ روحانی اعتبار سے ہے۔ انسان کی جو کچھ وقعت ہے۔ وہ اس کے دماغ کی وجہ سے ہے نہ کہ جسم کی وجہ سے، اس لئے اگر اس کے رہنے کی دنیا چھوٹی ہے تو کیا اور بڑی ہے تو کیا۔ کیا ایک مادی عرض و طول سے محدود کوہ تمثال تودۂ خاک ایک عرض و طول سے مبرّا اور مادی حدود سے منزہ نفس کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ کیا مادہ کے ایک سر بفلک کشیدہ ڈھیر کے مقابلہ میں روح مجوب و سرنگوں ہو سکتی ہے ؟ کیا ایک پہاڑ کو خیال سے بڑا کہہ سکتے ہیں ؟ کیا ایک بڑے سے بڑا سمندر اس انسانی دماغ پر تفوق حاصل کر سکتا ہے جو اس کو اپنے تصور میں محصور کر لیتا ہے، اس کو شاہروں میں منتقل کر دیتا ہے، اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر اس طرح پر گفتگو کر سکتا ہے گویا کہ اس کے ہزارہا میل محض چند انچوں کے برابر ہیں، اور اس کی خوفناک ترین لہروں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے ؟ اور کیا وہ تمام دوربین سے ظاہر کی ہوئی غیر شعوری دنیائیں ایک شعوری دماغ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھ سکتی ہیں ؟

فلکیات جدیدہ کے انکشافات اجرام فلکی کے درمیان اس دنیا کی قدیم اہمیت کو خواہ کتنا ہی گھٹا دیں لیکن وہ اس وقت تک انسان کی عظمت کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتے جب تک اُس میں قوتِ شعور موجود ہے۔ انسان کی عظمت اس کی فطرت میں ودیعت کی ہوئی طاقت کی بدولت ہے۔ اس لئے وہ سائنس کی تمام امکانی مادی تحقیقاتوں سے غیر متاثر ہے وہ محض اس لئے بڑا ہے کہ وہ جان سکتا ہے، استنباط کر سکتا ہے، حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے، امید کر سکتا ہے محبت کر سکتا ہے عبادت کر سکتا ہے اور یہ چیزیں وہ اس لئے کر سکتا ہے کہ وہ روح ہے۔ لیکن دُوربین کی ظاہر کی ہوئی بڑی سے بڑی دنیا محض ایک تودۂ مادی ہونے کے باعث ان میں سے ایک کام بھی کرنے سے ایسی ہی معذور ہے جیسے کہ ایک ہوا میں اُڑنے والا حقیر کیڑا یا خاک ریزہ معذور ہے اور اسی سے انسان کی اُس لامحدود اور لازوال فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کو فضائے بسیط میں عظمت و شان سے چمکنے والے تمام لاتعداد اور عظیم الجثہ کرّوں پر حاصل ہے

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کا فضائے بسیط میں منتشر ستاروں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جانا اس کی حقارت کی

علامت نہیں ہے بلکہ بزرگی کا نشان ہے۔ ایک سنگریزہ یا ایک مٹی کا ڈھیلا کیا حیرت زدہ ہو سکتا ہے محفل ثوابت و بزم سیارگاں کو دیکھ کر ایک وحشی درندہ میں کوئی حس تک پیدا نہ ہوگی۔ وحشی درندہ اس لئے بے حس ہے کہ اس میں قوتِ شعور نہیں ہے اور انسان اس لئے حمد و ثنا کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے، سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے، اور اس کی لطیف روح عالم قدس کے ساتھ التزام رکھتی ہے۔ دنیا کا تصور دنیا سے بہتر ہے اور ستاروں کا علم ستاروں سے برتر

سورج جسامت میں بہت بڑا ہے اور اُس کی جسامت کے مقابلہ میں زمین بالکل بے حقیقت شے ہے، لیکن اس سے انسان کی حقیقی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیا سورج باوجود اس قد و قامت کے خود اپنی پیمائش کر سکتا ہے اپنا وزن جان سکتا ہے، فضائے بسیط میں اپنے دائرۃ البروج کا اندازہ کر سکتا ہے یا اُن قوانین قدرت میں سے جن کی وہ کورانہ پابندی کر رہا ہے ایک قانون کو بھی سمجھ سکتا ہے، لیکن انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اس لئے وہ باوجود قد و قامت میں چھ فٹ ہونے کے سورج سے بڑا ہے

علم ہیئت ہم کو ستاروں کا بہت کچھ حال بتاتا ہے لیکن کیا ہم کبھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ہم کو اسی قدر انسان کا حال بھی بتلا سکتا ہے۔ انسان کا دماغ یہی نہیں کہ علم الافلاک کی روز افزوں ترقی کا ساتھ دینے کی قابلیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کی ترقی کا سبب ہے۔ اگر سمٰوات خداوند تعالےٰ کی قدرت کے مظاہرات ہیں تو وہ اسی قدر انسانی روح کی عظمت کے بھی نشانات ہیں کیونکہ انسان محض اپنی روحانی فضیلت ہی کے باعث کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں قدرت کے جلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے

کائنات کی تخلیقی طاقتیں خیال اور محبت ہیں اور چونکہ انسان ان دونوں صفات سے متصف ہے اس لئے وہ خالق ہے

چیننگ کا قول ہے کہ تمام نفس ایک ہی سلسلہ سے ملحق ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میرا وجود بھی وجودِ حقیقی سے متصل ہے۔ اس قادرِ مطلق نے میری ہستی کو محض پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ میرا اس کے ساتھ رشتۂ قرابت ہے کیونکہ میری روح روحِ حقیقی سے مشتق ہے۔ میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح سے وہ جانتا ہے اور اسی طرح سے محبت کرتا ہوں جس طرح سے وہ محبت کرتا ہے، اس لئے مجھے جس طرح اُس "نور السمٰوات والارض" کے مشاہدۂ جمال کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہے کہ تو میرا حقیقی باپ ہے اور میں کوئی تیری از دست افتادہ چیز نہیں ہوں بلکہ تیرا بچہ ہوں اور تیری برگزیدہ فطرت مجھ میں موجود ہے

انسانی عظمت کے مستحکم ترین ثبوتوں میں سے ایک ثبوت قطعی اور نئے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ ذریعہ "جدید نظریۂ ارتقاء" ہے۔ اس سے قبل انسان کا خیال بالکل مختلف تھا اور "ارتقاء" ایک خوفناک شے معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ انسان کی پیدائش کو عمل فطرت سے منسلک کرتا تھا اور اس کی موجودہ نمو یافتہ ہیئت کذائی

کو ادنیٰ قسم کی حیات سے مستلزم کرتا تھا اور اس لئے وہ تذلیل انسانیت کا باعث سمجھا جاتا تھا، لیکن اب یہ سب باتیں بدل گئی ہیں اور بڑے بڑے ارباب فکر اس حقیقت کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا نے انسان کی عظمت میں غیر محدود اضافہ کر دیا ہے۔ چونکہ انسان لاریب تمام سابقہ مدارج ارتقا کی حد کمال ہے اس لئے وہ اس تمام عمل فطرت کی معقول ترین اور مناسب ترین توجیہہ پیش کرتا ہے۔ عمل ارتقا اپنی آتشی حالت کی ابتدا سے دور دراز راستے طے کر کے اس منزل پر پہونچا ہے جو آج ہماری پیش نظر ہے لیکن اس نے ہمیشہ آگے ہی کو قدم بڑھایا ہے جس کی معراج انسان ہے۔ غیر ذی حیات سے ذی حیات تک، ادنیٰ قسم کی حیات سے اعلیٰ قسم کی حیات تک اور حیوان سے انسان تک سلسلہ بسلسلہ گامزن ہوا ہے اور اس طرح انسان آفرینش کی بلند ترین منزل پر پہونچ گیا ہے جو آفرینش کا نصب العین اور منزلِ مقصود ہے۔ جس وقت مادی جسم اپنی امکانی حد تک پہونچ گیا اس وقت نفس کی ابتدا ہوئی جس نے اسی وقت سے حکمرانی شروع کر دی اور مُدرک انسان کو وہ شرف حاصل ہوا جو صرف مدرک مطلق کی عظمت سے دوسرے درجہ پر ہے

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ کائنات کی دوسری کتنی دنیاؤں میں عمل ارتقار ترقی کی اس منزل پر پہونچ گیا ہے جس پر کہ وہ ہمارے یہاں پہونچا ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ ایسا ہوا ہے تو وہاں بھی اُس نے کسی نہ کسی شکل میں انسان ہی کا روحانی مثنیٰ پیش کیا ہوگا یعنی کوئی اس قسم کی ہستی پیدا کی ہوگی جس میں انسان کی طرح ایسی قوت ادراک وشعور پائی جاتی ہو جو " الٰہی خیالات کو اسی کی طرح خیال کر سکے " جیسا کہ انسان کر سکتا ہے، جو اس جہان میں " عمل ارتقار " کا ویسا ہی شاندار تکملہ ہو جیسا اس جہان میں انسان ہے اور جو بدیں سبب کسی صحیح مفہوم میں وہاں پر خدا کا ایسا ہی ہمشکل اور ہمرشتہ ہو جیسا انسان یہاں پر ہے

اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مادۂ اولین کی پہلی حرکت سے لیکر اس وقت تک کائنات کا تمام " عمل ارتقا " اس دنیا میں اور نہ معلوم کتنی اور دنیاؤں میں اسی اُدھیڑ بن میں مصروف رہا کہ انسان یا اُس کا مماثل پیدا کرے پھر اگر کائنات اس تمام " عمل ارتقار " کے مصائب ومصارف برداشت کرنے کے بعد ایسی اعلیٰ فطرت کا انسان بنانے میں کامیاب ہوئی ہے تو کیا اس کا انجام بھی اسی مناسبت سے اعلیٰ اور افضل نہ ہونا چاہئے اور کیا اس کی حیات بعد الممات عارضی مکان وزماں کی قیود سے آزاد نہ ہونی چاہئے ؟ کیا ان تمام موجودات کا خالق اکبر اور صانع حقیقی ایسا غیر معقول ہے کہ وہ اپنی کامل ترین مخلوق کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتے ہی نیست ونابود کر دے گا ؟ اگر انسان الٰہی الاصل ہے اور اعلیٰ الٰہی صفات سے مشرف ہوا ہے تو کیا وہ فنا ہو سکتا ہے اور کیا اس کو ایک ایسی ہی بقا کا وارث نہ ہونا چاہئے جو بقائے الٰہی کے متوازی ہو ؟

لوگ دوسری دُنیاؤں، نظامہائے اور ہجوم سیارگاں کو انسان کی تذلیل وتحقیر کے لئے بطور دلیل کے پیش

بیراگ کا روگ

(۱)

راجکماری آئینہ کے سامنے ہلکے بنفشئی رنگ کی ساری پہنے بیٹھی ہوئی تھی، کنیزیں اسے سنوار رہی تھیں — لمبے لمبے بال سلجھائے جا رہے تھے اور ان کی باتوں پر جو وہ کبھی ہنس پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئینہ کے اندر بجلی کی سی لہر دوڑ گئی ۔ وہ اس وقت محل کے اس حصہ میں تھی جو اس کی خلوت و آزادی خلوت کے لئے مخصوص تھا

اس کا نام کملا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح ——— اُس کنول کی طرح جو سطح آب سے اونچا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے ۔ نازک اور لچیلی تھی

اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راجکماری گنگنانے لگی ۔ اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگا دی جائے ۔ سچے موتیوں کے باریک باریک ذرّے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں ———

اس نے ایک آہ کے ساتھ گردن اٹھائی اور آئینہ کے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی، سینہ کے ہار کو سنبھالتی ہوئی بولی :— "تم نے تو آج مجھے تھکا دیا" کنیزیں پیچھے خاموش کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھیں ——— راجکماری نے دفعتہً پلٹ کر دیکھا اور ان سب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنس پڑی ۔ کسی نے جلدی سے ساری کا آنچل سنبھال کر اس کے شانہ پر ڈالا، کسی نے ماتھے پر سرخ بندی لگا دی اور کسی نے زرکار اطلس کی جوتی پاؤں میں پہنائی اور کملا آئینہ میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی

کملا راجہ جگدیس پور کی لڑکی تھی اور راجپوتانہ بھر میں کوئی راجکماری اس کے حسن و جمال کو نہ پہونچتی تھی لوگ کہا کرتے تھے کہ راجکماری کملا کے اندر تو سرسوتی دیوی نے جنم لیا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ملک کے نوجوان جو کوئی توقع اس کی طرف سے قایم نہ کر سکتے تھے، یہ نہ کہتے تو کیا کرتے

(۲)

بلداؤجی کا مندر رتن گڑھ کا تاریخی مندر ہے اور اپنی وسعت تعمیر کے لحاظ سے بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہر سال یہاں پھاگن کی پورنماشی کو بڑا میلہ لگتا ہے اور دُور دُور سے لوگ جاترا کرنے آیا کرتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف فقیروں اور سادھوؤں کے قیام کے لئے مسلسل کوٹھریاں ہیں۔ اور ان کے سامنے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا ہے، جہاں تپسیا کرنے والے اور دنیا کو تج دینے والے سادھو گیان دھیان میں مصروف نظر آتے ہیں

صبح کا وقت ہے اور سیکڑوں عورتیں تھالیوں میں رنگ برنگ کے پھول رکھے ہوئے پوجا کے لئے آ جا رہی ہیں۔ مندر کی پشت پر جہاں نسبتاً بہت کم ہجوم ہے، راجکماری کملا اپنی دو کنیزوں کے ساتھ کھڑی ہوئی آنے جانے والوں کو دیکھ رہی ہے، متعدد تھالیاں پھولوں سے بھری ہوئی صحن کے گوشہ میں رکھی ہوئی ہیں۔ اور اس بات کا انتظار ہو رہا ہے کہ ہجوم کم ہو تو یہ پھول بھی شیوجی کے استھان پر چڑھا دئے جائیں۔ کملا کا معمول تھا کہ وہ کبھی کبھی شہر کی دوسری عورتوں کی طرح یہاں آتی اور آزادی کے چند لمحے بسر کر کے چلی جاتی۔ ہر چند بعض پجاریوں اور پنڈتوں کو اس کا علم تھا، لیکن آج تک وہ کبھی یہ نہ معلوم کر سکے تھے کہ وہ کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے

راجکماری کملا تھک کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور رُکمنی اور لیلاوتی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی۔ راجکماری کملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیلا، سچ بتا جس وقت تو شیوجی پر پھول چڑھاتی ہے تو تیرے دل میں کیا آرزو ہوتی ہے"

لیلا — "راجکماری، میں کیا اور میری آرزو کیا"

رکمنی — "اور آرزو ہو بھی تو کیا، کبھی پوری ہوتے تو دیکھی نہیں"

کملا — (ہنستے ہوئے) "رکمنی، خوب کہا۔ لیکن کیا میں سن سکتی ہوں کہ تیری کیا آرزو ہے جو شیوجی نے آج تک پوری نہیں کی"

رکمنی — (افسردگی کے ساتھ) "راجکماری، کچھ نہیں، میں نے تو یونہی ایک بات کہدی۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ بغیر پھول چڑھائے بھی ہو جاتا ہے اور جو بات ہونے والی نہیں، وہ کسی طرح نہیں ہوتی، چاہے کوئی لاکھ سر رگڑا کرے"

لیلا — (پیشانی پر تیوریاں ڈال کر) "کیوں ایسی بات زبان سے نکالتی ہے، پرمیشر اگر سن لے تو نہ جانے کیا کرے"

اسی وقت دو عورتیں قریب سے گزریں۔ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی۔ "بڑے گیانی سادھو ہیں، چرن چھوتے ہی میرا سب دُکھ جاتا رہا، یہ معلوم ہوتا تھا گویا آنکھوں میں نیند سی بھری جا رہی ہے۔ تم بھی چلو کل صبح چل کر درشن

کرلو، وہیں تم سے قریب ہی رام گوبھا میں رہتے ہیں"

کملا رانی دیر تک خاموش کچھ سوچتی رہی اور بغیر پھول چڑھائے ہوئے واپس چلی گئی

(۳)

مہاراجہ —— " مجھے سوامی جی کا حال بالکل نہیں معلوم، لیکن تم ان سے ملنا چاہتی ہو تو میں انھیں یہیں بلاتا ہوں اچھا ہے میں بھی مل لوں گا "

کملا —— " مہاراج، جو لوگ دنیا چھوڑ چکے ہیں اُن سے دنیاوی جاہ وجلال کے ساتھ ملنا مناسب نہیں میں ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی کہ میں کون ہوں "

مہاراجہ —— (مسکراکر) " تمھاری اس آزاد طبیعت سے جگدیس پور والے بھی کچھ واقف ہو چلے ہیں۔ اور تمھیں معلوم ہے کہ وہ کیسے پُرانے خیال کے لوگ ہیں۔ صرف ایک مہینہ باقی ہے کہ تم انھیں کے بس میں ہوگی اس لئے مناسب نہیں کہ ان کو تمھاری طرف سے کسی بُرے خیال قائم کرنے کا موقع ملے۔ محلوں کی ذرا سی بات بھی کوٹھوں کوٹھوں پھرتی ہے "

یہ سنکر راجکماری کملا کے چہرہ پر انفعال و برہمی کی ملی ہوئی کیفیت کا ایک خاص رنگ پیدا ہوگیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جو حقیقتاً اس کے انتہائی ضبط وتامل کو ظاہر کررہا تھا

بولی —— " سچ ہے مہاراج، لڑکی ہر جگہ لڑکی ہے، خواہ وہ راجہ کے گھر میں پیدا ہو، یا کسان کے جھونپڑے میں، عورت کی کمزوری، قدرت کی وہ بے اعتمادی ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں، بہتر ہے میں نہ جاؤں گی، لیکن سوامی جی کو بھی یہاں آنے کی تکلیف نہ دیجئے اور رتن گڈھ کو جگدیسپور نہ بنائیے "

یہ کہکر راجکماری کملا جانے ہی والی تھی کہ اس کے باپ نے اس کو روک لیا اور بولا کہ " کملا میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تم وہاں نہ جاؤ، میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، تم آزردہ نہ ہو۔ میں تمھاری خوشی کے لئے دنیا کی ہر مصلحت کو قربان کرسکتا ہوں بشرطیکہ رتن گڈھ کی عزت پر حرف نہ آئے "

(۴)

یوں تو رتن گڈھ کوہستان بندھاچل کے دامن میں واقع ہے لیکن اس کی آبادی پہاڑ کی بلندی تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں قلعہ اور رنواس کی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ سب سے بلند مقام رام گوبھا کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سری رام جی نے لنکا پر فوجکشی کی تھی تو اسی راستہ سے گزرے تھے اور یہاں ایک رات دن قیام کیا تھا

صبح کا وقت ہے، اور گو آفتاب کافی بلند ہو گیا ہے، لیکن موسم کی خنکی کی وجہ سے ابھی تک زیادہ چہل پہل کہیں نظر نہیں آتی

رام گوپھا ایک وسیع کھوہ ہے جس نے ایک وسیع کوٹھری کی صورت اختیار کر لی ہے اور قدرت نے اس کے آگے ایک بڑی چٹان کی چھت قائم کر کے اچھا خاصہ برآمدہ بھی بنا دیا ہے، جگہ نہایت صاف، ستھری ہے اور چاروں طرف سبز جھاڑیوں کی وجہ سے گرمی میں بھی یہ جگہ کافی خنک رہتی ہے۔ قریب ہی ایک سنگستانی چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ گوپھا عرصہ سے غیر آباد تھا، لیکن چند دن سے سوامی رام ناتھ، بنگال کے مشہور سنیاسی فقیر یہاں آکر ٹھہر گئے ہیں

سوامی رام ایک دولتمند باپ کے بیٹے اور تعلیم یافتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایسے ماحول میں بسر ہوئی تھی جسے نہ مذہب سے کوئی سروکار تھا اور نہ سنیاس سے، لیکن چونکہ وہ فطرت کی طرف سے نہایت سنجیدہ اور سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول اور عیش و تنعم کی فضا سے بہت کم متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی کافی سادہ بسر ہوئی تھی، جب ان کا مطالعہ وسیع ہوا تو اُن کی یہ فطری سادگی اور زیادہ ظاہر ہونے لگی، یہاں تک کہ آخر کار ایک گیروے رنگ کی چادر کے سوا اُن کے جسم پر کوئی کپڑا نہ رہ گیا

ہرچند ان کے باپ جو رنگ پور کے مشہور سر برآوردہ زمیندار تھے، اپنے بیٹے کی اس زندگی سے خوش نہ تھے اور انھوں نے بارہا اس موضوع پر گفتگو بھی کی، لیکن رام ناتھ کا وہ گہرا سکوت جس میں عجیب طرح کی کیفیت مقاومت پنہاں تھی، ایک ایسا فیصلہ کن جواب ہوا کرتا تھا کہ آخر کار یہ تعرض چھوڑ دیا گیا اور وہ اپنی عمر کے چوبیسویں سال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دفعتہً گھر سے غائب ہو گئے

رام ناتھ گھر سے نکلنے کے بعد کہاں گئے، کہاں کہاں کی خاک چھانی، اور کس کس جگہ گیان دھیان میں مصروف رہے، یہ ان کی زندگی کی وہ باتیں ہیں جن کا علم صرف انھیں کو حاصل تھا، جس وقت وہ رتن گڈھ آئے ہیں ان کی عمر ۲۶ سال کی تھی اور سوائے کتابوں کے انبار کے کوئی اور سامان اُن کے ساتھ نہ تھا

صورت و شکل کے لحاظ سے ان میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ ابھی شباب کا زمانہ تھا اور شباب بھی ایک سنیاسی کا، اس لئے ان کی صورت میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی تھی، اور آنکھوں کی کشش کا تو یہ عالم تھا کہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان کا باتیں کر لینا۔ بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتا تھا ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا، اور قامت و اعضاء کے لحاظ سے ایک چھریرے سڈول جسم کے انسان تھے

کملا جس وقت رکمنی کے ساتھ وہاں پہونچی تو سوامی جی اپنے مطالعہ میں مشغول تھے اور کوٹھری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے ـــــــ

رکمنی نے دستک دی اور تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلے، لیکن اس شان سے کہ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کملا نے ان کو دیکھتے ہی نگاہیں نیچی کرلیں اور وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سوامی جی عورتوں کی آمد و رفت کبھی پسند نہ کرتے تھے اور حتی الامکان اس سے بہت گریز کرتے تھے کہ عورتوں سے انھیں خطاب کرنا پڑے، اس لئے دستک سننے کے بعد جب وہ باہر نکلے اور انھوں نے دو عورتوں کو کھڑا ہوا دیکھا تو وہ گھبرا سے گئے۔ لیکن چونکہ وہ باہر آگئے تھے اس لئے اب واپس بھی نہ جا سکتے تھے۔ ملاحا کونہ میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا

رکمنی نے بڑھ کر اُن کے پاؤں چھونا چاہے، لیکن انھوں نے روک دیا اور بولے کہ "دیوی، میرے چرنوں میں کیا رکھا ہے، ہندو دھرم میں غیر کی پوجا حرام ہے"

رکمنی ——"سوامی جی، یہ تو پرمیشر کی پوجا ہے آپ کے چرنوں کی نہیں"

سوامی جی——"پرمیشر کہاں ہے جس کی پوجا کرتی ہو، انسان خود پرمیشر ہے، اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہئے"

کملا سوامی جی کے منہ سے یہ باتیں سُنکر حیران رہ گئی اور اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اس آواز کو سُنا جو زمانہ نامعلوم سے اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی لیکن لب تک نہ آسکتی تھی۔

اس نے کہا——"سوامی جی، اپنی پوجا کا کیا طریقہ ہے"

سوامی جی——(مسکراتے ہوئے) "تم نے اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے ؟"

کملا ——(انفعال کے ہلکے رنگ کے ساتھ) "جی ہاں، روز ہی دیکھتی ہوں"

سوامی جی——"تمھیں وہاں کیا نظر آتا ہے"

کملا ——"ایک صورت نظر آتی ہے"

سوامی ——"کس کی"

کملا ——"اپنی"

سوامی ——"وہ چیز جسے تم "اپنی" کہتے ہو کیا ہے، کہاں ہے، کیا "میں" نام خوبصورت چہرہ کا ہے، بڑی بڑی آنکھوں اور گورے گورے رنگ کا ہے ؟ یہ تمام باتیں تو چند دن میں مٹ جانے والی ہیں، تو کیا "میں" بھی ان کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے"

کملا ——"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، گو ہونا تو نہ چاہئے"

سوامی——"کبھی سمندر تم نے دیکھا ہے"

کملا ——"جی ہاں، دیکھا ہے"

سوامی ـــــ "کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ قطروں کا مجموعہ نہیں، لیکن سمندر نام قطرہ کا تو نہیں۔ قطرہ جب تک سمندر میں شامل ہے خود بھی سمندر ہے، اور جب اس سے علیحدہ ہو گیا تو وہ ایک فانی قطرہ ہے، درانحالیکہ سمندر بدستور اسی طرح قائم ہے۔ اسی طرح "میں" نام نہ تمھاری صورت کا ہے اور نہ میری صورت کا، نہ تمھاری ایک ذات کا، نہ میری تنہا ہستی کا، بلکہ اس کل کا جو "ہم سب" کے پردہ میں ظاہر ہوا ہے، درانحالیکہ وہ "ہم" نہیں ہے۔ اسی کل کا دوسرا نام "پرمیشور" ہے اور جب تک ہم اس میں شامل ہیں، خود بھی "پرمیشور" ہیں اور اس لئے اپنی پوجا کرنا پرمیشور کی پوجا کرنا ہے

کملا ـــــ "مہاراج، یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ اپنی پوجا کیونکر کی جائے"

سوامی ـــــ "تم نے کبھی آدھی رات کو جنگل کا سناٹا دیکھا ہے، جبکہ کہیں کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی"

کملا ـــــ "جی ہاں، دیکھا ہے"

سوامی ـــــ "پھر تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس انتہائی سکوت کی بھی ایک آواز ہوتی ہے، اس گہری خاموشی میں بھی ایک خاص قسم کی سرگوشی سی پائی جاتی ہے۔ انسان بھی اگر دھیان سے کام لے کر خود اپنی خلوت میں ڈوب جائے، تو وہ بھی خاص قسم کی آواز اپنے اندر سے پیدا ہوتے ہوئے سن سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ کائنات میں وسیع ہوتا جا رہا ہے اور پرمیشور کی طرح سب پر چھایا جا رہا ہے"

کملا ـــــ "اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے نتیجہ کیا ہے"

سوامی ـــــ "نتیجہ کا سوال، منزل کا سوال ہے، اور منزل کا سوال قطع جستجو کا"

سوامی جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ کملا بھی اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی جھرجھری محسوس کر رہی تھی اور جس وقت رخصت ہوتے وقت سوامی جی نے اس کو اپنی اشک آلود آنکھوں سے دیکھا تو وہ کانپنے لگی اور اس طرح گھر کی طرف لوٹی گویا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ سمجھنا چاہتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے (باقی)

نیاز

میکدۂ اسلام

اور

اڈیٹر سہیل یمن کی بہکی بہکی باتیں

لکھنؤ سے ایک شیعی رسالہ "سہیل یمن" جناب ظفر مہدی صاحب کی ادارت میں برسوں سے شایع ہو رہا ہے اور اسی ذہنیت کے ماتحت جو اخبار "النجم" کی ہے۔ یعنی شیعہ سنیوں کے درمیان تفریق و اختلاف کی خلیج کو وسیع کرتے رہنا اور کبھی کوئی ایک بات بھی سمجھ کی ایسی نہ کرنا جسے صحیح معنی میں دینی یا انسانی خدمت کہا جائے

"میکدۂ اسلام" ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو انھیں کی قوت فکر و اجتہاد کا نتیجہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس میں جابجا میرا اور نگار کا بھی ذکر آیا ہے

اس رسالہ کا مقصود اس مسئلہ پر گفتگو کرنا ہے جو جناب امیر کی شراب نوشی سے متعلق ہے اور جس کا ذکر مولانا شبلی نے بھی کیا ہے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے بھی اس کی تائید کی

میکدۂ اسلام میں شبلی کی تحقیق کو غلط ثابت کرتے ہوئے جن جن دور از کار مباحث و مسائل پر خامہ فرسائی کرکے ورق سب و شتم کو پورا کیا گیا ہے، اُن سے اعتنا کرنا میرا فرض نہیں، کیونکہ وہ سب شیعہ و سُنّی کی اُس دیرینہ نزاع سے متعلق ہیں جس کا خیال بھی میرے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اس کی حمایت یا مخالفت میں قلم اٹھانا لیکن چونکہ صاحب رسالہ نے میرے خلاف ایک نہایت لغو و غلط الزام مولانا شبلی کی تائید کا قائم کیا ہے اس لئے اس کو رفع کردینا ضروری سمجھتا ہوں

[illegible]۶ء میں ایک صاحب نے استفسار کیا کہ رسالہ سہیل یمن میں جناب عمر کے متعلق "شراب صلب" کا پینا کتب اہل سنت سے ثابت کیا گیا ہے، سو اس کی کیا اصلیت ہے" میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ

یہ ظاہر کیا تھا کہ

" سہیل یمن کے اس مضمون کا ماخذ عقد الفرید ہے یا عقد الفرید کے حوالہ سے " ابن قتیبہ " لیکن مقالہ نگار نے دیانت سے کام لے کر نہ عقد الفرید کی پوری بحث پیش کی اور نہ ابن قتیبہ کی عبارت نقل کی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور حضرت عمر پر بادہ خواری کا الزام اسقدر صفائی سے عائد نہ ہو سکتا "

اسی سلسلہ میں میں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا

" یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت " یسئلونک عن الخمر ــــــ " نازل ہونے سے پہلے عام طور پر لوگ شراب کے عادی تھے اور اس آیت کے نازل ہونے پر بھی سب نے اسے ترک نہیں کیا تھا، لیکن ایک مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی صحابی نے (اور بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے) نماز مغرب بہ حالتِ سُکر پڑھائی اور قرات میں غلطی ہو گئی تو آیت " لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ " نازل ہوئی ...... "

میرے اس جواب میں (جو مئی ۲۷ء کے نگار میں درج ہوا ہے) ایک بات تو مدیر سہیل یمن کو یہ ناگوار ہوئی کہ میں نے اُن پر مناظرانہ دیانت سے انحراف کرنے کا الزام قایم کیا تھا اور دوسری یہ کہ بہ حالتِ سُکر نماز پڑھانے والے صحابی کا ذکر کرتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ بعض کے نزدیک یہ صحابی خود حضرت علی تھے

اب کامل سات سال گزرنے کے بعد ظفر مہدی صاحب " میکدۂ اسلام " شایع کرتے ہیں اور اس میں اپنی دیانت کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جناب امیر کے واقعۂ شراب نوشی کو لے کر مجھے بھی مولانا شبلی کی طرح موردِ الزام قرار دیتے ہیں، درانحالیکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے

میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے بہ حالتِ سُکر نماز مغرب پڑھائی تھی، لیکن اس سے میرا مدعا یہ ظاہر کرنا نہ تھا کہ میں بھی اُن " بعض " سے متفق ہوں، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ اس سے قبل میں صراحۃً اس باب میں مولانا شبلی کے خلاف اظہارِ خیال کر چکا تھا ــــــ

اگست و ستمبر ۲۵ء کے مسلسل دو اشاعتوں میں جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی کا ایک مضمون " ملکِ خطا کے شہزادے " کے عنوان سے نگار میں شایع ہوا تھا اور پہلا اعتراض مولانا شبلی پر انھوں نے یہی کیا تھا کہ

" آیت لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول میں ابوداؤد سے جو روایت انھوں نے نقل کی ہے اور حضرت علیؓ کے واقعۂ بادہ نوشی کا ذکر کیا ہے، حد درجہ قابل ملامت ہے۔ اور وہ حدیث اس قابل نہ تھی کہ اس سے استدلال کیا جاتا ...... "

میں نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

" اس مسئلہ میں کئی باتیں غور طلب ہیں

(۱) ابوداؤد کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھی یہ حدیث روایت ہوئی یا نہیں

(۲) اس کے راوی مجروح ہیں یا نہیں

(۳) آیۂ لاتقربوا الصلوٰۃ کی شانِ نزول یہی واقعہ ہے یا کوئی اور

(۴) مفسرین کی اس باب میں کیا رائے ہے

ابوداؤد کے علاوہ ترمذی میں بھی یہی واقعہ موجود ہے۔ لیکن ذرا اختلاف کے ساتھ۔ ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں

" عن علی ابن ابی طالب ان رجلاً من الانصار دعاہ (علی) وعبدالرحمٰن بن عوف فسقاہما قبل ان تحرم الخمر فامہم علی فی المغرب وقرا، قل یا ایہا الکفرون، فخلط فیہا، فنزلت لاتقربوا الصلوٰۃ الخ "

یعنی شراب حرام ہونے سے قبل حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کو کسی انصاری نے مدعو کیا۔ اور ان کو شراب پلائی۔ پھر مغرب کی نماز میں حضرت علی نے امامت کی اور اثنائے قرأت میں " قل یا ایہا الکفرون " غلط پڑھ گئے جس پر آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " نازل ہوئی (ابوداؤد کتاب الاشربہ صفحہ ۱۶۱ جلد دوم مطبوعہ نولکشور)

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں :-

" عن ابن ابی طالب صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوف طعاماً ودعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قل یا ایہا الکفرون ولا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون قال فانزل اللہ تعالیٰ یا ایہا الذین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ الخ "

(ترمذی جلد دوم صفحہ ، مطبوعۂ مصر)

ابوداؤد نے یہ واقعہ مسدد سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے سوید سے۔ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی انصاری نے حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کی دعوت کی تھی۔ اور ترمذی کی روایت سے عبدالرحمٰن بن عوف کا دعوت کرنا پایا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں مغرب کے وقت کی تصریح ہے۔ اور ترمذی میں کسی وقت کا ذکر نہیں

بخاری اور ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ نسائی میں اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو ابوداؤد میں بھی ہے لیکن حضرت علی کی شراب نوشی اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے

انوار التنزیل میں " لاتقربوا الصلوٰۃ " کی جو شانِ نزول بیان کی ہے۔ وہاں بھی حضرت علی کا کوئی ذکر نہیں ہے اس میں لکھا ہے کہ :-

" عبدالرحمٰن بن عوف نے جس زمانہ میں شراب حرام نہیں ہوئی تھی کسی صحابی کو مدعو کیا اور سب نے

مل کر کھانا کھایا، اور شراب پی یہاں تک کہ خوب سیر ہوگئے، اور نماز مغرب کا وقت آگیا۔ ان میں سے کوئی نماز پڑھانے لگا۔ اور اثنار قرأت میں " اعبد ما تعبدون " پڑھ گیا، جس پر آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " نازل ہوئی " [1]

اسی طرح علامہ زمخشری اور امام رازی وغیرہ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن حضرت علی کی شراب نوشی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام رازی نے آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " کے متعلق حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل حرمت خمر صحابہ شراب پی کر مسجد میں آتے تھے۔ اور نماز پڑھتے تھے۔ پس اللہ نے ان کو اس آیت کے ذریعہ سے منع کیا

دُرِ منثور میں ایک جگہ سبب نزول وہی واقعہ حضرت علی کا نقل کیا ہے اور دوسری جگہ ضحاک اور ابن عباس سے سکر نوم یعنی نعاس سبب نزول قرار پایا ہے

بہر حال آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے اور چونکہ ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت علی کے واقعہ، بادہ نوشی ہی کو اس آیت کا سبب نزول قرار دیا ہے اور دوسری روائتیں اس کی معارض واقع ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک حدیث قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور اس پر اعتماد کرکے، ہم حضرت علی کے متعلق یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے شراب پی۔ اور مولانا شبلی نے یقیناً اس معاملہ میں کاوش نہیں کی اور ابو داؤد کی اس حدیث کو صرف اس بنا پر کہ اس کے راوی غیر مجروح ہیں اختیار کرلیا

یہ تھے میرے خیالات اس خاص واقعہ کے متعلق جو میں فروری ۱۹۲۶ء کے نگار میں ظاہر کرچکا تھا لیکن سہیل یمن کے وہ فاضل و مجاہد مدیر جو حضرت عمر پر شراب نوشی کا الزام عاید کرتے ہوئے عقد الفرید کی پوری عبارت نقل کرنے میں خیانت سے کام لے سکتا تھا وہ میرے باب میں کیوں دیانت سے کام لیتا اور کیوں میرے اصل خیال کو پیش کرتا ——

یہ ہے ہمارے مناظرہ کرنے والے مولویوں کی ذہنیت و قابلیت کا حال، اور یہ ہیں ان کی مبلغا..... راستبازیاں، جن سے وہ سپید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش میں کام لیتے رہتے ہیں —— اصل موضوع کے متعلق جناب ظفر مہدی صاحب نے اس " میکدۂ اسلام " میں کیا لکھا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ میں نے حضرت عمر کے شراب نوشی کے متعلق جو کچھ ۱۹۲۷ء میں لکھا تھا۔ اس میں کسی ایک بات کا بھی جواب جناب ظفر مہدی صاحب سے بن نہ پڑا اور سات سال کی مسلسل فکرو کاوش کے بعد بھی سوائے چندان مزخرفات

---

[1] انوار التنزیل جلد دوم صفحہ ۸۸ مطبوعہ مصر و مفاتیح الغیب الرازی جلد دوم صفحہ ۴۴۴ مطبوعہ مصر

کے جو متعصب مولویوں کی طرف سے اکثر و بیشتر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی ایک بات بھی لائق اعتناء پیش نہ کر سکے

باب الانتقاد

تعلیمات قرآن اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جسے مولانا اسلم جیراجپوری نے مرتب کرکے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہتے ہیں بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں

قرآن کی تعلیم کا اسلوب زمانۂ دراز سے اس وقت تک یہی چلا آرہا ہے کہ چند مخصوص تفاسیر کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب سمجھائے جاتے ہیں - نہ مدرس خود غور و تامل سے کام لیتا ہے، نہ طلبہ کو اس طرف مایل کیا جاتا ہے گویا قرآن سے پہلے تفاسیر پر ایمان لے آنا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ تفاسیر کا ماخذ بالعموم کتب احادیث ہیں جن میں کثرت سے موضوع روایات پائی جاتی ہیں، اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن سمجھنے کی صحیح اہلیت طلبہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور کورانہ تقلید اُن کی قوت فکر و اجتہاد کو یکسر محو کردیتی ہے

عام طور پر مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہوگیا ہے (جو یقیناً مولویوں ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) کہ قرآن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اور اسلاف جو کچھ بتا گئے ہیں اس سے انحراف کرنا قرآن و رسول سے منحرف ہوجانا ہے

یہ خیال خود قرآنی تعلیم کے منافی ہے، کیونکہ وہاں تو ہر جگہ ہر انسان کو غور و فکر تدبر و تامل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن مولوی کہتا ہے کہ نہیں تفکر و تعقل کا دور گزر چکا اور اب ہمارے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جو کچھ ہمارے اسلاف لکھ گئے ہیں اُن پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آیا جائے

اس تعلیم نے یہ نقصان پہونچایا کہ مسلمانوں میں ذہنی غلامی پوری طرح سرایت کرگئی اور وہ اس دورِ علم و حکمت میں ناکارہ محض ہوکر رہ گئے

مولانا اسلم ملک کے اُن چند روشن خیال مولویوں میں سے ہیں، جو کورانہ تقلید کے مخالف ہیں اور قرآن میں غور و فکر کرنا ہر شخص کا فطری حق خیال کرتے ہیں،

اور اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے - اس جلد میں اللہ اور اس کے صفات، مخلوق، دین، رسالت، کتاب، اور معاد کے متعلق جو کھُلی ہوئی آیات قرآن میں پائی جاتی ہیں ان کو یکجا

کر دیا ہے اور اس اسلوب سے یکجا کیا ہے کہ ایک آیت خود دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے

ہر چند اعظم گڈھ کا قدامت پرست شبلی اسکول جس کی " سیرۃ نبوی " پر مولانا اسلم نے آزادانہ تنقید کرکے اس کے نقائص ظاہر کئے ہیں، اور مولویوں کی دوسری جماعتیں جو اسی کور ذہنیت کی مالک ہیں، مولانا اسلم کے اس اقدام کو پسند نہ کریں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس کے خلاف کافی پروپاگنڈا کریں لیکن مولانا اسلم باور کریں کہ اُن کی اس خدمت کی قدر کرنے والے اب مُلک میں کافی پیدا ہوگئے ہیں اور انھیں اس تالیف کے دوسرے حصّوں کو بھی جلد از جلد مکمل کر دینا چاہیے

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

یہ کتاب نہایت اچھی طباعت وکتابت کے ساتھ ۲۲۸ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور مولانا سے جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی کے پتہ پر دو روپیہ میں مل سکتی ہے

جنسی امراض اور ان کا علاج

یہ کتاب ڈاکٹر کرنل بھولاناتھ آئی۔ ام۔ اس۔ نے لکھی ہے اور تین حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصّہ تعلقات جنسی اور امراض و علاج سے متعلق ہے جسے خود کرنل صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا حصّہ حکیم مظفر حسین صاحب کا مرتب کیا ہے اور اس میں ویدک و یونانی نسخے درج کئے گئے ہیں۔ تیسرا حصّہ برتھ کنٹرول کے لئے وقف ہے۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی مفید ہے اور بہت ایسی معلومات کی حامل ہے جن سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہیے

اس دَور میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ " جنسیات " پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ اس فن کی معلومات عام کر دی جائیں۔ اس لئے مُلک کو کرنل صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اُردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کرکے عوام کو اُن کے سمجھنے کا موقعہ دیا

ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے رسایل کے بعد یہ دوسری مستحسن کوشش ہے۔ جس کی قدر مُلک کو کرنا چاہیے

یہ کتاب تین روپیہ (سے ر) میں کتب خانہ لُطف زندگی اعوان منزل لاہور سے مل سکتی ہے

اصغر گونڈوی کی شاعری

اس کے مؤلف کوئی صاحب سر کوب الہ آبادی ہیں اس تالیف کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ اصغر مطلقاً شعر کہنا نہیں جانتے اور جب ان کو چیلنج دیا گیا کہ وہ کسی صحبت میں سب کے سامنے کسی طرح پر غزل کہیں، وہ جان بچا گئے

ہر چند اس کتاب میں اصغر صاحب کے خلاف و موافق دونوں مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن مؤلف نے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ وہ فن شعر سے بالکل نابلد ہیں

اس نوع کی تالیفات میرے نزدیک سنجیدہ طبائع کو متأثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کا تعلق یکسر ذاتیات سے ہوتا ہے اور دیکھنے والا بہ اوّل نظر خراب رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے

محض یہ امر کہ اصغر صاحب نے چیلنج کو قبول نہیں کیا، اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے، اور ہر سنجیدہ شخص کو وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا جو اصغر صاحب نے اختیار کیا۔ اگر اس کے بجائے اصغر کی شاعری پر تبصرہ کرکے اس کے نقائص کو ظاہر کیا جاتا۔ تو بھی خیر کوئی بات ہوتی، گو ایسی اہم وہ بھی نہیں ـــــ معلوم نہیں اصغر صاحب اپنے شاعر ہونے پر فخر کرتے ہیں یا نہیں، لیکن میرے نزدیک ایک انسان کو سب سے پہلے اپنے انسان ہونے پر فخر کرنا چاہیئے

اگر اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے صرف انسان ہیں اور شاعر نہیں تو بھی ان کے لئے یہی بس ہے اور شاعر نہ ہونا اُن کی عظمت کو کم نہیں کر سکتا

مجھے یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی اور میں سرکوب صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ آیندہ ایسی کوشش سے باز رہیں کیونکہ اصغر کو غیر شاعر ثابت کرنے کے سلسلہ میں اپنے حُسنِ اخلاق کا جو نمونہ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ حد درجہ قابلِ نفرت ہے

یہ کتاب ۸ر میں مہدی علی خاں بُک سیلر چوک الہ آباد سے مل سکتی ہے

بہار کی پھکارن جناب سید فرید جعفری مچھلی شہری کا دوسرا افسانہ ہے جو علیحدہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس کہانی کا مقصود زلزلۂ بہار کی تباہیوں کے متعلق لوگوں میں جذبۂ ہمدردی پیدا کرنا ہے

فرید صاحب نے جس مقصد کے ساتھ یہ تصنیف پیش کی ہے وہ ہر آئینہ قابلِ قدر ہے اور چونکہ اس کی آمدنی زلزلہ فنڈ میں جائے گی اس لئے لوگوں کو قدر کرنی چاہیئے۔ قیمت درج نہیں ہے

ملنے کا پتہ سکرٹری بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی پٹنہ ہے

رسالۂ معلومات "افادیت" میں تجارت یقیناً شامل ہے، لیکن صرف تجارت تو افادیت کا مقصود واحد نہیں ـــــ

اس نظریہ کو سامنے رکھ کر مُلک کے موجودہ رسایل وجرائد پر نگاہ ڈالئے اور فیصلہ کیجئے۔ کہ ان سے انسانی زندگی کا کون سا مفاد متعلق ہے۔ یعنی کیا تجارت کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے ہے ـــــ پھر تجارت تجارت میں بھی فرق ہے۔ امریکن وانگریزی مصنوعات کی مانگ چاہے کتنی ہی کم ہو۔ لیکن ان کی مضبوطی کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ برخلاف اس کے کہ جاپان کا نام آتے ہی جنس کے ناکارہ، ونامضبوط ہونے کی

طرف خود بہ خود خیال منتقل ہو جاتا ہے

بالکل یہی کیفیت ہمارے مُلک کے رسایل کی ہے کہ وہ تجارت بھی کرتے ہیں تو بالکل جاپانی قسم کی کہ چیز بظاہر نہایت خوشنما و ارزاں ہے، لیکن اگر نقش و نگار مٹا دیجئے تو اندر سوائے ردّی کاغذ اور بوسیدہ لکڑی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا

یہ وبا اوّل اوّل پنجاب سے شروع ہوئی۔ اور اب تمام ہندوستان اس میں مبتلا نظر آتا ہے ——

آپ کسی رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے سرورق نہایت خوشنما و رنگین ہوگا، تصویروں کی بھرمار ہوگی۔ غزلیں بھی ہوں گی، فسانے و ڈرامے بھی نظر آئیں گے، ہنسنے ہنسانے والے مضامین بھی ہوں گے، لیکن آپ یہ چاہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو یا کسی ذہنی و دماغی ترقی کی طرف خیال مایل ہو، تو آپ کو سخت مایوس ہونا پڑے گا

معارف اور سچ وغیرہ قدامت پرست مذہبی رسایل کا ذکر نہیں کہ وہ تو کولھو کا بیل ہیں۔ جن کے لئے آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک ہی حلقہ میں چکر لگانا مقسوم ہو چکا ہے اس طرح نہ اُن رسائل کا ذکر ہے جو مذہب کے پردہ میں لغو و مہمل کتابوں کی تجارت کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے دماغ کو سال بھر تک ادنیٰ قسم کا مذہبی لٹریچر سے تباہ کرنے کا معاوضہ بارہ آنے ایک روپیہ سے زیادہ نہیں لیتے، بلکہ افسوس تو اُن لوگوں پر ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال و روشن دماغ کہتے ہیں اور پھر بھی اُن کے سامنے افادیت کا مفہوم ارزاں تجارت کے علاوہ کچھ نہیں ——

پنجاب میں اس وقت بعض رسایل ایک خاص مرتبہ و امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کا عنصر غالب بھی افسانوں اور غزلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، درانحالیکہ ان کے مالک ایسے ہیں جن کو کوئی مادّی فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے رسائل کو اقتصادو سیاست اور معیشت و معاشرت کے اُن مسایل کے لئے وقف کر سکتے ہیں جن کی تعلیم و اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔ البتہ اگر دہلی پنجاب میں شامل سمجھا جائے تو رسالہ جامعہ کو مستثنیٰ سمجھنا پڑے گا، جو واقعی صحیح معنے میں مُلک و قوم کی برمحل خدمت انجام دے رہا ہے

یو۔ پی کے رسایل اس سے زیادہ بدبختی میں مبتلا ہیں کہ اُن کو تجارت کا بھی سلیقہ نہیں اور رُجن و زبیدہ کی تصویریں شایع کرنے کے بعد بھی خریداروں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا سبب یہ نہیں کہ مفید چیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ پہلے رسایل کی ترتیب پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور اب ہر وہ شخص جو ایک بورڈ کی قیمت ادا کر سکتا ہے اڈیٹر بنا ہوا ہے

البتہ اب سے ۸ سال قبل ہمیں لکھنؤ سے اور رسالے صبح اُمید اور معلومات ایسے جاری تھے جو واقعی مفید تھے۔ صبح اُمید کے احیاء کی تو کوئی توقع نہیں، لیکن معلومات پھر جاری ہوا ہے

اس کے اڈیٹر مسٹر عبد الوالی - بی - اے نہایت روشن خیال اور وسیع المطالعہ انسان ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کے سامنے کس قسم کا لٹریچر پیش کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ مارچ و اپریل کے رسالوں میں انھوں نے بعض بین الاقوامی مسایل پر نہایت مفید و جامع مضامین لکھے ہیں اور ایسی صاف و شگفتہ زبان میں کہ پڑھنے والے کے دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا

ہر چند افراد قوم جو ادنیٰ درجہ کا ارزاں لٹریچر اور صرف نقش و رنگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس طرف جلد متوجہ نہ ہوں گے - لیکن عبد الوالی صاحب کو مطمئن رہنا چاہئے ایک وقت آئے گا جب ان کے مساعی کی قدر کی جائے گی - اور اگر یہ نہ ہو تو بھی ان کے اطمینان ضمیر کے لئے یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے پبلک کے ذوق کو خراب کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا

باب المراسلۃ والمناظرۃ

دعوائے مہدویت

(جناب سید محمد مہدی صاحب۔ الہ آباد)

میں شروع سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جو تدریجی انقلاب آپ کے خیالات میں ہوا ہے وہ پوری تفصیل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر اس دوران میں کئی بار آپ کی تحریر نے وہ رنگ اختیار کیا کہ اس کے بعد سوائے اعلانِ مہدویت کے کسی اور منزل کی گنجایش نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور آپ پھر ٹال گئے دو تین سال ہوئے جو ہنگامہ کفر و الحاد کا آپ کے خلاف ہوا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید نگار کی روش بدل جائے گی اور اس طرح میری وہ تمام توقعات ختم ہو جائیں گی جو آپ کی طرف سے میں نے قایم کی تھیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نگار کا مشن بدستور وہی قائم ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس ہنگامہ کے بعد آپ نے جو مضامین لکھے ہیں وہ بہت زیادہ سخت ہیں اور مذہب پر نہایت کاری ضرب لگانے والے ہیں۔ اس لئے صورتیں تمام وہی موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ پنجاب تو اتنے متقد (متنبی) اس وقت تک پیش کر چکے۔ اور ہمارا یو۔پی ایک مہدی آخر الزماں بھی نہ پیدا کر سکے۔ یہ بھی کر دیکھئے، شاید کوئی صورت فلاح و اصلاح کی پیدا ہو سکے

(نگار) آپ کے مشورہ کا شکریہ، لیکن میرے محترم دوست، شاید آپکو معلوم نہیں کہ جو آپ کا منتہائے نظر و خیال ہے، وہ میری پرواز کے لحاظ سے ننگِ پر و بال ہے، آپ کے نزدیک مہدی ہو جانا گویا اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص دعوے و اہتمام درکار ہوتا ہے۔ اور اگر آپ کسی پر طعن کرنا چاہیں تو یہ نام لیکر اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ کاش آپ سمجھ سکتے

کہ انسان مہدی و نبی سے بھی گزر کر خدا بننے کے لئے عالمِ وجود میں آیا ہے اور اگر آپ مجھے مشورہ دینے پر مجبور ہی تھے تو میرے دستِ گستاخ کو دامنِ الوہیت کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتے، عرش و کرسی پر چھا جانے کا ایما فرماتے نہ کہ دعوائے مہدویت جو میرے حوصلہ و عزم کے لحاظ سے کہیں فروتر ہے

مجھے نہیں معلوم کہ آپ دجال و مہدی وغیرہ کے ظہور کے قایل ہیں یا نہیں، لیکن اگر آپ آلِ رسول ہونے کے لحاظ سے واقعی "امام مخفی" کی آمد کے منتظر ہیں تو کیا دیر ہے

بال بکشا دصفیر از شجر طوبےٰ زن

آئیے، اور اس دلِ خانہ خراب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیے۔ آپ کی توقعات تو کسی طرح پوری ہوں "امام منتظر" کے لئے آپ کی یہ اختر شماریاں تو کسی طرح ختم ہونے میں آئیں

میرے عزیز دوست، باور کیجئے کہ آپ حضرات، اخلاق کی جس منزل سے گزر رہے ہیں، وہ میرے نزدیک خدا اور مذہب دونوں کے لئے باعثِ توہین ہے —— اگر خدا اتنی مدت کے بعد بھی انسان بنانے میں کامیاب نہیں اور اس کا بنایا ہوا مذہب ہزاروں سال کی عمر پانے کے بعد بھی ہنوز تکمیل انسانیت کی راہیں متعین نہیں کر سکا تو ایسے خدا و مذہب کو لے کر ہم کیا کریں ——

کتنا اندھیر ہے کہ آپ اس روشن زمانہ میں بھی خدا اور نبی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور خود اپنی جستجو کی طرف سے غافل ہیں۔

سر روحانیاں داری ولے خود را ندیدستی
بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی

دار المصنفین اور سیرۃ نبوی

(جناب عبد الحمید صاحب - حیدر آباد)

کسی گزشتہ پرچے میں آپ نے دار المصنفین سیرت نبوی پر تنقید کی تھی میں نے اس کتاب کو منگا کر دیکھا تو آپ کی باتوں کی حرف بحرف تصدیق کرنی پڑی۔ قرآن تو کہتا ہے قل انما انا بشر مثلکم اور درحقیقت رسول اکرم کی عظمت کا راز یہی خالص بشریت ہے اور اسی قرآنی تعلیم نے مسلمانوں کو صحیح راستے پر قائم رکھا کہ انھوں نے اپنے اتنے بڑے رسول کو عیسائیوں کی طرح خدا نہیں بنایا لیکن یہ سیرت

ان کو خدا بنانا چاہتی ہے اس کی چوتھی جلد کے صفحہ ۸۰ میں ہے کہ رسول اللہ مافوق البشر ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قل لا اقول لکم انی ملک۔ پھر جب، فوق البشر ہیں اور فرشتہ ہونے سے انکار ہے تو سوائے الوہیت کے اور کیا صورت ہوگی۔ اس کے مؤلف کی قرآن دانی کا یہ حال ہے کہ اس میں صفحہ ۲۵ میں آیت ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ کو جو ملائکہ کے متعلق ہے انبیاء کے شان میں قرار دیا ہے صفحہ ۱۳۰ میں آیت وما انزلنا علی قومہ من بعدہ من جند من السماء کا عجیب ترجمہ لکھا ہے کہ ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس پیغام کو دے کر اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اُتاری وہ سمجھتا ہے کہ فوجوں کا کام پیغام لے کر جانا ہے۔ غرض اسی قسم کی قرآن سے ناواقفیت بلکہ عمیق جہالت اس کتاب میں نظر آتی ہے آپ حسب ذیل امور کا جواب ضرور لکھیں

(۱) دار المصنفین کا مالک کون ہے

(۲) اس میں کون کون لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی علمی قابلیتیں کیا کیا ہیں

(۳) اس کو کن کن ریاستوں سے کتنی کتنی امداد ملتی ہے اور آج تک پبلک سے کس قدر چندہ لیا

(۴) کیا آپ کے خیال میں یہ جماعت کتابوں کی تجارتی کمپنی سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتی ہے

(۵) یہ جماعت قدیم الخیال مولویوں کی نمایندہ ہے پھر اس کو کیا ترجیح دیوبند یا دیگر مدارس کے علماء پر حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ امداد کی مستحق ہے اور اس کے پاس وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے

(نگار) آپ نے جس نوع کے اسقام و اغلاط کا ذکر کیا ہے اُن کی سیرۃ نبوی میں کمی نہیں آپ یا کوئی کہاں تک ڈھونڈھے گا۔ اور کب تک سر پیٹے گا —— افسوس ہے کہ تاریخ اسلام میں یہی ایک چیز ایسی تھی جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تھی۔ لیکن مولویوں نے اس کو بھی اس قابل نہ رکھا کہ خود اپنے ہی لوگ دیکھ سکیں، چہ جائیکہ اغیار! سچ تو یہ ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ نبوی سے بدرجہا بہتر بعض مستشرقین مغرب کی وہ تصانیف ہیں۔ جن میں کم از کم دس جگہ تو عقل و انصاف سے کام لیا گیا ہے، یہاں تو شروع ہی سے اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ سوائے مسلمان کے کوئی اور اسے پڑھ نہ سکے۔ اور اگر پڑھے تو محمدؐ کو دیوتا یا علم الاصنام کا کوئی کیرکٹر سمجھ کر خاموش ہو جائے —— پھر تماشہ یہ ہے کہ اس غلو کا نام محبت رسول رکھا جاتا ہے، سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے آپ نے جو اور سوالات کئے ہیں۔ ان کا جواب آپ براہِ راست دار المصنفین ہی سے طلب فرمائیں تو بہتر ہے

باب الاستفسار

کوثر

(جناب لطف الہیٰ صاحب۔ بنگلور)

قرآن میں لفظ کوثر سے کیا مراد ہے کیا واقعی وہ کوئی حوض یا چشمہ ہے جو جنت میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے

(نگار) لفظ کوثر کلام مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے :۔

اِنا اعطینا ک الکوثر یہاں لفظ کوثر بروزن "فوعل" "کثر" سے مشتق ہے اور خیر کثیر کے معنی میں آیا ہے، یعنی ہم نے تجکو بہت سے برکات بخشے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ عام مفسرین نے اس حقیقی معنی کی طرف بالکل اعتنا نہیں کیا اور احادیث پر اعتماد کرکے کسی جگہ یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ کوثر ایک نہر ہے فردوس کی اور کہیں یہ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وہ پانی کا حوض ہے جو میرے لئے مخصوص ہے اور جو معراج کے وقت مجھکو دکھایا گیا

مکی سورتوں میں فردوس کی نہروں کا ذکر اجمال کے ساتھ اور مدنی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے :۔

مثل الجنتہ اللتی وعد المتقون۔ فیھا انھار من ماء غیر آسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ وانھار من خمر لذۃ للشاربین وانھار من عسل مصفی

یعنی ان میں پانی، دودھ، شراب اور شہد کی نہروں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے —— عیسائی اور یہودی روایات میں بھی جنت کی نہروں کا ذکر پایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ وہاں دودھ اور شہد کے علاوہ تیل کی نہر کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں میں تیل کے بجائے پانی ہے

رسول اللہ کی حیات میں تو لفظ کوثر خیر کثیر ہی کے مفہوم میں لیا جاتا تھا لیکن آپ کے بعد وہ چشمۂ فردوس بن کر رہ گیا اور بقول طبری اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے ـــــ پھر یہ بدعت اسی جگہ ختم نہیں ہوگئی بلکہ اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہ میں موتی اور لعل بچھے ہوئے ہیں ـــــ اسی کے ساتھ یہ جغرافی تحقیق بھی پیش کی گئی کہ جنت کی تمام نہریں اسی کوثر کے اندر آکر گرتی ہیں جس کا دوسرا نام "نہر محمد" بھی ہے

قرآن میں جابجا فردوس کی عشرتوں اور جہنم کے مصائب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یقیناً وہ سب بیان تشبیہی و تمثیلی ہے جس کو مادی صورت سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن ہمارے مفسرین نے جنکے لئے موضوع احادیث کی کوئی کمی نہ تھی ان تمام باتوں کو دنیاوی لذت والم کا مفہوم سامنے رکھ کر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑا دفتر "صنمیات" کا مرتب ہوگیا ـــــ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو وہ خود حقیقتاً ان تمام باتوں کو صحیح باور کرتے تھے یا یہ کہ صرف برنائے مصلحت عوام کو ایسا سمجھاتے تھے تاکہ ان میں رغبت و شوق پیدا ہو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ مقصود صرف ترغیب و تشویق تھی بلکہ وہ حقیقتاً جنت و دوزخ کو اسی مفہوم و معنی میں لیتے تھے جو یہود و نصاریٰ یا قدیم ایرانی روایات میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اسرائیلی حکایات بیان کرنے کی ممانعت نہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ تمام وہ قصے کہانیاں جو اُس وقت رائج تھیں اور جن کو وہ لوگ اکثر سنتے رہتے تھے، اسلام میں شامل کر دی گئیں اور موضوع احادیث کے ذریعہ سے ان کی توثیق بھی ہوتی رہی تاکہ لوگوں کو چون وچرا کا موقعہ نہ ملے

قرآن مجید میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم کو بھی جابجا ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی نہایت صاف الفاظ میں ان کو غیر مادی ظاہر کرتے ہوئے ان کا مفہوم قوم کا زوال و عروج بتایا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کلام مجید کو احادیث سے علیحدہ کر کے کبھی سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اور روایات موضوعہ سے ہٹ کر کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ورنہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی

پھر تماشہ یہ ہے کہ یہ واہمہ پرستیاں کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہ تھیں بلکہ تقریباً ہر دور میں پائی جاتی تھیں اور رفتہ رفتہ برابر ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خرافیات کا ایک انبار ہو گیا اور اسلام اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا

اس سے قبل نگار کے صفحات میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم پر کافی بحث کر چکا ہوں اس لئے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں اسے ملاحظہ فرمائیے

لکھنؤ کی ماعری

اے زبانِ لکھنؤ، اے لکھنؤ کی شاعری
اے سراپا تیرا آورد، اے تکلف کی پری

اے تصنع پر فدا، اے صنعتوں کی تاجدار
باغِ آب و رنگ میں کاغذ کے پھولوں کی بہار

کچھ تجھے معلوم ہے تو نے لیا کیونکر جنم
کچھ تجھے معلوم ہے تجھ میں ہوا کیا بیش و کم

یعنی دِلّی جب جمالِ شعر کی دیوانہ تھی
شاعری سے سرزمینِ لکھنؤ بیگانہ تھی،

میں نہیں کہتا کہ اس جا کوئی آبادی نہ تھی
میں نہیں کہتا یہاں دریا نہ تھا، وادی نہ تھی

میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ دولت نہ تھے
میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ حشمت نہ تھے

میں نہیں کہتا کہ انساں اس جگہ ملتے نہ تھے
میں نہیں کہتا گل و غنچہ یہاں کھلتے نہ تھے

مالکِ سیف و قلم تھے صاحبِ ایجاد تھے،
دلبرانِ خوش ادا تھے عاشقِ ناشاد تھے

تھی یہی خاکی زمیں، اور تھا یہی چرخِ کبود
ہاں نہیں تھا، تو نہیں تھا شعر کا اس میں وجود

رمز دانانِ تخیل اس جگہ ملتے نہ تھے،
شعر کی تاثیر سے دل اس جگہ ہلتے نہ تھے

ناگہاں اتنے میں بدلا رنگ فیض آباد کا
لکھنؤ مسکن ہوا ہر صاحبِ ایجاد کا

اس طرف دلّی کی قسمت میں ہوا اک انقلاب
یعنی وہ ہنگامۂ عشرت ہوا ماضی کا خواب

ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرنے لگے اہلِ ہنر
گھر سے نکلے، شہر چھوٹا، خاک اُڑائی در بدر

بینوا کچھ آگئے اس جانب گدائی کے لئے
امن کے جویا تھے دفعِ بینوائی کے لئے

میرزا سودا بھی تھے ان بیکسوں میں میر بھی
جرأت و انشا بھی تھے اور سوز بھی، اور مصحفی

اپنے اپنے رنگ میں کی شعر خوانی اس طرح
طائرانِ خوش نوا گلشن میں چہکیں جس طرح

جب بیاں کرتے تھے وہ فرقت کے حالات یوں
آتے تھے بیساختہ آنکھوں سے سب کے اشکِ خوں

جب وہ کہتے تھے کہ ہم نے یوں گذاری زندگی
بنتی تھی فوراً شبیہِ بے قراری، زندگی

گوشہ گوشہ ہو رہا تھا مستِ صہبائے سخن
بچہ بچہ بن گیا تھا بادہ پیمائے سخن،،

میر کی تخئیل نے دنیا کو حیراں کر دیا، 　 سوز نے اک جوشش دنیا میں نمایاں کر دیا
مصحفی نے سیکھنے والوں کو جو تعلیم دی 　 شعر خوانانِ ادب نے شوق سے تسلیم کی"
وہ ضمیر خوش بیاں، وہ آتشِ رنگیں نوا 　 وہ اسیر نکتہ داں، وہ غافلِ معنی سرا
ایک پر کیا ایسے ایسے سیکڑوں دیوانے تھے 　 شمع گو تھی ایک، لیکن ہر طرف پروانے تھے"
ایک اس کامل نے دنیا بھر کو کامل کر دیا، 　 حلقۂ درس و ادب میں سب کو شامل کر دیا
دینِ شعر و شاعری یکسر مکمل ہو گیا، 　 لکھنؤ جو کچھ نہ تھا دلی سے افضل ہو گیا

دورِ نیرنگِ فلک نے اک نیا دکھلا دیا 　 شاعروں میں یعنی اک ناسخ کو بھی پیدا کیا
کون ناسخ جس نے کر دی شاعری یکسر تباہ 　 شعر کا دفتر کا دفتر کر دیا جس نے سیاہ
کون ناسخ جس کی ہے الفاظ پر نام و نمود 　 کون ناسخ ہے تصنع جس کا سازِ ہست و بود
جس نے لفظوں سے بنایا اک گھروندا شعر کا، 　 جس نے پائے خامہ سے میدان روندا شعر کا،
جس نے ایہام و تناسب کو بنایا راہ بر، 　 جس نے تضیعِ ہنر کا نام رکھا تھا ہنر،
جس کو آتا ہی نہ تھا ہر گز تنافر کا خیال 　 تھا نمایاں جس کے شعروں میں سراسر ابتذال
چغد کی آواز کو سمجھا جو آوازِ ہزار، 　 جس کا مرغِ دل تھا در وانے کی بلی کا شکار
الغرض بگڑا شاعری کا اس کی سعی تام سے 　 نفرت آئی اہلِ دل کو شاعری کے نام سے
ہو گیا آخر اسی اک رنگ پر جب اجتماع 　 آتش اور آتش کے شاگردوں نے بھی کی اتباع
انتہا یہ ہے کہ پیرو ہو گئے اس کے انیس 　 جیسے وہ تھے ہو گئے ویسے ہی پھر ان کے جلیس
وہ انیس خوش بیاں جن کا جہاں میں نام ہے 　 شاعری جن کی جہاں کے واسطے پیغام ہے
شاعری سے گو نہیں تھا ان کو کوئی واسطہ، 　 کیونکہ داخل شعر میں ہر گز نہیں ہے مرثیہ
اس میں جو آہ و بکا ہے شعر میں داخل نہیں 　 شعر ہے ظاہر میں لیکن شعر میں شامل نہیں
اور اگر ہم مان لیں اس کو کہ ہے وہ شاعری 　 پھر بھی وہ رنگِ تغزل کی نہیں جلوہ گری
یہ مناظر صبح کے، یہ شامِ رنگیں کا بیاں 　 اور یہ گھوڑے کی روانی صورتِ برقِ تپاں
تیزیِ شمشیرِ براں، صورتِ جوشش وغا 　 ہونے کو سب کچھ ہیں، لیکن ہیں تغزل سے جدا
وہ تعشق، وہ صبا، وہ رند، وہ خوشگو امیر 　 سب کے سب تھے ایک ہی دامِ تعلق میں اسیر
شعر کہنے کو تو لاکھوں ہیں مگر کچھ بھی نہیں 　 نالۂ بیکار لاکھوں ہیں اثر کچھ بھی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے ہے دامانِ سنبل تار تار — ایک کمسن قاتلوں میں ہو گیا جا کر شکار
ایک نے نوچا جنوں میں جا کے دامانِ سحر — ایک تربت پر ہوا مجنوں کی جا کر نوحہ گر
ایک نے ڈھونڈی کمر لیکن کہیں پائی نہیں — ایک مفلس ہو گیا ہے گھر میں اک پائی نہیں
ایک کے ہاتھوں سے چھوٹا توسنِ عمرِ رواں — دوسرے نے نقدِ جاں دے کر گیا سوداگراں
ایک نے دشتِ جنوں میں خاک اڑائی عمر بھر — ایک نے سیلابِ گریہ سے بہایا اپنا گھر
قصہ کوتہ رنگِ دنیا بھر کا یکساں ہی رہا — شعر کا دفتر پریشاں تھا پریشاں ہی رہا
رفتہ رفتہ آ گیا دنیا میں پھر دورِ صفیؔ — اُن کی شہرت مٹ گئی اور ان کی اب شہرت ہوئی
تھے معاصر اُنکے مرزا ثاقبؔ و آبرؔ و بہارؔ — فاضل و ثروتؔ، عزیزؔ نکتہ دانِ نامدار
باہمی کرتے تھے مل مل کر یہ احیائے سخن — محفلوں میں شعر کی دیتے رہے دادِ سخن
اوّل اوّل ان کا بھی لیکن قدیمی رنگ تھا — لکھنؤ کا بچہ بچہ جس کے اوپر دنگ تھا
نکتہ دانوں کے لئے وہ ایک سیدھی راہ تھی — جس میں کچھ کچھ آہ شامل اور کچھ کچھ واہ تھی
تھی وہی پھر بار دُور از عقل تشبیہات کی — تھی وہی گیسوئے جاناں میں سیاہی رات کی
تھا وہی بادام کی صورت میں آنکھوں کا ظہور — تھا وہی عارض کی رنگینی میں پنہاں نورِ طور
رفتہ رفتہ جب خرابی اس کی دکھلائی گئی — متفق ہو کر یہ اک تجویز ٹھہرائی گئی
چاہئے اب منعقد کرنا ہمیں اک انجمن — جس میں سب آپس کے شامل ہو کے دیں دادِ سخن
اب قدیمی رنگ میں لازم ہے کچھ قطع و برید — اب پرانے غمزوں کے آخر ہیں کب تک شہید
رنگِ ناسخؔ کا نہیں ہے آجکل کچھ دلنشیں — جو پرانے بت ہیں وہ قابل پرستش کے نہیں
جادۂ غالبؔ پہ رکھنا چاہیئے اب ہم کو قدم — اس سے ممکن ہے کہ پھر دنیا میں ہوں مشہور ہم
الغرض قائم ہوئی اس وقت بعدِ سعیِ تام — انجمن شعر و سخن کی جس کا تھا معیار نام
اک طرف ناطقؔ، صفیؔ، اور اک طرف محشرؔ عزیزؔ — اک طرف ابرؔ و بہارؔ و ثاقبؔ والا تمیز
اسمیں ثروتؔ بھی تھے، عالم بھی تھے اور فاضل بھی تھے — ماسوا ان ہستیوں کے اور اہلِ دل بھی تھے
مل کے ان سب نے کیا تبدیل رنگِ شاعری — یعنی ٹھہری مرثیہ کے ساتھ جنگِ شاعری
جب نہ ان سے ہو سکے مضمون غالبؔ سے بہم — آخرش سب نے اٹھایا مل کے نوحہ پر قلم
جانکنی کے سب کے سب ساماں بہم ہونے لگے — رفتہ رفتہ موت کے مضموں رقم ہونے لگے
ایک کی اینٹھی رگیں یعنی تشنج ہو گیا — ایک کا منہ بھر بھرایا اور تہیج ہو گیا

ایک کو برقانِ اصفر کی شکایت ہوگئی
ایک روئے اسقدر شدت سے رقت ہوگئی
اُس نے گورستاں میں مُردوں سے کیا جاکر کلام
موت کی ہچکی سے آیا دوست کا اس کو پیام
الغرض اس وقت سے یہ رنگ جاری ہوگیا
خون بن بن کر رگ و پے میں یہ ساری ہوگیا
آجتک سب اہل دل ہیں اس بلا میں مبتلا
شاعری کا واہ کیا اچھا ملا ان کو صلا
وہ سراجِ نکتہ داں، اور وہ قدیرِ ذی ہنر
آرزو و منظر و آشفتہ، دلاگر،
سب اسیر رنگ و بوئے باغ پیشینہ ہوئے
سب قتیلِ خنجرِ معشوقِ دیرینہ ہوئے
آجتک ان کا وہی ہے تار و پود شاعری
شاعری کیوں کہئے اس کو بلکہ کہئے "ماعری"

ہوش (ملیح آبادی)

صرف پچپن روپیہ

یا

پانچ روپیہ ماہوار

میرے والد کا حال ہی میں انتقال ہوگیا ہے اور میں مجبور ہوں کہ کسب معاش کے لئے خود ہاتھ پاؤں ہلاؤں ــــــ میں نے الہ آباد کے زنانہ نارمل اسکول میں داخلہ کا انتظام کرلیا ہے جس کا سشن یکم جولائی سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ مہینے میں ختم ہوجاتا ہے

میں اپنے بے شمار بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کرتی ہوں کہ یا تو گیارہ ماہ کے لئے یک مشت ۵۵ کی امداد فرمادیں یا پانچ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مرحمت فرمادیں

میں وعدہ کرتی ہوں کہ ملازمت کے بعد جس کا ملنا یقینی ہے۔ بہت جلد اس رقم کو واپس کردوں گی

الف۔ جیم۔ ذریعۂ دفتر نگار۔ لکھنؤ

کلام اختر

ہیں وہی صبر آزما بے سرو سامانیاں
مسٹ نہ سکیں عمر بھر میری پریشانیاں

طائرِ مجروح ہوں، میرے لئے وقف ہیں
روح کی بیچینیاں، دل کی پرافشانیاں

نزع کی طاری ہے گو مستقل اک کیفیت
سانس نہیں ٹوٹتا، اُف رے گرانجانیاں

درد دوا ہوگیا عشق میں پایانِ کار
راز سکوں بنگئیں، غم کی فراوانیاں

میری نظر میں نہاں روح کی افسردگی
میری جبیں پر عیاں قلب کی ویرانیاں

کاش کبھی پاسکیں رازِ مئے بیخودی
عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں

ڈوب چلی نبضِ دل، درد نہ کم ہو سکا
آج بھی اشکوں کی ہیں ویسی ہی طغیانیاں

دل ہے ترا آئینہ، دل سے نگاہوں کو ربط
تیری تمنا کا راز ہیں مری حیرانیاں

اختر ناکام ہے اور وہی، ہمت شکن
درد کی جانکاہیاں، غم کی فراوانیاں

میری مشکل نہ ہوئی دہر میں آساں کوئی
نہ ملا آہ، مرے درد کا درماں کوئی

سوچتا ہوں کہ بایں غفلت و مجبوری و یاس
زندگی ہے مری یا خوابِ پریشاں کوئی

اور کس کام کے ہیں قلب و جگر کے ٹکڑے
زیبِ داماں ہو کوئی، زینتِ مژگاں کوئی

جان کیوں تن سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہے
عیشِ سرمد تو نہیں، عمرِ گریزاں کوئی

لاکھ لبریزِ مئے رنگ ہو مینائے بہار!
دل میں بجھتا ہے شرارِ غمِ پنہاں کوئی

ٹوٹتے ہیں کہیں بے مے بھی حجاباتِ نظر
مل چکا شیخ! تجھے رُتبۂ عرفاں کوئی

الاماں سوزِ محبت کہ یہ عالم کب تک!
جیسے ہو دل میں نہاں شعلۂ لرزاں کوئی

وقت پہ آنہ سکے، اور جب آئے نہ رکے
زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی

میں رہا صرفِ شبِ وادیٔ وحشت اختر
میرے عالم میں نہ تھی صبحِ گلستاں کوئی

اختر (حیدرآباد دکن)

اشک بیتاب

جب پسِ کہسار چھپ جاتا ہے مہر تیز گام — اور سنہری بال بکھرائے ہوئے آتی ہے شام
چھیڑتی ہے جب الم کے گیت جوئے خوشخرام — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب سرورِ خواب میں مدہوش ہو جاتا ہے دہر — جب ردائے سیم کے دامن میں سو جاتا ہے دہر
جب سکوت و خامشی کی لے میں کھو جاتا ہو دہر — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

چاندنی میں گونجتے ہیں جب حدی خوانوں کے گیت — رات کے یا آخری حصے میں دہقانوں کے گیت
بیخودی میں جبکہ سنتا ہوں یہ دیوانوں کے گیت — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب فضائے آسماں پر گھر کے آتے ہیں سحاب — بجلیوں کی کوند میں ہوتا ہے بیہم اضطراب
یاد آتے ہو مجھے تم اور وہ عہدِ شباب — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

آم کا وہ پیڑ جو ہے برلبِ آبِ رواں — بچپنے میں کھیلتے رہتے تھے پہروں تک جہاں
رات کو جب چاندنی میں جا نکلتا ہوں وہاں — آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

شیدا

صدائے دل

مآلِ عشق کی ناکامیوں میں محو ہوں گم ہوں کہ میں سازِ شکستِ آرزو کا اک ترنم ہوں
مجھے اب قید و بندِ زندگی سے واسطہ کیا ہے
ہوئی مدت کہ اپنی روح سے محوِ تکلم ہوں

حجابِ تیرگی کچھ اس طرح اٹھا مرے دل سے اُجالا دفعتاً پیدا ہو جیسے ماہِ کامل سے
حقیقت کی تجلی نے کیا ہے روح کو روشن مری ہستی نظر آتی ہے آگے حدِ باطل سے
فریبِ زندگی سے اب مجھے نسبت نہیں کوئی
نکل آیا ہوں آگے ہستیٔ فانی کی منزل سے

حقیقت کی طلب کرتی رہی بیحد حزیں مجھکو ملی تسکیں کہیں مجھکو، نہ چین آیا کہیں مجھکو
حیات و موت کی تھی کشمکش اور روح گریاں تھی حقیقت خود ہی آئی دیکھ کر اندوہگیں مجھکو
اب اپنی روح سے اکثر کیا کرتا ہوں یوں باتیں
کہ جیسے ہستیٔ فانی سے مطلب ہی نہیں مجھکو

نبی احمد (بریلوی)

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں
تجلّی نظر آشنا چاہتا ہوں تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں
ابھی خام ہے کچھ، مذاقِ تمنا کرمہائے صبر آزما چاہتا ہوں
مجھے کوئی کافر مسلمان کردے مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں
دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کسکو بتادے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں
خریدار ہے کون دنیا میں دل کا کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں
خطا پر ندامت خطا در خطا ہے خطا کرکے دادِ خطا چاہتا ہوں
کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں
ہوس چاہتی ہے تجلّیٔ عریاں مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں
جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھادے وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں
تمنائے دل اور محدود! اکوکبؔ
مقامِ وراء الورا چاہتا ہوں

کوکب (شاہجہانپوری)

آیندہ جنوری ۱۹۳۵ء کے رسالۂ نگار کیلئے

مخصوص علمی و ادبی دعوت

مکرمی۔ تسلیم۔

یہ حقیقت غالباً جناب سے مخفی نہ ہوگی کہ گزشتہ چند سال سے نگار کا جنوری نمبر کسی نہ کسی مخصوص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے چنانچہ اسوقت تک مومن نمبر ظفر نمبر اور غالب نمبر شایع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار کو میں لکھنؤ اور دلّی کی شاعری کی تنقید کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں۔ اور متمنی ہوں کہ آپ بھی تھوڑا سا وقت نکالکر اس خدمت میں میری اعانت فرمائیے۔ اور اگر زحمت نہ ہو تو ابھی سے مطلع فرما دیجئے۔ کہ آپ کس موضوع پر اپنا مقالہ عنایت فرمائیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ اپنے افکار عالیہ کے ہمراہ اپنا فوٹو دیا بلاک اگر ہو تو وہ) مرحمت فرمائیں تاکہ مقالہ کے ساتھ وہ بھی شایع کیا جائے۔ آپ کے ایماء کے بعد آپ کا اسم گرامی عام اطلاع کے لئے نگار میں شایع کر دیا جائے گا ذیل میں مختلف مباحث کی فہرست آپ کو نظر آئے گی، لیکن اگر موضوع سے متعلق آپ کسی اور مسئلہ پر تحریر فرمانا چاہیں تو آپ کو اختیار کلی حاصل ہے، لیکن بہتر ہو اگر عنوان سے آپ آگاہ فرما دیں — یہ ضروری نہیں کہ مضمون طویل ہو، لیکن جتنا ہو آپکے بہترین لمحات فرصت کا نتیجۂ فکر ہونا چاہیے

خاکسار

نیاز فتحپوری

عنوانات جن پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مورخانہ نظر اور انکی خصوصیات
(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ
(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
(۱۱) دکن اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات
(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ، نعت میں
(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری
(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں
(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں
(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جسنے دہلی کا تتبع کیا
(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا
(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنھوں نے ملک قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
(۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے اور کیوں
(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے ؟ اور کیوں
(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا ؟
(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے ؟ اگر ہے تو کیا
(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے ؟ اگر ہے تو کیا
(۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں ؟
(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنھوں نے قدامت کو ترک کرکے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو
(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا
(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ :- لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہوکر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہی
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ سے
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۴ء	شمارہ ۱

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۱	جولائی ۳۵ء	جلد ۲۶

ملاحظات

مُسلمانوں کا یوم النبی

مسلمانوں میں ۱۲؎ ربیع الاول کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوؤں کے یہاں جنم اشٹمی کو، یعنی جس طرح ان کے یہاں کرشن جی کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کی جماعت ولادت نبوی پر جذباتِ مسرت ظاہر کرتی ہے

لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جنم اشٹمی کے منائے جانے پر ہندوؤں کے اکابر کی طرف سے نہ کوئی تحریک کی جاتی ہے نہ اخباروں میں نشر و اعلان ہوتا ہے، اور یوم النبی کے لئے علماء اسلام کو کافی پروپاگنڈا کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ مسلمان اس تقریب کی پذیرائی میں زیادہ جوش و ولولہ سے کام لیں، چنانچہ امسال تمام دنیائے اسلامی

؎ حالانکہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲ ربیع الاول۔ دسمبر ۲۲ء کے نگار میں ایک مفصل مضمون اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے من شاء فلیرجع الیہ

کے علما کی طرف سے اعلان شایع کیا گیا اور ہو سکتا ہے کہ اس اعلان کی بنا پر واقعی امسال زیادہ نمود و نمایش سے اس تقریب کو منایا گیا ہو ـــــ لیکن آج جبکہ اس مخصوص دن اور مخصوص تاریخ کو گزرے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا، دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے اثرات اب تک کچھ باقی ہیں اور کیا مسلمانوں کی عملی زندگی میں کوئی قابل ذکر تغیر پیدا کرنے میں اس کو کامیابی ہوئی ہے ؟

یوم النبی کی تحریک مسلمانوں میں کوئی قدیم تحریک نہیں کیونکہ اس کا پتہ قرونِ اولیٰ میں کہیں نہیں چلتا۔ خاص کر لفظ "یوم النبی" تو بالکل مغربی تتبع میں اختیار کیا گیا ہے جو ترجمہ ہے (Prophet day) کا ورنہ اب سے کچھ زمانہ قبل اس کو "ذکر میلاد" "میلاد النبی" اور عوام میں "مولود شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ـ لیکن یہ تحریک قدیم ہو یا جدید، اس کا نام "یوم النبی" قرار دیا جائے یا کچھ اور اس کے مفید ہونے سے بہرحال انکار نہیں ہو سکتا اگر واقعی اس سے ہماری عملی زندگی میں کوئی تغیر پیدا ہو، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا کبھی اس سے کوئی فائدہ اس قسم کا مترتب ہوا ہے اور کیا آیندہ کوئی توقع اس کی کی جاتی ہے ـــــ مجھے اس باب میں سخت مایوسی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر مسلمان بجائے سالانہ احتفال و اجتماع کے ہر مہینے اور ہر ہفتہ یوم النبی منائیں تو بھی کوئی فائدہ ان کو نہیں پہونچ سکتا۔ بلکہ جس اسلوب سے اس تقریب میں اظہار جذبات کیا جاتا ہے وہ بجائے مفید ہونے کے اور نقصان رساں ہے

کسی مذہب میں تہواروں یا خاص خاص تقریبوں کا پیدا ہو جانا، حقیقتاً اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ مذہب اپنے دورِ انحطاط سے گزر رہا ہے اور اب اس کے پاس سرمایۂ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یا اپنی گزشتہ تاریخ عروج کے بعض واقعات کو کبھی کبھی یاد کر لیا کرے۔ آپ کسی مذہب و قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی زمانۂ عروج میں نہ کوئی خاص تہوار تھا نہ کسی واقعہ کی یاد میں کوئی تقریب منائی جاتی تھی، لیکن جوں جوں اس میں انحطاط پیدا ہوا اس قسم کے مراسم بڑھتے گئے، یہاں تک کہ وہ مجموعۂ روایات سے زیادہ کوئی چیز نہ رہ گیا اور صرف انھیں روایات کا زبانی تحفظ اصل مذہب قرار پایا ـــــ جب کوئی قوم اوّل اوّل کسی مقصد کو لے کر پورے جوش کے ساتھ اٹھتی ہے تو اس کے سامنے سوائے اقدام و عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی فتوحات انتہا کو پہونچ گئیں، یا یہ کہ منزل مقصود اس کو حاصل ہوگئی تو اس کے قوا میں اضمحلال، عزائم میں کمزوری اور عملی زندگی میں ضعف پیدا ہونے لگتا ہے، حتےٰ کہ چند دن تک وہ اسی سطح پر قائم رہنے کے بعد پھر پستی کی طرف گرنے لگتی ہے اور تن آسانیوں کی عادت اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ کس طرح تیزی سے مائل بہ انحطاط ہے ـــــ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لئے زوال ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس حالت کو کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً کمال ہے بھی یا نہیں ـــ دنیا میں ترقی و عروج کی انتہا نہیں، تکمیل و ترقی کی راہیں

غیر محدود ہیں، اس لئے کمال کی تعیین محال ہے، اور زوال کمال کے لئے لازم نہیں ہے بلکہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کمال حاصل کر لیا یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انحطاط نام ہے تعیین منزل کا اور اس منزل تک پہونچ کر یہ سمجھنے کا کہ اب آگے ہم کو بڑھنا نہیں، لیکن اگر کوئی مقصود متعین نہ کیا جائے یا یہ کہ ہر مدعا کی تکمیل کے بعد، دوسرا مدعا پیش نظر رکھا جائے تو کبھی زوال ہو ہی نہیں سکتا

مسلمانوں کی تاریخ میں خیر عہد رسالت کو تو چھوڑئیے کہ وہ تو بالکل ابتدار کا رتھی اور اصولاً اس وقت نہ تعیین منزل کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا، نہ تکمیل مدعا کا، لیکن اس کے بعد جب فتوحات وسیع ہوئیں، سلطنت کے حدود میں وسعت پیدا ہوئی، تو کیا ہوا ؟ عہد عباسیہ کو عربوں کی فتوحات کا دور زریں کہا جاتا ہے، لیکن کیا اس دور زریں کے معنے یہ نہ تھے کہ جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکے اور کیا اس احساس میں ان کا زوال پنہاں نہ تھا

اسی طرح ترکوں کو لیجئے کہ اُن کا انتہائی نقطۂ نظر قسطنطنیہ کو فتح کر لینا تھا اور جب محمد خاں ثانی اس میں کامیاب ہو گیا تو اُن کی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب اسی جگہ رُک گیا اور اسی دن سے ان کا زوال شروع ہو گیا، ورنہ اگر وہ کسی منزل کی تعیین نہ کرتے اور اپنے اقدامات کو برابر اسی طرح جاری رکھتے تو آج سارا یورپ مسلمان ہوتا۔ اور سرزمین مغرب کا کوئی حصہ ایسا نہ بچا تا جہاں ہلالی پرچم نہ لہرا رہا ہوتا

الغرض قومیں جب آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ٹھیر جاتی ہیں، اس وقت سے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ انحطاط کے اس دور میں پہونچ جاتی ہیں کہ خود ان میں کوئی قوت عمل باقی نہیں رہ جاتی اور نکبت و ذلت کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فخریہ بیان کرنے لگتے ہیں اور اسی کو ذریعۂ ترقی سمجھتے ہیں

یہ ہے حقیقت قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کی اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے ماتحت مسلمانوں میں بھی بسلسلۂ "یوم النبی" اظہار مسرت کیا جاتا ہے

اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ کی ذات گرامی جن صفات کی حامل تھی وہ کبھی فراموش کئے جانے کے قابل نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اگر آج تمام مسلمان دنیا سے محو ہو جائیں تو بھی ان کا ذکر کیا جائے گا اور تاریخ کے صفحات اُن کے اعتراف سے لبریز نظر آئیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس اصول و انداز پر اُن کے یوم ولادت کی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے وہ واقعی ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا ہے

یہ تقریب آج نہیں بلکہ صدہا سال قبل اس وقت سے منائی جا رہی ہے جب مسلمانوں کی حکومت تھی، لیکن کیا ذکر "میلاد النبی" کے جلسے اس قوم کو انحطاط سے روک سکے اور اب جبکہ زوال کی انتہا ہو چکی ہے کیا یہ پھر اسے اُبھارنے کے ضامن ہو سکتے ہیں ؟

تمام عالم اسلامی کے علماء کرام کی طرف سے اعلان شایع ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "یوم النبی" حد درجہ جوش واہتمام سے منانا چاہیئے، چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں اونچے اونچے دروازے نصب کئے جاتے ہیں، رنگین جھنڈیوں سے درودیوار کی آرایش ہوتی ہے، بجلی کے قمقمے لٹکائے جاتے ہیں، شیرینی کا انتظام ہوتا ہے، نوجوانوں کے گروہ ہاتھوں میں جھنڈے لئے، سینے پر ریشمی کپڑوں کے بیج لگائے اللہ اکبر کے پُرزور نعرے مارتے ہوئے نکلتے ہیں، اور رات کو جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکتا ہے تو شیرینی لے لے کر لوگ اپنے گھر واپس آتے ہیں، اس حال میں کہ رات بھر وہ اس جنت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کا ذکر واعظ نے کیا تھا اور صبح کو جب بیدار ہوتے ہیں تو کاہلی و بیکاری کا وہی جمود ان پر طاری ہوتا ہے جو اس سے قبل طاری تھا اور کسی قسم کا کوئی اضافہ اپنی ہمت و جرأت میں نہیں پاتے

اسلاف پرستی یقیناً اچھی چیز ہے اور قوموں کو اُبھارنے کے لئے یہ ذریعہ بلاشک کارآمد ثابت ہوسکتا ہے لیکن اسلاف پرستی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سکندر کے مرنے کے بعد محض اس کی یاد سلطنت روما کو تباہی سے بچا سکی، کیا سلطان محمد ثانی اور سلیمان اعظم کے کارناموں کا ذکر سلطنت ترکی کو زوال سے بچا سکا، کیا عبدالرحمان کی جرأت و ہمت کی داستانیں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو زوال سے روک سکیں ——— اکاسرۂ عجم کی شوکت و جبروت کا ذکر ہر ایرانی کے لب پر تھا لیکن ایران تباہ ہوکر رہا، رام و کرشن کے ولولہ و عزم کی کہانیاں ہمیشہ سے ہندؤں کو یاد تھیں لیکن مسلمانوں نے ان کو مغلوب کرکے چھوڑا، سطوتِ مغلیہ کے آوازہ سے فضا گونج ہی رہی تھی کہ انگریزوں نے آکر تختہ کا تختہ اُلٹ دیا ——— پھر یاد رکھو کہ تم ہر سال کیا معنی اگر ہر مہینے "یوم النبی" مناکر رسول اللہ کی ولادت پر اظہارِ مسرت کرتے رہو گے تو بھی مٹنے سے نہیں بچ سکتے، کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کا ہمیشہ ایک ہی فلسفہ رہا ہے اور جب تک کوئی ہنوز وہی بات نہ ہوجائے محض ان کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی ——— پھر یہ وقت رستم و سہراب کی داستانیں دہرانے کا نہیں بلکہ رضا شاہ کے پیدا کرنے کا ہے، باب عالی کی گزشتہ سطوت و جبروت بیان کرنے کا نہیں، بلکہ مصطفےٰ کمال کے وجود میں لانے کا ہے، اور اگر روس کی لعنتِ استبداد کو دُور کرنے کے لئے لینن ہی کی ضرورت تھی، اگر اطالیہ کو حضیض سے نکال کر بلندی پر لانے کے لئے کوئی میسولینی ہی درکار تھا، اور جرمنی میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے ہٹلر کا پیدا ہونا لازم تھا، تو یاد رکھو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی رُوح پھونکنے کے لئے کسی نہ کسی خالد و عمر جیسے دملی کا ظہور میں آنا ضروری ہے، اور وہ نہ کسی احتفال و اجتماع سے پیدا ہوسکتے ہیں، نہ وعظ و تبلیغ سے، بلکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے سے، آگ کے اندر کود جانے سے اور ہتیلی پر سر لے کر نکل پڑنے سے

رسول کی ولادت و سیرۃ کا ذکر کیا جاتا ہے ——— اس رسول کا جس کی زندگی یکسر عمل، سراپا ایثار و قربانی تھی اس ہستی کا جس میں سوائے صداقت و خلوص کے نمود و نمایش کا کہیں پتہ نہ تھا، اس ذات گرامی کا جو صرف ہمدردی

ومحبت کے لئے وضع ہوئی تھی - لیکن حال یہ ہے کہ سوائے قول کے عمل کا کہیں نام نہیں، بجز نمود و نمائش کے صداقت کا کوسوں پتہ نہیں، سوائے خود غرضی و طمع نفس کے ایثار و قربانی سے کوئی واسطہ نہیں —— یہ پھر خدارا کوئی بتائے کہ یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس قسم کی یادگار ہے، یہ کس انداز کا اجتماع قومی ہے اور ہمارے علمارکرام، ہمارے قائدین عظام اس سے کس فائدہ کی توقع رکھتے ہیں

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کرسکتے ہیں، اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے، اگر اس کی مقدس تعلیم کا نشر و اعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہوسکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علو کو جھنڈے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کرسکتے ہیں، لہذا اگر اس کی صداقت عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود و نمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لہو و لعب کا مظاہرہ نامناسب نہیں، لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ کی توہین ہے، اسلام کی تذلیل ہے اور مسلمانوں کے اندر اک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہوسکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں

یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا فقدان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے ب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علمائے کرام ذکرِ میلاد فرماتے ہیں، سو اس کا خیال اس سے بھی بدتر ہے - کیونکہ انکا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ایک فوق الفطرت ہستی کی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے —— وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال ل بل سے خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے، وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل اور صنمکدوں کے بت سرنگوں ہوجاتے ہیں، وہ ابھی عالمِ طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کرکے آلائش سے پاک کر دیتا ہے، وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگریزے اس کی شہادت دیتے ہیں، جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا، اور اگر کبھی جوشِ نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں، پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکرِ میلاد کے سلسلہ میں قولاً و عملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں اس پر ہزاروں روپیہ ضایع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم و شعائر کی طرف متوجہ کرکے ان کے قوائے عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے

اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابر اسلام کو توجہ کرنا ہے، وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے، جو نمازیں پڑھنے سے دور ہوسکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بلکہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو اُن کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے — اور یہ نہایت آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علماء و اکابر

صرف زکوٰۃ کے مسئلہ پر توجہ کرکے ایک قومی بیت المال قائم کرسکیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ "یوم النبی" کی تقریب میں مقالاً مزخرفات کا ایک طومار اور عملاً لہو ولعب کا دلچسپ پروگرام توضرور پیش کرسکیں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے

اس وقت مسلمانوں کی ۸ کروڑ آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہوکر قومی اداروں میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور فقر و فاقہ و بیکاری کی وہ لعنت جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے کتنی آسانی سے دور ہوسکتی ہے

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں، ہر قصبہ، اور شہر کے ہر ہر محلہ میں منائی جاتی ہے اور اس لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لئے نہیں ہوسکتا۔ ہر محلہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنادی جائے جو ماہوار وصولی زکوٰۃ کے ذمہ دار ہوں اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو۔ اسی طرح شہروں کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبوں کی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہوگا —— اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا۔ ہر محلہ کے مستحقین امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ و امداد کے اختیارات دیئے جائیں

الغرض یہ اور اسی طرح کے بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہوسکتی ہیں جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کرکے لاکھوں بیکار مسلمانوں کو کام میں لگایا جاسکتا ہے۔ مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علماء کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ درد سر مول لیں، جبکہ ان کی زندگی یوں ہی لطف و مسرت سے بسر ہو رہی ہے

سُنا تھا کہ صوبۂ بہار میں امارت شرعیہ قائم ہوئی تھی اور غالباً اب بھی باوجود زلزلہ کی تباہ کاریوں کے صرف اس لئے باقی ہے کہ مسجدوں کی تعمیر و مرمت کے لئے چندہ فراہم کرسکے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ سوائے مسائل شرعیہ بتانے اور جواز و عدم جواز کا فتویٰ دینے کے کوئی کام اس نے اصلاح قومی کا کیا ہو، یا مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر کبھی غور کرنے کی توفیق اس کو ہوئی ہو۔ پھر جب ہمارے یہاں کے اکابر مذہب کی ذہنیت کا یہ عالم ہو اور ان کا فرض اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو کہ جب کنوئیں میں چوہا یا بلی گر جائے تو وہ یہ بتادیں کہ کتنے

ڈول پانی نکالنے سے وہ پاک ہوجاتا ہے، تو اپنے مستقبل کے متعلق خاک کوئی توقع قائم ہوسکتی ہے اور پامال و فنا ہونے سے ہم کو کون سی قوت محفوظ رکھ سکتی ہے

جنوری ۱۹۴۲ء کے نگار کی طیاریاں ابھی سے ہو رہی ہیں۔ یعنی ملک کے ارباب قلم کو ابھی سے متوجہ کیا جارہا ہے اور اس وقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں اُن کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً ہمیں اپنے مساعی کے نامشکور رہنے کی شکایت نہ کرنا پڑے۔ اور ہم اپنے ارادہ کے مطابق اس کو ہر نوع بہترین تکمیل کے ساتھ پیش کر سکیں

دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری کے متعلق اس سے قبل بارہا لوگوں نے لکھا ہے، لیکن یکجائی طور پر اتنا بہتر مجموعۂ تنقید غالباً آپ کو کہیں نہ مل سکے گا۔ اور نہ اتنے متنوع مباحث پر اس سلسلہ میں رائے زنی کی گئی ہو

ہم چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر نگار کا یہ نمبر "لفظ آخریں" کی حیثیت سے شایع ہو، لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صرف اسی وقت کامیابی ہوسکتی ہے۔ جب ملک کے تمام قابل ذکر اہل قلم، مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تمام مسائل پر روشنی ڈالیں۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ ہم ان کو اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوں گے

ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا، اور نہ ہوسکتا ہے کیونکہ اگر بہتر مضامین ہم کو موصول ہوتے رہے تو ہم صفحات بڑھاتے جائیں گے خواہ اس کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ جائے

یہ خبر غالباً مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ہمارے عزیز دوست مجنوں گورکھپوری نے ایوان اشاعت میں پھر رُوح پھونکی ہے اور کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ایوان کا اجراء بھی غالباً بہت جلد ہونے والا ہے

اس مرتبہ انھوں نے اپنے یہاں کے قواعد میں کچھ تبدیلیاں کردی ہیں تاکہ لوگ آسانی سے مستفید ہوسکیں اس لئے ہمیں امید ہے کہ اہل ذوق جناب مجنوں سے جدید قواعد طلب کرکے اس ادارۂ علم و ادب کی ہر ممکن خدمت انجام دیں گے

ترجمہ کے متعلق چند اصولی باتیں

چونکہ اُردو زبان ابھی تک دَورِ تراجم سے نہیں گزری ہے، اس لئے یہ بحث کبھی نہ کبھی ضرور دیکھنے میں آجاتی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کا ترجمہ کس اصول سے کیا جائے ۔۔۔۔ کوئی کہتا ہے کہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور کوئی عربی و فارسی سے مدد لینا ضروری سمجھتا ہے ۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ جس حد تک صرف معمولی قصے کہانی کی کتابوں کا تعلق ہے۔ آپ بہ آسانی ہندی بھاشا سے کام نکال سکتے ہیں، لیکن جس وقت سوال علمی کتابوں کا آئے گا تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو عربی فارسی سے مدد لیں یا سنسکرت سے، کیونکہ اُردو زبان معمولی روزانہ کی گفتگو کے لئے ایجاد ہوئی تھی اور اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ مطالب عالیہ یا مصطلحات علمیہ کے لئے الفاظ پیش کر سکے، اس لئے جب غیر زبانوں کے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اُردو داں طبقہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے

ہر چند بعض کتابیں مصطلحات علمیہ کی لکھی جا چکی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی اصولی گفتگو اس موضوع پر نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسا فیصلہ ہو سکا جس کو سامنے رکھ کر ہم ترجمہ کی دشواریوں کو دُور کر سکیں

انجمن ترقی اُردو اور جامعہ عثمانیہ کی خدمات اس باب میں یقیناً قابلِ قدر ہیں اور اس وقت تک وہاں سے متعدد علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہو چکا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تمام ترجمے کسی ایک اصول کے ماتحت نہیں کئے گئے اور اربابِ قلم کی وہ تشویش جو اصول سے متعلق تھی ہنوز باقی ہے

انجمن ترقی نے جو لغت مصطلحات کا مرتب کیا ہے وہ ناقص و نامکمل تو خیر ہی، افسوس یہ ہے کہ جتنا کچھ اس میں ہے وہ بھی کسی اصول کے ماتحت نہیں ہے، کسی جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے خالص ہندی بلکہ سنسکرت کے الفاظ لے لئے ہیں اور کسی جگہ عربی کے ثقیل مصطلحات لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ اُردو علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے ہم کو غیر زبانوں کے الفاظ لینا ضروری ہیں، اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ الفاظ کس زبان سے لئے جائیں، عربی سے یا سنسکرت سے۔

سنسکرت سے مصطلحات مستعار لینا گناہ نہیں لیکن چونکہ ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس زبان سے تعلق نہیں رہا ہے۔ اور عربی سے وہ بڑی حد تک مانوس ہیں یہاں تک کہ دیہاتیوں کی زبان میں بھی کثرت سے عربی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عربی سے مدد نہ لی جائے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ تصریفی آسانیوں کو دیکھیں گے تو لامحالہ سنسکرت پر عربی کو ترجیح دی جائے گی، اور یوں بھی اس وقت تک علوم و فنون کی جتنی کتابیں عربی میں آ چکی ہیں، سنسکرت یا بھاشا میں منتقل نہیں ہو سکیں

بہر حال چونکہ ترجمہ کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور میں نے ہمیشہ عربی سے مدد لینے کو مرجح سمجھا ہے اس لئے آج کی صحبت میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں کہ خود عربی میں ترجمہ کے کیا اصول ہیں، ممکن ہے کسی حد تک مفید ثابت ہوں

پہلا اصول تو یہ ہے کہ جب تک انھیں عربی الفاظ ملتے ہیں وہ عجمی الفاظ کا ترجمہ اپنی ہی زبان کے مترادف الفاظ میں کرتے ہیں۔ البتہ وہ عربی الفاظ میں اُن تمام الفاظ کو شامل کرتے ہیں جو اُن کے لغت و ادب میں اوزان عربیہ پر جاری ہیں خواہ اُن کی اصل کچھ ہو ——— مثلاً قلم کہ در اصل یونانی لفظ ہے لیکن چونکہ اُن کے لغت میں رائج ہے اس لئے اوسے وہ عربی سمجھتے ہیں، یا ابریق کہ فارسی الاصل ہے، یا قیس کہ سریانی کا لفظ ہے یا سلطان کہ قبطی الاصل ہے یا مشکاۃ کہ حبشی الاصل ہے سب عربی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر وہ اوزان عربیہ کا بھی زیادہ لحاظ نہیں لیتے بلکہ زیادہ تر استعمال و رواج کو دیکھتے ہیں اور اسی لئے جند بیدستر، سالامندرا اور قنطاریون ایسے الفاظ بھی اُن کے نزدیک عربی کے الفاظ ہیں

اس قاعدہ میں ان کے یہاں بہت کم استثنائی مثالیں مل سکیں گی اور افعال میں تو بالکل نہیں کیونکہ وہ غیر زبان کے افعال کبھی استعمال نہیں کرتے ——— اسی طرح حروف میں بھی کوئی مستثنیٰ نہیں ہے بجز (de) فرانسیسی (of) انگریزی اور (von) جرمنی کے، کہ یہ سب حروف اضافی ہیں اور عربی میں ان کی ضرورت نہیں لیکن صرف اس لئے کہ التباس پیدا نہ ہو اور لوگ آسانی سے سمجھ سکیں، کیونکہ اگر بجائے پرنس آف ویلیس کے پرنس ویلیس لکھیں تو ممکن ہے لوگوں کو سمجھنے میں زحمت ہو

اسماء میں بیشک شواذ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بعض عجمی الفاظ اس طرح داخل ہو ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ کیا جائے تو اصل مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا مثلاً لفظ پرنس کو لیجئے، کہ اس کا ترجمہ عربی میں لفظ امیر سے کیا جاتا ہے، لیکن پرنس آف ویلیس کا ترجمہ امیر ویلیس یا امیر آف ویلیس نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح معنی پر صریح دلالت نہیں ہوتی۔ چونکہ ترجمہ کا اصل مقصود یہ ہے کہ کم سے کم..... وقت اور الفاظ میں سامع ہمارے مدعا کو سمجھ سکے اس لئے عجمی الفاظ بجنسہ لے لینے میں وہ کبھی احتراز نہیں کرتے اگر ضرورت اس کی ناشی ہوتی ہے ——— اب سے بہت پہلے ابن اثیر، ابن سینا اور ابن بیطار بھی ایسے عجمی الفاظ کو جو کثرت سے رائج

ہو گئے تھے اور جو اپنے مفہوم کو زیادہ آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے تھے۔ لے لیتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں نہ کرتے تھے لیکن اگر کسی التباس کا اندیشہ نہیں ہوتا تو بیشک عربی میں ترجمہ کرتے تھے اور اب بھی یہی دستور ہے، چنانچہ " پرنسات اروبا" کبھی نہیں لکھیں گے بلکہ " امراء اروبا" لکھیں گے

الغرض ان کا مقصود ترجمہ سے یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا فوراً سمجھ لیا جائے اور اس غرض کے لئے وہ عجمی الفاظ لینے میں کبھی تامل نہیں کرتے مثلاً (Rheumatism) کو لیجئے کہ اب عربی میں زیادہ تر اس کو " روماتزم" کہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے عربی مرادف لفظ " دارالمفاصل" یا " وجع المفاصل" موجود ہے لیکن چونکہ دارالمفاصل سے عام طور پر ہاتھ پاؤں کے جوڑوں کا درد سمجھ میں آتا ہے اور پیٹھ کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے انھوں نے روماتزم جوں کا توں اپنے یہاں لے لیا۔ اسی مصلحت سے وہ بجائے توتیا کے زنک اور بجائے نشادر کے امونیا لکھتے ہیں

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی عجمی لفظ کا صحیح مترادف لفظ عربی میں نہیں ملتا ہے تو پھر یہ سوچی جاتی ہے کہ قریب تر مفہوم کس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے اور اگر کوئی لفظ ایسا مل گیا تو اسے اختیار کر لیتے ہیں ــــ مثلاً انگریزی لفظ " Mercenaries " ہے۔ اس سے مراد وہ افواج ہیں جو دوسرے ممالک سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اب انھوں نے سوچا کہ یہ رسم یقیناً عربوں میں بھی رہی ہوگی۔ اور ضرور اس کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتے ہوں گے، چنانچہ جستجو سے ان میں لفظ " مسترزقہ" ملا جو ایسی فوجوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور وہ انھوں نے اختیار کر لیا ــــ اسی طرح ایک اور انگریزی لفظ " Tributary " ہے جس سے مراد وہ چھوٹی ندی ہے جو کسی دریا میں جا کر گرتی ہے، اس کے لئے جب انھوں نے قدیم سفرنامے اپنے یہاں کے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے لفظ ناصر استعمال کیا گیا ہے جس کی جمع نواصر آتی ہے، اس لئے انھوں نے اس کو اختیار کر لیا ــــ اگر کوئی ایسا عجمی یا عامی لفظ ہوتا ہے جس کی عربی زیادہ رائج نہیں ہے تو بدستور وہی لفظ باقی رکھا جاتا ہے مثلاً مصر میں لفظ لقادی کثرت سے مستعمل ہے اور عربی لفظ بذار کوئی استعمال نہیں کرتا، اسی طرح مذبح کو سلاخ بلدی کہنے کا رواج ہے اور زبل کوئی نہیں کہتا، پُل کو بجائے جسر کہنے کے کبری کہتے ہیں اور ڈاک کو بجائے برید کے بوسطہ، تو انھوں نے انھیں رواجی الفاظ کو لے لیا، کیونکہ وہ زیادہ قریب الفہم ہیں اور عام و خاص سب انھیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

تیسرا قاعدہ عجمی ناموں کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ جو نام جس طرح سے عربی میں رائج ہیں ان کو بدستور اسی حال پر رکھا گیا خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، مثلاً ابراہیم، یوسف، المانیا، امیرکا وغیرہ اور جو نام نئے آتے ہیں ان کو تلفظ کے لحاظ سے لکھتے ہیں ــــ شہروں کے بعض نام ایسے ہیں جو زمانۂ قدیم سے عربی میں چلے

آ رہے ہیں جیسے وینس کے لئے بندقیہ، سسلی کے لئے صقلیہ سو اس کے لئے انھوں نے یہ کیا ہے کہ جب وہ کسی واقعۂ تاریخی کا ذکر کریں گے تو وہی بندقیہ و صقلیہ استعمال کریں گے، لیکن جب زراعت و صناعت حالیہ کے متعلق کچھ لکھنا ہوگا تو وہ وینس و سسلی ہی لکھیں گے، کیونکہ اہل حرفت و پیشہ میں یہی زیادہ رائج ہیں

بعض نام ایسے ہیں جو فی الاصل عربی ہیں لیکن اہل مغرب نے ان کی صورت میں تبدیلی پیدا کر دی ہے، سو ان کو اسی اصلی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اور اہل افرنج کے تصرفات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ مثلاً قاہرہ، قرطبہ، اشبیلیہ کہ اس کو کیرو۔ کارڈووا اور سیول وہ کبھی نہ لکھیں گے

چوتھا قاعدہ، الفاظ جدیدہ کے ترجمہ کرنے کا یہ ہے کہ اگر انھیں کوئی لفظ عربی کا ایسا مل جاتا ہے جو پہلے سے اس معنی میں رائج ہے تو پھر وہ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں مثلاً اکسیجن، ہدروجین، نیتروجین اور فسفور وغیرہ بلکہ اسی سے افعال بھی بنا لیتے ہیں مثلاً مغنطیس سے انھوں نے مغنط فعل بنایا اور کہربا سے کہرب۔ لیکن اگر کوئی لفظ رائج شدہ انھیں نہیں ملتا تو وہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ نئے لفظ کو اپنی زبان میں لے لیتے ہیں جیسے تلفون، فونوغراف، تکروفون، اتوموبیل اور کبھی کبھی کوئی دوسرا عربی لفظ بھی گھڑ لیتے ہیں جیسے اتوموبیل کے لئے سیارہ کہ اب عام طور پر یہی مستعمل ہے

اوّل اوّل جب بیروت میں بائسکل آئی تو اس کا ایک پہیہ بہت بڑا تھا، دوسرا بہت چھوٹا اور سوار ہونے میں بڑی زحمت ہوتی تھی، لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ ٹرائسکل (تین پہیوں والی گاڑی) کے مقابلہ میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے اس لئے انھوں نے لفظ بائسکل اختیار کرنے سے احتراز کیا اور دراجہ کا لفظ اختراع کیا، بعد کو جب دو پہیوں والی گاڑی کے لئے بائسکل اور تین پہیوں والی کے لئے ٹرائسکل کا لفظ وضع ہوا تو اہل مصر نے دراجہ کو چھوڑ کر عجلہ کا لفظ وضع کیا جو دونوں پر حاوی تھا

مصطلحات علمی میں چونکہ تعریب کا بہت کم موقعہ ہے اور ذرا ذرا سے تغیر سے معنے میں بہت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اس لئے انھوں نے اس باب میں بھی علماء کا تتبع کیا اور جوں کا توں لے لیا۔

اب معنی کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یا تو وہ حقیقی ہوں یا مجازی، اور اہل عرب کے نزدیک مالوف ہوں گے یا غیر مالوف۔ پس اگر وہ حقیقی ہیں اور مالوف بھی ہیں (مثلاً گھوڑے پر چڑھنے کو وہ رکوب کہتے ہیں اور شراب پینے کو شرب) تو اس قبیل کے معنے جہاں جہاں آئیں گے وہ یہی افعال استعمال کریں گے۔ اگر معنی حقیقی ہیں اور غیر مالوف تو ترجمہ لفظی کرتے ہیں۔ یا قریب قریب لفظی کے مثلاً بندوق سر کرنے کے لئے وہ لفظ اطلاق استعمال کرتے ہیں اور رمی وغیرہ کے لئے رمی

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور مالوف تو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اور اُسے اختیار کر لیتے ہیں جیسے فتنہ

جگانے کے لئے " ایقاظ الفتنہ "

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور غیر مالوف تو وہ اس قبیل کے استعارات کو اپنی زبان میں تلاش کرتے ہیں اگر قریب قریب اس کے مل گئے تو انھیں لے لیتے ہیں ورنہ پھر اس غیر زبان کے استعارہ کو استعمال کرنے لگتے ہیں ــــــ الغرض اہل عرب کے تمام اصول ترجمہ کے متعلق آسانی کے خیال پر قائم کئے گئے ہیں اور وہ دوسری زبان کے الفاظ لینے میں بھی تامل نہیں کرتے، اس لئے اگر اردو میں بھی انھیں اصول پر کاربند ہوں تو کیا حرج ہے، یعنی غیر زبان کے وہ الفاظ جو رائج ہو چکے ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیں اور مصطلحات علمیہ یا دوسرے بلند مفہوم کے الفاظ کا ترجمہ کرنے میں وہ اپنی زبان میں جستجو کریں اگر کوئی لفظ پورے معنی پر حاوی مل جائے تو لے لیں۔ اور اگر کسی غیر زبان سے استعارہ کی ضرورت ہے تو عربی فارسی سے مدد لیں

ہر چند اس صورت میں عربی فارسی کا علم ضروری ہوگا۔ اور ہر شخص ترجمہ نہ کر سکے گا، لیکن اگر سنسکرت یا بھاشا کے ثقیل الفاظ لئے گئے تو اُن کے لئے سنسکرت دانی کی ضرورت ہوگی، اور یہ امر ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے فارسی عربی کا سیکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا سنسکرت کا ــــــ

سکون کی جستجو

طاہرہ دیوی شیرازی کا یہ دوسرا افسانہ ہے جو نگار میں شایع ہو رہا ہے، آپ نسباً ہندو اور ازدواجاً مسلمان ہیں، لیکن اعتقاد کے لحاظ سے بالکل میرے خیالات کی ہمنوا ہیں

یہ افسانہ، فن کے لحاظ سے اُردو میں اس ارتقائی درجہ کی چیز ہے، جہاں مردوں کا دماغ بھی مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے چہ جائیکہ عورتیں

طاہرہ دیوی نہ صرف فارسی بلکہ فرانسیسی زبان کی بھی ماہر ہیں۔ اور غالباً یہیں سے یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ اُن کی افسانہ نگاری میں یہ رنگ کہاں سے آیا ——

زبان کی صفائی و شگفتگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بنگال کی ایک ہندو خاتون اتنی صاف و صحیح اُردو لکھنے میں کیونکر کامیاب ہو سکیں،

اُمید ہے کہ نگار میں اُن کے افسانے برابر شایع ہوتے رہیں گے۔ اور کسی آیندہ اشاعت میں ہم ان کی تصویر بھی پیش کر سکیں گے ——

نیاز

گلفام کی بابت سب کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اور اس دنیا میں وہ صرف چند دن اہمان ہے۔ اصطبل میں تھان کے سامنے لیٹے لیٹے اس کو کامل ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ مالک بھی اس کی خراب حالت دیکھتے دیکھتے نگ آگیا تھا۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ گولی کا نشانہ بنا کر اس کی تکلیفوں کو ختم کر دے۔ مگر دیرینہ رفاقت کا احساس اسے رمرتبہ باز رکھتا تھا۔ وہ روز اس خیال سے خاموش ہو جاتا کہ آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا۔ مرتے ہوئے کو مارنے سے کیا ندہ۔ اس کی چاروں ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ رانوں تک کا گوشت سڑ چکا تھا۔ جب ان میں کیڑے کلبلاتے تو درد کی شدت ے وہ بھیانک آواز سے ہنہنانے لگتا۔ اکثر رات کے وقت اس کے کراہنے کی آواز سے سوتے ہوئے لوگوں کی نیند خراب ہو جاتی اسے جھنجھلا کر پستول لے کر اٹھتا مگر طویلہ تک جا کر رہ جاتا۔ اسے اندر جاتے ہوئے بھی کراہت معلوم ہوتی تھی۔ وہاں کی تمام

فضا زخموں کی عفونت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ صرف جھانک کر دیکھتا اور واپس لوٹ آتا۔ دل ہی دل میں رائے قائم کرتا کہ صبح تک ضرور مر جائے گا
گھر کے پلے ہوئے شکاری کتے اس کے پاس آتے، زخموں کو سونگھتے، اور اُن پر پیشاب کرکے غریب بے زبان جانور کو اور زیادہ تکلیف پہونچاتے۔ کبھی کبھی بکرے کے سینگ بھی اس کی مجروح کھال پر عمل جراحی کی مشق کرتے۔ مگر وہ انتقام لینے سے قاصر تھا۔ رات کے وقت چوہے نکل کر اس کے کان کاٹتے، گردن پر چڑھتے۔ مگر اس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ دُم ہلا کر ان کو بھگا دیتا۔ وہ خاموش لیٹا ہوا اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔ مہترانی بھی اس جگہ کو صاف کرتے وقت ناک بھوں چڑھاتی، وہ کوستی کہ یہ کم بخت مرکیوں نہیں جاتا کہ پاپ کٹے۔ وہ لید اٹھانے سے پہلے ایک لات اس کی پیٹھ پر جڑ دیتی تھی۔ دوسرے گھوڑوں سے بچی ہوئی گھاس اسے کھانے کے لئے ملتی۔ اور وہ بھی بہت قلیل مقدار میں وہ اسے بھی نہ کھا سکتا۔ طویل بیماری سے اس کی بھوک پیاس بند ہو گئی تھی۔ اس کے لئے تمام دنیا ایک اصطبل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک ہی حالت میں لیٹے لیٹے جب اعضا تھک جاتے، اور بدن میں شدید درد ہونے لگتا تو وہ کوشش کرکے زیادہ سے زیادہ کروٹ بدل لیتا، تاکہ عارضی طور پر کچھ سکون حاصل ہو جائے اور بس۔ قرب وجوار کے شریر بچے در کھڑے ہو کر اسے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے مارتے۔ بعض بے رحم لڑکے پچکاریوں میں سرد پانی بھر بھر کر اس کی طرف پھینکتے۔ جس سے اس کے زخموں میں مرچیں سی لگنے لگتیں۔ وہ درد بھری آواز سے ہنہناتا اور خاموش ہو جاتا۔ بچے خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے چلے جاتے۔ اس کی بے بسی کی حالت پر کسی کو رحم نہ آتا تھا
موسم سرما کی ایک رات تھی نصف سے زیادہ حصہ گذر چکا تھا۔ اس کے زخموں کی تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اس کے دل میں تمام مصائب و آلام کے خلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اپنی تمام پس ماندہ قوتوں کو جمع کرکے اس نے ایک آخری کوشش کی اور کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ جسم کا ایک ایک حصہ بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا بھاری جسم ان نحیف ٹانگوں کے لئے ایک بارِ گراں تھا۔ مگر پوری ہمت سے کام لے کر اس نے توازن کو قائم رکھا
سب سے پہلے اس کی نظر ناند پر پڑی جس میں کئی دن کی سوکھی ہوئی گھاس کا تھوڑا سا ڈھیر پڑا تھا۔ اس کے سینہ پر سانپ سا لوٹ گیا، جب اس نے خیال کیا کہ مالک اب اس کی خوراک کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس کے سامنے وہ منظر آگیا۔ جب گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہلی بار وہ اول نمبر آیا تھا۔ واپسی کے وقت ایک عروس نو کی طرح اس کی گردن پھول کے گجروں سے لدی ہوئی تھی۔ اس روز خود مالک نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پالش کی تھی۔ اور کئی روز تک صبح و شام بالٹی بھر کر دودھ جلیبیاں اسے کھلائی گئی تھیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے خیال کیا کہ انسان بہت قدر ناشناس اور خود غرض ہے۔ وہ پھولوں سے لطف اندوز ہو لینے کے بعد انھیں مسل کر پھینک دیتا ہے۔ مگر جلدی ہی اس نے اپنی

رائے تبدیل کرلی۔ کہ شاید دنیا والوں کا یہی دستور ہو۔ کہ ہر چیز کو برت لینے کے بعد نظر سے گرا دیا جائے

پھر اس کی نگاہ لکڑی کے کھونٹے پر پڑی جس کے ساتھ کبھی آہنی زنجیروں کے ذریعہ اس کو باندھا جاتا تھا۔ مگر اب وہاں سن کی معمولی رسی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ کسی شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ گلفام میں چپکے سے بھاگ جانے کی ہمت ہے۔ اپنی اس بے بسی کی حالت پر اس کے آنسو نکل پڑے۔ اتنے ہی میں ایک چوہے نے بل سے سر نکال کر اپنے تیز دانت دکھائے۔ گویا وہ اسے کاٹ کھانے کی دھمکی دے رہا ہے۔ گلفام نے چاہا کہ سم کی ایک ضرب سے اس چھوٹے سے جانور کی ہڈی پسلی ایک کردے۔ مگر فوراً رک گیا کہ مبادا اس کشمکش میں جسمانی توازن بگڑ جائے۔ اور دوبارہ اسی جگہ گر پڑے جہاں کئی دن سے بے یار و مددگار پڑا تھا۔ اس نے آخری بار اس چار دیواری پر حسرت کی نگاہ ڈالی۔ جس کے اندر زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تھا۔ اور لرزتے ہوئے پاؤں کو جنبش دے کر چلنے لگا۔ اس کے دونوں کولھے نجاست میں لتھڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جسم پر مٹی جم کر خشک ہوگئی تھی

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

طویلہ سے نکل کر وہ سائیس کی کوٹھری کے قریب سے گذرا۔ جو دروازہ بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ رک کر ہنہنایا گویا اپنے ان داتا کو بھی آخری بار الوداع کہہ رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اب میں زندہ واپس نہیں آؤں گا

اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ چاند اپنے پورے شباب پر تھا۔ ستارے جگمگا رہے تھے۔ موسم سرما میں چلنے والی ہوا کے جھونکے اعضا کو مفلوج کردینے کی حد تک سرد تھے۔ اور اس کا جسم ٹھٹھر کر رہ جاتا۔ اگر زندہ رہنے کی آخری کشمکش کے جوش نے اس کے اندر حرارت نہ پیدا کردی ہوتی۔ چاندنی رات میں اس سنسان مقام پر کھڑے ہو کر اس نے تصور کی آنکھ سے اپنے عہد شباب کو دیکھا۔ ایک دن وہ جوان تھا اور چست و چالاک۔ اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا۔ اس کے جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر سریع الزوال۔ چار ہی قدم چلنے سے اس کا سانس پھولنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ باغیچہ میں سے گذرا۔ جہاں اس کے مالک نے مختلف الالوان پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ اس نے چاہا کہ اپنے سموں سے سب کو روند کر فنا کردے۔ اور اس طرح اپنے جوش انتقام کو سرد کرلے" مگر مجھے کیا فائدہ؟" اس سوال کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا

باغیچہ کے ایک کونے میں مالی کی کٹیا تھی۔ وہ رک گیا۔ اور پھونس کی دیوار کے قریب اپنی آنکھ لگا کر ایک روزن سے جھانکا کہ بوڑھا بے خبر سو رہا ہے۔ اس نے ارادہ کیا کہ اسے بیدار کرکے کہے۔ کہ "اے بندہ زر دپے کے ملازم! اب تو مجھے ہری ہری گھاس نہیں دیتا۔ میں مالک سے تیری شکایت کردوں گا" مگر خود اسی کے تلے سے ایک دردبھری صدا نکلی۔ کہ "اے بے وقوف خود تیرا مالک تیری فکر نہیں کرتا۔ اسے تیری پروا نہیں۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تو کل کا مرتا آج

ہی مر جائے۔ وہ تیری فریاد کو کن کانوں سے سنے گا؟"

چند قدم چلنے کے بعد باغیچہ کی حد ختم ہو گئی۔ خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ وہ رک گیا۔ تار زیادہ اونچے نہیں تھے۔ مشکل سے ڈیڑھ فٹ ہوں گے۔ کھیل کے میدان میں وہ چار چار فٹ بلند جنگلے آسانی سے چھلانگ مار جاتا تھا۔ مگر اب ٹانگوں میں سکت باقی نہیں تھی۔ چھلانگ مارنا تو درکنار راستہ چلنا بھی دوبھر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر جسم کمزور کیوں ہو جاتا ہے؟ بدن کی طاقت کہاں چلی جاتی ہے؟ مگر یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ جس کو سمجھنے سے اس کی عقل حیوانی قاصر تھی۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک ہی جگہ زیادہ دیر تک کھڑا رہے۔ اس خیال سے کہ کہیں جسم کی تھوڑی بہت گرمی زائل ہو کر سردی کا احساس بیدار نہ کر دے۔ وہ پھر چل پڑا۔ حالانکہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کمزور ٹانگیں اس کو کہاں لئے جا رہی ہیں۔ کوئی مخصوص منزلِ مقصود اس کی نظر کے سامنے نہیں تھی۔ وہ کارواں سے الگ ہو کر بھٹکنے والے مسافر کی طرح تھا۔ جس کا ہر قدم لاعلمی کی حالت میں کبھی منزل کی طرف اُٹھ جاتا ہے اور کبھی منزل سے دُور

وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ شاید کہیں یہ سلسلہ ختم ہو جائے یا ایسا مقام آجائے جس کو عبور کر لینا اس کے امکان میں ہو۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ اور بے خبر تھا کہ کائناتِ عالم کا ہر ذرّہ اس کے تاثراتِ قلب کا دقیق مطالعہ کر کے اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا چاہتا ہے۔ اس نے محسوس نہ کیا کہ ہر شے کا غیر مرئی دل جذباتِ ہمدردی سے معلو ہو کر اس کے لئے دھڑک رہا ہے

اتفاقاً ایک جگہ تار ٹوٹ جانے سے باڑھ میں ایسی جگہ بن گئی تھی جہاں سے گذر کر باغیچہ سے باہر نکل جانا اس کے لئے آسان تھا۔ وہ خوش ہوا کہ اب آزادی کی فضا میں پہونچ کر سانس لوں گا۔ مگر عین اس وقت بنگلہ کی طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سہم کر کھڑا ہو گیا۔ افشائے راز کے خوف سے اس کا تمام جسم لرزنے لگا۔ اس نے زمین کی طرف دیکھا۔ جس کی سطح پر پڑنے والا سایہ بھی کانپ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھی چاند پوری طرح روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس نے آرزو کی کہ کاش آج کے دن یہ قندیل فلک گل ہو جاتی تو بہتر تھا۔ مگر کسی کی آرزو کے مطابق نوامیسِ فطرت میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے قوانین اٹل ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ کتے کی آواز سے تمام چوکیدار بیدار ہو جائیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ کوئی چور بنگلہ کی حدود میں گھس آیا ہے۔ بے شک وہ بھی چور تھا۔ کم از کم اس کا دل چور تھا۔ اس نے اپنی ضمیر کی آواز صاف طور پر سنی۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنے مالک کے گھر سے فرار ہو رہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ چاند کی روشنی میں چوکیدار اس کو باڑھ کے قریب کھڑا دیکھ لیں گے۔ اور پکڑ کر واپس لے جائیں گے۔ تیز دوڑ جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے گذشتہ واقعات پر غور کر کے سوچا کہ کیا دوبارہ اس مسموم فضا میں زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ جہاں رہتے رہتے اس کی طبیعت اکتا چکی ہے——— پھر وہی زندگی

جس سے مر جانا بہتر ہے

اس نے بنگلہ کی طرف دیکھا۔ کوئی چیز سایہ کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ ایک چوکیدار بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے اچھی طرح پہچان لیا۔ یکایک روشنی نمودار ہوئی۔ اور سب طرف چکر لگا کے اس کے جسم پر پڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ننھائے پاس میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن جب خلافِ توقع چند لمحے تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ روشنی مفقود ہو چکی تھی۔ اور صرف ایک کتا اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ چوکیدار نے ارادتاً اس کی طرف سے لاپرواہی اختیار کر لی ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ یہ بلا کسی طرح دور ہو جائے۔ زخموں کی افراط کے باعث گلفام کی کھال بھی اس لائق نہیں تھی۔ کہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ پھر اسے کون پکڑتا۔ اس خطرناک مستقبل سے بچ جانا ہی اس کے لئے باعثِ مسرت بن سکتا تھا۔ مگر اس امر کا احساس کہ اب اس کی ہستی کو ایک بیکار شے تصور کر کے نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا۔ اب اس کی ٹانگوں میں کوئی تکلیف باقی نہیں رہی۔ اس کے زخموں کی چپک بند ہو گئی۔ اصطبل کی مسموم فضا کا خیال بھی اس کے ذہن سے زائل ہو گیا۔ مگر اس کی روح کو ایک ایسی اذیت پہونچنے لگی، جو دنیا کے تمام مصائب و آلام سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی آئے اور اس کو دوبارہ لے جا کر اسی گندی اور بدبودار فضا میں ہمیشہ کے لئے قید کر دے۔ یہ بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ دنیا کی کوئی ہستی اس کو نظرِ حقارت سے دیکھے۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ کہ اب کوئی آتا ہے۔ اب کوئی آتا ہے۔ مگر نہیں۔ کسی کو آنا تھا۔ نہ آیا۔ اس کی امیدیں پامال ہو گئیں۔ فضا میں کسی کا سایہ حرکت پذیر نہ ہوا۔ وہ خود اپنی ٹانگوں سے چل کر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خودداری مانع تھی۔ ترک کئے ہوئے راستہ پر خود اپنی ہی مرضی سے گامزن ہو کر ہار مان لینا اس کی شان کے خلاف تھا۔ اس کے پندار میں وہ ایک ایسا اعترافِ جرم تھا۔ جس کا عملی پہلو بذاتِ خود ایک زبردست جرم ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی ہستی کو اور زیادہ گناہ آلودہ کرے۔ اسلئے بادلِ ناخواستہ وہ آگے بڑھ جانے کے لئے مڑا مگر عین اس وقت اس کی نگاہ کتے پر پڑی۔ حالانکہ وہ کافی دیر سے اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ وہ پھر ٹھٹھک گیا۔ اس نے پہچان لیا۔ وہ موتی تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے تھے۔ اس وقت اس کا دماغ۔ جس کا توازن حوادثِ زندگی سے بگڑ چکا تھا۔ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کہ یہ دیرینہ دوست مصیبت کے وقت بھی کام آتا ہے یا نہیں۔ ایسی صورت میں کہ خود اس کے قواء اس کے احکام سے انحراف کرنے لگے تھے۔ یہ کس طرح توقع کی جا سکتی تھی کہ ایک غیر جنس ہستی اس کا ساتھ دے گی۔ اس نے سوچا۔ "کاش! میرا وجودِ ازلی تخلیق کی ساعتوں کا رہینِ منت نہ بنتا۔ میری ماں مجھکو جننے سے قبل مر جاتی"

اس نے اپنی گردن جھکا کر تھوتھنی موتی کے قریب کی۔ گویا وہ اس کے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر نطق سے محروم ہونے کے باعث کچھ بول نہ سکا۔ اور اس مجبوری کے عالم میں اس کے تمام جذبات "معنیِ بےلفظ" بن کر رہ گئے

موتی جھکا - اور گلفام کے سُموں کو چاٹنے لگا - اس بے زبان کے پاس بھی اظہارِ ہمدردی کے لئے اس سے زیادہ بہتر ذریعہ نہیں تھا - محبت بھرے دل کی سچی باتیں زبان سے ادا نہیں کی جا سکتیں - اور شرمندۂ الفاظ ہوئے بغیر حساس قلب کانوں سے سُن لینی ممکن ہیں - وہ ایک دوسرے کا مطلب سمجھ گئے - موتی نے راہبری کی اور مظلوم و بیکس گلفام اس کے ساتھ ہو گیا

صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے قبل وہ بمشکل ایک فرلانگ گئے ہوں گے - کہ گلفام کے لئے آگے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا - اس کا سانس بہت تیزی سے چل رہا تھا - تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی - ٹانگوں پر کافی دیر زیادہ زور پڑنے کے باعث زخموں کے اندر سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا - اور اس طرح اس کی رگوں میں سے نکلے ہوئے عزیز خون نے زمین پر ایسے نقوش پیدا کر دیئے - کہ اگر کوئی تعاقب کرنا چاہے - تو آسانی سے سراغ ملتا چلا جائے - اس نے حسرت سے اپنی ٹانگوں کو دیکھا - ان ٹانگوں کو جن کی طاقت اس کو کھیل کے میدان میں کامیاب بنا دیتی تھی - مگر آج اس کے جسم زار کو بھی گھسیٹنے سے معذور تھیں - اپنی عظمت گذشتہ کا خیال کر کے وہ رونے لگا - اس کی کمر سینکڑوں زخموں سے داغدار تھی - اور جگہ جگہ نجاست لتھڑی ہوئی تھی - حالانکہ کچھ عرصہ قبل اس پر بندے کس کر سواری لینا انسان کے لئے باعث فخر تھا

دو روز سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا - اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے - کچھ نہ کھانے کی وجہ سے نقاہت بڑھ رہی تھی - زخموں کی تکلیف سے جسم نڈھال تھا زندہ رہنے کی تمنا میں مزید کشمکش کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو گیا اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں - آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا - وہ گر پڑا - لڑکھڑا کر گر پڑا - زمین بالکل پتھریلی تھی - چھوٹے چھوٹے سنگریزے اس کے زخموں میں گھُس گئے - وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا - مگر کوئی نہیں تھا جو ایک چُمکاری دے کر اس کے درد میں کمی کرنے کی کوشش کرتا - اس نے دو چار لاتیں ماریں کہ شاید اس طرح بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے - مگر الٹا اثر ہوا - قریب کی خاردار جھاڑیاں اس کے زخموں پر نشترزنی کرنے لگیں - آخر کار بے حال ہو کر وہ خاموش لیٹ گیا - اس کی گردن کی رگیں پھولنے لگیں - اور پسلیوں سے لگا ہوا پیٹ لوہار کی دھونکنی کی طرح زور زور سے چلنے لگا - اس کا سانس اکھڑ گیا - دونوں نتھنے خون آلود جھاگ سے بھر گئے - اس کا ہنہنانا بھی ایک بھیانک شور میں تبدیل ہو رہا تھا - اس کے کراہنے کی آواز سُن کر کس کے دل میں رحم پیدا ہوتا - جب کہ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا - اس کی تمام گریہ وزاری صدا بصحرا تھی - اس کی آہ و بکا کو صرف ان جنگلی طیور نے سنا جو قریب کے ایک پرانے درخت پر اپنے اپنے گھونسلوں میں چھپائے بیٹھے تھے - مگر اس کے آنے ہی سے قبل اس کی بے جا اور غیر متوقع مداخلت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اڑ چکے تھے - اسی مرنے والے کی جانکنی کی آہیں خاموش فضا کے طلسم سکوت کو توڑ رہی تھیں - یا کبھی کبھی موتی کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی - جو انتہائی بے چینی کے ساتھ اپنے قریب المرگ رفیق کے جسم زار پر تھوتھنی رگڑ رگڑ کر اظہار ہمدردی کر رہا تھا

وہ بار بار اس کی ایال اپنے منہ میں پکڑ کر گھسیٹتا۔ اس کے سموں پر اپنے پنجے مارتا۔ مگر مرنے والا۔ گلفام نہیں سمجھ سکا۔ کہ اس کا دوست اسے کہاں چلنے کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ اگر موتی میں سمجھ ہوتی اور اس کی پتلی ٹانگیں اس بارِ گراں کی حامل بننے کی اہل ہوسکتیں تو وہ یقیناً گلفام کو اپنی کمر پر لاد کر ایک ایسی فضا میں لے جاتا جہاں کوئی اس کے زخموں کو مندمل کر دیتا۔ وہ اس کو انسانوں کی دنیا سے نکال کر معصوم فرشتوں کی نگری میں پہونچا دیتا جس جگہ ہر دھڑکنے والے دل میں سچی اور بے لوث محبت کا دریا لہریں مارتا ہے۔ جس مقام پر سانس لینے والا ہر متنفس پژمردہ پھولوں کی بھی اتنی ہی قدر کرتا جتنی ان کی حالت شگفتگی میں ——

سورج کافی طلوع ہو چکا تھا۔ کسان جھونپڑوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف جانے شروع ہو گئے —— مویشیوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صدا سنائی دینے لگی۔ کسی دور کے کھیت سے درانتی کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید چنے کی فصل تیار ہو گئی تھی۔ گلفام زمین پر سم رگڑنے لگا۔ اس نے زور سے لاتیں چلائیں۔ ہنہنانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی دیہاتی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ لوگ بہت نیک اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ مگر اس کی فریاد کسی کے کان تک نہ پہونچی۔ موتی بھی اپنے دوست کا منشا سمجھ کر چلانے لگا۔ وہ اتنی زور سے بھونکا، کہ قرب و جوار کے دوسرے کتے بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ کتوں کی فطرت ہے کہ اپنے ہم جنس کی آواز سن کر خواہ مخواہ چلانے لگتے ہیں۔ گویا انھیں بھی اس کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مگر کتوں کی زبان کو بھی کسان نہ سمجھ سکے۔ کھیت پک چکے تھے اس لئے وہ اپنے کام میں پورے انہماک کے ساتھ غرق تھے

گلفام اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔ ایک خواب بیداری کے عالم میں کوٹھی کا منظر اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ تخیل کی آنکھ سے اس نے دیکھا کہ مالک اور گھر کے دوسرے لوگ بیدار ہو گئے ہیں۔ ملازم اپنے فرایض کی انجام دہی میں کمر بستہ ہیں سائیس سے گلفام کی حالت دریافت کی جارہی ہے۔ وہ اطلاع دیتا ہے کہ رات کے سکوت میں وہ کہیں بھاگ گیا۔ مالک "خس کم جہاں پاک" کہہ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ اور سائیس کو ہدایت کرتا ہے کہ بہت جلد مہترانی کو بلاکر اصطبل صاف کرائے اور اس میں گندھک روشن کر دے۔ سفیدی کرانے کا بھی حکم دیا جاتا ہے۔ گلفام چونک پڑا۔ اس کے زخمی سینہ سے ایک آہِ سرد نکلی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بادل کی چادروں میں موت کے فرشتوں کو تلاش کرنے لگا۔ وہ زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ اسے مرجانے کی آرزو تھی

موتی بھاگ کر قریب کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اور وہاں کھڑے ہو کر خوب چلایا۔ مگر بے سود۔ اس بستی کے تمام لوگ کم از کم اس دن کے لئے بہرے ہو گئے تھے۔ اس کی فریاد کو نہ سن سکے۔ وہ جلدی ہی واپس آگیا۔ اس خیال سے کہ تنہائی ۔۔ ناخوشگوار لمحات میں مرنے والے دوست کو کوئی غیر معمولی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ اس نے دیکھا کہ گلفام کے منھ پر مکھیاں بھنکنے لگی تھیں۔ اس کی زبان جبڑے کے باہر لٹک رہی تھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے نور تھیں مکھیاں زخموں پر بیٹھتیں تو

ایران اور یونان میں اس علاج کا رواج پایا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی معاشرت و مذہب میں پانی کا کثیر استعمال اور دریاؤں کا احترام وغیرہ سب اس کی یادگار ہیں

مسیح سے کئی صدی قبل چین کی قدیم تاریخ سے اس کا وہاں رائج ہونا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار وہاں کے کسی معالج نے ایک عورت کا علاج برف کے پانی سے کیا تھا۔ یعنی نہایت سرد پانی سے سینکنے کے بعد خشک کپڑا اس کے چاروں طرف لپیٹ دیا تھا۔ چنانچہ زمانۂ موجودہ میں بھی پانی سے بھگوئی ہوئی ایک چادر لپیٹ کر اوپر سے خشک کمل لپیٹنا اس طریق علاج میں رائج ہے

جاپان میں ٹوکیو سے جو اوس کا صدر مقام ہے ایک میڈیکل جرنل نکلتا تھا۔ سنہ ۱۸۵۱ء کے اس جرنل میں وہاں تقریباً ۸۰۰ سو برس پہلے ٹھنڈے غسلوں سے علاج کیا جاتا تحریر تھا۔ تقریباً چار سو برس گذرے ہوں گے کہ ڈاکٹر "ناکا گامی" (Dr. Naca Gami) نے ٹھنڈے غسلوں کے خواص کے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب شایع کی تھی۔ اوس میں اونھوں نے دمہ۔ امراض اطفال۔ ہسٹیریا اور دیوانگی وغیرہ میں ان غسلوں کی بڑی سفارش کی تھی

قدیم اسپارٹا میں ان غسلوں کے لئے خاص قانون مقرر تھا۔ اور اہل روما میں بھی ان غسلوں کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی۔ روما کے غسل خانے اتنے وسیع ہوتے تھے کہ ان میں ہزاروں آدمی نہا سکتے تھے۔ اور ان کے علاوہ ٹھنڈے اور گرم غسل کے بھاپ اور گرم ہوا کے ذریعہ سے بھی غسلوں کا انتظام رہتا تھا۔ وہ لوگ نالوں کے کھولنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے

ہپوکریٹیس (Hippocretes) پانی کے خواص کا بڑا ماہر تھا۔ ... اور بخار، پھوڑا، پھنسی، اور تقریباً تمام امراض میں ٹھنڈے اور گرم دونوں قسم کے غسل سے علاج کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سرد پانی سے غسل کرنے کے بعد جسم جلد گرمی حاصل کر لیتا ہے اور گرم بنا رہتا ہے لیکن گرم پانی کا اثر اس کے خلاف ہوتا ہے۔ اوس کا یہ بھی اصول تھا کہ سرد پانی کا غسل تھوڑی دیر ہونا چاہیے اور اوس کے بعد بدن ملنا چاہیے

اسکلیپیڈیس (Asclepiades) ٹھنڈے اور گرم غسل کے علاوہ پٹیاں بھی استعمال کرتا تھا۔ اوس کے شاگرد اینٹونیس (Antonius) نے اس علاج میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کا زکام کہنہ اوسی کے ٹھنڈے غسلوں سے اچھا ہوا تھا۔ شہنشاہ مذکور کا بھتیجہ نیپلیس (Naples) میں بیئی (Baiai) کے گرم غسلخانہ میں علاج کے لئے گیا تھا۔ اینٹونیس (Antonius) کے علاج غسل سے شاعر ہوریس (Horace) کو شفا ہوئی تھی

پیسٹر نپ (Pastor Kneipp) قدیم بیوریا کے ڈاکٹر اپنے علاج میں پٹیوں وغیرہ کا بھی استعمال کرتے تھے

پلنی (Pliny) کے بیان کے مطابق پانچ سو برس تک یہ طریق علاج روم میں بکثرت رائج رہا سیلسس (Selcus) اور دوسرے مشہور معالج اپنی تصنیفات میں غسلوں کی بڑی تعریف لکھ گئے ہیں۔ سیلسس (Selcus) نے اسے کامل طریق علاج بتایا اور اس کے ساتھ ورزش اور مالش وغیرہ بھی شامل کی

عرب کے اطبا نے بھی اس طرف خاص توجہ کی چنانچہ چیچک اور بخار کے بارے میں جو غسل وہ تحریر کر گئے ہیں اس وقت تک اون میں اضافہ نہ ہو سکا

رہیزیز (Rhazes) لکھتا ہے کہ بخار کو کم کرنے کے لئے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی پینا مفید ہے بوعلی سینا (Avicenna) قبض دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کی سفارش کرتا تھا۔ لوائیس (Lyons) کے رہنے والے سٹر بارا (Bara) نے گھلی ہوئی برف پینے اور پانی سے بھرے ہوئے برتنوں کو پیال اور تنکے وغیرہ سے ڈھک کر ان کو ٹھنڈا رکھنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اوس نے ۱۶۱۱ء میں ایک کتاب شائع کی۔ جس میں کہ اس نے جملہ امراض کہنہ وامراض متعدیہ مثلاً طاعون و دق وغیرہ میں اس علاج کی سفارش کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ٹھنڈا پانی بہترین دوا ہے

اٹلی کے طبیب لنزائن (Lanzine) نے اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں پانی کے اندرونی استعمال اور اس کے ذریعہ سے تپ دور کرنے کے باب میں ایک عمدہ کتاب مرتب کی تھی۔ فرا برنرڈینو (Fra Bernerdino) کا نام ہی ٹھنڈے پانی کا ڈاکٹر ہو گیا تھا۔ وہ بدہضمی عصبی امراض، اور سیلان الدم کا علاج برف سے کرتا تھا

جان وسلی ایم۔اے (John Wesley M.A.) نے ۱۷۴۷ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام پریمیٹیو فزیک (Primitive Physic) تھا۔ اس کتاب میں پانی کے استعمال سے امراض دُور کرنے کی جو تدابیر بتائی ہیں۔ اون سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کی صحت بخش خصوصیات اوس وقت بھی معلوم تھیں وہ لکھتا ہے کہ

(۱) میعادی بخار میں جاڑا معلوم ہونے سے پہلے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا، اور ٹھنڈا پانی پینے کے بعد اوڑھکر لیٹ رہنا۔ فرانس اور جرمنی میں اب بھی رائج ہے

(۲) معمولی بخار میں کم اور زود ہضم غذا کھانا، اگر زیادہ کمزوری نہ ہو اور ضعیفی بھی نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا

اور جاڑا معلوم ہونے سے قبل اوڑھ کر لیٹ جاتا اور تھوڑا تھوڑا وقفہ دے کر لیموڈال کر پانی پینا - ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رائج تھا - اور جب کونین وغیرہ ناکامیاب ہوتی تھیں تو اس سے فائدہ ہوتا تھا

(۳) مرگی میں بھی ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا اور سرد پانی پینا مفید ہے

(۴) دمہ میں روزانہ صبح ٹھنڈا پانی پینا - پھر فوراً ہی ٹھنڈے پانی سے سر دھو ڈالنا - اور ہفتہ میں ایک بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا مفید ہے - فوری رفع تکلیف کے لئے تھوڑا گرم پانی پی کرتے کرڈالنا کارآمد ثابت ہوا ہے

(۵) خشک دمہ کے لئے ہفتہ میں تین بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا ازبس سودمند ہے

(۶) چوٹ کا آماس روکنے کے لئے، فوراً پانچ چھ تہ کپڑا کرکے اوسے ٹھنڈے پانی میں بھگو کر لپیٹنا - اور جب گرم ہو جائے تو پھر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر لپیٹنا مفید ہے

(۷) چوٹ سے اگر آماس پیدا ہو جائے - آدھ گھنٹہ تک صبح و شام گرم پانی میں کپڑا بھگو کر سینکنا فائدہ مند ہے

(۸) آگ سے جل جانے کی حالت میں جلے ہوئے حصہ کو ٹھنڈے پانی میں ایک گھنٹہ سے لے کر چار پانچ گھنٹہ تک ڈبوئے رکھنا فائدہ پہونچاتا ہے

کلین (Callen) نے بھی پانی کے استعمال پر ایک کتاب لکھی تھی - یہ ڈاکٹر ڈاردن (Dr. Darwin) کے اصول پر کام کرتے تھے - وہ جاڑا لگنے پر گرمی پہونچاتے تھے - اور گرم ہو جانے پر ٹھنڈک پہونچاتے تھے

سر جان فلائر (Sir John Flayer) نے سترہویں صدی کے آخر میں پانی سے بھیگی ہوئی چادر لپیٹ کر علاج کرنے کا ذکر کیا ہے، اوس نے لکھا ہے کہ انگلینڈ میں بھی لوگ اس کے عادی تھے لیکن اوس کی شکل کچھ اور تھی

سر جان سنکلیر (Sir John Sinclair) نے بھی اس پر ایک کتاب لکھی تھی پندرہویں صدی میں اٹلی کے طبیب سیوانرولا (Savonarola) بریزی (Bairizzi) اور بیکیو (Baccio) ٹھنڈے پانی کا بکثرت استعمال کرتے تھے اوس وقت اسپین اور جرمنی میں اس کا بڑا رواج تھا - سترہویں صدی میں سپٹلا (Septala) دردسر اور لو لگ جانے میں ٹھنڈے پانی سے کام لیتا تھا - بلجیم (Belgium) کے طبیب ہرمین (Herman) ٹھنڈے پانی سے کل امراض اچھے کرتے تھے

سر جان فلائر (Sir John Flayer) مذکور نے ۱۷۰۹ء میں غسلوں کا پورا حال لکھا

انھوں نے لچفیلڈ (Lichfield) واقع انگلینڈ (England) میں ایک پانی کا شفا خانہ [illegible]لا۔ جس میں گرم و سرد غسل اور خشک لپیٹ کا باقاعدہ انتظام تھا

اوس کے بعد سنہ ۱۷۲۳ء میں جان ہینڈکاک (Hancock) نے بھی غسل پر ایک کتاب لکھی وہ مریض کو زیادہ پانی پلا کر اور کمبل میں لپیٹ کر پسینہ لا کر علاج کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ لال بخار میں ٹھنڈا پانی پینا بہت مفید ہے

سر جان چارڈن (Sir John Chardin) اٹھارھویں صدی کے ایک مشہور انگریزی سیاح تھے، وہ ایران پہونچ کر میعادی بخار میں مبتلا ہوئے۔ اون کے ساتھ ایک فرانسیسی سرجن بھی تھے جو اون کی نازک حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اونھوں نے فوراً ایک ایرانی طبیب بلایا۔ اس نے مریض کو پانچ فاقہ کرائے۔ اور فاقہ کی حالت میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی کثرت سے پینے کو دیا۔ اسی کے ساتھ پانی سے بھیگی ہوئی چٹائی میں لپیٹ دیا۔ اور اسے پانی سے تر رکھا۔ جس سے دو ہی دن میں بخار غائب ہو گیا

اٹھارھویں صدی کے آخر میں کری اور جیکسن (Currie & Jackson) دو مشہور انگریزی طبیب ہوئے ہیں۔ اونھوں نے اس کی بڑی چھان بین کی۔ اور اچھی کامیابی حاصل کی اونھوں نے اس پر کتابیں بھی لکھیں

سنہ ۱۸۰۹ء میں آسٹریا (Austria) کے گریفن برگ (Grafeanburg) میں ایک چھوٹے سے گاؤں سلیسیا (Silesia) میں ونسنٹ پرسنیز (Vincent Priessnitz) کی پیدائش ہوئی۔ چونکہ یہ گاؤں کے رہنے والے تھے انگریزی کتابوں میں ان کے لئے صاف صاف گنوار لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا ناظرین بھی اونھیں گنوار ہی سمجھ لیں یہی گنوار آدمی تھا جس کو پانی کے علاج کی دھن سوار ہوئی اور اوس نے اوس میں کافی تجربہ حاصل کیا

یہاں پر یہ بھی بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پرسنیز (Priessnitz) کو ایسی کیا مصیبت پڑی تھی جس کی وجہ سے وہ پانی کی خوبیاں آزمانے پر مجبور ہوئے۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ جب اون کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ ایک حادثہ سے ان کے جسم میں کئی جگہ چوٹ آئی۔ اور دو پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ موجودہ طبیبوں نے صحت ہونے سے پورا جواب دے دیا۔ چونکہ اونھیں اپنے مویشیوں کا علاج کرنے میں پانی سے اکثر کام لینا پڑتا تھا۔ اس لئے اونھوں نے وہی طریقہ عمل اپنے اوپر بھی استعمال کیا یعنی پوسٹ کھائی ہوئی جگہوں کو بھیگے ہوئے کپڑے سے ڈھک دیا۔ اور اونھیں برابر تر رکھا۔ تھوڑے عرصہ میں اوسے پوری صحت حاصل ہو گئی۔ اس حیرت انگیز کامیابی کو سنکر لوگ اون کے پاس دور دور سے آنے لگے

اور ان کا تمام وقت مریضوں کی تیمارداری میں گذرنے لگا۔ اُن کے اس کام سے خوش ہو کر حکومت آسٹریا نے اون کو سند عطا کی اور اس کے بعد فرانس کے فوجی علاج میں بھی پانی سے کام لیا جا[illegible]۔ فرانس گورنمنٹ نے اپنے آدمی ان کے پاس یہ علاج سیکھنے کے لئے بھیجے اور اوسے اپنے یہاں رائج کیا۔ اس کے بعد مسٹر فلوری (Mr: Fleury) نے ایک بہت عمدہ باقاعدہ پانی کے علاج پر کتاب لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں شایع ہوئی۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ تحقیق کر کے اپنے تجربات قلمبند کئے

امریکہ میں بھی زمانہ قدیم سے اس طریق علاج کا رواج چلا آتا تھا۔ چنانچہ فلیڈلفیا (Philadelphia) میں ڈاکٹر بنجمن رش (Benjamin Rush) گٹھیا۔ چیچک خسرہ زرد بخار و دیگر بیماریوں کا علاج ٹھنڈے پانی سے کرتے تھے۔ ۱۷۹۴ء میں اونھوں نے بخار میں برف کی تھیلی سر پر رکھنا ایجاد کی۔ اوس میں اونھیں بڑی کامیابی ہوئی

ڈاکٹر بارڈ (Dr Bard) اور ڈاکٹر ہوسک (Dr: Hosack) دونوں نے نیویارک (New York) کے اسپتال میں ۱۷۹۵ء سے ٹھنڈے پانی کا استعمال شروع کیا۔ مسٹر کری (Mr: Curry) کی کتاب اوس کے تین چار سال بعد امریکہ پہونچی۔۔۔

۱۷۹۹ء میں آگسٹا (Augusta) کے پیٹر ایڈمس (Peter Edes) نے اوس کتاب میں اپنے تجربات ملا کر دوسری کتاب مرتب کی۔ ایک دوسرے امریکن مصنف نے ۱۸۰۰ء میں سوجن کے لئے اور فاسد مادہ سے بھرے ہوئے مقام پر گیلی پٹی باندھنا ایجاد کیا

گوتم بدھ نے ایک مرتبہ مگدھ ولیش میں اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا کہ گیلی مٹی اور گوبر سے سانپ کا زہر دور کیا جا سکتا ہے۔ پانی کی طرح مٹی کا اثر بھی ہزاروں برس پہلے معلوم کر لیا گیا تھا۔ جس کے ہزارہا ثبوت ہیں

پانی کی عجیب و غریب فوقیت معلوم کرنے کے بارے میں ورجینیہ (Virginia) کے ہنری ولسن لاکیٹ (Henry Wilson Lockel) کے تجربات قابل تعریف ہیں۔ اون کے تجربات ۱۸۰۱ء میں شایع ہوئے تھے۔ وہ ایک کتاب کی صورت میں پنسلوینیہ (Pennyslovania) کی یونیورسٹی میں پیش ہوئے تھے۔ وہاں سے انھیں ڈاکٹر آف میڈیسن (Doctor of medicine) کی ڈگری عطا ہوئی تھی

ویدوں میں سے ایک اجور وید بھی ہے اور اس میں بھاپ کے ذریعہ سے علاج کرنے کا حال بتایا گیا ہے

ڈاکٹر لاکٹ (Dr Lockette) کے تجربات سے متاثر ہو کر ڈاکٹر دو ڈیٹ (Bright)

نے بہت سے کامیاب علاج اسی طرح کئے۔ اس کے بعد فلیڈیلفیہ (Philadelphia کے ڈاکٹر جان بل (John Bu[illegible]) نے اس میں اور ترقی کی اور ایک دوسری کتاب موسومہ باتھس (Baths) مرتب کی۔ یہ کتاب انگریزی میں اب تک موجود ہے

انیسویں صدی کے نصف حصہ میں لیبر میسٹر (Liebermeister) برانڈ (Brand) زیمیسن (Ziemesen) باشندگان جرمن اور ونٹر منز (Wintermintz) باشندہ ویانا (Vienna) نے فلیوری (Flury) کی تصنیفات پر نظر ثانی کی امداد سے زیادہ مرتب شکل میں پیش کیا

ہندوستان میں سب سے پہلے پنڈت شاستری نے مہاراجہ جے پور کا علاج کیا تھا۔ وہاں سے اونھیں قریب تین لاکھ روپیہ عطا ہوا تھا۔ اونھوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کرکے راجپوتانہ میں پہلا قدرتی صحت گاہ (Nature cure clinic) کھولا۔ اوس میں اونھیں کافی کامیابی بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے تین ہی برس بعد وہ انتقال کر گئے۔

پنڈت کرشن سروپ سونی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل مراد آباد نے پھر مسٹر کونے کی مرتبہ کتاب دی نیو سائنس آف ہیلنگ (The new science of healing) کا ترجمہ اردو و ہندی میں کیا لوگوں کی کافی امداد کی۔ دو تین سال ہوئے انتقال کر گئے

مسٹر جواہی کرشنا راؤ ساکن مدراس نے بھی اس کے لوگوں کو کافی فائدہ پہونچایا

مہاتما گاندھی نے بھی اسے قبول کیا۔ اور وہ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سنڈ لیبر ایم ڈی (Lind Lair M.D) کو جب اونھوں نے خط لکھا تھا۔ تو اس کی بڑی تعریف کی تھی

پہاڑوں کے بعض وحشی قبائل میں دستور ہے کہ جب اون کے یہاں کوئی شخص بیمار پڑ جاتا ہے تو شام کو گاؤں بھر میں سب کو خبر کر دی جاتی ہے۔ صبح یا دوپہر کو جیسا وہ لوگ آپس میں طے کریں سب لوگ اپنے اپنے یہاں سے ایک ایک گھڑا تازے پانی سے بھر کر مریض کے گھر جاتے ہیں۔ گھر والے مریض کو لا کر ایک پرنالے کے نیچے برہنہ بٹھلا دیتے ہیں اور اوسے پکڑے رہتے ہیں۔ گاؤں والے ایک ایک کرکے دھار باندھ کر گھڑے کا پانی اوس کے سر پر ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو دوسرا گھڑا بھر بھر لاتے ہیں۔ وہ لوگ مریض کے رونے چلانے کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب اون کے اندازے کے مطابق پانی گر چکتا ہے تو مریض کو خوب پونچھ کر رضائی وغیرہ میں لپیٹ کر لٹا دیتے ہیں۔ مریض کو پسینہ آ جاتا ہے۔ اور وہ اچھا ہو جاتا ہے۔ پسینہ لانے کے لئے جنگل کی کچھ پتیاں ڈال کر پانی کو گرم کرتے ہیں۔ ایسی بھاپ کا ذکر آیورویدک و حکمت کے گرنتھوں میں بھی ہے

صدیقی العزیز

کل شام کو محبت نامہ ملا، مگر اس حال میں کہ پندرہ دن سے صاحب فراش ہوں، اور کروٹ بھی دوسرے کے سہارے سے لیتا ہوں، افسوس ہے کہ میں اس وقت کسی خدمت کے قابل نہیں، آپ اگر دعا کے قابل ہیں تو اسے کر دیکھئے، دوا کی طرف سے تو میں مایوس ہو چکا ہوں

ایک عجیب قسم کا درد حوالی قلب سے اٹھ کر تمام رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے۔ اور ۲۴ گھنٹے کے لئے بالکل بیکار کر جاتا ہے، اطبا کا خیال ہے کہ وجع القلب ہے، ڈاکٹر اس کو انجائنا بتاتے ہیں، بہرحال یہ تو ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ اصل چیز کیا ہے، اس کی خبر کسی کو نہیں ——— کل سے خود اپنا علاج شروع کروں گا، وہی ہومیوپیتھی جس کے آپ مخالف ہیں۔ اور میں حد درجہ موافق۔ علامات کے لحاظ سے میں نے (Kalmia 200 C) تجویز کیا ہے، اور امید ہے کہ اس سے فائدہ ہو ——— آپ بھی یاد رکھئے، شاید یہ کبھی کام آ سکے

یہ خط میں ایک اور صاحب سے لکھوا رہا ہوں کیونکہ آپ جواب کے منتظر ہوں گے

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۲۲ء ۴ر	جون ۲۳ء ۴ر	جون ۲۹ء ۸ر	اکتوبر ۳۱ء ۳ر	ستمبر ۳۲ء ۴ر
اکتوبر " ۴ر	اکتوبر " ۴ر	مارچ ۳۰ء ۸ر	نومبر " ۳ر	اکتوبر " ۴ر
جنوری ۲۴ء ۴ر	نومبر " ۴ر	مئی " ۴ر	دسمبر " ۳ر	نومبر " ۴ر
فروری " ۴ر	دسمبر " عہ ر		جنوری ۳۲ء ۱۲ر	دسمبر ۴ر
مارچ " ۴ر	مارچ ۲۷ء ۴ر	ستمبر ۴ر	فروری " ۴ر	جنوری ۳۳ء عہ ر
اپریل ۴ر	اپریل " ۴ر	اکتوبر ۴ر	مارچ " ۴ر	فروری " ۸
مئی ۴ر	مئی " ۴ر	نومبر ۴ر	اپریل " ۸ر	مارچ " ۸ر
جون ۸ر	جون " ۴ر	دسمبر ۴ر	مئی " ۴ر	اپریل " ۸ر
اگست ۴ر	دسمبر ۲۵ء ۶ر	جولائی ۳۱ء ۳ر	جون " ۴ر	مئی " ۸
جنوری ۲۶ء ۴ر	فروری ۲۹ء ۸ر	اگست ۳ر	جولائی " ۴ر	جون " ۸ر
مئی " ۴ر	مارچ ۸ر	ستمبر ۴ر	اگست " ۴ر	

منیجر نگار لکھنؤ

ایک دُکھیاری لڑکی

بلا کی سردی پڑ رہی تھی، اور برف باری کا یہ عالم تھا کہ شاید آج کے بعد پھر کبھی ایسی دیکھنے میں نہ آئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سال کی آخری شام تھی، اُس سردی اور تاریکی میں ایک غریب چھوٹی بچی ننگے سر ابھی تک وہ مکان سے چلتے وقت سلیپر پہنے تھی، لیکن چونکہ وہ اس کی ماں کی تھیں، اس لئے ڈھیلی تھیں اور اس کے پاؤں سے جب وہ سڑک پر دو گاڑیوں سے بچنے کی کوشش میں تیز دوڑ رہی تھی، گر پڑی تھیں، ان میں سے یک کہیں غائب ہو گئی تھی دوسری ایک شریر لڑکا اٹھا کر بھاگ گیا تھا،

چھوٹی بچی ابھی تک چل رہی تھی، اس کے پاؤں سردی کی وجہ سے نیلے ہو رہے تھے، وہ اپنے بوسیدہ کُرتے میں دیا سلائیوں کا ایک بکس لئے ہوئے تھی اور چند اس کے ہاتھ میں تھیں، صبح سے اس وقت تک کسی نے ایک دیا سلائی کی ڈبیہ بھی نہ خریدی تھی، اس بیچاری کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا، بھوک اور سردی کی وجہ سے وہ کانپتی ہوئی چلی جا رہی تھی

برف کے گالے اس کے گھونگھر والے بالوں پر جو اس کے کندھوں تک آتے تھے، جمے جا رہے تھے، آخر کار تھک کر وہ دو مکانوں کی دیواروں کے ملنے سے جو ایک گوشہ نکل آتا ہے، وہیں بیٹھ گئی، اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور انھیں گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی، گھر جانے کی وہ ہمت نہ کر سکتی تھی، اس نے ابھی تک کوئی دیاسلائی نہ بیچی تھی، اس کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا، اور بلاشبہ اس کا باپ اسے مارتا، اس کے علاوہ گھر میں بھی اتنی ہی سردی تھی جتنی کہ سڑک پر کیونکہ وہ کوٹھے پر رہتی تھی، اور ہر چند چھت کے بڑے بڑے سوراخ گھاس پھوس سے بند کر دئے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی سرد ہوا سنسناتی ہوئی اندر آتی تھی، اس کے ہاتھ ٹھٹھر گئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیاسلائی کی ایک تیلی نکالی، اور قریب کی دیوار سے رگڑی اُس سے ایسی صاف اور گرم روشنی پیدا ہوئی جیسی کوئی چھوٹی شمع روشن ہو، اس نے اپنے ہاتھ لو پر رکھ دے، عجیب دلکش روشنی تھی۔ اس چھوٹی بچی

کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ ایک بڑے چولھے کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ دیا سلائی اتنی خوبصورتی سے جل رہی تھی کہ اس بچی نے اپنے پاؤں بھی گرم کرنے کے لئے پھیلاؤ ے ——— مگر ایک لمحہ میں دیا سلائی بجھ گئی، وہ گرم چولھا غائب ہوگیا اور چھوٹی بچی اپنے ہاتھ میں دیاسلائی کی جلی ہوئی تیلی لئے ہوئے جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی

اس نے دوسری تیلی جلائی، اور پھر روشنی ہوئی جہاں کہیں اس کی روشنی پڑتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دیوار کا پردہ اٹھ گیا ہے، اور وہ کمرہ کے اندر دیکھ سکتی ہے، اس نے دیکھا کہ کمرہ میں ایک میز رکھی ہوئی ہے، اس پر ایک سفید میز پوش پڑا ہے اور اس پر چینی کی قابیں سجی ہوئی ہیں، سیب، اور سوکھے پھل بہت اہتمام کے ساتھ میز کے ایک طرف رکھے ہیں۔ اور ایک قاب میں بھنی ہوئی مرغی سے دھواں نکل رہا ہے، سب سے زیادہ دلفریب منظر یہ تھا کہ "مرغ مسلم" جس کے پیٹ میں چھری اور کانٹے لگے ہوئے تھے۔ قاب سے ایک کر سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔ مگر شعلہ بجھ گیا۔ اور موٹی سخت دیوار پھر اس کے سامنے آگئی

اس نے تیسری دیا سلائی جلائی، شعلہ پھر پیدا ہوا، اور اس مرتبہ وہ ایک بہت خوبصورت کرسمس کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی، یہ اس درخت سے جس کو اس نے گذشتہ کرسمس کی شام کو ایک امیر سوداگر کے گھر میں کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا تھا، کہیں زیادہ بڑا اور کہیں زیادہ سجا ہوا تھا، ہزاروں شمعیں جل رہی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی تصویریں جیسی اس نے دوکانوں میں دیکھی تھیں، درخت پر سے جھانکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ لڑکی نے اپنے ہاتھ ان کی طرف پھیلا دئیے، اور دیا سلائی بجھ گئی، کرسمس کی شمعیں اونچی ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ آسمان پر ستاروں کی مانند جھلملاتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ان میں سے ایک گر پڑی اور اسکے پیچھے روشنی آسمان پر دور تک تیر شہاب کی طرح جاتی ہوئی معلوم ہوئی

اب کسی کی روح پرواز کر رہی ہے" چھوٹی لڑکی نے آہستہ سے کہا، یہ خیال اسے اپنی دادی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ وہ دادی جس نے اس پر ہمیشہ شفقت و مہربانی کی۔ اور جو اب مرچکی تھی، اس نے کہا تھا کہ جب کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے تو کوئی روح خدا کے حضور میں پرواز کرتی ہے۔ اس نے دوسری دیا سلائی جلائی، روشنی اس کے چاروں طرف پھیلی اور اس کی چمک میں اُس نے اپنی دادی کو دیکھا جو اسی طرح نیک اور مہربان لیکن کہیں زیادہ مسرور نظر آتی تھی

اس نے کہا " دادی، مجھے اپنے پاس بلالو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے دیا سلائی کے بجھتے ہی چھوڑ دوگی اور اسی طرح سے غائب ہو جاؤگی جیسے کہ گرم چولھا، سال نو کی دعوت اور کرسمس کا خوبصورت درخت" اس نے جلدی جلدی اپنی تمام دیاسلائیاں جلا ڈالیں کہ کہیں اس کی دادی چلی نہ جائیں۔ دیاسلائیاں اس آب و تاب سے جلیں کہ دوپہر کی روشنی ان کے سامنے ماند ہوگئی، اس سے قبل کبھی دادی اتنی لمبی اور شاندار،

اتنی خوبصورت اور مہربان نہ دکھائی دی تھیں۔ اس نے چھوٹی بچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور دونوں خوش خوش اڑتی چلی گئیں، وہ زمین سے دور اور بہت دور اُڑ گئیں، یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہونچ گئیں جہاں سردی، بھوک اور تمام تکلیفوں کا وجود نہیں

لوگوں نے صبح کو جب سردی پڑ رہی تھی چھوٹی بچی کو دیوار کے گوشہ میں دیکھا، اس کے گالوں پر چمک اور ہونٹھوں پر مسکراہٹ تھی، اور وہ سال کی آخری شب میں ٹھٹھر کر مر چکی تھی، نئے سال کا آفتاب اپنی نرم نرم کرنوں کے ساتھ اس پر چمک رہا تھا لیکن وہ سکون اور سکوت کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دامن میں دیاسلائیاں تھیں، ان میں سے ایک بنڈل پورا جل چکا تھا

"بیچاری اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی" کچھ لوگوں نے اس کو دیکھ کر کہا، لیکن کسی کو اس کے خواب شیریں کا پتہ نہ چلا، اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ اور اس کی دادی دونوں کیسے لطف کے ساتھ نئے سال کی خوشی منا رہی ہیں

(ماخوذ)

حسیب (نفیسی)

جمُود

سائنس کی اصطلاح میں "جمود" (Inertia) مادہ کی وہ خاصیت ہے جو اسے خود بخود حرکت کرنے سے روکتی ہے یعنے اگر کوئی شے ساکن ہے تو، جب تک ہم اُس کو کسی ذریعہ سے متحرک نہ کردیں، وہ ساکن ہی رہے گی۔ مثلاً اگر آپ کی جیب میں گھڑی ہو تو وہ جیب ہی میں رہے گی۔ جب تک آپ اُس کو جیب سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہ رکھ دیں۔ کسی قسم کی گاڑی اس وقت تک نہیں چلے گی جب تک ہم اس میں گھوڑا نہ جوت دیں یا انجن نہ لگادیں۔ گھوڑا یا انجن اُمل "خارجی طاقت" کا منبع ہے جو گاڑی کو متحرک کرتی ہے غرض کسی ساکن شے کو متحرک کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ اُس پر کسی "خارجی طاقت" کا اثر ڈالا جائے اسی طرح اگر کوئی شے کسی وجہ سے متحرک ہوگئی تو وہ قیامت تک نہ رُکے گی۔ جب تک خارجی طاقتیں اس کو روک نہ دیں۔ یہ نظریہ تو آپ کو عجیب وغریب، بلکہ مہمل معلوم ہوگا۔ آپ کہیں گے کہ جب ہم کسی چیز کو متحرک کردیتے ہیں تو وہ تھوڑی دیر کے بعد خود ہی ساکن ہوجاتی ہے۔ مثلاً گیند کو اچھالتے ہیں تو وہ زمین پر گرجاتا ہے، اور گولی کو زمین پر لڑھکا دیتے ہیں تو وہ بھی تھوڑے فاصلہ تک جانے کے بعد رُک جاتی ہے۔ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جب ہم کسی شے کو متحرک کردیں تو وہ کبھی رُکے ہی نہیں ؟

مگر آپ نے اس مسئلہ پر کافی غور نہیں کیا۔ گولی "خود ہی" نہیں رُکتی۔ گیند "آپ ہی آپ" زمین پر نہیں گرجاتا۔ گیند کو زمین کی کشش ثقل اپنی طرف کھینچتی ہے۔ گولی ہوا کی مدافعت اور سطحِ زمین کی رگڑ سے رک جاتی ہے۔ اگر کشش ثقل نہ ہوتی تو گیند زمین پر نہ گرتا۔ اور سیدھا اڑتا ہوا نہیں معلوم کہاں چلا جاتا۔ زمین کی سطح بالکل چکنی ہوتی اور ناہمواری کا نام ونشان بھی نہ رہتا تو گولی برابر چلتی رہتی اور نہ معلوم کہاں تک چلی جاتی ـــــ اگر سنگ مرمر کا ہموار فرش ہو اور اُس پر شیشے یا پتھر کی گولی لڑھکا دی جائے تو بہت دُور تک تیزی سے چلی جاتی ہے۔ یہ عام تجربہ کی بات ہے کہ جس قدر سطح ناہموار ہوگی اسی قدر جلد گولی رک جائے گی۔ سطح زمین کی "ناہمواری" ایک "طاقت" ہے، جو گولی کی رفتار کو سست کرکے بالآخر اُسے ساکن کردیتی ہے۔ اس لئے،

کسی خارجی طاقت کا دباؤ ڈالے بغیر، نہ کوئی متحرک شے رُکے گی اور نہ کوئی ساکن شے متحرک ہو سکے گی - یہ ہے "**جمود**" کا علمی (Scientific) مفہوم

"**جمود**" کا یہ نظریہ سر اسحٰق نیوٹن نے پیش کیا تھا - اُس نے "حرکت" کے متعلق تین قوانین بیان کئے تھے - اِن میں سے پہلا قانون 'جمود' کی تعریف میں ہے - دوسرے قانون میں "طاقت" کو ناپنے کا معیار قائم کیا گیا ہے - اس مضمون میں، میرا مقصد پہلے قانون کی تشریح کرنا ہے

"جمود" کے مندرجہ بالا مفہوم پر غور کرنے سے واضح ہو گا کہ اس کا تعلق اشیا کے "وزن" سے کچھ نہ کچھ ضرور ہے - وزنی اشیا کو متحرک کرنے کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے - مٹی کے چھوٹے سے ڈھیلے کو ہم آسانی سے اٹھا کر بہت دُور پھینک دے سکتے ہیں - لیکن اگر اسی مٹی کی بہت بڑی چٹان ہو تو شاید دو باتیں آدمیوں کی طاقت بھی اس کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہ ہو - جس شے کا جتنا وزن زیادہ ہے، اتنا ہی جمود بھی زیادہ ہے - ایک "لحیم شحیم" شخص کا جمود، ایک پتلے دُبلے آدمی کے جمود سے بڑھ کر ہے --- موٹے آدمیوں کے "فطری تساہل" کا باعث ان کا وزن یا "حجم" ہے

نیوٹن کے خیال میں جمود مادہ کی ایک خاصیت ہے - مگر میرا خیال ہے کہ غیر مادی اشیا میں بھی جمود ہے - مثلاً شاعروں اور مصنفوں کو خیالات کا جمود ہوا کرتا ہے - جب تک اُن کے جذبات کسی وجہ سے نہ اُبھر آئیں وہ کچھ کہتے یا لکھتے نہیں - پھر اگر کسی شاعر کے جذبات میں ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو وہ مسلسل "بکتا" رہتا ہے جب تک کوئی خارجی اثر اس کے جذبات کو درہم برہم نہ کر دے

"طاقت" اور "جمود" میں گھرا تعلق ہے - "طاقت" عموماً "جمود" کی دشمن ہوتی ہے - ان دونوں کے باہمی ربط کے راز سربستہ کو علم ریاضی کی زبان میں محض چند حروف اور ہندسوں کے ذریعہ بیان کیا جا سکتا ہے - اس موضوع پر بحث کرنے کے قبل جمود اور وزن کے تعلق کو واضح کر دینا بہتر ہو گا - جمود کے دو پہلو ہیں متحرک اشیا کا جمود اور ساکن اشیا کا جمود - یہ تو ہم سمجھتے ہیں کہ متحرک شے کو روکنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے - اگر متحرک شے کی رفتار تیز ہے تو زیادہ طاقت درکار ہوگی - اس لئے متحرک اشیا کا جمود ان کی رفتار پر بھی منحصر ہے - کسی متحرک شے کے وزن اور رفتار کو ضرب دینے سے جو عدد حاصل ہوتا ہے اُس کو اُس شے کا "**معیار حرکت**" (Momentum) کہتے ہیں

اگر وزن کے لئے "و" لکھیں، اور رفتار کے لئے "ر" تو "معیار حرکت = ر×و"

یعنی انگریزی میں یوں سمجھئے کہ

Momentum = M×V, (Mass × Velocity)

اب سے "معیارِ حرکت" کا اصطلاحی نام "رَو" ہوگا۔ اس اختصار سے بڑی سہولت ہوگی اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس متحرک شے کا "رَو" زیادہ ہے اس کا جمود بھی زیادہ ہے۔ ساکن اشیا میں "رَو" نہیں ہے۔ لیکن ساکن اشیا کو حرکت میں لانے کے لئے اُن میں "رو" پیدا کرنے کی ضرورت ہے " و " یعنے وزن تو ہر شے کا کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ جب ہم کسی ساکن شے کو مقررہ رفتار " ر " سے متحرک کردیں تو اس نے "رَو" حاصل کرلیا۔ اب اُس کو ساکن کرنے کے لئے، مخصوص "مقدار" میں "طاقت" کی ضرورت ہوگی جو "رَو" کے اثر کو بالکل زائل کردے یعنے " ر " کو صفر بنادے

"رَو" اور "طاقت" کے تعلقات پر آئندہ اظہار خیال کروں گا

آرزو (جلیلی)

بیراگ کا بروگ

(مسلسل)

(۵)

اس میں شک نہیں کہ کملا کی رگوں میں ایک پشت نہیں سیکڑوں پشت سے راجپوت خون دوڑ رہا تھا جو حکومت و فرمانروائی کے لئے مخصوص ہے، اور خود اس کی اتنی عمر اسی احساس میں بسر ہوئی تھی کہ راجکماریوں کی زبان سے جو لفظ نکلے وہ پورا ہونے کے لئے ہے اور جو تمنا ان کے دل میں پیدا ہو، اس کا کامیاب ہونا ضروری ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ کملا کی حقیقی مسرت کبھی اس ساعت سے وابستہ نہ ہوتی، جب وہ تعمیل حکم میں لوگوں کو سرنگوں دیکھتی تھی، بلکہ وہ اس وقت خوش ہوتی تھی۔ جب اس کا فرمان سنکر کبھی کوئی اتنا ہی کہہ دیتا کہ "کیا راجکماری ابھی ؟"

وہ فطرت کی طرف سے ایک ایسا وسیع دماغ لائی تھی جس کے سامنے اس کو ساری دنیا کی بساط مملکت بھی تنگ نظر آتی تھی چہ جائیکہ رتن گڈھ کی سرزمین جو چند ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھی وہ کہا کرتی تھی۔ اور کہتی کیا تھی، دل میں سوچا کرتی تھی کہ کسی راجہ کے یہاں پیدا ہونا گویا قفس کے اندر پیدا ہونا ہے اور قفس خواہ لوہے کا ہو یا سونے کی تیلیوں کا بہرحال قفس ہے

اس کی طبیعت بہت آزاد واقع ہوئی تھی اور ہر چیز کا مطالعہ وہ بہت قریب سے کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ گھبرا اٹھتی جب اوسے معلوم ہوتا کہ راجہ کے یہاں پیدا ہونا۔ گویا ہر اس چیز سے دور رہنا ہے جسے تمام انسانوں کے لئے قدرت کی نوازش عام کہتے ہیں

وہ سوچا کرتی کہ انسان کے بقائے حیات کے لئے جو شرائط ضروری ہیں وہ راجہ اور پرجا دونوں کے لئے یکساں ہیں، پھر ان دونوں میں تفاوت کیسا، فرق مراتب کیوں کیا اس لئے کہ ایک کا دماغ دوسرے سے زیادہ

ترقی یافتہ ہے، مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو حکمران ہے وہ سب سے زیادہ احمق و جاہل ہے، تو کیا اس لئے کہ ایک دوسرے سے زیادہ بہادر و جری ہے، لیکن کیا حکومتوں کا قیام اس تلوار پر منحصر ہے جو بادشاہ کے پہلو میں نظر آتی ہے یا اُس تلوار پر جو ایک معمولی سپاہی کے کمر میں لٹک رہی ہے ——— ظاہر ہے کہ یہ امتیاز صرف اتفاقات کا نتیجہ ہے جسے خود انسان کی گمراہیوں نے پیدا کیا ہے اور جو فطرت کے نزدیک کبھی پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔

وہ چاندنی راتوں میں چاند کو دیکھتی۔ اور بیتاب ہوجاتی کہ کاش وہ پھولوں کی سیج کے بجائے کسی ساحل کے ریگزار پر ہوتی اور وہاں سے اس منظر کا لطف اٹھاتی، جب آفتاب اس کے قصر کے مرمریں ایوانوں پر طلوع کرتا تو وہ سوچا کرتی کہ معلوم نہیں جنگل کے چشموں اور پہاڑ کی آبشاروں پر اس کا طلوع کس طرح ہوتا ہوگا

برسات کی کسی رات میں اگر کبھی دُور سے بانسری کی آواز اُس کے کانوں میں آجاتی تو صبح کو دربار کے مغنیوں کا گانا اسے اچھا نہ معلوم ہوتا، اور اگر کبھی دہقان کے کھیتوں میں وہ گاؤں کی عورتوں کو گاتے ہوئے سُن لیتی تو بے اختیار اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ جاکر جذبات سے بھرے ہوئے سادہ گانے میں ان کا ساتھ دے ——— الغرض کملا نسل اور خاندان کے لحاظ سے چاہے کچھ ہو، لیکن اپنی طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے وہ راجہ کی بیٹی نہ تھی بلکہ اس کسان کی بیٹی تھی جو دوسروں کا دُکھ برداشت کرنے اور اپنا دُکھ کسی سے نہ کہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے ——— وہ محلوں کی فضا سے بسا اوقات اتنا گھبرا جاتی کہ شکار یا تفریح کے بہانہ سے باہر جنگل کی طرف چلی جاتی اور وہاں چھپ کر بہ تبدیل لباس گاؤں کی لڑکیوں سے ملتی، اُن کے گھروں میں جاکر زمین پر بیٹھ جاتی اور اُن کی باتیں گھنٹوں سنا کرتی، وہ رانواس کی اس گفتگو سے جس کا تعلق زر و جواہر اور آرایش و زیبایش کے علاوہ کسی چیز سے نہ ہوتا، گھبرا اُٹھی تھی اور جب گاؤں میں وہ صرف کھیتی یا مویشیوں کی باتیں سنتی تو ایسا محسوس کرتی کہ اس کا دل کھنچا جا رہا ہے، اور دنیا میں پہلی بار اس نے قدم رکھا ہے

مذہبی معتقدات کے لحاظ سے وہ سخت ہندو تھی اور پوجا کے تمام مراسم نہایت پابندی سے ادا کیا کرتی تھی، لیکن محل کے مندر میں وہ پوجا کرنے سے کبھی خوش نہ ہوتی تھی، کیونکہ وہاں کی ہر چیز اسے سونے چاندی میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی اور راجکماری ہونے کا احساس اس وقت بھی اس سے علٰحدہ نہ ہوتا تھا، اسی لئے وہ اکثر و بیشتر بلدا اُرجی کے مندر چلی جاتی۔ کیونکہ وہاں پہونچنے کے بعد جب وہ عام انسانوں کے برابر کھڑی ہوکر پھول چڑھاتی تو اس کا ضمیر ایک حد تک مطمئن ہوجاتا اور دل کی گہرائی میں بہت کمی محسوس کرتی

لیکن چونکہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو مغربی علوم و فنون بھی سکھائے گئے تھے، اس لئے وہ رسمًا تو پوجا پاٹ سب کچھ کر لیتی تھی، لیکن اس کا دل ہمیشہ اس فلسفہ کی جستجو میں رہتا تھا جس کے ماتحت مذاہب کے اصول وضع کئے گئے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ کسی پتھر کے ٹکڑے کے سامنے خواہ وہ کتنا ہی حسین کیوں نہ تراشا گیا ہو۔ جھک جانا

کوئی معنی نہیں رکھتا، کسی مورتی پر پھول چڑھانا یا پانی ٹپکانا۔ بالکل لایعنی حرکت ہے، اگر کوئی خاص کیفیت اس سے پیدا نہ ہو اور چونکہ کیفیت کا تعلق خود انسان کی ذات سے ہے اس لئے وہ پوجا کے مفہوم کو بھی اپنے ہی اندر تلاش کیا کرتی تھی اور یہی وہ بات تھی کہ جب اوّل اوّل سوامی جی نے یہ کہا کہ "انسان خود پرمیشور ہے اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہیئے" تو وہ چونک پڑی اور ایسا محسوس کرنے لگی کہ ایک آواز جو بہت دور سے اسے کم کم سنائی دیتی تھی دفعتہً بلند ہو کر اس کے دماغ میں گونجنے لگی ہے

کملا کی نسبت جگدیش پور کے راجہ سے ہو چکی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ خود کملا کی مسرت یا نفرت اس سے بالکل وابستہ نہ تھی، یعنی جس وقت یہ بات پختہ ہوئی اور اس کو علم ہوا تو اس نے صرف اس لئے کہ باپ کی مرضی یہی ہے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور خاموش ہو رہی، لیکن اس عمر میں شادی کے خیال سے جو خاص دلی انبساط پیدا ہوتا ہے، وہ اس میں پیدا نہیں ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ جس طرح صبح کو اٹھ کر نہانا یا منہ دھونا ضروری ہے اسی طرح غالباً یہ رسم بھی ضروری ہے

راجہ جگدیش پور، اپنے ہونے والے شوہر کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی اور سوائے اس کے کہ وہ ایک خوبصورت نوجوان تو ضرور تھا، کوئی اور خاص بات اس میں نہ پائی جاتی تھی، تعلیم کے لحاظ سے وہ بہت معمولی حیثیت کا انسان تھا اور تربیت و سیرت کے اعتبار سے جو اطلاعات حاصل ہوئی تھیں وہ اس سے زیادہ نہ تھیں کہ اس کا اکثر وقت سیر و شکار میں صرف ہوتا ہے یا پھر ایسے مشاغل میں جو دنیا کو غور و تامل کے ساتھ دیکھنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے

کملا کے باپ کے لئے سب سے زیادہ مسرت اس رشتہ میں یہ تھی کہ دونوں ایک ہی خاندان کے راجپوت تھے۔ اور دوسرے یہ کہ جگدیش پور بڑی ریاست تھی اور وہاں کی مہارانی بننا کوئی معمولی بات نہ تھی

نسبت کے بعد کملا اور اس کے باپ کے درمیان اس معاملہ میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور اگر ایک طرف آہستہ آہستہ شادی کی طیاریاں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف کملا جو اس طرف سے بالکل خالی الذہن تھی بدستور فلسفۂ زندگی پر غور کرنے میں منہمک تھی

سوامی جی سے ملنے کے بعد اوّل اوّل جو تغیر اس کے ذہن میں ہوا وہ صرف یہ تھا کہ پہلے جن باتوں سے وہ سرسری گزر جاتی تھی اب اُن پر غور کرنے لگی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ ملاقاتیں بڑھیں اور تبادلۂ خیال زیادہ وسیع ہوا تو اس کے خیالات میں ایسا غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا کہ اس کے باپ کو بھی آخر کار اس کا علم ہو گیا اور اس نے کملا کو بُلا کر تصدیق کرنا چاہی۔

راجہ رنبیر سنگھ رتن گڈھ کا راجہ، ادھیڑ عمر کا انسان تھا اور اپنی وضع و قطع، عادت و خصلت کے لحاظ سے اسی زمانہ کا راجپوت تھا۔ جب عزت کا معیار باپ دادا کی روایات اور پرانے نقوش سے ہٹنا سخت

گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ یوں وہ نہایت نیک نفس، اور خوش اخلاق تھا اور یہ بھی درست ہے کہ وہ کملا کے معاملہ میں بعض اوقات اپنے اعتقاد و یقین کے خلاف اُن حدود سے بھی تجاوز کر جاتا تھا جو اس کے آبا و اجداد نے قایم کئے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ اسی حد تک کر سکتا تھا کہ اس کی عزت نفس گوارا کرے، لیکن جب سوال خاندانی وقار کا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ کیونکر اسے برداشت کر سکتا تھا

رات اس کے اندر خاص محل کے درمیانی کمرے میں راجہ رنبیر سنگھ بیٹھا ہوا تھا کہ کملا آئی اور سلام کر کے سامنے مؤدب کھڑی ہو گئی۔ راجہ نے کچھ دیر تک اس کے سراپا کو غور سے دیکھا اور بولا کہ "بیٹھ جاؤ"—— کملا وہیں گدے پر بیٹھ گئی اور بولی کہ "مہاراج آپ نے اس وقت خلافِ معمول کیوں یاد فرمایا ہے"

راجہ —— "کملا، یہ آج تم نے ساری کیسی پہن رکھی ہے، کیا رتن گڈھ کے توشہ خانہ میں اب کوئی ساری ایسی نہیں رہی جسے راجکماری استعمال کر سکے"

کملا —— "نہیں مہاراج، توشہ خانہ میں کیا کمی ہے، اور ہزاروں ساریاں راجکماری کے لایق موجود ہیں، لیکن کملا کے قابل کوئی نہیں"

راجہ —— "تو کیا تم کملا نہیں ہو اور کملا راجکماری نہیں ہے"

کملا —— "ہاں میرا نام کملا ہے اور میں ایک راجہ کی بیٹی بھی ہوں، لیکن مہاراج کیا راجہ اور انسان دو الگ الگ چیزیں ہیں"

راجہ —— "ہرگز نہیں"

کملا —— "پھر جب میں بھی انسان اور میرا باپ بھی انسان ہے تو کیا انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا کوئی عیب ہے"

راجہ —— "تو کیا انسانوں کی بیٹیاں قیمتی کپڑے استعمال نہیں کرتیں"

کملا —— "ہاں کرتی ہیں مگر اس وقت جب وہ پہلے ہزار عورتوں کے کپڑے اُن کے تن سے اُتروا لیتی ہیں"

راجہ —— "یہ کیا، کپڑے کیونکر اُتروا لیتی ہیں"

کملا —— "کچھ نہیں، مہاراج، جانے دیجئے، بات یہ ہے کہ میرا جی اب صرف موٹے جھوٹے کپڑوں ہی کو چاہتا ہے، ریشم اور سونا بہت پہن چکی، اب ان سے جی گھبرا اٹھا ہے، اس میں کسی کا کیا حرج ہے"

راجہ —— "حرج؟ حرج کیوں نہیں، لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، اور جگدیش پور خبر پہونچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے، تو آخر کیا کارن تو نہیں ہے، جو اس طرح یہ نا لگی ہوئی موٹے کپڑے

کی ساری استعمال کرے "

کملا ــــ " مہاراج، یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں راجہ کے گھر میں پیدا ہو گئی، اگر کسی فقیر کے جھونپڑے میں پیدا ہوتی تو یہ کپڑے بھی میسر نہ آتے "

راجہ ــــ " ٹھیک ہے، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جب تم راجہ کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو راجکماریوں ہی کی طرح تم کو رہنا بھی چاہئے، اگر پرمیشور نے ہم کو دیا ہے تو اس کو برتنا بھی چاہئے "

کملا ــــ " مہاراج، پرمیشور کا ذکر آپ کیوں بیچ میں لاتے ہیں وہ کیوں کسی کو دینے لگا، اس کو کیا غرض کہ سو کو تباہ کر کے ایک کا گھر بھر دے وہ اگر تقسیم کرتا تو آج یا تو ساری دنیا دولتمند ہوتی یا سب کی سب مفلس و نادار "

راجہ ــــ " تو یہ دولت و عزت جو آج ہمیں حاصل ہے وہ پرمیشور کی دی ہوئی نہیں ہے "

کملا ــــ " ہرگز نہیں، بلکہ خود حاصل کی ہے اور اتنی بڑی قیمت دے کر حاصل کی ہے کہ مجھے تو سوائے خسارہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا "

راجہ ــــ ہاں، بیشک قیمت دی ہے اور واقعی بڑی قیمت دی ہے لیکن خسارہ کیسا ؟ اگر ہمارے باپ دادا نے اپنا خون بہا کر، یہ سب کچھ حاصل کیا تھا تو کیا آج ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں اور اس میں خسارہ کی کون سی بات ہے "

کملا ــــ " مہاراج دنیا میں وہی خون قیمتی ہے جو دوسروں کے لئے بہایا جائے، لیکن اپنا خون اگر خود اپنے لئے بہایا گیا ہے تو ممکن ہے اس کی قیمت زر و جواہر، زمین و املاک کی صورت میں یہاں مل جائے لیکن پرمیشور کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں "

راجہ ــــ " تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں حکومت چھوڑ کر تمہارے سوامی جی کی طرح پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ جاؤں "

کملا ــــ " نہیں مہاراج، میں یہ نہیں کہتی، گو دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے اور بڑے بڑے راجاؤں نے ایسا بھی کر دکھایا ہے، بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جو زندگی میں بسر کر رہی ہوں اس سے تعرض نہ کیا جائے، کیونکہ میری راحت اسی میں ہے "

راجہ ــــ " میں نے اگر یہاں تم کو اس کی اجازت دے بھی دی تو کل جگدیس پور جا کر کیا ہوگا، کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ اس کو گوارہ کر لیں گے، یہاں تو خیر تم راجکماری ہو، مگر وہاں تو مہارانی ہوگی، راج کی عزت کا انحصار تمہاری ذات پر ہوگا، یہ کیونکر ممکن ہے کہ تم بھکارنوں کی طرح دربار میں

آؤ اور ان کی عزت خاک میں ملا دو "

کملا —— " ہاں، مہاراج میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ اس حال میں میرا وہاں جانا مناسب ہے یا نہیں اور ممکن ہے کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے "

راجہ رنبیر سنگھ جس کا غصہ اب ضبط سے باہر ہو چکا تھا، کھڑا ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ " کملا تم میری محبت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، میں خوب سمجھتا ہوں کہ تمہارا دماغ کس نے خراب کیا ہے اور میں آج ہی رتن گڈھ کو اس کے وجود سے پاک کئے دیتا ہوں، جو تم کو بھی اپنا ہی ایسا خوار و ذلیل دیکھنا چاہتا ہے "

کملا بھی ساتھ ہی ساتھ اٹھی لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، راجہ رنبیر سنگھ چلا گیا اور کملا بھی آنسوؤں کے چند قطرے فرش پر گرا کر پشت کے دروازہ سے نکل گئی

(باقی)

باب الاستفسار

مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا

(جناب سید اصغر علی صاحب - ٹونک)

بعض تفاسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور یہ عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا

(نگار) ہر چند مسلمانوں کی مذہبی روایات میں علاوہ مسیحی و یہودی عنصر کے اور بھی دیگر عناصر اس قدر شامل ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کے نکالنے کی کوشش کرے تو اسلام میں "لا الٰہ الا اللہ" بھی باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ توحید کا خیال بھی کوئی نیا خیال نہ تھا اور ریگستان عرب میں رسول اللہ کے ظہور سے قبل خدائے واحد کی پرستش کا آوازہ کئی بار بلند ہو چکا تھا۔ یعنی ہر چند اسلام نے مذہب کے باب میں کسی احداث یا ابداع کا مدعی نہ تھا اور مذاہب سابقہ کی تصدیق ہی اس کا مدعا تھا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ ہر رطب و یابس جو اُن مذاہب میں پایا جاتا تھا وہ اسلام میں بھی لے لیا گیا اور تمام وہ روایات جو یہودیوں، نصرانیوں، آتش پرستوں یا دیگر مسلک والوں میں پائی جاتی تھیں اُن پر ایمان لانا، اسلام کا ضروری جزو قرار پایا۔

یقیناً ایسا نہ ہونا چاہئے، لیکن ہوا یہی اور اب عام طور پر اسلام جس معتقدات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے وہ بہت کچھ

خرافیات پر مشتمل ہے ــــــ آپ کوئی مذہبی کتاب، کوئی تفسیر اٹھا لیجئے، آپ کسی مولوی سے جزئیات ایمان پر گفتگو کیجئے، کسی واعظ کا وعظ سنئے، آپ یہ معلوم کرکے حیران رہ جائیں گے کہ اسلام جس کے متعلق بالکل سادہ و فطری مذہب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، نہایت زبردست صنمیاتی لٹریچر اپنے اندر رکھتا ہے، جس پر ایمان لانا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا قرآن و رسول پر، کیونکہ یہ تمام باتیں احادیث سے مستنبط بتائی جاتی ہیں اور حدیث چونکہ فرمودۂ رسول ہے اس لئے اس کا ماننا فرض ہے خواہ عقل میں آئے یا نہ آئے اور خیر! یہ تو کوئی کہہ سکتا ہی نہیں کہ حدیث کا کیا اعتبار جبکہ ابوہریرہ اس کے راوی ہیں اور امام بخاری اس کو صحیح سمجھنے والے

الغرض مدعا یہ کہ موجودہ اسلام جو زیادہ تر جامعین احادیث اور ان کے راویوں کا اسلام ہے، اتنا ہی عجیب و غریب ہے جتنا کوئی مذہب اس دنیا میں ہو سکتا ہے اور مشکل ہی سے کفر و اسلام کے درمیان کوئی خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہایت دلچسپ چیز ہے، لیکن غالباً اس سے زیادہ دلچسپ موضوع یہ ہے کہ ایک مذہب کے معتقدات کا ماخذ اصلی کیا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ہم نے ایک مسلسل مضمون عہد عتیق کے ماخذ روایات کے متعلق شائع کیا تھا جو اہل علم کے طبقہ میں بہت پسند کیا گیا۔ بہ سلسلۂ استفسار جو مسئلہ آپ نے پیش کیا ہے وہ بھی اسی طرح پیروانِ محمدؐ و مسیح دونوں میں یکساں طور پر اہمیت رکھتا ہے، درانحالیکہ دونوں اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وہ خالص بُت پرستوں کی یادگار ہے

آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے تو وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے کیونکہ رسول اللہ کی احادیث اس باب میں موجود ہیں۔ درانحالیکہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا خواہ وہ مصلوب ہونے کے ساتویں دن مانا جائے یا قیامت کے قریب، اصنامی روایات قدیمہ سے لیا گیا ہے اور حقیقت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں

مسیح کی وفات کو ۳۰۰ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور سلطنت روما نے ابھی تک عیسوی مذہب اختیار نہیں کیا ہے، ہرچند بعض شاہانِ روما اس نئے مذہب کی طرف اپنا میلان ظاہر کر چکے ہیں اور ایک دو کلیسے بھی تعمیر ہو چکے ہیں، لیکن شہر کی آبادی جو لاکھوں نفوس پر مشتمل ہے، ہنوز اس نئے مذہب سے متنفر ہے اور نہ صرف عوام بلکہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور اعیان و امراء کی جماعت بھی مذہب و عقائد مذہب کے لحاظ سے عہد تاریک کی باطل پرستیوں میں مبتلا ہے

ہاں، تواریخ ۳۰۸ء کا ذکر ہے کہ روما میں موسم بہار کی مسرتیں شروع ہو گئی ہیں اور ۱۷ مارچ کو پوجاریوں کی جماعت ہاتھوں میں نرکل لئے ہوئے نکلی ہے جو گویا اس امر کا اعلان ہے کہ سائبل دیوی کی پوجا کا مقدس ہفتہ

شروع ہو گیا ہے

اس کے پانچ دن بعد ہی پوجاری ایک بت لئے ہوئے سڑکوں سے گزرتے ہیں اور مندر تک اُسے پہونچا دیتے ہیں یہ بت ایک خوبصورت نوجوان دیوتا کا ہے جو ایک صنوبر کے درخت سے بندھا ہوتا ہے اور اس کے چہرہ پر موت کی زردی چھائی ہوتی ہے۔ یہ بت اتیس دیوتا کا ہے اور یہ رسم گویا اس کی موت پر اظہار غم کے لئے اختیار کی جاتی ہے

اس کے بعد کا دن "خونیں دن" کہلاتا ہے، یعنی وہ دن جب اتیس کا خون بہایا گیا تھا۔ اس کی یادگار میں۔ پوجاریوں کو بھی خون آلود ہونا پڑتا تھا اور مشرق میں جہاں یہ رسم انتہائی جوش کے ساتھ ادا کی جاتی تھی۔ پوجاری اپنے عضو مخصوص کو کاٹ کر سائبل دیوی کی قربانگاہ پر نذر چڑھا دیا کرتے تھے، لیکن روما میں اس کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ صرف اپنے جسم کو جابجا زخمی کر لیا کرتے تھے تاکہ اتیس کی موت کا غم ہر سال تازہ رہے۔

اس کے دوسرے دن اتیس کے دوبارہ زندہ ہونے پر جشن منایا جاتا تھا اور یہ تقریب اتنی پُر مسرت ہوتی تھی کہ سارا روما گویا دیوانہ ہو جاتا تھا اور جو جس کے جی میں آتا تھا کر رہا تھا۔ دو دن بعد پوجاریوں کی جماعت ایک سیاہ پتھر کو جو فی الحقیقت بُت تھا اور (جس کا بالائی حصہ نقرئی ہوتا تھا) غسل دینے کے لئے ایک جگہ لیجاتے اور پھر وہاں سے باجے بجاتے ناچتے کودتے اور نہایت فحش گانے گاتے ہوئے واپس آتے

یہ بیان ہے اگسٹائن کا جو اس وقت تک عیسائی نہ ہوا تھا اور جس نے خود اپنی آنکھوں سے ۳۸۵ء میں اس رسم کو دیکھا تھا۔ اور تعجب کرتا تھا کہ عیسائیوں کے اس عقیدہ کو کہ مسیح مصلوب ہونے کے ساتویں دن پھر زندہ ہو کر آسمان سے زمین پر واپس آئے اہل روما کے اُن بت پرستانہ مراسم سے کتنی مشابہت ہے۔ جس طرح اتیس کو وہ صنوبر کے درخت سے بندھا ہوا دکھاتے ہیں اسی طرح عیسیٰ کو صلیب سے بندھا ہوا بتاتے ہیں اور جس طرح وہ دوبارہ زندہ ہوا تھا بالکل اسی طرح مسیح کی نسبت بھی بیان کرتے ہیں ـــــــ یہ اگسٹائن وہی شخص ہے جس کے متعلق کبھی یہ خیال بھی نہ قائم ہو سکتا تھا کہ آئندہ چل کر سنٹ اگسٹائن کے مقدس نام سے تمام عیسوی دنیا میں مشہور ہونے والا ہے

سنٹ جروم جس کے بیان کی صداقت سے عیسوی دنیا کے کسی ہر فرد کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی لکھتا ہے کہ

> "بُت پرستی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ کا عاشق جو نہایت خوبصورت نوجوان تھا، مار ڈالا گیا تھا اور پھر ماہ جون میں دوبارہ زندہ ہو گیا تھا، چنانچہ جون کا مہینہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہے اور اس دیوتا کے مرگ و زیست کی یادگار نہایت اہتمام سے ہر سال منائی جاتی ہے"

(حاشیہ صفحہ ۶۹) لہ اہل روما کے مضیات کی ایک دیوی جو تمام دیوتاؤں کی ماں سمجھی جاتی تھی۔

جروم جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ فلسطین میں بسر کیا تھا لکھتا ہے کہ یہ رسم تمام سرزمین عراق و فلسطین میں رائج تھی اور بالکل قدیم اہل روتہ کی خرافیانی روایات کے مطابق تھی۔ فرق اگر تھا تو صرف اسقدر کہ وہاں اس کا نام ایسس تھا اور یہاں تموز، وہاں سائبل دیوی تھی اور یہاں اشتار۔ بالکل یہی روایت یونانیوں کے یہاں بھی پہونچی اور وہاں ان دونوں کا نام اڈونس اور وینس ہوگیا

الغرض عیسوی مذہب جہاں جہاں پہونچا کسی نہ کسی دیوتا کے مرگ و زیست کا فسانہ ہر جگہ پایا جاتا تھا اور اس کی یادگار ہر مقام پر نہایت اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ سرزمین عراق میں اُر سے لے کر یروشلم تک، اس مرکر زندہ ہونے والے دیوتا کا نام تموز تھا۔ فلسطین کے شمال اور تمام ایشیائے کوچک میں اُسے ایسس کہتے تھے اور یونانیوں میں وہ اڈونس کے نام سے مشہور تھا ـــــ رہ گیا مصر سو وہاں بھی دریائے نیل کے ساحل پر ہر سال اوسیرِیس دیوتا کے ہلاک کئے جانے اور پھر اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی تقریب پر میلہ لگا کرتا تھا، اور ایران میں عیسوی مذہب سے صدیوں قبل مذہب "مترائیت" رائج تھا اور وہاں بھی مترا کے مرکر زندہ ہونے پر ہر سال جشن منایا جاتا تھا

جس زمانہ میں عیسوی مذہب سرزمین یونان میں پھیلا، تمام مذاہب قدیمہ اور ان کے روایات اضافی وہاں کثرت سے شایع تھے، اور تقریباً تمام مذاہب کے لوگ اپنی رسمیں آزادی سے ادا کرتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عیسوی مذہب کو بھی ان سے متاثر ہونا چاہئے تھا، چنانچہ وہ متاثر ہوا اور مسیح کے مصلوب ہوکر دوبارہ زندہ ہونے کی روایت انھوں نے بھی لے لی

رہ گئے اہل عرب، سو ان کے یہاں چونکہ نصرانی اور یہودی روایات پر اعتماد کرنے کا دستور چلا آرہا تھا، اس لئے اسلام لانے کے بعد بھی وہی کیفیت باقی رہی اور مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ جوں کا توں انھوں نے بھی اختیار کرکے اس کی توثیق کے لئے احادیث وضع کرلیں

قرب قیامت کی علامت میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مسیح آسمان سے اُتر آئیں گے۔ اور مہدی آخرالزماں کا ظہور ہوگا، یہ عقیدہ بھی انھیں اصنامی روایات قدیمہ کی یادگار ہے اور کسی طرح اس کو خالص اسلامی چیز نہیں کہہ سکتے

قرآن مجید ان میں سے کسی بات کی تصدیق نہیں کرتا، اس لئے ایک مسلمان ان کے ماننے پر مجبور نہیں البتہ وہ لوگ جو احادیث کو قرآن سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں، یا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن بغیر احادیث کی مدد کے سمجھ میں آہی نہیں سکتا، ایسا کہتے ہیں تو کہنے دیجئے

ایک لفظ اور مصرع کی تحقیق

(جناب ز - بیگم صاحبہ حیرت - شملہ)

(۱) لفظ ناگزیر ہے یا ناگریز، اگر پہلی صورت درست ہے تو کیونکر

(۲) "از سقف خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو" اس مصرعہ کے باقی اشعار کیا ہیں اور کس نے کہے ہیں

(نگار)

(۱) ناگزیر صحیح ہے اور ناگریز غلط فارسی میں گزیر کے معنی چارہ و علاج کے ہیں اور ناگزیر "ضرورت" کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے

(۲) جس نظم کا یہ مصرعہ ہے وہ وحشی کی ہے - پوری نظم یہ ہے :-

زیبا تر آنچہ ماندہ زبابا ازانِ تو
بدا سے برادر از من و اعلیٰ ازانِ تو

ایں طاس خالی از من و آن کوزۂ کہ بود
پارینہ پُر ز شہدِ مصفا ازانِ تو

یا بوئے ریسمانِ گُسل، میخ کَن ز من
مہمیز کلہ تیز و مطلا ازانِ تو

آں دیگ لب شکستۂ صابون پزی من
آں چمچۂ ہریسہ و حلوا ازانِ تو

آں قوچِ[1] شاخ کج کہ زند شاخ ازانِ من
غوغائے جنگ قوچ و تماشا ازانِ تو

ایں استرِ[2] چموشِ[3] لگد زن ازانِ من
ایں گربۂ مصاحبِ بابا ازانِ تو

از صحن خانہ تا بہ لبِ بام ازانِ من
وز بام خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو

ایک نظم میلی نے بھی اسی زمین میں لکھی تھی، فرق یہ ہے کہ وحشی نے بھائی سے خطاب کیا ہے اور میلی کا

---

[1] قوچ، بکری کو کہتے ہیں [2] استر، خچر کو کہتے ہیں [3] چموشش، شریر لات مارنے والے جانور کو کہتے ہیں

غور فرمایا ہے کہ خدا یا قدرت کے مقابلہ میں کیا انسان کی ہستی چیونٹی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اگر انسان اپنی جگہ حشر و نشر کا عقیدہ لئے بیٹھا ہے تو کیا فطرت کو اس پر ہنسی نہ آنی چاہیے

دلگیر اکبرآبادی مرحوم

دلگیر مرحوم میرے اُن احباب میں سے تھے جن سے باوجود تعلق قطع ہوجانے کے تعلق باقی رہا ——— یعنی باوصف اس کے کہ ایک زمانہ سے میں اُن سے بے خبر تھا اور وہ مجھ سے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ آگرہ وجوارِ آگرہ کا خیال آیا ہو اور دلگیر مرحوم سامنے نہ آگئے ہوں

اوّل اوّل میری اور ان کی شناسائی اب سے تقریباً ایک رُبع صدی قبل اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے اجرائے نقاد کے سلسلہ میں، یو۔پی کے بعض شہروں کا دورہ کیا تھا اور سراتھو سے لوٹتے ہوئے (جہاں اس وقت مہدی مرحوم تحصیلدار تھے) فتحپور میں قیام کیا تھا

ہر چند اس وقت میں بھی اُن کی طرح جوان تھا، لیکن میری جوانی صرف رعنائیٔ خیال تک محدود تھی اور اُن کی، پرستاریٔ جمال سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ —— اس لئے ان کا دو دن کا قیام، میرے لئے پُر لطف ہو یا نہ ہو لیکن ولولہ انگیز ضرور تھا اور غالباً یہ کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ ادبیات کی طرف میری توجہ کے جو اسباب اوّل اوّل پیدا ہوئے، اُن میں ایک بڑا سبب دلگیر کی ذات بھی تھی ——— پھر نقاد کو انھوں نے جس شان سے نکالا، اور جس انشاء کو وہ پیش کرنا چاہتے تھے؛ اس کے لکھنے والوں کو ڈھونڈھ نکالنے میں جس کاوش سے انھوں نے کام لیا، وہ حقیقتاً اُنھیں کا حصّہ تھا

دلگیر غالباً جناب غوث الاعظم کی اولاد میں سے تھے۔ اور اسی لئے ان کے نام میں لفظ شاہ کا اضافہ پایا جاتا تھا۔ اور کچھ جائداد بھی بطور جاگیر اُن کے خاندان میں منتقل ہوتی چلی آرہی تھی ——— مجھے یاد نہیں خود انھوں نے یا کسی اور نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ بہرحال یہ بات میرے دماغ میں محفوظ ہے کہ سال میں ایک بار غالباً عشرۂ محرّم کے کسی تاریخ میں وہ اُس طلائی علم کو لوگوں کے زیارت کے لئے باہر نکالتے تھے جسے اُن کے مورثِ اعلےٰ جیلان سے ہندوستان لائے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ۔ سید بھی لکھتے تھے، درانحالیکہ خود جناب غوث الاعظم سید نہ تھے بلکہ شیخ تھے

اس سے مدعا یہ ہے کہ دلگیر کسب معاش کی طرف سے مطمئن تھے اور دُنیاوی افکار کی وہ اُلجھنیں جو ہندوستان کے بہت سے ذہین دماغوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں کبھی ان کی راہ میں حایل نہیں ہوئیں، اور اسی لئے جب تک نقاد جاری رہا۔ خریداروں سے بے نیاز ہو کر جاری رہا اور اس کی اصلی شان کو دلگیر نے ہاتھ سے نہ جانے دیا

چونکہ دلگیر کا ذکر عین نقاد کا ذکر ہے اور اُن کی زندگی کا صرف وہی حصّہ قابل التفات ہے جو نقاد کی خدمت میں صرف ہوا، اس لئے اُن کی دیگر ذاتی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے، بار بار نقاد ہی کا نام زبان پر آتا ہے جس نے ان کو ملک سے روشناس کیا

نقاد پہلی بار کیوں بند ہوا، اس کا حال تو معلوم نہیں، لیکن دوبارہ جاری کس طرح ہوا، اس سے ملک کا ہر ادیب واقف ہے ـــــ دہلی کی کوئی خاتون" قمر زمانی بیگم" دلگیر مرحوم کے ادبی خدمات کا اعتراف کرتی ہوئی ان کو دہلی طلب کرتی ہیں۔ یہ وہاں پہونچتے ہیں، رفتہ رفتہ رسم بڑھتے ہیں اور آخر کار خود خاتون ادارت نقاد کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتی ہیں ـــــ ہائے، یہ بھی کیا زمانہ تھا، جب دلگیر ایک مجسمہ کیف و رنگ تھے۔ اور ان کی ہر ہر سانس عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نکلتی تھی

برسات کا موسم ہے، بھوپال کے ذرہ ذرہ سے جوشِ مستی اُبل رہا ہے، یادش بخیر ملک حبیب احمد صاحب کے مکان پر احباب کا قیام ہے اور دلگیر بھی موجود ہیں۔ کوئی کسی خیال میں ہو، لیکن دلگیر اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں ـــــ ایک دن شام کو ہم سب حمیدیہ روڈ پر ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے کہ دفعۃً شام کے دھندلکے اور سرد ہواؤں کے جھونکوں نے دلگیر کو بیتاب کر دیا اور وہ وہیں سڑک پر کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے، پوچھا گیا۔ شاہ صاحب خیر تو ہے۔ لیکن شاہ صاحب وہاں کہاں تھے۔ تھوڑی دیر بعد دفعۃً اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر (اس زور سے کہ اگر وہ ہاتھ کسی انسان کے جسم پر پڑ جاتا تو سُرمہ ہو کر رہ جاتا) بولے کہ، سنو، اور سردھنو، یہ کہکر انھوں نے قمر زمانی بیگم کا ایک مضمون جس کا عنوان شاید "کلی سے" تھا، اور جو حال ہی میں انھیں ملا تھا اور ابھی تک شایع نہ ہوا تھا، سُنانا شروع کیا، وہ انھیں زبانی یاد تھا ـــــ اس میں شک نہیں کہ مضمون نہایت پاکیزہ تھا، لیکن اس کی معنوی خوبی کا علم اس وقت ہوا جب دلگیر نے کہا کہ " تم لوگوں کو معلوم ہے کہ کلی سے مُراد کیا ہے " اور پھر خود ہی بول اٹھے کہ " یہ کلی میں ہوں "

اس ایک واقعہ سے مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نقاد کا دور ثانی خود دلگیر کے لئے کس درجہ نشہ آور تھا اور یہ ایک خاتون کی شرکت نے ان کو اور اُن کے رسالہ کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا تھا

افسوس ہے کہ نقاد کا یہ دور" دولت مستعجل" ثابت ہوا۔ اور ایک سال کے اندر ہی اندر عروج

وزوال کیا حیات وموت کی تمام منزلیں ختم ہوگئیں ــــــــ فرزمانی بیگم کون تھیں، اور اتنا التفات غار دہر کرتے کرتے کیوں دفعتہً کنارہ کش ہوگئیں۔ یہ راز آج تک پبلک میں نہ آسکا، کیونکہ اس کے بعد جو خاموشی دلگیر نے اختیار کی وہ اخیر وقت تک دور نہ ہوئی اور ادبی دنیا سے وہ اس حد تک کنارہ کش ہوئے کہ آخر کار آنریری مجسٹریٹ بن گئے، اور اخیر دم تک یہی بنے رہے

دلگیر خود بھی ایک خوش گو شاعر تھے اور انشاء عالیہ کو بہت پسند کرتے تھے، شعر ایک خاص جوش کے ساتھ پڑھتے تھے اور بے اختیار ہوجاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن جب انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا

یہ میکدہ کی بھیڑ، یہ انبوہ، یہ ہجوم
ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

تو وہ دفعتہً کھڑے ہوگئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر رقص کرنے لگے

افسوس ہے کہ نقاد کے بند ہونے کے بعد اُن کی زندگی بالکل دوسری ہوگئی اور شعر وسخن یا ادب وانشا سے انھیں کوئی لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ اُن کی علالت کا حال بھی مجھے ان کی زندگی میں نہ معلوم ہوا اور موت کی خبر تو ظاہر ہے مرنے سے پہلے معلوم ہی نہیں ہوسکتی۔ ان کے بڑے بیٹے سید شاہ انتظام الدین جمالی ایم۔ اس۔ سی، اُن کے جانشین ہیں، خدا کرے یہ اپنے باپ کے فرزند معنوی بھی ثابت ہوں اور اُن کی یادگار نہیں کم از کم ان کا دیوان ہی مرتب کرکے شایع کراسکیں (اگر واقعی کوئی دیوان موجود ہے)

باب الانتقاد

مخزن المفردات ہومیوپیتھی ہومیوپیتھی یعنی علاج بالمثل کا طریقہ اب اسقدر عام، اسدرجہ مقبول اور اتنا مفید ثابت ہوتا جارہا ہے کہ اس کی اہمیت پر گفتگو کرنا لایعنی سی بات ہے۔ ہندوستان میں اول اول اس طریق علاج کو بنگال نے قبول کیا اور اسکے بعد رفتہ رفتہ تمام ملک میں اسکی اشاعت ہونے لگی، حتیٰ کہ ہندوستان میں اب شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کے کانوں تک یہ آوازہ نہ پہونچی ہو اور شاید ہی کوئی اگر ایسا ہو جس کو ایک آدھ بار اس سے واسطہ نہ پڑا ہو —— یہ طریق علاج اپنی ارزانی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے لئے اتنا موزوں و مناسب ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے، پھر فائدہ کا یہ عالم ہے کہ اگر دوا ٹھیک تجویز ہوجائے تو تیر کی طرح کام کرتی ہے

انگریزی میں تو خیر کثرت سے اور بڑی بڑی تصانیف اس موضوع پر پائی جاتی ہیں، لیکن اُردو میں بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دو چار کتابیں لاہور سے اور اتنی ہی لکھنؤ سے شایع ہوچکی ہیں، لیکن کوئی ایسی تصنیف جو پورے طور پر خواص الادویہ کو حاوی ہو کوئی نہ تھی —— اب ڈاکٹر کانشی رام صاحب ہومیوپیتھ نے جو عرصہ سے یہیں لکھنؤ میں اپنا کامیاب مطب چلا رہے ہیں اس کمی کو پورا کیا اور تین ضخیم جلدوں میں مخزن المفردات ہومیوپیتھی شایع کرکے ایسی بیش بہا خدمت ملک و قوم کی انجام دی ہے کہ اسکی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے —— ہومیوپیتھی میں اصل چیز یہ معلوم کرنا ہے کہ کسی دوا کی کیا خصوصیات ہیں، یعنی ایک مریض کے حالات کس دوا کے علامات سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور اصل ڈاکٹر وہی ہے جو ایسی دوا کو ڈھونڈھ نکالے۔ پھر جو لوگ عرصہ سے اس کام کو کر رہے ہیں اور روز کے تجربہ سے انھیں معلوم ہوچکا ہے کہ فلاں فلاں امراض میں زیادہ تر فلاں فلاں ادویہ کے علامات نمودار ہوتی ہیں، ان کے لئے تو نسخہ تجویز کرنا چنداں دشوار نہیں، لیکن عام لوگوں کے لئے یہ بہت دشوار ہے اور اسی دشواری کی دور کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ کتاب شایع کی ہے۔

تینوں جلدیں تقریباً ۰۰۰ ۳ صفحات محیط ہیں اور تمام اُن دواؤں کے خواص سے بحث کرلی ہیں جن کے متعلق ہومیوپیتھی میں اس وقت تک تحقیق مکمل ہوچکی ہے —— ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب کی طیاری میں نہ صرف انگریزی کی متعدد کتابوں سے مدد لی ہے بلکہ خود اپنے تجربات بھی پیش کئے ہیں جو انس مفید و کارآمد ہیں اسی کے ساتھ ہر دوا کے علامات اسقدر بشرح و بسط کے ساتھ بتائے ہیں کہ اگر بغور ان کا مطالعہ کیا جائے تو دوا کی تجویز میں غلطی کا بہت امکان بڑھ جاتا ہے —— پھر زبان بھی بہت صاف اور طرز بیان بھی سلجھا ہوا ہے —— وہ حضرات جو اس فن سے کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا اپنے پاس رکھنا لازم ہے —— تینوں جلدوں کی یکجائی قیمت ۱۶ـہ کسی طرح زائد نہیں —— بھارت ہومیو رسٹو، چوراہا قیصر باغ لکھنؤ، اس کے ملنے کا پتہ ہے

نسخہ جات ہومیوپیتھی یہ کتاب بھی ڈاکٹر کانشی رام صاحب کی تالیف ہے اور ان لوگوں کے لئے جو

معمولی امراض میں بغیر زیادہ کاوشش کے دوا تجویز کرنا چاہتے ہیں۔ بہت کارآمد ہے۔ اس میں ردیف وار تمام امراض کا ذکر کرکے اس کی دوائیں درج کردی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ مختصراً یہ بھی بتا دیا ہے کہ کن کن حالات میں کونسی دوا دینا مناسب ہے۔ خوراک کا وقفہ اور دوا کی طاقت بھی ساتھ ساتھ ہی دے دی گئی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ سفر و حضر میں ہر وقت انسان کے پاس رہے۔ قیمت عہ ہے اور بھارت فارمیسی سے یہ بھی مل سکتی ہے

جرمنی کی قومی بیداری اسوقت سیاسیات عالم میں جرمنی کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بین الاقوامی سیاست کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے سمجھنے کے لئے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری نہ ہو۔ یہ کتاب فی الاصل فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی، جس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور اب انگریزی سے اُردو میں ہوا ہے۔ اس کے مترجم محمد امیر الحسن صاحب ہیں جو ٹائمس آف انڈیا کے رپورٹر ہیں

اس کتاب میں موجودہ نازی تحریک کے آغاز و نشو و نما، اس کے داخلی و خارجی اسباب، ہٹلر کے حالات زندگی، اور اس کے پروگرام سے بحث کرتے ہوئے جرمنی کی جدید خارجہ پالیسی اور یہودیوں کے خلاف جرمنی تحریک سے مفصل بحث کی گئی ہے ـــ ترجمہ صاف و سادہ ہے۔ گو کہیں کہیں الجھا ہوا ہے ـــ اس کی قیمت ۱۲ار ہے اور ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہے

محمد امیر الحسن صاحب ـــ عدن والا بلڈنگ۔ دوسرا مالہ۔ روم نمبر ۴۸ پریل روڈ۔ بمبئی

سمندر کا عجائب خانہ سلسلۂ عجائبات قدرت کی یہ پہلی کتاب ہے جسے سید محمد عسکری جعفری نے تالیف کیا ہے۔ اس میں آبی جانوروں کے دلچسپ حالات نہایت صاف و شگفتہ زبان میں بیان کئے ہیں اور جا بجا نقوش و تصویریں بھی دیدیے ہیں ـــ نیچرل ہسٹری کے متعلق ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے اور اگر مؤلف نے اسی طرح اس سلسلہ کو رفتہ رفتہ مکمل کردیا تو بڑی خدمت ملک و زبان کی ہوگی۔ یہ کتاب ۱۲ار میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے

معیار ادب انڈین پریس الہ آباد نے اس نام سے چار ریڈریں، پانچویں، چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں جماعت کے لئے شایع کی ہیں۔ ان کو سید حامد علی صاحب اور قاضی خورشید احمد صاحب نے متفقہ کوشش سے مرتب کیا ہے ـــ ان ریڈروں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام مضامین خواہ وہ نظم کے ہوں یا نثر کے انتخاب نہیں کئے گئے ہیں۔ بلکہ اوریجنل ہیں۔ اور اس بات کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں کہ کس جماعت میں کس قسم کے اسباق ہونے چاہئیں

گو زبان و محاورہ کی غلطیاں ان میں بھی پائی جاتی ہیں ـــ تاہم دوسری ریڈروں کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہیں

صنمخانۂ خیال

شیریں لبوں میں خلد کا مفہوم بے نقاب
زلفوں میں جھومتی ہوئی موجِ جنوں نواز

موجِ جنوں نواز میں طوفانِ بیخودی
طوفانِ بیخودی میں تمناؤں کا گداز

باتوں میں لہلہاتی ہوئی جام کی کھنک
اور جام کی کھنک میں بہاروں کے برگ و ساز

اعضا میں لوچ، باتوں میں رس، دل میں مستیاں
آنکھوں میں نور، نور میں رنگینیٔ مجاز!

رنگینیٔ مجاز میں گہری حقیقتیں
گہری حقیقتوں میں بہت ہی عمیق راز

رازوں میں میرے شعر کا سرچشمۂ جمال
وہ ہیں عدم کہ ایک صنم خانۂ خیال

عدم

التفاتِ اولیں

ہوا خوابِ تمنا صرفِ تعبیرِ فراموشی
اب احساسِ کشش ہے ۔ اور نہ زنجیرِ فراموشی

تغافل ہی تغافل رہ گیا بزمِ محبت میں
جھلکتی ہے ہر آئینے میں تصویرِ فراموشی

بسایا تھا کبھی قصرِ محبت جن نگاہوں نے
نظر آتی ہیں اب مصروفِ تعمیرِ فراموشی

جسے تم خود کبھی اپنا شہیدِ ناز کہتے تھے
وہی محروم ہے اب زخمیٔ تیرِ فراموشی

بجھانا تھا تمھیں شمعِ محبت کو بجھا بیٹھے
بھلانا تھا تمھیں نا شادِ الفت کو ۔ بھلا بیٹھے

مگر شاداب ہے میری وفا کا گلستاں اب بھی
یہ دنیا ہے ہم آغوشِ بہارِ بے خزاں اب بھی

جو اک میکش کو بابِ میکدہ تک کھینچ لائی تھیں
وہی مدہوشیاں ہیں کارواں در کارواں اب بھی

بہت سی داستانیں صبح تک دہرائی جاتی ہیں
بتاتے ہیں مری خاموشیوں کے رازداں اب بھی

وہی رنگینیاں اب تک گذرگاہِ تخیل میں
بہشت آباد ہوتی ہیں مری تنہائیاں اب بھی

غرض ـــ اب بھی وہی دورِ وفا بنیادِ باقی ہے
تمھارے التفاتِ اولیں کی یاد باقی ہے

روشن صدیقی

خواب بیداری

نصفِ شب کی خنک فضاؤں میں
کہکشاں کی لطیف چھاؤں میں

چپ سے ہوتے ہیں جب در و دیوار
سرد ہوتا ہے جب ہر اک بازار

چھائی ہوتی ہے جب مناظر پر
ایک کیفیتِ سکوں پرور

آسمانوں پہ ماہ و انجم سے
جب ابلتے ہیں نور کے چشمے

سبزۂ محوِ خواب پر پیہم
جب فضا سے ٹپکتی ہے شبنم

جب سناتی ہے شب کی خاموشی
ہلکی ہلکی لطیف موسیقی

قدسیوں کے گروہ پر کھولے
جب اترتے ہیں آسمانوں سے

زہرۂ عرش کے ترنم پر
رقص کرتے ہیں جب مہ و اختر

محوِ گلگشت ہوتی ہیں روحیں
خواب کے جب بہشت زاروں میں

جبکہ ہوتا ہے نیند میں مخمور
سارے دن کا تھکا ہوا مزدور

جب شجر محوِ خواب ہوتے ہیں
بام و در محوِ خواب ہوتے ہیں

ایسا محسوس ہوتا ہے مجکو
جیسے میں نے شراب پی لی ہو

روح ہوتی ہے غرقِ کیفیت
تیز ہوتی ہے قلب کی حرکت

دوڑتی ہیں سرور کی لہریں
میری رگ رگ میں ریشے ریشے میں

پھر اسی سرخوشی کے عالم میں
ہاں اسی بیخودی کے عالم میں

دفعتاً کوئی سامنے آکر
مجکو بے ہوش و بے خبر پاکر

اپنے رُخ سے نقاب اٹھاتا ہے
میری حالت پہ مسکراتا ہے

اسرار الحق مجاز (علیگ)

کیفِ غم

غم بظاہر اک اثر، اک کیفیت کا نام ہے — فی الحقیقت اک شراب، اک بادۂ بے جام ہے
غم اگر اپنی تجلی سے نہ ضوتابی کرے — ہو نہ ہرگز اس کا عرفاں، روح جس کا نام ہے
غم نہیں جزوِ مسرت تو مسرت کچھ نہیں — وہ حقیقت میں مسرت ہے جو غم انجام ہے
غم نہ ہو تو آئینۂ ہستی کا دھندلا ہی ہے — یہ مری تاریک محفل کا چراغِ شام ہے
غم سے تکمیلِ حیاتِ عشق ہے اے بے خبر — زندگی پُرغم نہ ہو تو زندگی خام ہے
کیوں پسند اسکو کروں جو چیز ہی عالم پسند — ہے پسندیدہ جہاں کو عیش، مجکو غم پسند
ساقیٔ فطرت عطا کر خاطرِ برہم مجھے — ہے گراں اوراقِ گل پر قطرۂ شبنم مجھے
عیش و عشرت نے بھری محفل کو غافل کردیا — بزمِ عالم میں بچھانی ہے صفِ ماتم مجھے
اپنے دل کے خون سے بجھتی ہے میری تشنگی — موجِ بادہ سے نہیں ہے فکرِ کیف و کم مجھے
چاہتا ہوں جرعۂ غم سے نشاطِ بیخودی — ہے ابھی اندیشۂ نیرنگیٔ عالم مجھے
ہر خوشی دنیا کی ہے صرف ایک دھوکا اک فریب — زہر آلودہ نظر آتا ہے جامِ جم مجھے
مست ہوں اپنے خیالاتِ پریشاں میں ہنوز — اک نشاطِ جاوداں ہے کاہشِ پیہم مجھے
کچھ تو ہو دنیا میں اور مجھ میں مذاقِ امتیاز — کیفِ عشرت دے جہاں کو، اور کیفِ غم مجھے

غم سے انساں عالمِ فانی میں سرافراز ہے
غم نہیں، میرے نظامِ زندگی کا راز ہے

فضل الدین آثر (اکبرآبادی)

جوئبار سے خطاب

مست نغموں سے نہ کر دل کو مرے یوں بیقرار — شادمانی سو رہی ہے، اور سونے دے ابھی
میرا دل ہے لذتِ موہوم کا سرمایہ دار — آنسوؤں سے غم کی بارش اور ہونے دے ابھی
دل کا ہر احساس زخمی ہو چکا ہے لاکھ بار — دل کی دنیا کو متاعِ صبر کھونے دے ابھی

فطرت (واسطی)

غزلیات

علی اختر

یہ بھی تنظر کا دھوکا ہے یا کارِ نظر ہے کیا معلوم
سطح پہ ذرّے رقصاں ہیں یا موجِ گہر ہے کیا معلوم

کون نہ جانے محو تم ہو، ناحق شکوہ کیوں کیجئے
چرخ ہے یا اس پردے میں وہ عربدہ گر ہے کیا معلوم

وہ بھی ہیں کچھ کھوئے ہوئے سے جنکو واقف کہتے ہیں
ہستی کے اسرارِ نہاں کی کسکو خبر ہے، کیا معلوم

ہاتوں کو اٹھا اٹھا کر ہمدم! اک مدت سے روتا ہوں
میری آہِ نیم شبی میں کوئی اثر ہے کیا معلوم

ہستی کا ہنگامہ بپا ہے، سانس کے آنے جانے پر
عالم ضبط و تمکیں ہے یا رقصِ شرر ہے کیا معلوم

دیوانے تو دیوانے ہیں ان کو اپنا ہوش نہیں
عقل پہ جنکو ناز ہے اتنا ان کو مگر ہے کیا معلوم

ہجر کی شب طوفانِ ہجومِ اشک میں اتنا ہوش کہاں
سینے میں ہے قلب کہ صرفِ دیدۂ تر ہے کیا معلوم

ہمنے تو رو کر ہی گزاریں گھڑیاں عمرِ فانی کی
ہوگا پاسِ دردِ محبت ان کو اگر ہے، کیا معلوم

مدت گزری اختر کی پائی نہ کسی سے کوئی خبر
مر گیا وہ ناشاد کہ ابتک خاک بسر ہے کیا معلوم

سید اصغر جعفری ساڈھوروی

رنگت بدل گئی ہے تمھاری شباب میں
ڈوبے ہوئے ہو سر سے قدم تک شراب میں

یہ دل ہے محشرِ غم و حسرت سے ان دنوں
دنیا بدل گئی ترے عہدِ شباب میں

شب کو وہ دلکشی تھی کہ ممکن نہیں بیاں
کل تم چھپے ہوئے تو نہ تھے ماہتاب میں

وہ جانِ نغمہ کون سے پردے میں ہے نہاں
جس کی صدائیں گونج رہی ہیں رباب میں

اصغر وہ حسن و عشق کے افسانے یاد ہیں
عالم ہی اور تھا مرے دورِ شباب میں

عبد اللطیف تپش ایم۔ اے

نہ کی ترچھی نظر ہے کیا کہئے
اور پھر اس قدر ہے کیا کہئے

پردہ داری کا کس کی چرچا ہے
کون یہ پردہ در ہے کیا کہئے

قصۂ اشکِ نامرادیِ غیر
منفعل چشمِ تر ہے کیا کہئے

وہ تماشائے خلوت آرائی
اب سرِ رہگذر ہے کیا کہئے

پوچھتے ہیں مآلِ سجدۂ شوق
یہ بھی اک دردِ سر ہے کیا کہئے

شمعِ ہستی کا ابھی افسانہ
کوئی دم میں سحر ہے کیا کہئے

ہونیوالا ہے کیا تپش انجام
ان کو سب کچھ خبر ہے کیا کہئے

راز رامپوری

تری نظر میں ہے سامانِ صد بہار آ جا
بہارِ گلشنِ عالم ترے نثار آ جا

تجھے ہے رسمِ زمانہ پر اختیار آ جا
مٹا کے قیدِ سرِ بام و رہگذار آ جا

بہار و کیفِ حیاتِ بہار کی سوگند
خزاں نصیبوں کی جانب بھی ایکبار آ جا

ابھی تو راز صدائیں شناخت کرتا ہے
ابھی تو ہم تھے ترے آنے کا انتظار آ جا

نگار

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ)
ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ (للعہ)
سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ ۲

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۶	اگست ۱۹۳۴ء	شمارہ ۲

ملاحظات

مرغابی شو کہ کار با طوفان ست

چند سال سے امریکہ میں بہائی مذہب کے متبعین کا ایک ادارہ "دی نیو ہسٹری سوسائٹی" کے نام سے قائم ہے اور وہ اپنے مقاصد میں بین الاقوامی اہلیت پیدا کرنے کے لئے ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر تمام دنیا کے صاحب فکر و اہلِ قلم نوجوانوں کو اظہار خیال کی دعوت دیکر انعامات تقسیم کیا کرتی ہے[1]

[1] اس سوسائٹی کی طرف سے جو اعلان شائع ہوا ہی اسکا ترجمہ جناب خان بہادر صاحبزادہ سرفراز علی خاں صاحب چیف سکرٹری دربار جاورہ نے اُردو میں کردیا ہے اور میں انکا از بس شکر گزار ہوں کہ اس طرف سب سے پہلے مجھے صاحبزادہ صاحب موصوف نے توجہ دلائی، جو اسوقت نہایت ہی روشن خیال، خوش فکر اور سنجیدہ فہم و تدبر رکھنے والے امراء میں سے ہیں۔ جو حضرات اس اعلان کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ صاحب ممدوح سے طلب کرسکتے ہیں۔ (اڈیٹر)

پہلے مقابلہ کا موضوع یہ تھا کہ:۔

"اعلیٰ مدارس کن طریقوں سے دُنیا میں صلح و آشتی کے خیال کو ترقی دے سکتے ہیں"

یہ موضوع صرف امریکہ کی یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے مخصوص تھا جس میں وہاں کے ۱۷۰ طلبہ نے دلچسپی کا اظہار کیا دوسرے مقابلہ کا موضوع یہ تھا:۔

"یونیورسٹیوں کے طلبہ کیونکر تمام دنیا میں ایک انسانی سلطنت قایم کرنے میں مدد کر سکتے ہیں"

اس مقابلہ میں تمام یورپ کے طلبہ کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی اور ۰۰۰ہم مضامین اس موضوع پر موصول ہوئے تھے۔

اب ۱۹۳۶ء کے لئے جو مقابلہ تجویز ہوا ہے اس میں ایشیا کے تمام نوجوانوں کو دعوت شرکت دی گئی ہے اور موضوع سخن یہ ہے کہ:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ دُنیا میں صرف ایک عالمگیر مذہب قایم کیا جائے اور اس باب میں ایشیا کے نوجوان کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں"

یہ مقابلہ گزشتہ جولائی کو ہونے والا تھا اور جو جو مضامین قابل انعام قرار پائے ہوں گے انھیں انعام بھی مل چکا ہوگا، اسلئے اب میرا اس مسئلہ پر گفتگو کرنا اس لئے نہیں ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں کو اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دوں، بلکہ مقصود بتانا ہے کہ اس وقت دنیا میں، قدیم مذہبی اداروں کی طرف سے کسقدر بے چینی پھیل رہی ہے اور نوع انسانی کا یہ اضطراب تدریجی طور پر کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ امریکہ کی اس سوسائٹی کا قیام محض بہائی مذہب کی تبلیغ کے لئے ہو، ممکن ہے کہ اس نوع کے نشر و اعلان میں در پردہ کوئی مذہبی تنگ نظری بھی شامل ہو، لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں ہے، صرف یہ دیکھنا ہے کہ اب مذہب کا جو نظریہ کن اُصول پر قایم کیا جا رہا ہے اور اختلاف مذاہب کی وجہ سے جو شورش و بدامنی، جو قتل و خونریزی اس وقت تک ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کے انسداد کی طرف کیونکر آہستہ آہستہ طبائع انسانی مایل ہوتی جا رہی ہیں اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب یا تو کوئی ایسا زبردست پیغمبر رونما ہو جو اختلافات مذہبی مٹا کر سب کو ایک دین و مسلک سے وابستہ کر (جو تقریباً محال ہے) یا پھر کرۂ ارض سے مذہب کا خیال ہی یکسر محو ہو جائے (جو بالکل قرین قیاس ہے)۔

تاریخ تمدن انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوع آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اُٹھ رہا ہے اور عقاید مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے، اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے، کیا اس کے اُصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم دماغی نشوونما اور ذہنی ارتقاء دینے سے عاری ہے

اس کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں، مذاہب عالم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود

ہوجائے گا کہ یقیناً مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہوا اور اسے حائل ہونا چاہئے تھا کیونکہ مذاہب عالم کی پیدائش نتیجہ تھا صرف مقامی و نسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوع انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آہی نہ سکتا تھا، اگر کوئی مذہب ایشیاء... مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشو و نما ہوا تو وہ اہل مغرب کی طرف سے خالی الذہن تھا، صرف ایک مخصوص جماعت، ایک محدود ملک کی اصلاح کا مقصد اُن کے سامنے ہوتا تھا اور اس لئے قدرتاً وہ ایسے اُصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کے لئے اُن کے ماحول، ان کی معاشرت اور اُن کی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہوں — میری مراد مذہب سے یہاں نہ صرف وہ چند معتقدات ہیں جن کا تعلق صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعیات سے ہے، بلکہ اس شریعت یا اُصول اخلاق و معاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے ماتحت کسی قوم میں رائج ہوجاتے ہیں اور جن کا اختلاف اُصولی اختلاف قرار دیا جاکر باہم کشت و خون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دُنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب، اسلام ہوا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دُنیا میں آخری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے وہ مکمل کہا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا میں جتنے انبیاء ظاہر ہوئے اُن سب نے یہی کہا کہ وہ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، لیکن عملاً وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوسکے کہ ایک محدود جماعت مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور پیدا رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہوگئی۔ اس کا سبب صرف یہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن و عقل میں جو نشو و نما پیدا ہو رہا ہے اس کے اقتضاء کو وہ پورا نہ کر سکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدن و معاشرت کا بلکہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی اس کی عبادت اور حیات بعد الموت سے بھی متعلق ہیں، اور اسی لئے ایک مذہب صرف ہمارے اصول معاشرت و اخلاق منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت بعض متعین و مخصوص عقائد کو تسلیم کرے۔ یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعویدار ہے درآنحالیکہ عقول انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پیدا ہو رہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے — اور غالباً یہی وہ کمزوری ہے جس کو یوں پورا کیا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک طرف ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے، مذہب کے اصول کی دعوت متزلزل نہیں ہو سکتے، اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمال عقل کے اُن تمام باتوں کو چون و چرا تسلیم کر لینے کا جنکو ہمارے اکابر و اسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں جو تضاد و تباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب بالکل مقامی و زمانی چیز ہے یعنی ایک مخصوص قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر جو

کیا جاتا ہے، اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوائے اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے، یعنی وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذاہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون اس سے کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلاف و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہر چند مذہب کی اس حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے، اور اس سے قبل بھی اس تلخی کا علم لوگوں کو حاصل تھا لیکن چونکہ ترقی تمدن اس حد تک نہ ہوئی تھی کہ تمام کرۂ ارض کے امن و سکون اور جملہ نوع انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال منجر ہوتا اس لئے چنداں پرواہ بھی نہ کی جاتی تھی، لیکن اب کہ علمی اکتشافات، ذرائع نقل و حمل، اور تجارتی و اقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنا دیا ہے، سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دنیا کا امن و سکون کیونکر قائم رکھا جائے اور باہمی جذبات مخالفت و منافرت کو دور کر کے کسی طرح تمام نوع انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقاید و قانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہن انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا، لیکن چونکہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا اور انھیں اصول پر کاربند ہونے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کئے گئے تھے، اس لئے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور ایک مذہب پر کیا موقوف ہے اس وقت کوئی نظام عمل جو ذہن انسانی کی تشویش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن و سکون پیدا کرنے کا [illegible] نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے، یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہبیت کم یا ختم ہو جائے اور مذہبی عصبیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا، اور کیا کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بنکر رہنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہوگا، کیونکہ مذہبیت کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوئی ہیں، ایک امتیاز رنگ و نسل کی اور دوسری جذبۂ سرمایہ داری کی، یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبۂ منافرت کی پرورش کر رہا ہے بالکل اسی طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے، چنانچہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور سرمایہ داروں کی طرف سے مزدوروں کی محنت و خونریزی کا جو صلہ ملتا ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے۔ وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہے مذہبیت کا جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت و حکومت کی بنیادیں قائم کیں، اس لئے مذہبیت کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا ہے، مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کو جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہئے، تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیۃً تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں نہ پیدا ہو جائیں، کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کا انسداد دوسری بیماریوں کے مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اسی لئے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بیجا نہیں، جبکہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو قسم کا خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کرکے کسی ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کر دینا پسند کرتے ہیں۔

ان میں اول الذکر صورت یقیناً بہتر ہے لیکن تقریباً ناممکن العمل، دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند صدی کے بعد مذہب تو یقیناً ختم ہو ہی جائے گا، گو سرمایہ و عمل کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علی حالہ قایم رہے۔

پھر جب آثار یہ ہیں اور حالات کی نزاکت اس حد تک پہونچ گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان جو اختلافِ مذہب کے لحاظ سے دُنیا کا حد درجہ بدنصیب ملک ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر بسنے والوں نے اپنے وطن کو غلامی و ذلت، پستی و نکبت سے نکالنے کی کیا تدبیریں سوچی ہیں۔ اس سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا حق جو اس کے فرزندوں پر عاید ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ اس کو کسی اور کی غلامی میں نہ دیدیں، یعنی ایک ملک و قوم کا تنہا طرۂ فخر و امتیاز صرف یہ ہے کہ اس کی گردن جھکی ہوئی نہیں ہے اور اس کی دولت پر دوسروں کا قبضہ نہیں ہے۔ لیکن یہ اسوقت ممکن ہے جب اس کے تمام افراد کسی ایک غرض مشترک سے وابستہ ہوں، ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور صرف ایک ہی نصب العین کے طرف اُن کے متفقہ قدم اُٹھتے ہوں۔ پھر کس قدر بدنصیب ہے وہ ملک جس کے فرزند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، صرف اسلئے کہ ان میں سے ایک مسجد میں جاکر عبادت کرتا ہے اور دوسرا مندر میں، ایک کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوسرے کے گلے میں زنار۔

دُنیا میں اور بہت سے ملک ہیں، لیکن اس باب میں ہندوستان سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بُری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے، اس کی مثال اسوقت روئے زمین کے کسی حصہ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف توجہ کون کرے۔ پنڈتوں اور مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اسقدر گندہ کر رکھا ہے؟ تو کیا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان، جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں؟

اس کے متعلق اسی اشاعت میں یونیورسیٹیوں والا مضمون پڑھکر خود فیصلہ کیجئے کہ اب قسمت آزمائی کی صورت کیا باقی رہگئی ہے۔

عبدالوالی صاحب بی۔ اے اپنی ایک تحریر میں مجھے لکھتے ہیں:-

"نیاز صاحب، یہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے، مذہب اور مولویوں کو چھوڑ کے اس بدمذاق جماعت کی طرف متوجہ ہوجئے۔ ان کمبختوں کو فخر ہے کہ اُردو سے بے نیاز ہیں، دُنیا میں یہ اکیلی قوم ہے جو بیر جانے کی دعویدار ہے سوائے اپنی مادری زبان کے — مذہب تو اپنی موت آپ مر رہا ہے مرے کو مارنے میں کیا رکھا ہے — نشانہ بازی تو ان بے حسی اور بدمذاقی کے تودوں پر کیجئے جو اپنے آپ کو یونیورسیٹیوں کے تعلیم یافتہ کہتے ہیں اور جو ... دماغی کام کرنے کے اسدرجہ غیر ذہنی زندگی رکھتے ہیں— بالکل ڈفالیو ... ہی

ان کی حالت ہے کہ عمر بھر گایا بجایا مگر گانا نہ آیا ——"

میں اس باب میں عبدالوالی صاحب سے بالکل متفق ہوں اور میری نگاہ سے اس جدید تعلیم یافتہ جماعت کی قابلیت اور صحت دماغی کے ایسی ایسی عجیب مثالیں گزری ہیں کہ اگر ان کا اظہار کروں تو کوئی باور نہ کرے، لیکن ہم کو اگر ان سے کوئی شکایت ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ انھیں قوم کا درد نہیں ہے، ملک کی محبت سے اُن کے سینے خالی ہیں اور علم کی صحیح روشنی سے اُن کے قلب معمور نہیں، لیکن قائدین مذہب تو ملک و قوم کے دشمن ہیں، انسانیت و اخلاق کے ابولہب ہیں اور اپنی پیٹ کی دوزخ میں ملک و ملت سب کچھ جھونک دینا چاہتے ہیں۔

آج اگر نوجوانوں کی تعلیم یافتہ جماعت اصلاح قوم کا جذبہ لیکر آمادۂ کار ہو بھی جائیں تو سب سے پہلے انھیں وہی کام کرنا پڑیگا جو میں کر رہا ہوں، کیونکہ جب تک آپ راہ سے سنگ گراں کو نہ ہٹا دیں راستہ کیونکر طے ہو سکتا ہے۔

اصلاح خواص سے شروع ہوتی ہے یا عوام سے، یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک عوام میں بیداری پیدا نہ ہو اور پبلک کی اصلاح نہ ہو ہیئت اجتماعی کی تشکیل دشوار ہے۔ پھر غور کیجئے کہ عوام کا کیا حال ہے اور ان پر کس کا اثر غالب ہے؟ اگر ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ جدید تہذیب و ترقی کے تمام نظریوں سے آراستہ ہو کر اصلاح ملک کے لئے آمادہ ہو جائیں، تو بھی مولوی کے اُس ایک "سوں" کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو وہ ملک کی جاہل آبادی پر کسی واقعۂ معجزہ و کرامت کی صورت میں پڑھکر پھونک دے گا۔ عوام کی اس کورانہ ذہنیت کا بدل دینا جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی ہے آسان کام نہیں۔ اس کے لئے یا تو اپنی حکومت ہونی چاہئے جو بزور شمشیر اس تمام فاسد مواد کو دور کر دے، جیسا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال یا ایران میں رضا شاہ پہلوی نے کیا، یا پھر تعلیم اتنی عام اور صحیح ہونی چاہئے کہ پبلک خود دوست دشمن میں تمیز کر سکے جو یقیناً صدیوں کا کام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کے سلسلہ میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور عام طور پر تعمیری پروگرام بنانا ہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے، حالانکہ اُصولاً سب سے پہلے تخریبی فرائض سے سبکدوش ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی عمارت اس حد تک شکستہ و خراب ہو جائے کہ معمولی مرمت اس کے لئے کافی نہ ہو، تو اس کا گرا دینا ضروری ہے اور جب تک اس کو پہلے زمین کے برابر نہ کر دیا جائے اس پر دوسری عمارت قائم نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کی تنظیمی حالت کا بھی بالکل یہی حال ہے کہ اس کے اصلاح کیلئے فی الحال تعمیری پروگرام پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک، پہلے اس سبب کو نہ محو کر دیا جائے جس نے اس کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا ہے اور یہ سبب مذہبیت کا وہ غلط مفہوم ہے جسے مولویوں اور پنڈتوں نے پیدا کیا اور جو ان کے فنا ہونے کے بعد ہی دور ہو سکتا ہے۔

دُنیا میں جسمانی غلامی کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے، درآنحالیکہ جسمانی غلامی نتیجہ ہے، ذہنی غلامی کا اس لئے ضرورت تو سب سے پہلے ذہنی غلامی کو دور کرنے کی ہے اور غالباً اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مذہبی عصبیت سے زیادہ ذہنی غلامی پیدا کرنیوالی

[illegible]

کوئی چیز نہیں۔

اس وقت زمانہ میں علم و عقل کا ایک طوفان برپا ہے، مادی ترقی کا سیلاب موجیں مارتا چلا آرہا ہے اور اس لئے اب اگر کوئی بات منھ سے نکالنے کی ہے تو صرف یہ کہ " مرغابی شو کہ کار با طوفان ست"۔

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہونچا دے، ورنہ خس و خاشاک کی طرح اس کا بہہ جانا بھی یقینی ہے، خواہ وہ آج ہو یا کل۔

اسی ماہ کی اشاعت میں کسی جگہ آپ اسپر کا اعلان نظر آئے گا کہ " مجموعۂ استفسار و جواب" چھپ کر طیار ہو گیا ہے۔ وہ حضرات جو " نگار" کا مطالعہ ابتدا سے کر رہے ہیں، اُن سے یہ امر مخفی نہ ہو گا کہ اسوقت تک کتنے اہم مسائل پر بسلسلۂ استفسارات بحث ہو چکی ہے اور جو حال کے خریدار ہیں وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے قبل کیا کچھ نہ اس سلسلہ میں لکھا گیا ہو گا، پہلے سنہ ۲۲ء سے اس وقت تک کے تمام استفسار و جواب کو یکجا شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن کتابت کے بعد معلوم ہوا کہ حجم ۱۵۰۰ صفحات سے زاید ہو جائے گا اور اس لئے اس کے تین حصے کر دینا مناسب ہے، چنانچہ پہلا حصہ جس میں مختلف علمی، ادبی، مذہبی و تاریخی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، ۱۲۱۵ صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔ اس کی قیمت مع محصول عہ مقرر کی گئی ہے لیکن خریداران نگار کے لئے ایک روپیہ کی رعایت ملحوظ رہے گی۔ جن حضرات نے پیشگی قیمت بھیجدی تھی ان کی خدمت میں مجموعہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف تمام خریداران نگار کے لائبریریوں میں پایا جائے گا بلکہ وہ اپنے احباب کو بھی اسکی اہمیت پر روشنی ڈالکر خریداری کی طرف مائل کریں گے۔ اگر نگار کی اعانت آپ کے نزدیک ضروری ہے تو امداد کی بہترین صورت یہی ہے کہ اس کی مطبوعات کو خود بھی خریدیں اور اپنے حلقۂ تعارف میں بھی مقبول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ معاملہ نہ گدائی کا ہے نہ احسان کا بلکہ ایک سودا ہے جس میں آپ ایک چیز خریدتے ہیں اور میں فروخت کرتا ہوں، پھر اگر آپ عہ خرچ کرکے کوئی ایسی چیز حاصل کر رہے ہیں جو ہمیشہ آپ کے کام آنے والی ہے تو کیا یہ سودا آپ کے نزدیک بُرا ہے۔

[illegible]

جنوری سنہ ۳۳ء کے رسالہ کے لئے جن حضرات نے لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے یا جو اصحاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ جسقدر جلد اُن کا مضمون موصول ہو گا اتنی ہی آسانی ترتیب میں ہو گی اور اتنی ہی بہتر جگہ انکے مقالہ کو مل سکیگی۔

تذکرۂ معرکۂ سخن

اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ نگار سائز کے ۲۰۰ صفحات پر شائع ہو گیا۔ مفصل اشتہار صفحہ ۸ پر ملاحظہ فرمائے۔ قیمت عہ منیجر نگار

زندگی کی عجیب و غریب داستان

کرۂ زمین جس پر انسان آباد ہے ایسا حقیر و ذلیل کرہ ہے کہ اس وقت تک گنتی کے صرف چند ایسے سیارے دریافت ہوئے ہیں جو ہماری زمین سے چھوٹے ہیں، ورنہ باقی سب اس کے مقابلہ میں اتنے بڑے ہیں کہ اگر لاکھوں زمینیں ان کے اندر ڈال دی جائیں تو بھی جگہ خالی رہے، اور بعض تو اتنے بڑے ہیں کہ کروڑ ہا کروڑ زمینیں بھی ان کا خلا پُر کرنے کے لئے کافی نہ ہوں

اگر کوئی سوال کرے کہ اس بسیط فضا میں کتنے ستارے پائے جاتے ہیں تو اس کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو تمام دنیا کے ریگزاروں میں ذرات ریگ کا شمار کر سکے ——— یہ ہے کائنات کی عظمت اور یہ ہے ہمارے کرۂ ارض کی حقیقت اس کے مقابلہ میں

فضا میں جتنے تارے پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض نے تو جھنڈ کی صورت اختیار کر لی ہے اور اکثر ایسے ہیں جو تنہا چکر لگا رہے ہیں، لیکن باوجود ستاروں کی اتنی کثرت کے فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے متصادم ہو جانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور ہر ایک دوسرے سے اتنی دور واقع ہے کہ ہم اس بعد کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر فضا کو آپ سمندر قرار دیں اور تاروں کو جہاز تو یوں سمجھئے کہ ان میں سے ہر جہاز اس طرح سفر کر رہا ہے کہ اس سے قریب ترین جہاز بھی لاکھوں میل کے فاصلہ سے کم نہیں ہے، اور ایک کا دوسرے کی کشش میں آجانا مستبعد ہے۔ لیکن اگر ایسا کبھی ہو جائے تو کیا ہو؟

کہا جاتا ہے کہ اب سے اربوں سال قبل ایک سیارہ، فضا میں آوارہ پھرتا ہوا ہمارے آفتاب کے قریب آگیا اور اس سے آفتاب کے مادہ میں بالکل ایسا ہی تلاطم پیدا ہوا جس طرح چاند اور سورج کی کشش سے زمین کے سمندر میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،

پھر ظاہر ہے کہ یہ زمین کے سمندروں کا تلاطم نہ تھا بلکہ آفتاب ایسے عظیم الشان کرہ کے مادہ کا ہیجان تھا جو جا بجا عظیم الشان پہاڑوں کی صورت میں اُبھرنا شروع ہوا اور جب وہ سیارہ زیادہ قریب آگیا تو کشش کی زیادتی

سے آفتاب کے متلاطم مادوں کے اجزا اس سے جدا ہو کر فضا میں چاروں طرف پھیل گئے اور گردش کرنے لگے، جو نظام شمسی کے سیارے کہلاتے ہیں اور جن میں سے ایک ہمارا کرۂ زمین بھی ہے

آفتاب اور دیگر سیارے جو ہمیں نظر آتے ہیں سخت گرم ہیں، اتنے گرم کہ ان میں کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ کوئی جاندار چیز پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے سطح آفتاب کے جو اجزا اس سے علٰحدہ ہو کر گردش میں آگئے تھے وہ بھی بدرجہ گرم تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ سرد ہونے لگے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک ز مگر یہ نہیں معلوم کہ کب اور کیونکر اس قابل ہو سکا کہ اس میں آثار حیات پیدا ہوں۔ ہر چند ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہ سکتے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ انسان کا وجود بھی انھیں آثار میں سے بعض کا نتیجہ ہے، جو ایک خوردبینی ذرۂ ریگ پر کھڑا ہوا کائنات کے بسط اور فضا کی لامحدود وسعت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور خوف سے کانپ اٹھتا ہے

یقیناً اس پر خوف کی کیفیت طاری ہونا چاہئے کیونکہ جس وقت وہ زمانہ کی وسعت پر نگاہ ڈالتا ہے تو تاریخ انسانی کا تمام عہد اسے پلک مارنے سے زیادہ وسیع نظر نہیں آتا، اور کائنات میں اپنے کرہ کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتی جیسے ریگزار عالم میں کسی ذرۂ ریگ کا لاکھواں حصّہ ——— علاوہ اس کے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ نظام عالم کو نہ اس کی زندگی کی پرواہ ہے، نہ اس کے جذبات کی پاسداری بلکہ ایک حد تک بے پروائی و دشمنی ہے تو اس کا خوف اور زیادہ بڑھ جاتا ہے

اس وسیع فضا کا اکثر حصّہ اتنا سرد ہے کہ اس میں کسی کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور مادّہ کا اکثر حصّہ اتنا گرم ہے کہ حیات کا بقا اس میں محال ہے، رات دن مہلک و مضرت رساں شعاعوں کے حملے ہوتے رہتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کس طرح نوع انسانی ختم ہو جائے

یہ ہے وہ کائنات جس کے اندر ہم ہو پڑے ہیں اور اگر یہ غلطی نہیں تھی تو اس کو سوائے اتفاق کے اور کیا کہہ سکتے ہیں

ہکسلے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر چھ بندر ٹائپ رائٹر پر بٹھا دیے جائیں اور وہ لاکھوں سال تک اس پر اپنی انگلیاں چلاتے رہیں تو یقیناً کہیں نہ کہیں شیکسپیر کی کوئی نظم ٹائپ کی ہوئی مل جائے گی۔ بالکل یہی حال فضا کے اندر کروڑوں ستاروں کا سمجھئے کہ وقت نامعلوم سے دوران گردش میں خدا جانے کن کن حوادث سے دوچار ہوتے چلے آئے ہیں اور اتفاق سے اُن میں سے بعض کسی مرتب نظام سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ لیکن جاندار چیزوں کے پیدا کرنے کی صلاحیت بہت کم ستاروں میں ہے کیونکہ اس کے لئے ایک خاص معتدل درجۂ حرارت کی ضرورت ہے اور وہاں یہ عالم ہے کہ بعض سیارے بالکل آگ ہی آگ ہیں اور بعض برف ہی برف ——— اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کائنات حقیقتاً جاندار پیدا کرنے کے لئے وجود میں نہیں آئی تھی ورنہ شروع ہی سے اس کی حرارت میں درجۂ اعتدال پیدا کیا جاتا اور اگر

کرۂ زمین میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تو اس کو محض اتفاق سمجھنا چاہیئے نہ کہ مقصود آفرینش

ہم کو نہیں معلوم کہ صرف مناسب مادی حالات جاندار پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ کرۂ زمین چونکہ آہستہ آہستہ سرد ہو رہا تھا اس لئے قدرتاً اس میں جاندار پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہونی چاہیئے تھی، بعض کہتے ہیں کہ جب زمین کسی ایک حادثہ یا اتفاق سے وجود میں آئی تھی تو لازم تھا کہ کوئی دوسرا اتفاق ایسا بھی پیدا ہوتا جو جاندار اشیاء کو وجود میں لاتا۔ کیونکہ وہ مادی اجزاء جو حیات کے لئے ضروری ہیں نہایت معمولی کیمیاوی اجزا ہیں (مثلاً کاربن جو کاجل میں پایا جاتا ہے، یا ہائڈروجن و آکسیجن جو پانی میں موجود ہے یا نائٹروجن جس سے فضا معمور ہے) اور یہ سب اجزاء کرۂ زمین میں پائے جاتے تھے، جن کے باہم ملنے جلنے سے اتفاقاً جاندار خلایا وجود میں آگئے

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی جاندار خلایا کا پیکر ہونا انھیں کیمیاوی اجزاء کے اختلاط و امتزاج کا نتیجہ ہے اور کیا کوئی ماہر علم الکیمیا انھیں اجزاء سے کوئی جاندار چیز پیدا کر سکتا ہے، اس کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکا

کہا جاتا ہے کہ ہائڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے اجزاء باہم مل کر کروروں کی تعداد میں قالب (molecule) پیدا کرتے ہیں اور ان سے جاندار اشیاء وجود میں آتی ہیں

ایک صدی قبل تک عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ان اجزاء میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیت کسی اور قوت سے پیدا ہوتی ہے جس کا علم اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اب علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ کوئی اور قوت کام نہیں کرتی، بلکہ انھیں عناصر کے امتزاج سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس میں بڑا حصہ کاربن کا ہے تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاربن کا ہر ذرہ مرکب ہے ایک مرکزی حصہ سے جسے نواۃ (Nucleus) کہتے ہیں اور چھ برقیاروں (electrons) سے جو اس مرکزی حصہ کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں، گویا کاربن ہی اصل چیز ہے جس سے حیات پیدا ہوتی ہے ——— ماہرین علم الکیمیا کا خیال ہے کہ مقناطیسیت کی طرح حیات بھی بالکل خود رو چیز ہے جس کو صرف اتفاق کا نتیجہ کہنا چاہیئے

بہر حال وہ کاربن کی مدد سے انسان پیدا ہوا ہو یا کسی اور سبب سے۔ یہ یقینی ہے کہ اس کے بقا کے لئے مناسب روشنی اور گرمی لازم ہے اور اگر کسی وقت کرۂ ارض کا وہ درجۂ حرارت جو بقاء حیات کے لئے ضروری ہے مفقود ہو گیا تو ہمارا فنا ہو جانا یقینی ہے خواہ وہ حرارت کے بڑھ جانے سے ہو یا اس کے مفقود ہو جانے سے

جس طرح عہد قدیم کا انسان جو زمین کے منطقۂ معتدلہ میں آباد تھا، برف کی بڑی بڑی چٹانوں کو اپنی وادی کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر گھبراتا تھا۔ کہ کسی دن وہ برودت کی زیادتی سے ہلاک نہ ہو جائے، بالکل اسی طرح

آج کے انسان کو بھی ڈرنا چاہیئے کیونکہ جو اسباب اندیشہ کے اس وقت پائے جاتے تھے، اب بھی پائے جاتے ہیں بلکہ جوں جوں زمانہ زیادہ گزرتا جاتا ہے۔ یہ اسباب بھی زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں

زمین کو جتنی حرارت پہونچ رہی ہے وہ سب آفتاب کے طفیل میں ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جب تک آفتاب اس خدمت کو انجام دے رہا ہے کرۂ ارض پر حیات بھی باقی ہے اور جس دن اس نے اس خدمت کو ترک کر دیا، سب جاندار ہلاک ہو جائیں گے

پھر چونکہ آفتاب بھی ایک سیارہ ہے جو روز بروز اپنی حرارت کو کھوتا جا رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اسی نسبت سے زمین کو بھی کم گرمی پہونچے گی اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آفتاب سے قریب تر ہوتی جائے گی پھر اگر یہ اس قدر قریب ہو گئی کہ آفتاب نے اسے دفعتہً اپنے اندر کھینچ لیا تو گرمی کی شدت سے حیات فنا ہو جائے گی اور اگر کسی خاص حد تک پہونچ کر قائم ہو گئی تو پھر جوں جوں آفتاب سرد ہوتا جائے گا، یہ بھی فنا سے قریب تر ہوتی جائے گی

بعض کا خیال یہ ہے کہ قانون حرکت کی رو سے زمین آفتاب سے اور زیادہ دور ہوتی جا رہی ہے، اگر اس کو صحیح مان لیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے، کیونکہ اس صورت میں بُعد بڑھنے کی وجہ سے آفتاب کی حرارت اور کم پہونچے گی، یہاں تک کہ ایک دن برودت نقطۂ انجماد تک پہونچ جائے گی اور آثارِ حیات بالکل مفقود ہو جائیں گے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب یہ سارا نظام گردش اسی طرح بغیر کسی خلل کے جاری ہے، لیکن اگر اتفاق سے اسی دوران میں کسی اور سیارہ سے تصادم ہو گیا تو پھر اور جلد خاتمہ ہو جائے گا، بہر حال آپ جو صورت صحیح تصور کریں اور جو واقعات و حوادث پیش آئیں، ان سب کا نتیجہ وہی ایک ہے یعنی یہ کہ کسی نہ کسی دن فنا ہونا ہے

پھر غور کرنے کی بات ہے کہ کیا زندگی کی ساری داستان اس سے زیادہ نہیں ہے، کہ پیدا تو ہوئے ہم غلطی یا اتفاق سے اور ہلاک کئے جاتے ہیں ایک ایسے منظم قانون سے جس کا توڑ کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ فلکیات کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، ممکن ہے طبیعیات اس معمہ کو حل کر سکے

اسلئے اگر ہم مذہب کی روح کو سمجھیں تو اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے ان کو بدلدینا ضروری ہے
قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ تبلیغ کے دو طریقے اختیار کرتے تھے
(۱) ایک طریقہ یہ تھا کہ غیر مسلمانوں کو مسلمان بنایا جاتا تھا
(۲) دوسرا طریقہ جو بہت ہی کم استعمال ہوا تھا وہ یہ تھا کہ اہل کتاب کو دعوت دی جاتی تھی کہ آؤ ہم اور تم توحید کے اعتقاد پر جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے قائم ہو جائیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس طرح بھی تبلیغ کر سکتے ہیں کہ غیر مسلمانوں کو مسلمان بنا کر اپنی جماعت میں شامل نہ کریں بلکہ خدا وغیرہ چند بنیادی عقائد کے ذریعے سے ہم اور وہ ایک اتحاد کے سلسلے میں شامل ہو جائیں۔ یہ طریقے موجودہ زمانے میں ہماری بہت سی مشکلات حل کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں ——— مذہبی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا جاتا ہے تو سب سے بڑی مشکل قدامت پرست عالموں کی طرف سے پیش آتی ہے۔ عالموں کا دعوٰے ہے کہ وہ وارث انبیا ہیں اور اسلام کو صحیح طور سے سمجھ سکتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کا یہ دعوٰے کس حد تک صحیح ہے۔ رسولوں میں ایک طرف علم ہوتا ہے تو دوسری طرف انقلابانہ ذہنیت ہوتی ہے جو وسیع القلبی سے پُر اور تقلید سے دور ہوتی ہے۔ رسولوں کے یہ اوصاف عالموں میں نہیں ہوتے اسلئے صحیح معنوں میں وہ وارث انبیا نہیں ہے۔ کیونکہ رسولوں کے علم سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن انکی ذہنیت کا ان میں کچھ بھی حصہ نہیں ہوتا ——— دنیا میں مذہب کی ضرورت تو ہمیشہ ہی رہیگی لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگ مذہب کا حقیقی مقصد نہیں سمجھتے۔ اور مذہب میں سیاسیات اجتماعیات وغیرہ کا جو حصہ ہے اسکو وقت کی ضرورت کے مطابق بدلا نہیں جاتا۔ علاوہ اس مختلف مذاہب کے مقلدین کے پاس کوئی ایک ایسا مرکز نہیں رکھتے جہاں سب جمع ہو جائیں اور مذہبی مغائرت کی جگہ مذہبی برادری پیدا ہو ——— مختلف مذاہب کے اندر اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک مرکز بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ مرکز رسول اللہ کی تبلیغ کے دوسرے طریقے کے مطابق ہو اور ایک نظام کی صورت میں ہو یہ نظام مذہبی صورت میں ہو اسلئے ایک جدید مذہب کا خاکہ بنایا جائے۔ اس مذہب کا نام عالمگیر مذہب ہو۔ اس میں شامل ہونے کیلئے پرانے مذہب کی جماعت ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک مسلمان مسلمان رہ کر اور ایک ہندو ہندو رہ کر بھی اس میں داخل ہو سکتا ہے ——— مولانا شبلی نے علم الکلام میں فطری مذہب کا جو خاکہ کھینچا ہے اس پر ایک نظر ڈال کر اس مذہب کے اصول یوں بنائے جا سکتے ہیں :-

(۱) مذہب کا مقصد دنیا میں یہ ہو کہ عام بنی نوع انسان کی بھلائی مدنظر رکھی جائے
(۲) دنیا کو پیدا کرنے والے ایک خدا کو مانا جائے
(۳) اس زندگی کے بعد بھی دوسری زندگی کا عقیدہ تسلیم کیا جائے
(۴) انسان کو اپنے اعمال کے نتائج اس دنیا اور دوسری زندگی میں بھگتنے ہوں گے۔

(۵) دنیا کے سب مذہبوں کے بانی اور بزرگوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے
(۶) ایک عبادتگاہ بنائی جائے جہاں ایک مقررہ طرز پر خدا کی عبادت کی جائے اور سب مذہب کے بانیوں کے نام عزت سے لئے جائیں
(۷) حج کے طور پر سال میں ایک بار اس مذہب کے ماننے والوں کی کانفرنس منعقد کی جائے
(۸) عبادت کا مقصد یہ سمجھا جائے کہ اس سے خود انسان کی بھلائی مقصود ہے
(۹) نیکی سے مطلب نیک کاموں کے علاوہ دولت عزت حکومت حاصل کرنا بھی ہو
(۱۰) اس مذہب میں جو ہندو مسلمان عیسائی یہودی وغیرہ مذہب کے لوگ شامل ہوں ان کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ باہم کر شادی کر سکیں
(۱۱) اس مذہب کے اصول ہمیشہ انسانی ترقی کی روشنی میں جانچے جائیں
(۱۲) اخلاق کی فہرست میں ایمانداری صبر نرمی بہادری کے علاوہ دنیا میں اتحاد و امن قائم کرنا اور دنیا کے ہر حصے کو ترقی پر پہنچانا بھی ہو
(۱۳) چند اصول کو چھوڑ کر فروعات سے اس مذہب کو واسطہ نہ ہو
(۱۴) اس مذہب کی طرف سے ایک نیا علم "علم فلاح انسان" کے نام سے بنایا جائے اور اس کے ذریعہ سے انسان کی ترقی اتحاد امن اور اچھی سوسائٹی بنانے کے طریقہ بتلائے جائیں۔ اس علم کی کتابیں سکولوں میں پڑھائی جائیں

آج ہم سیاسیات میں دیکھتے ہیں کہ یورپ نے سیاسی اتحاد پیدا کرنے کیلئے بین الاقوامی انجمن بنائی ہے اور کتابوں میں ورلڈ سٹیٹ (دنیا کی حکومت) کا خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ مختلف قومیں اپنی قومی سلطنتوں کے وجود قائم رکھتے ہوئے بھی بین الاقوامی انجمن کو مان رہی ہیں گویا لوگ دو حکومتوں کے ماتحت آئے ہیں ایک اپنی حکومت اور دوسری بین الاقوامی ـــ یہ طریق کار ہم مذہب میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح مختلف مذہب کے لوگ اپنی خصوصیت قائم رکھتے ہوئے بھی ایک نظام سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ جس سے مذہبی تصادم کی جگہ مذہبی اتحاد کا جلوہ نظر آئیگا ـــــ اس مذہب کے بنانے میں جمہوری طریقے اختیار کئے جائیں۔ جمہوری سلطنت میں جسطرح سب کی مرضی سے نظام بنتا ہے۔ اسی طرح یہ مذہب بھی اس میں شامل ہونیوالے مختلف مذہبوں کی مرضی اور اجازت سے بنیگا۔ گویا یہ مذہب ایسا ہوگا جس کے بارے میں کہا جائیگا کہ اس کو خود انسان نے غور کر کے جمہور کی رائے کے مطابق تمام دنیا کی بہتری کے لئے بنایا ہے

م۔ ر۔ غ

(نگار) آپ کے خیالات میں جس حد تک نیت کا تعلق ہے نہایت پاکیزہ ہیں، لیکن عملاً کس حد تک قابل لحاظ ہیں، اس کے متعلق میں آئندہ اشاعت میں اپنے خیالات پیش کروں گا ـــ اس ماہ کے ملاحظات غور سے پڑھئے، ممکن ہے آپ کی بعض تجاویز کا ذکر اس میں آگیا ہو
(نیاز)

طالبعلموں کی ذہنی طاقتیں ۲۵ء میں وہی ہوں جو ۲۰ء میں تھیں اور ۳۵ء میں وہی رہیں جو ۳۳ء میں تھیں، اسکے معلموں کو باوجود ان کے علم وتجربے کے طوق لعنت پہنایا جائے تو بہتر ہے۔ معلم وہ ہے جو اپنے دماغ کی قوت متعلم میں منتقل کرے۔ کسی نہ کسی طرح متعلم تک پہونچائے معلم کی شان پیغمبر کی ہونا چاہیئے اس کو جو فیض ہوا ہو اسے متعلمین پر منتقل کرے یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلمین کا دماغ (خلاق) بنائے۔ اگر اس نے یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ یونیورسٹی طوطے پڑھانے کی جگہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی چراغ سے چراغ روشن کرنے کی جگہ ہے۔

اس صوبہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں، سوسائٹی کے لئے ذہنی قوت کی مقدار کسقدر ہر سال ہمکو ان یونیورسٹیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ کتنے نئے خیال ان یونیورسٹیوں نے پچھلے دس سال میں پھیلائے سوسائٹی کی کتنی خرابیاں ان یونیورسٹیوں کے متعلمین نے دور کیں۔ نئی دنیا بنانے میں ان یونیورسٹیوں کے نوجوانوں نے کیا اور کتنی سعی کی ہم نے اپنے گرم خون اور تازی جان والے نوجوان یونیورسٹیوں کے سپرد کئے تھے انھیں کیا بنا کے انھوں نے ہمیں واپس کیا۔ ان یونیورسٹیوں کی شاندار عمارتیں کیا قوم کی ذہنی طاقتوں کے مقبرے ہیں جن میں وہ دفن کیجاتی ہیں۔ پچھلے دس برس میں دس ہزار جوان گریجوئیٹ یونیورسٹیوں نے نکالے ہونگے دس ہزار گرم خون والے نوجوان جس سوسائٹی میں ہوں اور وہ سوسائٹی جس جگہ پر تھی اُسی جگہ پر رہے۔ دس ہزار تازی جان رکھنے والے نوجوان جس سوسائٹی میں ہوں وہ سوسائٹی اپنی صلاح نہ کرسکے۔ دس ہزار نوجوان! اور سوسائٹی کی خرابیوں ارونا۔ دس ہزار یونیورسٹیوں کے نکلے ہوئے نوجوان اور فرسودہ اور پست خیال والوں کی حکومت اور جبروت سوسائٹی میں قائم رہے۔ دس ہزار یونیورسٹیوں میں پلی ہوئی جانیں سوسائٹی میں موجود ہوں اور سوسائٹی کے ذہن کی سطح وہی ہو جو دس برس اُدھر تھی۔ دس ہزار ڈائینامو اور کرنٹ ندارد واہ ری یونیورسٹی۔ واہ رے یونیورسٹی کے معلم اور واہ رے یونیورسٹی کے طالب علم۔ یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلمین کے دماغوں کو وسیع کرے ابھارے اور بلند کرے انھیں یہ محسوس کرائے کہ انسانی کوششوں نے عالم کے کیا کیا راز کھولے ہیں۔ ہر شاخ علم کے حدود کیا ہیں اور کیا واسطہ اور رابطہ ایک علم کا دوسرے علم سے ہے۔ وہ حقیقتیں جو علوم سے منکشف ہوئی ہیں، ان کا تعلق انسانی زندگی سے کیا ہے انسانی مجبوریاں اور اس کی طاقتیں کیا ہیں۔ انسان نے کیا کیا۔ کیا اور جو کچھ کیا کس طرح کیا۔ فرد کا جماعت سے کیا تعلق ہے۔ جماعت کی مضبوطی افراد سے کس طرح ہوتی ہے۔ انسان کی کمزوریاں کیا ہیں افراد اور جماعتیں کس طرح ان کمزوریوں سے اپنے کو پست کرتے کرتے فنا ہوجاتی ہیں۔ یہ کمزوریاں کس طرح دُنیا سے دور ہوں اور ہوسکتی ہیں خلاصہ یہ کہ یونیورسٹی کا کام یہ ہے کہ متعلم کے دماغ کو حقیقت جو بنائے اور ہر چیز کے اصلی حدود سمجھنے کی طاقت پیدا کرے علم اور صنعت یعنی فطرت اور انسانی طاقت کے جو اجزاء انسانی زندگی میں ہیں انھیں الگ الگ سمجھ سکے

یہ عمل جب انسانی ذہن کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ (خلاق) ہونے لگتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ ایک خیال کو دوسرے خیال سے ملاکے تیسرا خیال پیدا کرنے کی قوت اس میں ہوجاتی ہے۔ ایک خیال کو نئے حالات پر استعمال کرنے کی استعداد اور قدرت وہ پیدا کرلیتا ہے۔ اس کو اپنے اوپر اعتماد ہوتا ہی جس سے ہمت وجراءت پیدا ہوتی ہے یہ ہی چیزیں انسانی زندگی کے آلہ کار ہیں

کیا یہ یونیورسٹیاں زندگی کے آلات کار اپنے متعلمین کو فراہم کرتی ہیں۔ یا صرف یہ سکھاتی ہیں کہ دفتروں میں نوکری کے لئے عرضیاں لئے گھوما کرو۔ کسی پیشہ میں داخل ہو تو اس کو بجائے بلند کرنے کے پست کر دئے یونیورسٹی کے متعلمین انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس میں اب آئے ہیں۔ لوگ انکی بابت کیا کہتے ہیں؟ جو کچھ ہم نے سنا ہے اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اس کی بنا پر یونیورسٹی کی تعلیم تعریف کی مستحق نہیں ہے۔

یہ علیین یونیورسٹیوں کے کیا کرتے ہیں اس کا بھی کوئی دیکھنے والا ہے ان کے نتائج کار تو ہمارے سامنے ہیں ان سے ان کے کام کی خوبی تو نظر نہیں آتی۔ وہ ہی امتحانات وہ ہی متعلمین کی ذہنی سطح، پھر ان یونیورسٹیوں پر اتنا روپیہ صرف کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

تھیوسیڈائڈ باشندگان اتھینیس کی بابت لکھتا ہے:۔

"ہم اتھینی حسن کے عاشقوں میں ہیں گر ہمارے مذاق میں سادگی ہے اپنے ذہن کی تربیت مردانگی کو بغیر ضائع کئے ہم کرتے ہیں۔ دولت کا صرف ہم لاف اور نمائش کے لئے نہیں کرتے نادار ی ہمارے یہاں ذلت نہیں ہے بلکہ حقیقی ذلت اسمیں ہے کہ ناداری سے بچنے کی کوشش نہ کیجائے۔ اتھینی باشندہ یعنے ملکی سیاست سے بے پرواہ اور بے خبر نہیں ہوتا اگر وہ کاروبار میں بھی مشغول ہے تب بھی سیاست کے تعلق معقول واقفیت اور خیال رکھتا ہے۔ ہم اتھینی اس شخص کو جو سیاست کے متعلق خیال نہیں رکھتا اور سیاسی معاملات میں دلچسپی نہیں دکھاتا۔ ایک بے مصرف آدمی سمجھتے ہیں۔

کیا علما، یونیورسٹی اپنے طلبار کے لئے یہ نمونہ زندگی پسند کرتے ہیں۔ کیا ان کی زندگی بھی اسی نمونہ کی ہے اگر نہیں تو کس نمونہ کے نوجوان تم پیدا کرنا چاہتے ہو۔ علمار یونیورسٹی با تم کس طرح ان مولویوں اور پنڈتوں سے بہتر ہو جن کی مذمتیں تمھارے ورد زبان ہیں۔ وہ قدما کی سکھائی ہوئی باتیں دہراتے اور اپنے شاگردوں کے دماغوں میں ٹھونستے ہیں تم جدید یورپ کی تصانیف رٹتے ہو اور اپنے طالبعلموں کے دماغوں میں بھرتے ہو۔ کیا گیٹے کا مشہور مقولہ تمنے سنا ہے "حقایق عالم جن کا علم ہمیں پڑھنے یا سننے سے ہو ان کا انکشاف از سر نو ہمیں کرنا پڑتا ہے" جس کے یہ معنے ہیں کہ پڑھکے یا سُن کے کوئی خیال اور کوئی حقیقت انسان کے ذہن کی ملکیت اسوقت تک نہیں ہوتی جب تک یہ محسوس نہ ہو کہ اس کو اس نے خود دریافت کیا ہے یعنی قوت فاعلی اس پر صرف کی ہے۔ یونیورسٹی کا کام نوجوانوں میں فعل کرنے والا ذہن پیدا کرنا ہے۔ جو خیال اُس کے ذہن کے سامنے پیش کیا جائے اُسے اپنا کرے اور یہ زینہ ہے خلاق ذہن پیدا کرنے کا، ہمیں بتاؤ دماغ کی اس قسم کی تربیت کے لئے ہماری یونیورسٹیوں میں کون طریقے اختیار کئے جاتے ہیں سب سے بہتر طریقہ خیال پیدا کرنے اور حقیقت کو منکشف کرنے کا گفتگو ہے ان یونیورسٹیوں میں یہ طریقہ کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔ سقراط نے کوئی کتاب نہیں تصنیف کی کوئی نظام فلسفہ نہیں مدون کیا۔ وہ حقیقت جو تھا اور اپنے خیالات کو گفتگو کر کے خود بھی فائدہ حاصل کرتا تھا اور دوسروں کو بھی مستفید کرتا تھا اپنے اس طریقہ تعلیم سے کتنے حقیقت جو دماغ اُس نے پیدا کر دئے۔ یونانی فلسفہ حقیقت میں ان دماغوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنے چراغ سقراط کے چراغ سے روشن کئے تھے، درسگاہوں کا طریقہ افلاطون نے قائم کیا اور پہلی درسگاہ یونان میں افلاطون کی اقادمیہ تھی۔ لیکن اس اقادمیہ سے

افلاطون دوسرا افلاطون نہ پیدا کرسکا جیسے سقراط نے افلاطون پیدا کیا تھا۔ درسگاہوں میں تعلیم لکچر دیکر کرسکتے ہو بحث و مباحثہ کرکے نہیں دے سکتے۔ لکچر اور کتابیں متعلمین کے دماغوں کو مرعوب کردیتی ہیں ان کو اُبھرنے سے روکتی ہیں۔

سقراط نہیں ہوسکتے ہو نہ سہی لیکن وہ طریقے تو برت سکتے ہو جو وہ برتتا تھا۔ وہ فضا تو اپنے گرد پیدا کرنے کی کوشش کرسکتے ہو جو وہ پیدا کرتا تھا۔ یونیورسٹی حقیقتاً سقراطی فضا پیدا کرنے کی جگہ ہے۔ تم افلاطون کی طرح لکچر دینے کا شوق رکھتے ہو مگر سقراط کی طرح مسئلہ کے حل کرنے میں متعلمین کی مدد کیوں نہیں کرتے تاکہ متعلم تمھارے چراغ سے اپنا چراغ جلائے۔ یونیورسٹی کسی نظام خیال کی تعلیم دینے کی جگہ نہیں بلکہ ہر نظام پر بحث کرنے کی جگہ ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مسلمات کی گنجایش نہیں۔ یہ ردو قدح کی جگہ ہے۔ یہاں ذہنی اشیاء کی تحلیل و ترکیب ہوتی ہے۔ کیا ان یونیورسٹیوں کے دس ہزار تلامذہ کے دماغ اسی کام کے لئے تیار کئے گئے ہیں؟ ملک کی زندگی کے کتنے مسائل پر اپنی ذہنی طاقتیں انھوں نے استعمال کیں اور نہیں استعمال کیں تو کیوں کیا کسی مسئلہ کا حل درکار نہیں ہے۔ یہ ہاتھ پر ہاتھ دہر کے بیٹھنا کیا معنی۔

اس کی ضرورت ہم تم کو بتائیں۔ یونیورسٹیوں سے تم دس ہزار گریجوئیٹ کیا سیکھ کے آئے ہو۔

یہ جو کچھ ہم نے کہا وہ حقیقتاً یونیورسٹیوں سے کہا۔ اب ہم دو دو باتیں یونیورسٹیوں کے طالبعلموں سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ یونیورسٹیاں ہماری نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہم سے بھی پہلی نسل کے لوگ اس کے بنانے میں شریک تھے ہمارا اور ہم سے پہلے والا جنریشن ہندوستان کا یورپ اور انگلستان کے اُنیسویں صدی کے خیالات کا فضلہ نوش جنریشن تھا۔ تمھارے اساتذہ بھی ظاہر ہے کہ اسی جنریشن کے لوگ ہیں۔ ان سے بہت زیادہ امیدیں تمھیں نہ رکھنا چاہئیں۔ ان میں بہت سے علم و تبحر والے لوگ ہیں لیکن تمھارے ذہنوں اور قلبوں کو جس آگ کی ضرورت ہے وہ ان میں ہے ہی نہیں تم تک کیا پہونچائیں گے ان سے ان کے ذہن کے بغیر سلگے کوئلے لو۔ ممکن ہے خود تمھاری دبی ہوئی آگ ان کو سلگا دے اور یہ بھی دہکیں اور پھر تم بھی دہک اُٹھو۔ لکچرار سے لیکر ریڈر اور پروفیسر تک کسی کو آرام نہ لینے دو۔ ہر وقت ان سے کہو کہ تم ہمیں ذہنی کشتیاں لڑنا سکھاؤ۔ اسی کی تم تنخواہ پاتے ہو۔ ہندوستان کی زندگی کی اُن سے کہو تصویر بنا کے پیش کریں تم اُس کے ہر جزو پر ردوقدح کرو اگر بری تصویر پیش ہو اسپر مضحکہ کرو۔ ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو پر ذہنی نقطۂ نظر سے غور کرنے کا نہ صرف تمھیں اختیار ہی بلکہ اسپر غور کرنا تمھارا فرض ہے۔

پروفیسروں کو اتنی مہلت نہ دو کہ وہ اپنی بیویوں یا پرائی بیویوں میں بیٹھ کے وقت ضائع کریں۔ کلاس روم کے بعد ان کا زیادہ وقت طلبا کی صحبت میں صرف ہونا چاہئے۔ پروفیسر ہمہ وقت ان ڈیوٹی ہے تم اپنی جگہ یونیورسٹی کو محکمہ نہ بننے دو۔ اسے اپنے ذہنوں کے پلنے بڑھنے کی جگہ بناؤ۔ تمھاری زندگیاں گورنمنٹ اسکولوں اور انٹرمیجیٹ کالجوں میں پہلے ستیاناس کردی جاچکی ہیں وہاں تم ایسے ہاتھوں میں آتے ہو۔ جنھیں ہمہ وقت اپنی تنخواہوں کی فکر ہوتی ہے۔ جن کا رجحان مدرسہ کو مثل دیگر سرکاری محکموں کے ایک محکمہ بنا دینے کی جانب ہوتا ہے ہمیں موجودہ گورنمنٹ اسکولوں کا کافی تجربہ ہے۔ اور اسی تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کی ہم جرأت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ اسکولوں کی فضا ذہنی لطافت سے اسدرجہ خالی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ

مدرسین کی ذہنیت ادنےٰ سے لیکے اعلیٰ تک وہی ہوتی ہے جو پٹواری سے لیکے ڈپٹی کی ہوتی ہے۔ طالبعلموں خدا کے لئے یونیورسٹی میں پہونچکر گورنمنٹ اسکولوں کی زندگی کو بھلا دو۔ اگر یہ زندگی تمھیں یونیورسٹی میں بھی یاد رہی تو سوائے گورنمنٹ ملازمت کے تم کسی مصرف کے نہ ہوگے اور گورنمنٹ میں ملازمین کی جتنی بلند زندگی ہوتی ہے اس کو اگر جاننا چاہتے ہو تو کسی ضلع میں ان لوگوں کی صحبت میں ایک ہفتہ رہو۔ تم اگر صاحب مذاق ہو تو تمھارا دم گھٹنے لگے گا اور یہ محسوس کروگے کہ کسی بند کمرہ میں بٹھا دئے گئے ہو اور دل چاہتا ہے کہ دروازہ کوئی کھولدے تاکہ ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آجائے۔

ٹیگور نے کہا ہے جب بچہ جنم لیتا ہے تو خدا اس کے کان میں کہتا ہے اے انسان میں تجھ سے ناامید اور بددل نہیں ہوا ہوں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان نئی غرض خداوندی پوری کرنے کے لئے آتا ہے ایک نیا پیام عالم بالا سے لیکر آتا ہے بقول ٹینیسن یہ کہتا آتا ہے "پرانی ترتیب بدلتی ہے اور اپنی جگہ نئی کو دیتی ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہونے کے بہت ڈھنگ ہیں۔" اپنے دل میں یہی سمجھو کہ یونیورسٹی کے ذریعہ دنیا میں نئی جان ہم پھونک رہے ہیں۔ جو چیز آنے والی ہے اس کی شکل بنانے میں مصروف ہیں اپنے پیام کو موزوں شکل دینا چاہتے ہیں تاکہ دنیا دلچسپی سے سنے۔ دنیا کے ساتھ بیاہ کرنے کے لئے دولھا بن رہے ہیں۔ یہ اسٹاف یہ پروفیسر تمہیں سجانے بنانے کیلئے ہیں براہ خدا اپنا یہ طرز عمل بدلو کہ تم میاں مٹھو ہو اور تمھارے اُستاد تمھیں پڑھا رہے ہیں۔ میاں مٹھو سسٹم آف ایجوکیشن غلط اور بالکل غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تم پڑھتے اور سیکھتے ہو لیکن یہ غلط ہے کہ کوئی دوسرا تمھیں سکھاتا ہے، معلم کا انداز طبیعت تو یہی ہو کہ میں پڑھاؤں اور سکھاؤں لیکن متعلم یہ نہ سمجھے کہ وہ سکھایا جارہا ہے اور وہ یہی سمجھے کہ اُستاد بخل کر رہا ہے اور وہ زبردستی اس کے پاس جو کچھ ہے اسے چھین رہا ہے اُستاد کے لئے متعلم رہزن و ڈاکو ہو جو کچھ اُس کے دماغ میں ہو اُسے لے لے۔ ایک آخری بات کان میں کہنا اور پوچھنا چاہتا ہوں

بکسر میں مہاتما گاندھی کے ساتھ سناتن دھرمیوں نے جو کچھ کیا وہ تم نے سنا ہوگا۔ اس شرمناک واقعہ کی ذمہ داری یونیورسٹی کے گریجویٹ پر کچھ عائد کرتے ہو یا نہیں۔ ان گریجویٹس نے تعصب پست خیالی، وہم پرستی بلند اور اعلیٰ خیال سے نفرت، پرانے فرسودہ خیالات سے اسدرجہ رغبت کہ جان ان پر قربان کرنے کو تیار، ان حالات کی اصلاح کے لئے کیا کیا۔ تمھارا کیا قصد ہے۔ جمود، پستی اور کنسرویٹزم پر اپنے کو بھی قربان کردگے۔ ہمیں بتاؤ تمھارا کیا قصد ہے۔؟

(معلومات)

عبدالوالی بی۔ اے

باب المراسلة والمناظرة

کیا لامذہبیت امن وسکون کی ضامن ہے

جناب شہاب الدین صاحب۔ عثمانیہ یونیورسٹی)

ماہ مئی کے نگار میں ایک صاحب کا مضمون ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "تاریخ کا منارہ، تمدن کا ستون، قوموں کی زندگی کا اہم اصول اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف مذہبی اصول ہیں" آپ نے جو نوٹ لکھا ہے اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

امن وسکون کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنی نوع انسان ایک خیالِ مشترک سے وابستہ ہوں ان کے اغراض ومقاصد باہم گر متصادم نہ ہونے پائیں۔ سامنے ایک منزل ہو اور ہر قدم اٹھانے والا اُسی کو اپنا منتہائے مقصود تصور کرے۔ یہی ہے حاصل اتحاد اور اسی سے وہ یکجہتی اور خواہش عمل پیدا ہوتی ہے جو بقائے انسانیت کے لئے از حد ضروری ہے۔ پھر ذرا غور کیجئے کہ نفس انفرادی کے مقابل نفس اجتماعی پیدا کرنے کے جو ذرائع اختیار کئے گئے ان میں سب سے قوی ذریعہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ مرکزیت واتحادِ ملت کے قیام میں (جس کے بغیر امن وسکون ممکن نہیں) اور احساس انسانیت کو بیدار کرنے میں مذہب نے جس قدر حصّہ لیا۔ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کرسکتی۔ اب رہ گئی قومیت سو بقول آپ کے "وہ بھی مذہب ہی کے اثرات باقیہ میں سے ہے" اس میں شک نہیں کہ مذہب کی تاریخ خوں آشامی کی ایک ہیبتناک داستان ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے صفحات اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل کے ایسے عجیب وغریب مناظر پیش کرتے ہیں جن سے انکار کرنا گویا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جس مقصد کے لئے مذہب کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی تکمیل اس نے نہیں کی۔ اسمیں بھی

شبہ نہیں کہ دنیا سے افتراق و بدامنی، خونریزی و انسانیت شکنی کا خاتمہ ہو سکا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو بنی نوع انسان کو ایک شیرازہ سے وابستہ کرے؟ یقیناً اس کا جواب آپ یہ دیں گے کہ "لامذہبیت" اور "لاقومیت" ہی وہ تنہا ذریعہ ہے جو انسانیت نواز ہو سکتا ہے۔ مگر خوف یہ ہے کہ یہ نظریہ جو اتنی وسعت اختیار کرے کہ تمام انسانوں کو "ایک ہی کرہ کے رہنے والے اور ایک ہی مادر گیتی کے فرزند" ہونے کا یقین دلائے لیکن نظریہ کی حد تک ہی نہ رہے۔ جو اعتراض مذہب کے متعلق آپکا ہے وہی اس پر بھی عائد ہوتا ہے کہ اُصول کی حد تک "آپ پاکیزہ سے پاکیزہ جذباتِ انسانیت و اخوت لوگوں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں" مگر دُنیائے عمل میں ان کی حقیقت معلوم۔

آج کل روس "لامذہبیت" کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ روسی قوم اپنے مفاد کے آگے "ایک ہی سیارہ کے بسنے والوں" کے اغراض کو بالکل اسی طرح پامال نہ کرے گی جو متبعین مذہب کے کارناموں کا نمایاں پہلو ہے؟ اگر فطرتِ انسانی ہر جگہ ایک ہے تو پھر کیوں مذہب کو بدنام کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ شخص ثالث کی حیثیت سے جس طرح آپ مذہب پر تنقید فرماتے ہیں اسی طرح "لامذہبیت" سے بھی بے تعلق ہو کر اس کا جواب عنایت فرمائیں گے۔

(نگار) یہ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ امن و سکون کے قیام کے لئے بنی نوع انسان کا کسی ایک خیال مشترک سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ اور اگر اسی اصول کو سامنے رکھکر آپ غور و تامل سے کام لیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذاہب عالم کبھی اس اُصول پر کاربند نہیں ہو سکے اور نہ یہ اُن کے حیطۂ اقتدار میں تھا۔

افسوس ہے کہ آپ نے "نفسِ اجتماعی" سے کسی خاص قوم یا مخصوص جماعت کا مفہوم مراد لیا ہے اور اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ مذہب نے اس کے قیام میں بڑا حصہ لیا ہے، لیکن اگر ہیئت اجتماعی میں تمام بنی نوع انسان کو شامل کرلیں (اور دنیا کے امن و سکون کے لئے ان کو شامل کرنا ضروری ہے) تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مذہب نہ صرف یہ کہ اس باب میں ناکام رہا بلکہ بڑی حد تک برہمی سکون کا باعث ہوا۔

اگر دُنیا میں صرف ایک ہی مذہب رائج ہوتا تو بیشک آپ کا یہ دعوےٰ صحیح ہو سکتا تھا کہ اس نے وہ نفسِ اجتماعی پیدا کیا جو دنیا میں قیام امن و سکون کے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا اسلئے بجائے اس کے کہ تمام بنی نوع انسان میں یکجہتی پیدا ہوتی، انہیں مذاہب کی وجہ سے باہمدگر اور اختلاف پیدا ہوا یہاں تک کہ دُنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو مذہب کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو۔

آپ اس کے جواب میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو دنیا کا قصور ہے کہ وہ کیوں نہ مسلمان ہوکر ایک رشتہ سے وابستہ ہوگئی، لیکن آپ کا یہ اعتراض درست نہ ہوگا، کیونکہ جس طرح آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ایک عیسائی بھی کہہ سکتا ہے کہ دنیا نے کیوں نہ مسیحی مذہب اختیار کیا اور ایک ہندو بھی یہی کہنے کا حق رکھتا ہے اور ایک آتش پرست بھی۔ پھر اسکا فیصلہ کیونکر ہو کہ دُنیا اور اہلِ دُنیا کو کیا کرنا چاہئے تھا اور کس مذہب کا اختیار کرنا مناسب تھا۔

دین یا مذہب نام ہے ایک مخصوص اعتقاد و یقین کا جو کسی شخص کے دل میں پیدا ہو کر اس کے ضمیر کو مطمئن کردے اور چونکہ یہ اطمینان بڑی حد تک ایک ملک کے آب و ہوا، اسکی جغرافی حالت، اور تمدنی و معاشری ضروریات سے وابستہ ہوتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ مذہب جو اہلِ مغرب کے زندگی یا حالات کے لحاظ سے ظہور میں آئے گا وہ مشرق والوں کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا، اور جو اہلِ شمال کے لئے مناسب ہوگا وہ جنوب کے باشندوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ اگر آپ نے سامی مذاہب اور آرین مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور اس فرق کے پیدا ہونے کا خاص سبب یہی اختلافِ ذوق تھا جو ان دونوں قوموں میں پایا جاتا تھا اور چونکہ اختلافِ ذوق ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے اختلافِ آب و ہوا، اختلافِ ماحول، اور اختلافِ جغرافی کا، اس لئے دنیا میں مختلف مذاہب کا پیدا ہونا ضروری تھا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ تمام دُنیا کسی ایک مذہب کو اختیار کرکے تمام بنی نوع انسان کو کسی ایک مرکز سے وابستہ کردے۔ الغرض مذہب کا خیال اصولاً و فطرتاً کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو کسی ایک شیرازہ سے منسلک کرسکے اور اس لئے یہ قیاس کرنا کہ مذہب دنیا میں قیام امن و سکون کا باعث ہوسکتا ہے، بالکل قیاس مع الفارق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ مذہب نے اتحادِ خیال و اتحادِ عمل کے ایسے ایسے مناظر پیش کئے ہیں جس سے انکار محال ہے، بالکل درست ہے، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اتحادِ خیال و عمل کسی مخصوص جماعت یا مخصوص افراد سے آگے بڑھ سکا اور کیا اس اتحادِ خیال و عمل کی بنیاد دوسری قوموں اور جماعتوں کی تباہی و بربادی پر قایم نہیں رہی، پھر ایسا اتحاد و اجتماع یا ایسا نفسِ اجتماعی، دنیا کے کس کام آسکتا ہے اور وہ لوگ جو بنی نوع انسان کے تمام افراد کو ایک مرکز پر لانا چاہتے ہیں، اس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اب آپ کے استفسار کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ اگر مذہب اس مقصد میں ناکام رہا تو اس کا دوسرا ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے اور اگر یہ ذریعہ "لامذہبیت" یا "لاقومیت" قرار دیا جائے تو اس کی کامیابی کی کیا ضمانت ہے اور کیا روس جو اس وقت "لامذہبیت" کا سب سے بڑا علمبردار ہے، دوسرے ملکوں کے اغراض کو بالکل اس طرح پامال نہ کرے گا جس طرح "مذہبیت" نے کیا۔

آپ کا یہ سوال یقیناً غور طلب ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کا جواب دیا جائے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ "لامذہبیت" کا صحیح مفہوم کیا ہے ــــ مجھے علم نہیں کہ آپ نے اس کا کیا مفہوم قرار دیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کے دو پہلو ہیں۔

ایک وہ جس کا تعلق فلسفۂ مذہب یا معتقدات دینی سے ہے جس میں ایک قوم کی روایات بھی شامل ہیں اور دوسرا وہ جو سوسائٹی یا سماج سے متعلق ہے۔ پھر اب دیکھنا یہ ہے کہ مذاہب میں باہمدگر خونریزی کا سبب کونسا پہلو ہوا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا سبب صرف معتقدات دینی تھے جن کی تبلیغ وترویج نے سارا فساد برپا کیا اور اس کو محو کردینے کا نام میں نے " لامذہبیت " قرار دیا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کا مذہب صرف اس کے ذاتی احساس ویقین تک محدود رہتا ہے اور دوسرے کے اعتقاد کو مجروح نہیں کرتا تو ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ اس کے خلاف گفتگو کریں لیکن اگر وہ سوسائٹی کے نظام کو درہم برہم کر دینے والا ہے یا ہمارے حاسۂ اجتماعی کو ضرر پہونچانے والا ہے، تو یقیناً اسے محو ہو جانا چاہئے۔

روس کی " لامذہبیت " بجائے خود ایک ایسی سخت " مذہبیت " ہے کہ عام رواداری کے جذبات اس کے ماتحت بہت مشکل سے نشو ونما پا سکتے ہیں، درانحالیکہ " لامذہبیت " کا وہ مفہوم جو دنیا میں قیام امن کا باعث ہو سکتا ہے " مذہبی آزادی " یا " لاعصبیت " سے زیادہ نہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مذہب کے سماجی پہلو کو علی حالہٖ قایم رکھکر اس کے معتقداتی پہلو کو تنگ کرکے صرف افراد تک محدود کر دیں اور تبلیغی سرگرمی کو یکقلم موقوف کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ نے اگر نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ میں شروع سے مذہبی علمار کی مخالفت کر رہا ہوں اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ جب تک ان کا اقتدار قائم ہے، مذہبی تبلیغ برابر جاری رہیگی اور جس وقت تک یہ مشغلہ قایم ہے، فتنہ وفساد کبھی دور نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کی یہ ذہنیت کہ جب ناقوس کی آواز کانوں میں آئے تو لاحول پڑھنے لگیں اور نماز کے وقت اگر گھنٹے یا باجہ کی صدا بلند ہو تو اُسے توہین اسلام قرار دیں، محض مولویوں کی پیدا کی ہوئی گمراہ ذہنیت ہے اسی طرح ہندؤں کی یہ ذہنیت کہ اگر کسی مسلمان کو گائے کی قربانی کرتا ہوا دیکھ لیں تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آئے، یا اللہ اکبر کی آواز سُن لیں تو ان کا جذبۂ عناد مشتعل ہو جائے، اُن کے پنڈتوں کی پیدا کی ہوئی ذہنیت ہے اور اس کا سدّباب اس طرح ممکن ہے کہ ان قائدین مذہب کو فنا کر دیا جائے۔

میں جس " لامذہبیت " کا موید وحامی ہوں وہ روس کی لامذہبیت نہیں ہے جس میں خود نہایت سخت تعصب پایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک ایسی مذہبی آزادی ہے جسے " لاعصبیت " کہنا زیادہ موزوں ہے اور اس کے پیدا کرنے کی صورت صرف یہی ہے مولویوں اور مذہبی علمبرداروں کو فنا کر دیا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو مذہب کا خیال رفتہ رفتہ بالکل انفرادی وذاتی حیثیت اختیار کرلیگا اور دُنیا کے ہیئت اجتماعی کو اس سے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بہت دشوار ہے اور اس کا ردّ عمل لامحالہ وہی ہوگا جو آپ روس میں دیکھ رہے ہیں، کیونکہ اقتصادی مسایل کا حل بھی بڑی حد تک اس سے وابستہ ہے اور دُنیا جو روز بروز کسب معاش کی دشواریوں میں مبتلا ہو رہی ہے مجبور ہوگی کہ بھوکا مارنے والے مفلس وقلاش بنانے والے مذہب کو ترک کرکے اس " لامذہبیت " کو اختیار کرے جو اور کچھ نہیں تو کم ازکم فاقہ کی مصیبت کو دور کرنے والی ہے۔

باب الاستفسار

گھڑی سازی کی تاریخ

(جناب محمد اصغر علی صاحب۔ فرخ آباد)

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنے باب الاستفسار میں گھڑی سازی کے فن پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ ابتدائً وقت کی تقسیم کی کیا صورت تھی اور رفتہ رفتہ اس میں کیا تدریجی ترقی ہوئی کہ موجودہ حالت تک پہونچ گئی۔

(نگار) گھڑیوں کی ایجاد سے قبل وقت کی تقسیم اجرام سماوی اور سایہ کو دیکھ کر کیا کرتے تھے، یعنی جب چاند اپنا چکر زمین کے گرد ختم کر لیتا تھا تو اسے مہینہ کہتے تھے اور جب زمین اپنا چکر سورج کے گرد پورا کر لیتی تھی تو اس کو سال سے تعبیر کرتے تھے اور دن سے مراد وہ وقت تھا جو زمین کو اپنے محور پر گردش کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

اب رہ گئی اس سے بھی چھوٹی تقسیم گھنٹوں یا ساعتوں کی سو اس کے لئے وہ دن میں درختوں کے سایہ سے اور رات کو سیاروں کی رفتار سے مدد لیتے تھے۔ انسان نے کتنے عرصہ تک وقت کی تقسیم کا حساب اس طرح رکھا اس کی تعیین دشوار ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے پہلی گھڑی جو اختراع ہوئی وہ "دھوپ گھڑی" تھی اور بعض کا خیال ہے کہ انجیل کے "سفر ملوک ثانی" اور "سفر اشعیا" میں بسلسلۂ شفاء خر قیا ملک یہودا اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل مسیح ۷۴۲ سال دھوپ گھڑی کا رواج پایا جاتا تھا، اور ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ کلدانی تہذیب زیادہ قدیم العہد تھی اور ممکن ہے دھوپ گھڑی وہاں سے منتقل ہوئی ہو۔

یونان کا فلسفی انکسیمندر، بیروسس کے دو سو سال بعد جب سرزمین کلدانیہ میں پہونچا ہے تو اس نے وہاں دھوپ گھڑی دیکھی اور وہیں سے وہ یونان لایا تھا جہاں بعد کو اس کا رواج عام ہو گیا۔ پھر اس دھوپ گھڑی کی صنعت میں

کس کس تفنن سے کام لیا گیا اس کا بیان دشوار ہے، ان میں سے بعض اتنی بڑی بنائی گئیں کہ بقول بعض اہرام مصری بھی اسی میں داخل ہیں اور جن کے سایہ سے تعیین وقت ہوا کرتی تھی اور بعض اتنی چھوٹی تیار کی گئیں کہ انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتی تھیں۔

لیکن چونکہ دھوپ گھڑی صرف دھوپ میں کام دے سکتی تھی اور ابر و باد کے موسم میں وہ بیکار تھی اس لئے لوگوں کا خیال پانی کی گھڑی کی طرف منتقل ہوا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ دو برتن لئے جاتے تھے ان میں سے ایک کے اندر پانی بھر دیا جاتا تھا اور اس کی پیندی میں باریک سوراخ ہوتا تھا جس سے پانی ٹپک کر دوسرے برتن میں جاتا تھا۔ اس برتن کے چاروں طرف متعدد خطوط و نقوش ہوتے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ پانی کس خط تک پہونچا اور کتنا وقت گزر گیا بعد کو اس میں جدتیں بھی کی گئیں یعنی ایک یا ایک سے زاید پہیے استعمال کئے گئے جو پانی کے دباؤ سے گھومتے تھے اور ایک پہیہ میں سوئی لگادی گئی جو پہیہ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی تھی اور وقت بتاتی تھی۔

پانی کی گھڑی کے موجد اہل مصر ہیں اور حسب بیان وٹروویس اسکندریہ کے ایک حجام نے ۲۴۵ سال قبل مسیح اسکو ایجاد کیا تھا۔ یہ خاص شخص اس کا موجد ہو یا نہ ہو لیکن یہ یقین ہے کہ پہیہ کا اضافہ اس نے کیا تھا۔ اس کے بعد جب افلاطون یونانی مصر میں آیا تو یہاں سے پانی کی گھڑی اپنے ساتھ یونان لے گیا اور وہاں خود اپنے ہاتھ سے ایسی گھڑی تیار کی جس میں ہر گھنٹہ ختم ہونے پر ستار بجتا تھا۔ ۱۵۷ سال قبل مسیح رومہ میں اس کا رواج ہوا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ پمپیوس جنگ کے موقعہ پر بھی اس گھڑی کو ساتھ رکھتا تھا جس میں موتی جڑے ہوئے تھے۔ جولیس قیصر نے لکھا ہے کہ ۵۵ سال قبل مسیح انگلستان میں بھی اس نے یہ گھڑیاں دیکھی تھیں اور غالباً فنیقی تاجروں نے یہاں ان کو رواج دیا ہوگا۔

اہل عرب نے گھڑی سازی کے فن میں بڑی محنت و ذہانت سے کام لیا، چنانچہ وہ گھڑی جو ہارون الرشید نے ۸۰۷ء میں فرانس کے بادشاہ شارلمان پاس بھیجی تھی بہت مشہور تاریخی گھڑی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بھی پانی کی گھڑی تھی، یہ تھی تو تانبہ کی لیکن اس پر طلا کا کام تھا، اس میں بارہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں جن میں سے چھوٹے چھوٹے معدنی گیند گر گر کر گھنٹا بجاتے تھے، جب اسکے بارہوں کھڑکیاں کھل جاتی تھیں تو ان میں سوار نکلتے تھے اور چاروں طرف چکر لگا کر پھر اندر داخل ہو جاتے تھے اور کھڑکیاں بند ہو جاتی تھیں۔

پانی کی گھڑی کے بہت زمانہ بعد "ریت گھڑی" ایجاد ہوئی، یعنی بجائے پانی کے ریت بھر دی جاتی تھی اور وہ سوراخ سے آہستہ آہستہ گرتی تھی، اس کے موجد بھی اہل مصر ہیں۔

انگلستان میں شمعوں کے ذریعہ سے تعیین اوقات کی جاتی تھی، روزانہ چھ شمعیں روشن کی جاتی تھیں جن میں سے ہر ایک بارہ انچ کی ہوتی تھی، ان شمعوں کے بدلنے اور اس کی بتی کاٹنے کے لئے دو راہب مقرر ہوتے تھے جو اپنی انگلیوں سے بتی کاٹتے تھے (قینچی کا رواج اسوقت تک نہ ہوا تھا) یہ شمعیں سینگ کے اندر روشن کی جاتی تھیں تاکہ ہوا سے گل نہ ہوں، بعد کو فانوس کے اندر رکھ کر جلانے کا رواج پیدا ہوا

موجودہ پہیہ رکھنے والی گھڑیوں کے ایجاد کب ہوئی، یقین کے ساتھ بتانا مشکل ہے، بعض کہتے ہیں کہ قبل مسیح دو سو سال اسکی ایجاد ہوگئی، بعض کا خیال ہے کہ سنہ ۵۱۰ء میں ایک شخص بیتھوس نے ایجاد کی، اور بعض کی تحقیق یہ ہے کہ سنہ ۸۵۰ء میں ایک راہب باسیویکوس نے اس کو اختراع کیا۔ سنہ ۹۹۶ء میں پاپائے اعظم سلوسٹر ثانی نے ایسی گھڑی بنائی جو پہیوں کے ثقل سے گھومتی تھی، چنانچہ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ پاپا سحر جانتا ہے اور جادو کے مدد سے اس نے یہ گھڑی بنائی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی تک اس صنعت میں کافی ترقی ہوگئی چنانچہ اہل عرب نے بعض ایسی گھڑیاں طیار کر کے خلفاء مصر کے سامنے پیش کیں جو نہایت مکمل تھیں۔ یہی گھڑیاں بعد کو فریڈرک ثانی کے پاس پہونچیں اور اسی وقت سے اطالیہ میں پہیہ والی گھڑیاں بننی شروع ہوئیں جس کا تتبع انگلستان میں بھی کیا گیا۔ چنانچہ اڈورڈ اول کے زمانہ میں کسی راہب نے جو لوہار کا لڑکا تھا ایسی گھڑیاں طیار کیں جو گھنٹوں کے علاوہ شمس و قمر کی گردش اور اوقات مد و جزر کو بھی بتاتی تھیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۳۲۵ء میں ایک اور راہب نے ایسی گھڑی بنائی جو سیاروں کی گردش کو بھی بتاتی تھی۔ اس میں دو پتلے نصب تھے جو گھنٹہ بجاتے تھے اور اوپر آٹھ پتلے پہلوانوں کے تھے جو آپس میں زور آزمائی کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ گھڑی اب بھی موجود ہے اور کام دیتی ہے۔

سنہ ۱۳۴۴ء میں وینس کے ایک آدمی نے ایسی گھڑی بنائی جو نہ صرف شمس و قمر اور سیاروں کی حرکات کو ظاہر کرتی تھی بلکہ سال کے تمام تہواروں کو بھی بتاتی تھی۔

گھڑی میں پنڈولم یا رقاص کا استعمال سترھویں صدی عیسوی سے ہوا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کے موجد اہل عرب ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ وہ کوئی فرنگی تھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کے موجد اہل عرب تھے لیکن ترقی دی اسکو اہل فرنگ نے۔ سنہ ۱۸۰۸ء میں نیویارک کے ایک شخص نے ایسی گھڑی بنائی جو ۱۸ فٹ لمبی، ۸ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ دبیز تھی۔ اس میں دو ہزار پہیے تھے۔ اس کے اوپر واشنگٹن کا مجسمہ بنایا گیا تھا اور بہت سے دوسرے مجسمے ایسے تھے جو علاوہ وقت کے گردش شمس و قمر اور خدا جانے کیا کیا ظاہر کرتے تھے۔

موجودہ ساخت کی جیبی گھڑی بیضاوی شکل کی سب سے پہلے سنہ ۱۴۹۰ء میں طیار ہوئی اور ایک شخص پیٹرس ہیلی نے اسے طیار کیا تھا۔ اس قسم کی گھڑیوں میں صرف ایک سوئی ہوتی تھی جو دن میں دو یا تین مرتبہ گردش کرتی تھی۔ اور چونکہ یہ بھاری بہت ہوتی تھیں اس لئے گردن میں موٹی زنجیر سے باندھ کر لٹکائی جاتی تھیں۔

چونکہ یہ گھڑیاں بہت قیمتی ہوتی تھیں اس لئے سوائے بادشاہوں اور امراء کے دوسرے استعمال نہ کر سکتے تھے، سترھویں صدی میں کمانی ایجاد ہوئی اور جیبی گھڑیاں زیادہ مکمل بننے لگیں ــ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اب جتنی ترقی ہوئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ــ سب سے زیادہ مکمل گھڑیاں وہ ہیں جو کرونوگراف یا کرونومیٹر کہلاتی ہیں اور رصدگاہوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

انتباہ!

اے روش نا آشنا، گم گشتۂ راہِ حیات　　آ، بتاؤں تجھ کو رمز زندگی وجہِ ممات
دل ترا احساس کی لذت سے ہے نا آشنا　　راہِ آزادی میں واماندہ ہے تیرا حوصلہ
مشکلاتِ وقت سے تو جنگ کر سکتا نہیں　　تو غلامی کے اندھیرے سے اُبھر سکتا نہیں
ہے یہاں ہر پھول کے پردے میں پنہاں خار زار　　آستیں کے سانپ ہیں یہ تیرے سارے غمگسار

اپنے مستقبل کی اپنے ہاتھ سے تعمیر کر
بیٹھ جا اقبال کے سینے میں پہلو چیر کر

جب رگِ انسانیت میں عزم کرتا ہے گزر　　شوق آتا ہے نکل، دیوارِ آہن توڑ کر
خون میں جب آتشِ احساس ہوتی ہے رواں　　سانس سے بن بن کے انگارے نکلتا ہے دھواں
جذبۂ آزاد جب ہوتا ہے دل میں موجزن　　شیر کے پنجے میں بھی ہرگز نہیں رکتا ہرن

اور جب بیچارگی کرتی ہے عزمِ احتجاج
سر پہ اک مزدور کے سلطان کا ہوتا ہے تاج

محمد صادق ضیا

ہمارے قائدین ملّت

غم و آلام سے خالی ہے پیشہ رہنمائی کا
نکموں کے لئے اچھا ہے پیشہ رہنمائی کا

چراغِ معصیت سے خلوتیں جن کی فروزاں ہیں
عصائے رہنمائی سے فروغِ بزمِ ایماں ہیں

عطا ہوتا ہے اک دو ماہ میں تمغۂ شرافت کا
نہ کیونکر ہر سر و مایہ کو سودا ہو قیادت کا

درخشاں ہیں گلے ہاروں سے مانندِ عروس انکے
نہایت شان و شوکت سے نکلتے ہیں جلوس انکے

بہت ہے اپنی مفلس قوم کے پیسے کا پاس ان کو
سفر کے واسطے مطلوب ہے سیکنڈ کلاس ان کو

نہ راجاؤں سے ڈرتے ہیں نہ دبتے ہیں حکومت سے
بسر ہوتی ہے چندوں کی بدولت شان و شوکت سے

نہایت قابلِ نفرت ہیں افعالِ زبوں ان کے
ہوئے ہیں قوم کا خوں پی کے چہرے لالگوں ان کے

مہاجن بن رہے ہیں گوشتِ مفلس قوم کا کھا کر
یہ بندے نفس کے مسرور ہیں احرار کہلا کر

حکومت پھانس لے تو جیل کی سختی سے ڈرتے ہیں
شکوہِ قوم سے حکام کو مرعوب کرتے ہیں

سفارش سے گزارش سے علالت کے بہانے سے
نکل آتے ہیں وہ طعن بن کے اکثر جیل خانے سے

اگر چلتا نہیں اہلِ حکومت پر کوئی افسوں
رقم کرتے ہیں بیکس قوم کو اک نامۂ پر خوں

کسی صورت سے حاصل جیل میں ہولے کلاس انکو
نہ کرنے پائیں تنہائی کی راتیں بھی اداس ان کو

یہ حالت ہے تو زنداں سے کوئی گھبرائے کیا معنی
کسی ظالم کے ظلم و جور سے ڈر جائے کیا معنی

ہوا محشر بپا نعروں سے گردوں کی فضاؤں میں
مگر سولہ برس میں کیا کیا ان رہنماؤں نے

دیارِ ہند میں ہے ملتِ بیضا غلام اب تک
یہ حریت کی طالب دم بخود ہے زیرِ دام اب تک

گلا اس سخت جاں کا ہے عدو کی تیغِ براں ہے
مسلماں کا لہو اب تک مثالِ آب ارزاں ہے

وہی پستی وہی نکبت وہی ذلت وہی خواری
وہی مستی وہی غفلت وہی خوابِ گراں طاری

رہینِ انتظارِ ناخدا یہ قوم ہے اب تک
یم تعلیم سے ناآشنا یہ قوم ہے اب تک

نہ ہے کوئی نصاب اس کا: ہے کوئی نظام اس کا
نہ کوئی مدعا اس کا نہ کوئی اہتمام اس کا

جو دیکھو رہناؤں کو تو اک اک شیر صحرا ہے
کوئی ہٹلر بنا پھرتا ہے کوئی ڈمی ولیرا ہے

جو کیجے امتحاں تو نفسِ آمارہ کے بندے ہیں
کلام حشر زا کے دام ہیں چندوں کے پھندے ہیں

کوئی مسجد بنے سیلاب آئے زلزلہ آئے
نکل آتے ہیں چندے کے لئے دامن کو پھیلائے

ہر اک بستی ہر اک قریہ میں مولانوں کا پھندہ ہے
کسی تحریک کو لے لیجے مقصد "صرف چندہ" ہے

پشاور سے اگر رنگون تک پھیلی ہے آگ ان کی
کراچی سے اگر کشمیر تک ہے دوڑ بھاگ ان کی

تعلق کیا ہے اس کا ملتِ بیضا کی خدمت سے
مسلمانوں کو کیا ملتا ہے اس سیر و سیاحت سے

سُن اے مردِ جری! اے "خالد و فاروق" کے پوتے
ضرورت کیا ہے لیڈر کی تجھے قرآن کے ہوتے

ضرورت ہے کہ اب تو ان ستمرانوں کو پہچانے
لئے جاتے ہیں دوزخ کی طرف تجھکو یہ مولانے

نہ ہو مرعوب ان کی آتشیں تقریر سے غافل
نہ ہو دم بھر بھی ان کے نعرۂ تکبیر سے غافل

یہ آزادی کے دعوے بے خبر باتیں ہی باتیں ہیں
متاعِ دین و ایماں لوٹنے والوں کی گھاتیں ہیں

ترے ہمدرد بن کر تیرے خوں سے پیٹ بھرتے ہیں
تری خدمت کے پردہ میں حکومت تجھ پہ کرتے ہیں

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانہ

انتخاب از کلام محروم

(مرسلۂ عدم)

اسیرانِ قفس کی اے چمن والو خبر لینا　　بہار آئے تو ان بھولے ہوؤں کو یاد کر لینا
دلِ نازک ترا اس سے نہ اے صیاد ہو برہم　　مری عادت میں داخل ہے کبھی فریاد کر لینا

ترا نام تسکیں دہِ قلبِ مضطر　　تری یاد آرامِ جانِ حزیں ہے

کھُل سکے اُن پہ کس طرح واقفِ سوز و ساز ہوں　　چاہئے اب کہ شمع ساں میں بھی زباں دراز ہوں

اک اضطرابِ پیہم پہلے تھا اب سکوں ہے　　وہ غم کی ابتدا تھی، یہ غم کی انتہا ہے

اہلِ ہوا نہیں ہیں فقط آج غم نصیب　　روزِ ازل سے جام نگوں ہے حباب کا
محروم کچھ بُرا نہ ہوا جا چکا اگر　　تھا دورِ غفلتوں کا زمانہ شباب کا

جو وہ غمخوار ہو جائے تو غم کیا　　زمانہ کیا۔ زمانہ کے ستم کیا

دلِ ناداں کی بدولت ہے جو رسوائی ہے　　بددعا اور اسے کیا دوں کہ یہ ناکام تو ہے

حسرتِ خفتہ کو جگاتا ہے　　ذکر پیری میں نوجوانی کا

ذرّاتِ خاک بن نہیں جاتے نجوم کیوں　　حیرت سے دیکھتا ہوں تری رہگزر کو میں

طبیعت مائلِ ذوقِ جفا معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی بے وفائی بھی وفا معلوم ہوتی ہے

سفر کرتے ہوئے منزل بمنزل جا رہے ہیں ہم مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

یوں پشیماں ہوں میں غفلت میں جوانی کاٹ کر جس طرح دن بھر پشیماں ہو پشیمانِ سحر
حُسن یہ سارا اُسی کا ہے کہ جس کے عشق میں چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر
سوئے در کیا دیکھتا ہے۔ اے دلِ غمدیدہ دیکھ یہ شبِ فرقت ہے جس میں کم ہے امکانِ سحر

فتنہ آرا شورشِ اُمید ہے میرے لئے نااُمیدی راحتِ جاوید ہے میرے لئے

گزرتی جا رہی ہے زندگی اور روح شاداں ہے مسافر کے لئے کم تر مسافت ہوتی جاتی ہے

محروم

رقص

دل کی وہ گہرائیاں، جذبات کے وہ ولولے ترجمانی جن کی ناممکن ہو یکسر، نطق سے
روپ بھر لیتے ہیں اعضا کی لچک کا ہمنشیں رقص میں عریاں نظر آتی ہے دِل کی سرزمیں
مرمریں اعضا میں ہوتا ہے بہاروں کا ہجوم پھول کھلتے ہیں نگاہوں میں، لرزتے ہیں نجوم
دِل کے ہر ذرے کا سوز و ساز ہوتا ہے عیاں روح کے اعماق کا ہر راز ہوتا ہے عیاں
دل کی ہر پہلو سے پوری ترجمانی رقص ہے رعشۂ اعضا سے تخلیقِ معانی رقص ہے

عدم

خواتینِ عرب کی فیشن طرازیاں

(عہد جاہلیتہ و اسلام میں)

عورت، ہر جگہ عورت ہے، خواہ وہ کشمیر کے مرغزاروں میں پیدا ہوئی ہو، یا صحرائے عرب کے ریگزاروں میں۔ عورت کی یہ حس کہ وہ حسین ہے، جاذب قلب و نظر ہے اور یہ کہ "زیب دیتا ہے اُسے دشمنِ ایماں ہونا" یورپ و ایشیا ہر جگہ یکساں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگر ایک اپنا دامن مرد کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتی تو دوسری بگڑ کر یہ کہ گزرتی ہے کہ

میرا دامن چھوڑئے اپنا گریباں پھاڑئے

الغرض عورت حسین ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ کو ایسا ضرور سمجھتی ہے اور یہی وہ حس ہے جو اس میں جذبۂ آرائش و زیبائش پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ حس جو آج مغرب کی عورت میں اسقدر نمایاں طور پر پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل ایشیا کی عورت میں بھی پائی جاتی تھی اور جن اسباب غمزہ و ناز سے آج مغرب کی عورتیں آراستہ نظر آتی ہیں، انھیں اسباب سے خواتین ایشیا بھی کسی وقت آراستہ تھیں۔

خواتین یورپ کی ابداع و اختراع وضع و ملبوس آج ضرب المثل ہے لیکن تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایشیا کی عورت بھی یہی ذہنیت رکھتی تھی اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے ہر جگہ اور ہمیشہ اس نے اس ابداع و اختراع سے کام لیا۔

بعض کا خیال ہے کہ خواتینِ عرب عہد جاہلیت میں اپنے وضع و ملبوس کے لحاظ سے سخت وحشی تھیں اور ان میں زیبائش و آرایش کا خیال بڑی حد تک معدوم تھا حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ وہ آرائش و زیبایش کے مختلف طریقوں سے واقف تھیں، ملبوس کی تراش و خراش میں بھی اختراع سے کام لیتی تھیں اور وضع میں رنگینیاں پیدا کرنا بھی انھیں معلوم تھا۔ پھر چونکہ اُن کا نہ کوئی دین تھا، نہ قانون اس لئے ان ذوقِ آرایش میں اعتدال قائم رکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی اور اسی لئے جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے خواتین عرب کے شوقِ تجمیل و آرائش میں نامناسب افراط کو محسوس کیا، تو اس نے "تبرج جاہلیت" (یعنی عہد جاہلیت کی زینت و آرایش) کو ممنوع قرار دیا۔

عہد جاہلیت کا لٹریچر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتیں صرف اُون اور سوت ہی کا لباس استعمال نہ کرتی تھیں بلکہ مختلف رنگ کے دیبا و حریر بھی حسب استطاعت پہنتی تھیں اور جب کسی جگہ اجتماع ہوتا تھا تو بہترین لباس و آرائش کے ساتھ شریک ہوا کرتی تھیں۔ المنخل الیشکری لکھتا ہے :۔

الکاعب الحسناء ترفل فی الدمقس و الحریر

(نوجوان حسین لڑکی دیبا و حریر کا ملبوس پہنے ہوئے اترا رہی ہے)

کپڑوں کے زرین نقش و نگار کا حال سلمی بن ربیعہ اس طرح بیان کرتا ہے :۔

والبیض یرفلن کالدمی فی الریط والمذہب المصون

ریط سے مراد ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہیں اور المذہب المصون سے زرین نقش و نگار رکھنے والے ملبوس اسی طرح کے ہزاروں اشعار عہد جاہلیت کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے وہاں کی عورتوں کی رنگینی طبع و تزئین و تجمیل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس وقت یوروپ میں خاص تقریبات کے وقت امیر گھرانوں کی عورتیں ایسے ملبوس پہنتی ہیں جن کے دامن فرش پر گھسٹتے رہتے ہیں اور غالباً یہی وہ وضع ہے جس کو فارسی میں "دامن کشاں گزشتن" سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم عربی عورتیں بھی بالکل اسی طرح کے لباس پہنکر مجالس و محافل میں شریک ہوتی تھیں جسے "جرّ ذیول" کہتے ہیں اس فیشن کے متعلق مورخین عرب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اس کو جناب ابراہیم کی بیوی ہاجرہ نے وضع کیا تاکہ دامن کے گھسٹ کر چلنے سے اُن کے نشان قدم مٹتے جائیں اور اُن کی سوکن سارہ کو پتہ نہ چلے۔ اس کے بعد اور عورتوں نے بھی یہی وضع اختیار کی۔ چنانچہ عرب عورتوں کے اس طرح "دامن کشاں" چلنے کا ذکر کثرت سے وہاں کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ امرؤ القیس لکھتا ہے :۔

خرجت بہا امشی تجر وراءنا علی اثرینا ذیل مرط مرحّل

اس شعر میں شاعر اپنی معشوقہ فاطمہ کا ذکر کرتا ہے کہ جب وہ خلوتگاہ سے نکل کر چلی اور عاشق بھی ساتھ ساتھ چلا تو وہ اپنے ملبوس کا دامن گھسیٹتی دئی گزری تاکہ دونوں کے نشان قدم مٹتے جائیں اور کسی کو پتہ نہ چلے۔

"مرط مرحل" سے مراد وہ ریشمی کپڑا ہے جس کے اوپر محمل کی تصویریں منقوش ہوں۔

یہ وضع عرب عورتوں میں بہت مقبول تھی اور عہد اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ لکھتا ہے :۔

کتب القتل والقتال علینا وعلی الغانیات جرالذیول

یوروپ کے عہد وسطے کے بعد بھی عورتوں میں رسم تھی کہ وہ اپنے کولوں کو بڑا دکھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے گدے یا تکیے کمر سے نیچے دونوں طرف باندھ لیتی تھیں۔ اور پھر اس کے اوپر دوسرا ملبوس پہن لیتی تھیں۔

یہ وضع بھی عہد جاہلیت کی عورت نے اختراع کی تھی جسے عظامہ، حشیہ اور رفاعۃ کہتے تھے اور اہلِ لغت نے اس کے معنی لکھے ہیں کہ وہ تکیے کی طرح کپڑے کی گدی ہوتی ہے جس کو باندھ کر عورتیں اپنے کولوں کو بڑا ظاہر کرتی ہیں۔

استعمالِ زیور میں وہاں کی عورتوں کو بہت شغف تھا اور لباس سے زاید اس طرف توجہ تھی۔ اور ایک ایک حصۂ جسم کے لئے متعدد زیور استعمال کرتی تھیں۔ مثلاً ہاتھ کی اُنگلیوں میں انگوٹھیاں، کلائی میں کنگن، بازو میں جوشن اور پہونچے میں دست بند استعمال کرتی تھیں جن کا نام علی الترتیب خاتم، سوار، دملج اور جبیرۃ تھا۔ دست بند استعمال کرنے کی رسم بعد کو متمدن یورپ میں بھی جاری ہوئی اور اسوقت تک پائی جاتی ہے۔

انگوٹھیاں وہ دسوں اُنگلیوں میں پہنتی تھیں اور یہ رسم عہدِ اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب آغانی لکھتے ہیں کہ:-

"وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ معشوقہ (ثریا) کے پاس گیا اور جب وہ کپڑے اتار کر اسکے پاس آئی تو اسکے دوست کو دیکھکر لوٹ گئی۔ اس نے کہا کہ شرم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ میرا دوست ہی اور اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہی۔ یہ کہکر وہ ہنسنے لگا۔ ثریا کو غصہ معلوم ہوا تو اس نے نکل کر ایسا دو ہتڑ مارا کہ دسوں انگوٹھیوں کے نشان اسکی پیشانی پر پڑ گئے۔"

جب ظہورِ اسلام ہوا تو عورتوں کا یہ ذوقِ آرایش حد کو پہونچا ہوا تھا قمیص کا گریبان کھُلا رہتا تھا اور دوپٹہ پیچھے لٹکتا رہتا تھا جس سے سینہ و گردن دونوں عریاں نظر آتے تھے۔ اسلام نے اس وضع کو فتنہ سے خالی نہ دیکھکر حکم دیا کہ عورتیں اپنے دوپٹہ کا پلو سینہ پر ڈال لیا کریں۔ (ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن د آبا ئھن)

اس حکم سے ان کو سخت صدمہ ہوا، لیکن چونکہ دینی روح ان میں پوری طرح رچ چکی تھی اس لئے سوائے تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر کچھ زمانہ بعد ایک اور وضع انھوں نے ایجاد کی جو ان کے گمان میں خلاف مذہب نہ ہوسکتی تھی، یعنی تنگ کپڑا استعمال کرنا شروع کیا جسے "وضعِ قباطی" کہتے تھے۔ ابن رشد نے لکھا ہے کہ قباطی ان تنگ و چُست کپڑوں کو کہتے ہیں جو جسم کے نشیب و فراز اور اعضاء کے اُتار چڑھاؤ کو نمایاں کر دیتے ہیں، خلیفۂ ثانی نے اس وضع کو بھی ممنوع قرار دیا کیونکہ اس میں بھی کافی عریانی تھی۔

عرب کی عورتوں کا ملبوس بعض مرتبہ شاعری سے بھی کافی متاثر ہوا ہے اس سلسلہ میں ایک ادبی واقعہ کا بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

خواتینِ عرب سیاہ رنگ کا ملبوس اور خاصکر سیاہ دوپٹہ پسند نہ کرتی تھیں۔ ایک بار عراق کا کوئی سوداگر مدینہ آیا جسکے پاس مختلف رنگوں کے دوپٹے تھے۔ یہاں پہونچتے ہی اس کا تمام مال فروخت ہوگیا لیکن سیاہ دوپٹہ کسی نے نہ لیا۔ سوداگر مسکین الدارمی کے پاس گیا جو اپنے زمانہ کا مشہور رنگین مزاج شاعر تھا اور کچھ دن سے مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہا تھا۔ مسکین کو اس پر رحم آیا اور خرقۂ زہد اُتار کر مسجد سے باہر آگیا۔ اب اس کی وہی شان رندی تھی اور وہی ادائے رنگیں۔ اس نے چند شعر لکھ کر اپنے ایک دوست کو جو مغنی تھا دئے تاکہ وہ کسی جگہ جاکر اُن کو سنا دے۔ وہ اشعار یہ تھے:-

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود		ماذا فعلت براھب متعبد

قد کان شمر للصلاۃ ثیابہ حتیٰ خطرت لہ بباب المسجد
ردّی علیہ صلاتہ وصیامہ لا تقتلیہ بحق دین محمد[1]

ان اشعار کا مدینہ میں مشہور ہونا تھا کہ گوشہ گوشہ تک یہ خبر پہونچ گئی کہ وہ آدمی کسی سانولی لڑکی کے عشق میں جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے مسجد سے باہر آگیا ہے اور مدینہ کی کوئی ملیح لڑکی ایسی نہ تھی جو سیاہ رنگ کی اوڑھنی کی طرف مائل نہ ہوگئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوداگر نے بہت کافی نفع سے سیاہ رنگ کے دوپٹے فروخت کردئے اور اسوقت سے سیاہ دوپٹوں کا رواج شروع ہوگیا۔

اس کے بعد سنہرے رنگ کے دوپٹوں کا رواج ہوا، جیسا کہ قاضی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو دارمی کے رنگ میں لکھے گئے تھے:۔

قل للملیحۃ فی الخمار المذہب افسدت نسک اخی التقی المترہب
نور الخمار ونور وجہک تحتہ عجبا لوجہک کیف لم یلتہب
وجمعت بین المذہبین فلم یکن للحسن عن ذہبیہما من مذہب
واذا اتت عین لتسرق نظرۃ قال الشعاع اذہبی لا تذہبی

بالوں کی آرایش کے سلسلہ میں وہاں مناسرہ کا بھی رواج تھا جو عہد جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا اور عہد اسلام میں بھی عرصہ تک باقی رہا۔ مناسرہ کی صورت یہ تھی کہ بالوں کی مینڈھیاں گوندھکر سر کے اوپر اس طرح باندھ لیتی تھیں کہ خراسانی اونٹ کی دو کوہانوں کی طرح وہ حصہ دوجگہ سے بلند نظر آتا تھا۔ رسول اللہ نے اس سے بھی عورتوں کو باز رکھا کیونکہ اس وضع میں پہلے سر پر دوپٹہ وغیرہ پیشانی تک لپیٹا جاتا تھا اور اس سے صحت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔

بالوں کی ایک وضع جناب سکینہ بنت حسین کے نام پر "طرۂ سکینہ" کے نام سے رائج ہوئی۔ جناب سکینہ نہ صرف اپنے حسن وجمال بلکہ بالوں کی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ کی نہایت مشہور خاتون تھیں۔ آپ کو تزئین وآرایش کا خاص ذوق فطرت سے ودیعت ہوا تھا اور بالوں کی زیبایش میں آپ نے ایک خاص اختراع کی جسے "طرۂ سکینہ" کہتے ہیں۔ یہ وضع خواتین عرب میں بہت مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ عمر بن عبد العزیز نے نہایت سختی سے اسے روکا۔

ایک وضع خلیفہ مہدی کی بیٹی علیہ کے نام سے مشہور رہوئی۔ یہ نہایت حسین وجمیل تھی اور فن شعر وموسیقی کی بھی بڑی ماہر تھی لیکن پیشانی بدنمائی کی حد تک وسیع وکشادہ پائی تھی، اس عیب کو چھپانے کے لئے اس نے جڑاؤ سربند وضع کیا جس سے پیشانی

---

[1] ان اشعار کا مفہوم یہ ہے:۔ اس سانولے رنگ کی لڑکی سے جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے جاکر کہو کہ یہ تو نے ایک زاہد شب زندہ دار کا کیا حال کردیا۔ وہ تو اپنی تمام عمر عبادت ونیایش کے لئے وقف کرچکا تھا کہ ناگہاں تو نظر آگئی اور نماز وروزہ سب خاک میں ملادیا۔ پھر تجھے اپنے دین ومذہب کا واسطہ، سچ بتا کیا تو اس کو واقعی قتل کردے گی۔

ڈھک جاتی تھی یہ وضع اتنی مقبول ہوئی کہ جس عورت کو دیکھئے سربند سے پیشانی کو چھپائے ہوئے ہے۔

بالکل اسی طرح فرانس کی ایک مشہور امیرزادی نے کیا جس کا نام (La Belle Ferronnière) تھا۔ اس کے وسط پیشانی میں آگ سے جل جانے کا داغ تھا۔ اس کو چھپانے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ داغ کی جگہ ہیرا رکھکر دونوں طرف ریشمی دھاگے سے باندھ کر سر میں لپیٹ لیا۔ اسپین کی ایک امیرزادی کی رانیں بہت موٹی تھیں اس نے ایک خاص لباس ایجاد کیا جس سے یہ عیب چھپا رہتا تھا، اسی طرح لوئی نہم شاہ فرانس کی ایک لڑکی کے پاؤں بہت بھدے تھے اور ان کے چھپانے کے لئے اس نے لانبا گون اختراع کیا جس کا دامن زمین تک لٹکتا رہتا تھا اور پاؤں کو چھپائے رکھتا تھا۔ بعد کو یہ اوضاع تمام ملک میں رائج ہوگئیں۔

دور عباسیہ ترقی تمدن اور تہذیب مجلس و معاشرت کے لحاظ سے اسلام کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اس قسم کی اختراعیں کثرت سے ہوئیں اور عورتوں کو اپنی تجمیل و تحسین کی طرف بہت توجہ ہوئی۔ علی ابن ہشام کی ایک کنیز (رتیم) تھی جو بے انتہا خوبصورت و وضعدار تھی۔ اس نے سر کی ٹوپی میں فیتہ باندھنے کی وضع ایجاد کی تاکہ سر کے نہیں۔ اور پھر یہ وضع عام ہوگئی۔ یہ کنیز ابن ہشام (اپنے مالک) کے قتل کا بھی باعث ہوئی، کیونکہ خلیفہ مامون نے یہ لونڈی علی ابن ہشام سے طلب کی تھی اور اس نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔

عہد بنی اُمیہ میں دستی پنکھوں میں اشعار لکھنے کا رواج عام تھا، لیکن عہد عباسیہ میں کپڑوں پر بھی عمدہ عمدہ فقرے اور اشعار لکھے جاتے تھے۔ کمر اور سر کی مرصع پٹیوں قمیص کے دامنوں اور ٹوپیوں وغیرہ پر بھی سونے کے ورق لگا کر اشعار نمایاں کئے جاتے تھے اور یہ ایجاد بھی عورتوں ہی نے کی تھی پھر یہ وضع صرف طبقۂ امراء ہی تک محدود نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی کنواریاں بھی اپنی چادروں، پٹیوں اور ملبوسوں میں اشعار منقوش کراتی تھیں۔ چنانچہ وشّار لکھتا ہے کہ میں نے کلیسائے مریم میں ایک کنواری کو دیکھا کہ چاند کی طرح ہیل باہر نکلی۔ اس کے کمر میں مرصع پیٹی تھی اور اس پر یہ اشعار منقوش تھے:۔

زنارہا فی خصرہا لیطرب 	وریحہا من طیبہا الحبیب
ووجہہا احسن من حلیہا 	ولونہا من لونہا اعجب [1]

وضع کی ایجاد پر حوادث سیاسی اور اکتشافات اثری بھی متاثر ہوا کرتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی عورتیں ہر تاریخی واقعہ کی یادگار اپنے کپڑوں پر منقوش کر لیا کرتی تھیں۔ جب آٹھویں ہجری میں سنگ مرمر کے دو ستون (عہد فاطمی کے) دریافت ہوئے تو عورتوں نے اپنے ملبوس کی تراش میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی جو طول میں دو ستونوں سے مشابہ تھی۔ بعد کو یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس کا نام جرالعمود پڑ گیا۔

---

[1] مفہوم یہ ہے کہ اسکی کمر کی پیٹی کتنی خوشنما ہے اور اس کے چہرہ کا حسن اُس کے زیوروں سے زیادہ جاذب نظر ہے۔

مصر کی عورتوں نے ایک اور وضع قمیض کی ایجاد کی جس کو بہطلہ کہتے تھے اور چونکہ اس میں بہت زیادہ صرف ہوتا تھا اسلئے حکومت نے بمشکل تمام اس سے عورتوں کو باز رکھا۔ مقریزی کا بیان ہے کہ عورتیں اتنی بڑی بڑی قمیص بناتی تھیں کہ زمین تک لٹکتی رہتی تھی اور آستین تین تین گز کی ہوتی تھیں، ایک ایک ہزار درہم ایک قمیص پر صرف ہو جاتے تھے، پاجامہ یا ازار کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ وزیر منجک نے نہایت سختی سے اس کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ان کی آستینیں کاٹ کاٹ دیں، انکے کپڑے پھاڑ پھاڑ ڈالے اور بعض کو تو اس نے قتل بھی کرا دیا جب کہیں جاکر یہ رسم وہاں سے اُٹھی لیکن اس کے مرنے پر چند دن بعد پھر اس کا رواج ہو گیا چنانچہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ۷۹۲ھ میں بڑی آستین والی قمیصوں کے خلاف پھر احکام جاری کئے گئے ۔۔۔ یہ آستینیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ہاتھ اُٹھانے سے تمام گردن و شانہ، بلکہ سینہ اور پیٹ تک نظر آنے لگتا تھا۔

دوزخ

(۱)

دریا چپ چاپ بہ رہا تھا — کتنا خاموش! کتنا غمگین!....

کنارے پر مکانات ایسے اُداس نظر آتے تھے، جیسے خستہ حال فقیروں کا گروہ، جنھیں ملاح نے کرایہ نہ رہنے کی وجہ سے روک رکھا ہو! — اپنے جھکے ہوئے کاندھے ایک دوسرے سے ملائے — اپنی لاغر ٹانگیں پانی میں پھیلائے! اُن کی کھلی ہوئی کھڑکیاں حقارت آمیز حسرت سے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے اکا دُکا اچھے مکانوں کو دیکھ رہی تھیں جو سبز سبز گھاس پر ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے مخملی فرش پر شمعدان —

ان غریب گھروں میں روشنی نہ تھی! — فسردہ خاموشی! خاموش تاریکی! تاریک اُداسی! — اور موجوں کی سسکیاں! جو آہستہ آہستہ، لاپروائی سے چلی جا رہی تھیں، ایک عالم خود فراموشی میں! زندگی کے بوجھ سے تھکی ہوئی!...

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ جھینگروں کی جھنجھناہٹ ہوا میں گونجی ہوئی تھی!... آبی پودوں سے ٹکرا کر یہ "نغمہ" غضب کا سحر انگیز ہو جاتا تھا! ہوا کے رُک رُک کر آتے ہوئے ہلکے ہلکے جھونکے کبھی کبھی پانی کی سطح سے گزر کر انھیں اُس کنارے بھی پہونچا دیتے!..

دور ایک کشتی آ رہی تھی!...

کنارے پر کے ایک مکان میں ایک عورت کھڑی تھی۔ کمزور، نحیف!.. کٹہرے پر جھکی ہوئی ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کئے کشتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ٹھیک جہاں پر کشتی تھی، آفتاب کی سنہری کرنیں پانی میں چمک رہی تھیں۔ گویا کہ کشتی سنہرے "آئینہ" پر پھسلتی چلی آ رہی تھی!...

شام کی روشنی میں اس عورت کا موم جیسا زرد چہرہ ایسا ہی چمک رہا تھا جیسی کہ خود اس کی روشنی تھی!.. دور سے ایسا صاف دکھائی دیتا تھا جیسے تاریک راتوں میں سمندر کی موجوں پر چمکتا ہوا سفید جھاگ! اس کی پُر خوف مایوس نگاہیں، مضطربانہ، کچھ تلاش کر رہی تھیں! اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ لیکن پیشانی کی شکنیں اس کی نا اُمیدی کو صاف ظاہر کر رہی تھیں!..

گاؤں کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی!....

اس نے سر ہلانا شروع کیا گویا کہ وہ کوئی آواز سننا ہی نہیں چاہتی۔
"میں نہیں برداشت کر سکتی! میں نہیں برداشت کر سکتی!" — وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی!
لیکن اذان کی صدا آتی ہی رہی!....
وہ صحن میں ٹہلنے لگی۔ اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ سانس زور زور سے آ رہی تھی۔ آنسو اُمڈے آ رہے تھے!
— مدت سے اسے ایک تکلیف دہ مرض تھا۔ کتنے ڈاکٹروں کو اس نے دکھلایا۔ کتنی بڑی بوڑھیوں سے اس نے مشورہ لیا۔ ہزاروں منتیں مانیں۔ درگاہوں پر نذر نیاز کی۔ لیکن تکلیف کم نہ ہوئی۔ ذرا بھی آرام نہ ملا۔ اُٹھتے بیٹھتے کسی طرح بھی چین نہ ملتا! آخرکار ایک کانے بوڑھے نے اسے ایک ٹوٹکا بتایا۔ کہ ایک پوٹلی میں قبرستان کی گھاس، مرگھٹ کی خاک، کانچ کے ٹکڑے اور اپنے دو چار بال باندھ کر کسی تندرست، نوجوان عورت کی طرف جو بہتے پانی سے ہو کر اس کی طرف آ رہی ہو پھینک دے۔ تب اسکا مرض منتقل ہو جائے گا! —
اور اسوقت وہی جادو کی پوٹلی وہ آنچل میں چھپائے تھی!... اور سامنے کشتی آ رہی تھی!... جب سے اس نے پوٹلی باندھی تھی یہ پہلی کشتی تھی جو اس نے دیکھی!
وہ آ کر کٹہرے پر جھک گئی۔ کشتی اب اتنی نزدیک تھی کہ اس کے آدمی صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سب کے سب اجنبی معلوم ہوتے تھے۔ اگلے حصہ پر ایک مرد کھڑا لگی سے کھے رہا تھا۔ سکان ہاتھ میں لئے ایک عورت بیٹھی تھی اور اس کے پاس ایک نوجوان تھا۔
بیمار عورت کٹہرے پر اور جھک گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ زرد چہرہ سُرخ تھا آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں! وہ کشتی کے نزدیک آنیکا انتظار کر رہی تھی!
آدمیوں کی گفتگو کی آواز اب آنے لگی۔ کبھی تو بالکل صاف۔ کبھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر —
کشتی اب مکان کے سامنے تھی۔ ٹھیک اسوقت کسی نے دیاسلائی جلائی، روشنی، جھلملاتی ہوئی ایک عورت کے چہرہ پر پڑی — بچوں کا سا معصوم و شگفتہ چہرہ! ہونٹ تبسم میں کھلے ہوئے!... اتنا پیارا چہرہ! اتنا معصوم! اتنا خوش! وہ ابھی بالکل لڑکی تھی!...
روشنی بُجھ گئی۔ ساتھ ہی کوئی چیز کشتی کے نزدیک پانی میں گری اور کشتی گزر گئی! —

---

(۲)

ایک سال بعد —
بھاری، گہری، رنگین بدلیوں میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آسمان کی سرخی دریا کی ساکن سطح پر منعکس ہو رہی تھی۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جھینگر اور کیڑے خاموش تھے — صرف موجوں اور آبی پردوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں!

دور ایک کشتی آرہی تھی!...

وہی عورت دریا کے کنارے کھڑی تھی گزشتہ سال پوٹلی دوشیزہ کی طرف پھینکنے کے بعد وہ بیہوش ہوگئی تھی!... اسکے مستحکم اعتقاد نے -- اور شاید گاؤں کے نئے ڈاکٹر نے بھی -- اس کے مرض میں تخفیف کردی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت اچھی ہوتی گئی اور آخرکار قریب قریب اسے صحت ہی ہوگئی! اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی -- لیکن خوشی دیرپا نہ تھی - رفتہ رفتہ عجیب طرح کا غم اس نے محسوس کرنا شروع کیا۔ رہ رہ کر اسے کشتی والی دوشیزہ یاد آتی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے لڑکی اس کے آگے ہاتھ جوڑے آنسو بھری حسین آنکھوں سے التجا کررہی ہے! وہ اکثر سسکیاں سنتی!... لڑکی زرد! لاغر! ہمیشہ اسے اپنی بڑی معصوم آنکھوں سے دیکھتی معلوم ہوتی! --

آج شام کو وہ کنارے پر آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ بالو پر بیٹھی تھی! رہ رہ کر اٹھتی، ادھر ادھر نظر دوڑاتی۔ اور پھر بیٹھ جاتی!...

مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی!....

اس نے ڈنڈا رکھدیا گھٹنے ٹیک کر دعا مانگی۔ پھر آگے بڑھی۔ اور... بغل بغل پانی میں جاکر اپنے کو گرادیا!... موجوں نے لسے اپنی سرد گرفت میں پکڑا، اپنی تاریک گہرائی میں اسے گھسیٹ لیا اور اسے لئے ہوئے آگے بڑھ گئیں!... چپ چاپ! آہستہ آہستہ! اداس!... گاؤں سے پرے، کھیتوں سے پرے!... دور، بہت دور!...

کشتی اب بہت نزدیک آگئی تھی۔ گزشتہ سال کے وہی چھ مسافر تھے۔ نوجوان سکان کے پاس بیٹھا تھا۔ دوشیزہ کشتی کے بیچ میں کھڑی تھی۔ ریشمی سرخ لباس پہنے!-- دونوں کی شادی ہونے والی تھی!...

کشتی مکان کے پاس سے گزر گئی۔ اس نے مسکراکر آسمان کی طرف دیکھا!.. اس کے تبسم میں کتنی شیرینی تھی! کتنی مسرت! کتنی حلاوت!...

وہ گانے لگی.. اس کی آنکھیں رنگین بادلوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ گارہی تھی... ایسا مطمئن گیت! ایسا پرسکون گیت! مسرت سے چھلکتا ہوا! خوشی سے مہکتا ہوا! کامیابی سے سرشار!.....

(ماخوذ)

تمنائی!

تصحیح

جولائی کے نگار میں صفحہ نمبر ۵ کی آخری سطر میں بجائے ر رو کے صرف لر چھپ گیا ہے قارئین درست کرلیں - منیجر نگار

نغمۂ دل

یہ مجموعۂ کلام شاہجہاں پور کے مشہور اہل سخن جناب دؔل کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے، کتاب کی ابتدا جناب نیاؔز فتحپوری کے ایک بسوط مقدمہ سے ہوتی ہے، جو ضرورت سے زیادہ طویل ہے، اس کے بعد جناب عزیزؔ لکھنوی کا ایک تبصرہ ہے جو اسی قدر مختصر ہے، پھر غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور آخر میں چند متفرق اشعار، رباعیات اور مخمس ہیں۔

غزلیات کی ترتیب افسوس ہے کہ اسی قدیم طرز پر یعنی ردیف وار رکھی گئی ہے، اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا، یعنی ابتدا میں کلام کا کیا انداز تھا، اور رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لائق مصنف نے قدیم اور جدید کا فرق دکھانے کی غرض سے غزلوں پر "ق" اور "ج" لکھدیا ہے، لیکن اس سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ شروع میں قدیم کلام بلالحاظ ردیف درج کر دیا جاتا، اس کے بعد جدید غزلیں یکجا جمع کردی جاتیں، اور غزلوں کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے رکھی جاتی، اس طور پر کلام کے ارتقاء تدریجی کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔

علاوہ اس کے اگر ضخیم دواوین و کلیات کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو یہ زیادہ مفید اور بہتر ہوگا، شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا، بلکہ کیا کہا، اور کیسا کہا؟ اور نہ ضروری ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ سب شائع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ لائق مصنف نے انتخاب سے کام نہیں لیا، ورنہ ان کے کلام کی رونق دوبالا ہوجاتی

اگرچہ فرصت کی کمی کی وجہ سے ادبی مشاغل کا سلسلہ ایک مدت سے بند ہے، تاہم یہ سخت ناانصافی ہوگی، اگر اس قسم کے قابل قدر کلام سے اعتنا نہ کیا جائے، موجودہ حالات میں تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں، البتہ دیواؔن کے سرسری مطالعہ سے جناب دؔل کی خصوصیاتِ کلام کے متعلق جس حد تک اندازہ کر سکا، اس کو مختصراً حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

جناب دؔل کا خاص صحیفۂ سخن غزل ہے، عام طور پر غزل گوئی نہایت آسان چیز سمجھی جاتی ہے، اگر صرف زلف و کمر، خط و خال، ناز و ادا وغیرہ کی مصوری کا نام غزل ہے تو بے شبہ ہر بوالہوس غزل گوئی کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن واقعہ

یہ ہے کہ اس سے زیادہ نازک اور مشکل اور کوئی صنفِ سخن نہیں، ہر شخص عشق و محبت کی نزاکتوں کا اندازہ شناس نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ذوقِ صحیح اور فطرتِ سلیم کی ضرورت ہے، جو ہر انسان کا حصہ نہیں ؎ ع ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اس بنا پر ایک غزل گو شاعر کے کلام میں سب سے پہلے جس چیز کو میری نگاہ ڈھونڈھتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر نے اپنے آئینۂ محبت کو کس حد تک ابتذال کی گرد سے پاک و صاف رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نے جس ہستی کو اپنا محبوب نظر بنایا ہے، اس کی حیثیت صرف ایک بازاری فتنہ گر کی ہے یا اس میں کچھ لطیف معنوی محاسن بھی ہیں، ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے، جناب دلؔ نے آنکھیں کھولیں تو ملک پر امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا، زانوے تلمذ بھی جناب دلؔ نے انھیں کے سامنے تہ کیا، لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبعِ سلیم عطا ہوئی تھی، اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا، جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے، تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے، نیازؔ صاحب ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے، اور کسی ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ نہ ملے تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھولے سے بھی اس (آرام جان) جلوۂ تمنا کا ذکر نہ آئے،،

مجھکو جناب دلؔ کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعوے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا یہ منشا ہے کہ جناب دلؔ کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں، جو مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعرا کے سرمایۂ خیال ہیں، مثلاً شمعِ تربت، چراغ مزار، بت سفاک، گریہ و زاری، ناز و ادا، کوچۂ قاتل، گورِ غریباں، وغیرہ ان کی جھلک جناب دلؔ کے کلام میں بھی نظر آتی ہے، اور یہ اثر زیادہ تر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے مثلاً

دل صد چاک میں دیکھا رُخِ روشن ان کا
ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا

اور آشفتہ تہ خاک کرے گا ہم کو
بال کھولے ہوئے آنا سرِ مدفن ان کا

ہاتھ دل پر رکھ کے یہ کہنا کسی کا یاد ہے
اب اسے اپنا نہ کہنا یہ ہمارا ہو گیا

جوڑا چھا ہے مری تقدیر ان کی زلف کا
یہ بھی بل کھائی ہوئی ہے وہ بھی بل کھائی ہوئی

چھری رکھکر گلے پر کاش قاتل آفریں کہتا
ہمارے ذبح کرنے کے لئے تکبیر ہو جاتی

ترا کوچہ ہے یا دار الشفا اے غیرتِ عیسیٰ
ادہر بیمار بیٹھے ہیں اُدھر بیمار بیٹھے ہیں

کھینچو چھری نقاب اُلٹ کر عتاب میں
چین جبیں کو چین نہیں ہے حجاب میں

وقت خود بینی نہ دیکھیں آپ تنکر آئینہ ہر ادائے حُسن پر کھینچے گا خنجر آئینہ

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں، لیکن دو شعر اور ملاحظہ ہوں :-

ہوا سنکی، گھٹا چھائی، چمن میں پھر بہار آئی تمنا ہے کہ وہ گل پیرہن پہلو نشیں ہوتا

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا آسماں، یہ کیفِ بہار یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعوی پر قائم ہیں؟ کیا پہلے شعر میں "اس آرام جان کی تمناہ کا ذکر نہیں ہے، دوسرے شعر کا مصرع ثانی اگر وصل نہیں، تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟

ان مثالوں سے صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل محفوظ نہیں ہے اور یہ اُستاد کے فیضِ صحبت کا لازمی نتیجہ تھا، لیکن چونکہ فطرت متین اور ذوق آشنا تھی، اس لئے جناب دل اِس حمام میں عام لکھنوی شعراء کی طرح بالکل برہنہ نظر نہیں آتے، اور کہیں کہیں اسی قدیم ذخیرۂ سخن میں ذوقِ سلیم کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے، جس نے آیندہ چل کر ان کے آئینہ کلام کو لکھنویت کی آلائش سے اِس حد تک صاف کر دیا کہ پڑھنے والے کو کبھی یقین نہیں آسکتا، کہ یہ لکھنؤ کے کسی صحبت یافتہ کا کلام ہے، قدیم غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

وہی مستِ حقیقی ہے جو بہم بزم ساقی میں شکستِ شیشۂ دل کی صدا پر وجد کرتا ہو

بڑھیں دل دینے والے خود بخود جوشِ محبت میں سر پر ناز پر یوں حُسنِ دلکش جلوہ آرا ہو

دلیل عشق صادق سوز پنہاں ہو نہیں سکتا جلے جو شمع کی لو میں اُسے پروانہ کہتے ہیں

ذوقِ جانبازی میں یہ احساس تک باقی نہیں دل میں پیکاں رہ گیا یا دل کو پیکاں لے چلا

خاموش دل زارِ تہِ خنجرِ قاتل شکووں کا ہے یہ وقت کہ تسلیم و رضا کا

گو نذرِ فنا ہو گئی پروانوں کی ہستی روشن ہے مگر نام شہیدانِ وفا کا

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں، جن سے جناب دل کی سلامتِ مذاق کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے ہم کو جناب دل کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے، یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت، کم نظر آتا ہے، جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :-

حسرت کا ہے نمونہ رنگ تغزل اپنا ہم انتہائے غم کی تصویر کھینچتے ہیں

اگرچہ فطری متانت اس موقع پر بھی قائم رہتی ہے، یعنی عام لکھنوی شعراء کی طرح جناب دل علانیہ سینہ کوبی اور نوحہ گری کی حد تک نہیں پہونچتے تاہم اُنھوں نے غم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ لکھنویت کے اثر سے بالکل محفوظ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ مثالو

سے بخوبی ہو سکتا ہے،

شب غم کی مصیبت بھی قیامت نا مصیبت تھی ۔ یہ عالم تھا کہ اب نکلا مگر نکلا نہ دم میرا
جگر پھر کیوں نہ دوں لے جوش گریہ تجھکو آنکھوں میں ۔ شب ہجراں بس اک تو ہے شریک رنج و غم میرا
عشق کا انجام حسرتناک ہے اے اہل دل ۔ مٹ گئی ہر آرزو اک نقش دل پر رہ گیا
دل بھی مٹ جاتا تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں ۔ رہنے والا کون ہے کس کے لئے گھر رہ گیا
مصیبت در مصیبت میں ہوں ضبط غم سے اے ہمدم ۔ ٹپکتا ہے مرے ہر زخم دل سے نوحہ گر ہونا،
غم پیہم سے گھبرا کر گریباں چاک کرتے ہیں ۔ اسی کو ہم سمجھتے ہیں شب غم میں سحر ہونا
مبارک ہو تجھے او ناشناس شان خودداری ۔ مری بزم عزا میں بیٹھ کر اب نوحہ گر ہونا
سینہ شق ہے رنگ فق، دل مضطرب چشم اشکبار ۔ ایک ضبط آہ سے افسوس کیا کیا ہو گیا
عشق میں ایسی ٹھوکر کھائی آس کا شیشہ ٹوٹ گیا ۔ روز نئے دکھ سہنے سے اے ہمدم جی چھوٹ گیا
اس گریۂ پیہم کی وہ ساعت آخر ہے ۔ جس وقت مرا دامن آنکھوں سے جدا ہوگا
کب تک شب غم کوئی بدلتا رہے پہلو ۔ تسکین کی صورت نہ ادھر ہے نہ اُدھر آج
کافی ہے مرنٹوں کے لئے داغ بیکسی ۔ روشن رہے یہ شمع ہمارے مزار پر
زینت دل میں نہ ارمان نہ شوق اُمید ۔ گھر ہے اُجڑا ہوا اس میں کوئی ساکن ہی نہیں
کسی کے ہجر میں ہم یوں بحال زار بیٹھے ہیں ۔ کہ چہرہ زرد ہے، لب خشک ہیں رخسار بیٹھے ہیں
جوش نشاط کیسا دل سرد ہو رہے ہیں ۔ عبرت کا ہے نمونہ افسردگی ہماری

اس قسم کے اور اشعار بہ کثرت موجود ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دل کی طبیعت پر یاس و حسرت کا رنگ زیادہ غالب ہے، لیکن اتنا غنیمت ہے کہ ماتم سرایان لکھنؤ کی طرح جنازہ بر دوش نظر نہیں آتے، بلکہ اکثر درد عشق کی بلند اور پاکیزہ اداؤں کی جھلک ان کے کلام میں محسوس ہوتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

نشتر غم اہل ہوس کے لئے پیام مصیبت ہے، لیکن جناب دل کے لئے اس کی خلش روح کی تازگی کا سرچشمہ ہے،

روح تازہ ہو گئی اللہ رے ذوق خلش ۔ دل کا ٹکڑا بن گیا دل میں جو نشتر رہ گیا

عشق صرف ایک سطحی اور عامیانہ جذبہ نہیں ہے، بلکہ ایک راز عمیق ہے، جس کا اندازہ مشکل ہے۔

بار بار ڈوب گئے اُبھر مرے دل سے نشتر ۔ راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

نشۂ عشق پیمانۂ و ساغر کا محتاج نہیں ہے۔

جو مست حقیقی ہیں خمخانۂ اُلفت میں ان کو کبھی پیمانہ درکار نہیں ہوتا

عشق کی اصلی شان خاک ہونے پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

خاک ہوجانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دل جل گیا پروانہ لیکن رنگِ محفل بن گیا

محبوب کے فیضِ نگاہ کا خیر مقدم ان الفاظ میں کرتے ہیں،

اے نگاہِ روح پرور آفریں صد آفریں جانِ بسمل بن گیا، وہ درد پیدا کر دیا

کاش یہ صدائے آفریں کبھی ماتم کدہ لکھنؤ سے بھی بلند ہوتی!

عشق کا تقاضا گریہ و بکا نہیں، بلکہ پرسکوت سوز و گداز ہے

صورت شمع جل خموشی سے ہے تقاضاءِ عشق سوز و گداز

ارباب ہوس تسکین و راحت کے طلبگار رہتے ہیں، لیکن ایک نکتہ دانِ محبت اس رمز سے واقف ہے کہ دراصل اضطراب ہی زندگی کی روح ہے۔

درحقیقت مضطرب دل کیلئے وہ موت تھی اصطلاح عام میں تسکین جس کا نام تھا

عشقِ حقیقی جوش کا طالب ہے، صرف زبانی شور و غل بے سود ہے،

مثالِ نعرۂ منصور جوشش پیدا کر عبث ہے شورِ اناالحق جو حکم دار نہ ہو

عاشق میں استعداد و صلاحیت ہے، تو معشوق کی نگاہ کرم خود بخود اُٹھ جاتی ہے، تقاضا پاسِ ادب کے خلاف ہے،

ان کی نظر کبھی تو اُٹھے گی سپے کرم حُسنِ طلب یہی ہے، تقاضا نہ کیجئے

عشق میں ناکامیوں سے گھبرانا نہ چاہئے،

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجئے

ذوقِ نیازِ عشق کی فطرت ہے اس لئے اس کو دوست کی بے اعتنائی کا گلہ مند نہ ہونا چاہئے،

سنگِ درِ حبیب کو حس نہ سہی قبول کی فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نیاز میں،

آہ و فریادِ عشق کی رسوائی کا نشان ہے۔

آہ سینہ میں گھٹے اُف نہ زباں سے نکلے درد اس حد سے گزر جائے تو رسوائی ہے

درد دل کا انیس اور پریشانی دل کی تسکین کا سرمایہ ہے۔

دل کی تسکین یہی ہے کہ پریشاں ہو جائے درد کی شان یہی ہے کہ رہے مونسِ دل

عاشق کو جان دینا چاہئے، لیکن بستر پر کروٹیں بدل کر نہیں، بلکہ اس طرح کہ محبت کا نام روشن ہو جائے۔

خاک ہونا تو محبت کا نشاں ہو جانا کوچۂ یار میں ٹمنا مگر اک شان کے ساتھ

عاشق کی اصلی زندگی راہ وفا میں اپنے کو قربان کر دینا ہے،

ٹمنا رہِ وفا میں ہے زندگی ہماری ہر ذرہ خاکِ دل کا اک روحِ مستقل ہو

اہلِ ہوس کے معشوق کی منزل لبِ بام سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن جناب دل کے محبوبِ نظر کا مقام لبِ بام کیا عرش بریں سے بھی بلند تر ہے۔

ہمت مگر کچھ اور رہے اپنے خیال کی کہئے تو کہہ دوں عرش بریں کو مقام دوست

عام شعرا معشوق سے جس بے باکانہ طریقہ پر اپنی تمناؤں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن جناب دل کی آرزو اس قدر نازک اور لطیف ہے کہ نگاہ شوق بھی اس کو ادا نہیں کر سکتی۔

کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن

عاشق کی حقیقی شمعِ راہ صرف اس کے دل کی آشفتگی اور ذوقِ جنوں کی سرمستی ہے، جو بلا کسی ہمدم یا رہبر کی اعانت کے عشق کی تمام دشواریوں کو آسان بنا دیتی ہے۔

آگے ترے وحشی کے آشفتگیِ دل ہے ہمدم کی نہیں حاجت رہبر کی نہیں پروا

افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم کو صرف انھیں چند مثالوں پر قناعت کرنا پڑتا ہے، لیکن ان مثالوں سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ جناب دل صرف بُتِ بیدرد، اور قاتل نخوت پسند کی فسوں سازیوں کے اسیرِ دام نہیں ہیں، بلکہ عشق محبت کی لطیف اداؤں کے بھی محرمِ راز ہیں، ان مثالوں سے ان کے کلام کی اخلاقی اور روحانی بلندی کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے یعنی ان کا عشق ہوس پرست شعرا کا عشق نہیں، جو بزدلی، پست خیالی، کم ہمتی، بے غیرتی اور نفس پرستی کی مجسم تصویر ہوتا ہے، بلکہ وہ عشق ہے جس کی فطرت صدق و وفا ہے، خلوص و ایثار جس کی سرشت ہے جو ضبط و استقلال کا مجسمہ ہے جو موت کو زندگی سمجھتا ہے، جو خوددار، جانباز اور سرفروش ہے، جو شجاعت و تہور کا درس آموز ہے جو تسلیم و رضا کا لذت شناس ہو جو سراپا ذوقِ شہادت سے لبریز ہے، جو ناکامیوں کی ٹھوکریں کھا کر بھی سرشارِ آرزو رہتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے کیا جانئے کس خیال سے دامانِ آرزو
خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے بزمِ وفا میں آج شہیدانِ آرزو

اس کا نام محبت کی بے تابی ہے،

آساں نہیں مشاہدۂ حُسنِ جاں گداز　　اس انجمن میں ہمتِ پروانہ چاہیئے

یعنی عشقبازی ہر بوالہوس کا کام نہیں، اس کے لئے صبر و ہمت اور ایثار نفس کی ضرورت ہے۔

وہ کیا گھبرائے اے ہمدم خرام حشر پرور سے　　کہ جس کے شیشۂ دل کی ہے زینت چور ہو جانا

عشق اسی بلند حوصلگی کا طالب ہے۔

حُسن کی عالم فریبی گو بہت مشہور ہے　　ہم مگر ایمان لائے روئے جاناں دیکھ کر

یہی وہ "روئے جاناں" ہے جو در اصل ارباب ذوق و نظر کی پرستش کا مستحق ہے، وہ حُسن کیا، جو عاشق کے روحانی احساسات کو منور نہ کر دے، اور وہ عشق کیا جس میں اتنی بھی لطافت و صلاحیت و استعداد نہ ہو!

کاش ان کی رہ گزر میں پیوندِ خاک ہوتے　　کچھ زندگی نہیں ہے یہ زندگی ہماری

عشق اسی جذبۂ فنا اور ذوقِ ایثار کا متمنی ہے نہ کہ بستر پر کراہنے اور رونے اور چلانے کا!

امثال مذکورۂ بالا سے جناب دلؔ کے کلام کی معنوی عظمت، پاکیزگی، اور بلندی کا اب تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو، ضرورت تھی کہ دور حاضر کے دیگر غزل گو شعرا سے جناب دلؔ کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، اس وقت ان کے کلام کی خوبیاں اور زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتیں، لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے تفصیلی موازنہ کے لئے ہمارے پاس کافی وقت نہیں، ہم کو صرف اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ہے کہ جہاں تک عشق و محبت کے اخلاقی پہلو کی پاکیزگی اور خیالات کی شائستگی کا تعلق ہے جناب دلؔ اپنے عام معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ممکن ہے کہ ایک نکتہ سنج نگاہ کو جناب دلؔ کے آئینۂ سخن میں دقیق مسائل اور حکیمانہ اسرار کے جلوے نظر نہ آئیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت نے ان کو ایک ذوق آشنا قلب عطا کیا ہے، چنانچہ اکثر ان کے اشعار میں بادۂ تصوف کی مستی نظر آتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

صوت سرمدی کائنات کے ہر ذرے میں ترنم ریز ہے، اس کے لئے کسی مقام کی تخصیص نہیں، صرف گوش دل کے وا ہونے کی ضرورت ہے۔

گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں　　ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

کثرت نور بھی مانع نظارہ ہوتی ہے۔

کثرتِ تنویر آخر بن گئی وجہ حجاب　　پردہ اُٹھنے پر بھی اک پردا نظر آیا مجھے

رازِ عشق کی لطافت عوام کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے، اس لئے اس کا اعلان غلطی اور خلافِ مصلحت ہے۔

حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور — تھیں چھپانے کی جو باتیں وہ بہ آواز کہیں

گو جمالِ حقیقت نگاہوں سے مخفی ہے، تاہم کائنات کا کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا۔

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا — ذروں میں کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا

جمالِ حقیقی کے بندۂ عقیدت کو دشت و صحرا کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں۔

جو مرجع عالم ہے اسی در کی طلب ہے — کیوں دشت نوردی کرے دیوانہ کسی کا

انسان کی حقیقت ترکیبِ عناصر سے بلند تر ہے۔

گم اپنی حقیقت ہے ترکیبِ عناصر میں — یہ پیرہن ہستی پردہ نظر آتا ہے

عشق جس قدر جلوۂ حسن سے قریب ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس کی بیخودی اور وارفتگی بڑھتی جاتی ہے اور جس قدر بیخودی بڑھتی ہے اسی قدر در اصل دوری ہوتی جاتی ہے، کیونکہ بیخودی کے عالم میں احساس قرب قائم نہیں رہ سکتا

محو جمال بے خود و مخمور ہو گئے — یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

پرستاران حقیقت کفر و ایماں کی باہمی جنگ آرائیوں سے ہمیشہ بے تعلق رہتے ہیں۔

دنیائے حقیقت میں آزاد تعین ہیں — ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بتخانہ

ایک پوری غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

وہ حسنِ مطلق ہے جلوہ افگن بغور جس نے خدا کو دیکھا — عجیب قدرت کے ہیں کرشمے جدھر نظر کی خدا کو دیکھا
جو ڈوب کر پھر کبھی نہ ابھرا ہوا وہی آشنائے ساحل — بقا، دائم کا اک مرقع غریق بحر فنا کو دیکھا
اسی کا نقشہ جما ہوا ہے، اسی کی اب لو لگی ہوئی ہے — نظر میں عالم تھا بے حقیقت جب اس وفا آشنا کو دیکھا
مشاہدہ ہو تو کس طرح ہو، بصارت ظاہری ہے عاجز — گزر گیا جو خودی کی حد سے اسی نے اس خود نما کو دیکھا
خبر نہیں انتہا کی ہمکو کیا ہے گم بیخودی نے اے دل — قدم جو رکھا رہ طلب میں تو دور تر رہنما کو دیکھا

ان مثالوں کے بعد جناب دل کے جذبۂ عشق کی لطافت اور حقیقت شناسی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

جناب دل کی پاکیزہ خیالی تم نے دیکھ لی، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے احساس کا کیا عالم ہے؟ یعنی ان میں تڑپنے اور تڑپانے کی قابلیت کس حد تک ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں محض لفظی طلسم آرائی ہے یا اس میں کچھ سوز و اثر بھی ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک یہی چیز تغزل کی حقیقی روح ہے، بغیر اس کے ایک غزل گو شاعر کے تمام تخیلات بے کار ہیں، بدقسمتی سے لکھنؤ کی

بدولت سوز و گداز کا مفہوم گریہ و بکا سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ سوز و گداز کو در اصل سینہ کوبی اور فریاد و ماتم سے کوئی تعلق نہیں، یہ صرف روح کی ایک لطیف و دردمندانہ کیفیت کا نام ہے، جس سے شاعر کا کلام عام طور پر لبریز ہوتا ہے، اس حیثیت سے جناب دلؔ اپنے عام معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں، یعنی ان کا کلام صرف ضعف، بے حسی، اور موت کا افسانہ نہیں ہے، بلکہ اپنے اندر احساس کی کافی گرمی اور زندگی کی روح رکھتا ہے اس کا اندازہ اشعار مذکورہ بالا سے بھی ایک حد تک ہو سکتا ہے، اس موقع پر چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:۔

یہی ہیں سوزِ دل عندلیب کے سہنے		قفس تو پھونک دیا چند پر نہیں نہ سہی

یہی وہ ایثار کا شریفانہ احساس ہے جس میں روحِ انسانی کی حقیقی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

یہ قفس کیا قفس تن کے بھی ٹکڑے اُڑ جائیں		ہم سے آنا کوئی کہدے کہ بہار آئی ہے

احساس کی شدت اور وارفتگی کی کتنی صحیح تصویر ہے!

موت کے ساتھ اہل ہوس کی دُنیائے محبت ختم ہو جاتی ہے، لیکن ایک ذوق آشنا اور دردمند روح کی سعی طلب کا آغاز فنا سے ہوتا ہے۔

مٹا کے ہستی دل صرف دعا کرتے		یہیں سے سعی طلب کی ہم ابتدا کرتے

صحرائے محبت کا ہر ذرہ تسکین و راحت کا مرکز ہے، اس لئے ایک لذت شناسِ دیوانگی کا دل منزل کی تلاش و حسرت سے بے نیاز ہوتا ہے۔

جو ذرۂ صحرا ہے، وہ ہے مرکز تسکین		پابند جنوں حسرت منزل نہیں رکھتا

عشق اپنے اندر خود ایک مستقل مستی اور زندگی کی روح رکھتا ہے، اس کو شراب و ساقی کی ضرورت نہیں۔

رہیں گے مست ہمیشہ شراب ہو کہ نہ ہو		لے تو ہمت ساقی اگر نہیں، نہ سہی

نشترِ عشق کی کاوش تو اہلِ ہوس کے لئے ہمیشہ ایک مستقل مصیبت اور اذیت کا سامان ہے، لیکن صاحب ذوق کیلئے بالآخر سرمایہ راحت بن جاتی ہے۔

کاوشِ پیہم بالآخر ہو گئی لطف آفریں		اب وہ نشتر راحت دل ہے جو خوں آشام تھا

پردۂ حُسن اُٹھتا ہے، پھر بھی طالب جمال محروم نظارہ ہے، کیونکہ وہ اِس حد تک جوشِ تمنا سے مست اور سرشار ہو جاتا ہے کہ اس کا احساس نظر جاتا رہتا ہے۔

گو پردہ اُٹھا پھر بھی حیراں ہوں کہ کیونکر دیکھوں		احساس نظر گم ہے اب جوشِ تمنا ہے

ذوقِ جنوں کی شدت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

ہم شدتِ جنوں میں یوں خاک اُڑا رہے ہیں
صحرا پہ چھا گئی ہے آشفتگی ہماری

یہ بالکل مبالغہ نہیں ہے، ہمارے نزدیک اگر احساسِ محبت میں اتنی بھی شورشِ مستانہ نہ ہو تو وہ عشق کس کام کا۔ اب ہم چند اور اشعار بلا کسی تشریح کے نقل کر دیتے ہیں، جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دلؔ اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں اور ایک غزل گو شاعر کے لئے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

ہم مستِ عشق ہیں ہمیں ساغر سے کیا غرض
ساقی کی چشمِ مست ہماری نظر میں ہے

ہے نقش ذرہ ذرہ پہ جوششِ سرِ نیاز
کون آج سجدہ ریز تری رہ گذر میں ہے

اُٹھے تو محوِ تمنا، ملے تو غرقِ حیا
نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

وہ خدنگ روح پرور ہے جزوِ دل جو ملے دل
مجھے اضطراب کیوں ہو، مجھے انتشار کیوں ہو

نظارہ سوزِ شمعِ تجلی سہی مگر
تقلید گرمجوشیِ پروانہ چاہیئے

ریاضِ دہر میں ہر شاخِ گل سے لطف اُٹھا
یہ شکل ساعدِ ساقی کی ہے وہ ساغر کی

اُٹھے نگاہ ڈھلے بادۂ نشاط افزا
کہ آرزو ہے اسی کیفِ روح پرور کی

تڑپ تڑپ کے یہ کہتے تھے کشتگانِ نگاہ
سکونِ قلب ہے جنبش کسی کے خنجر کی

مٹنے پہ بھی ہے دل کا وہ عالم کہ الاماں
دنیا ہر ایک ذرے میں آباد ہو گئی

دل تھا وہ دل جو خاک ہوا راہِ عشق میں
اکسیر تھی وہ خاک جو برباد ہو گئی

دامانِ دل میں جوششِ تمنا لئے ہوئے
آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

آئی بہار حاصلِ دنیا لئے ہوئے
ہر شاخِ گل ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

اب تک ہیں جوشِ عشق کی ہنگامہ خیزیاں
اُٹھا غبارِ قیس تو صحرا لئے ہوئے

ہر اشکِ خوں کو دیکھ رہا ہوں محیطِ غم
قطرے مری نظر میں ہیں دریا لئے ہوئے

ان اشعار کو پڑھو، کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک زندہ اور کیف آشنا روح آتش فشانی کر رہی ہے۔

ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بارگاہِ حسن کا ادب شناس ہو اور اپنی ہستی کو رضائے محبوب پر وقف کر دے، اس کو انتہائی جوشِ دیوانگی کے عالم میں بھی یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس کی حیثیت صرف ایک طالب کی ہے، جس کا کام صرف نیاز و عقیدت ہے، جناب دلؔ کے کلام میں یہ جذبہ خاص طور پر محسوس ہوتا ہے

چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

راہِ طلب میں جوشِ عقیدت کی شرط ہے　　ہو سجدۂ نیاز ہم آغوشِ نقشِ پا

ایک دوسری جگہ اسی شریفانہ جذبہ کو یعنی ظلم وستم تو حُسن کی عادت ہے، لیکن عشق کا فرض یہی ہے کہ رشتہ وفا ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے" اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہر تمنا امتحانِ عشق میں ہو صرفِ جور　　اے وفا، دل یہ تیرا فرض ہو وہ خوئے دوست

حُسن کی محشر خرامیوں کے سامنے جناب دل کے نیاز عشق کی یہ شان ہے،

انھیں اس شان سے چلنا کہ اک ہنگامہ برپا ہو　　ہمیں ہر گام پر اے ہم نفس آنکھیں بچھا دینا

اس سے زیادہ اور کیا عقیدت کا جوش ہو سکتا ہے، لیکن نہیں ان کا جوشِ نیاز اس سے بھی آگے بڑھکر اس حد تک پہونچا ہے کہ بجائے محبوب کے سنگِ در ہی سے اپنا اظہار خیال کرتے ہیں۔

بس انتہا ہے کہ سنگِ درِ حبیب سے ہم　　بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے

جوشِ عقیدت کی واقعی یہ انتہا ہے۔

وہ ہزاروں ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن ان کے ذوق سرفروشی اور پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی،

کسی کے عشق میں اب تک وہی ہے جوشِ جانبازی　　ہزاروں ٹھوکروں پر بھی رہا ثابت قدم میرا

کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ جس سر نے آستان یار چھوڑ دیا اس کی قسمت میں حوادثِ آسمانی کی ٹھوکریں کھانا ہے۔

ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہے سنگِ حوادث کی　　وہ سر جو تیرے سنگِ آستاں سے دور ہو جائے

یک دوسری جگہ اپنے ذوقِ نیاز کا اظہار ان سادہ لیکن موثر الفاظ میں کرتے ہیں۔

ہم کو ان سے ہے غرض دنیا ہوئی اپنی تو کیا　　وہ اگر نامہرباں ہوں مہرباں کوئی نہ ہو

بحبوب کے جور وستم کو جس نگاہ عقیدت سے دیکھتے ہیں، وہ حقیقت میں جناب دل کی صحبتِ مذاق کی ایک روشن یل ہے، وہ اس راز سے واقف ہیں کہ محبوب کا جور وظلم ہی دراصل اس کا لطف وکرم ہے، اس لئے وہ کسی قسم ا شکوہ طرازی کو آدابِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

جور وجفائے یار کا شکوا نہ کیجئے　　عشق وفا سرشت کو رسوا نہ کیجئے

ور ان کو اس ننگ کا احساس یہاں تک ہے کہ مرجانا گوارا ہے، لیکن شکوہ سنجی کی ذلت پسند نہیں،

الٰہی اس سے پہلے بند ہو جائے زباں میری
خلافِ عشق ہو سرگرم فریاد و فغاں ہونا

درد اُٹھتا ہے تو مسرت سے اچھل پڑتے ہیں کہ یہ کسی دلنواز کا پیام کرم ہے،

جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اُچھل پڑے
سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

ان کے نزدیک جوشِ محبت کا تقاضا یہی ہے کہ پیکانِ ستم جہاں تک ممکن ہو ذوقِ خلش کو بڑھاتا رہے۔

خلش افزا رہے پیہم یہ تحریکِ محبت ہو
ملے پہلو میں گنجائش جہاں تک نوکِ پیکاں کو

خنجرِ قاتل سے جناب دل کو جو ذوق اور شیفتگی ہے اس کی تسکین صرف ایک وار سے نہیں ہو سکتی، چنانچہ آرزو ہے کہ دل کے ٹکڑے پھر کسی طرح باہم مل جاتے اور ذوقِ شہادت کی لذت ایک مرتبہ اور نصیب ہوتی۔

ابھی اے چارہ گر باقی ہے ذوقِ خنجرِ قاتل
کسی تدبیر سے پھر پارہ ہائے دل ملا دینا

نگاہ محبوب سے ناوک اندازیوں کا تقاضا ان الفاظ میں کرتے ہیں

اے نگاہ قدر انداز چلیں یوں ناوک
جزوِ دل ہو کوئی پیوست رگ جاں کوئی

کاش یہ ولولہ ان "بیمار دلوں" میں بھی پیدا ہو جاتا جن کو اب تک نوحہ خوانی سے فرصت نہیں!

ذوقِ ستم کی لذت شناسی ان کو اپنے زخم خوردہ دل سے تیر کے ٹکڑوں کے نکالنے کی اجازت نہیں دیتی کہ وہی حقیقت میں ایک شوریدہ مزاج کے دل کی آرائش و زینت کا سامان ہے، جو آسانی سے ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتا، اس کے لئے حوصلہ اور غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہے۔

نہ کھینچ اے چارہ گر مجروح دل سے تیر کے ٹکڑے
سجایا ہے بڑی کاوش سے ہم نے اس گلستاں کو

جناب دل کے اِس ذوقِ گلستاں آرائی کی داد دینا آسان نہیں، اس کی لطافت کو صرف صاحب ذوق ہی محسوس کر سکتا ہے۔

وارفتگی کے عالم میں احترامِ حسن کا احساس دل میں موجود ہے، چنانچہ آستانِ یار کے قریب پہونچ کر دفعۃً سنبھل جاتے ہیں کہ یہ ادب کا مقام ہے۔

اے دل سنبھل کہ پیشِ نظر کوئے یار ہے
ذروں میں کچھ کشش ہمیں محسوس ہو چلی

ایک ایک لفظ پر غور کرو کسقدر روحانی کیف میں ڈوبا ہوا ہے۔

جس اخلاق و عقیدت کے ساتھ آستانِ یار پر حاضر ہوتے ہیں اس کی تصویر یہ ہے:-

لختِ جگر ہیں زینتِ دامانِ آرزو
یوں لے چلا ہے دل ہمیں اس جلوہ گاہ میں

اس سے زیادہ قیمتی اور کیا نذر ہو سکتی ہے؟

محبوب کے نقشِ پا میں بھی ان کی عقیدت پرست نگاہوں کو کیف و نشاط کے جلوے نظر آتے ہیں

ذراتِ دل نشاط سے معمور ہو گئے　　فردوسِ آرزو ہے کہ آغوشِ نقشِ پا

اپنی ہستی کو رضائے دوست پر وقف کر دینے کو منزلِ مقصود کی دلیل سمجھتے ہیں۔

سمجھا ہوں اس کو منزلِ مقصود کی دلیل　　دل ہے کسی کے نقشِ قدم پر مٹا ہوا

در یار پر گرنا ان کے نزدیک عشق کی معراج ہے۔

در دلبر پہ گرا میں تو مقدر نے کہا　　بیخودِ عشق یہ معراج ہے اُفتاد نہیں

لیکن اہلِ ہوس کی طرح ذلیل ہو کر نہیں گرتے بلکہ جوشِ مسرت اور فخر و ناز کے ساتھ جس کی تصویر یہ ہے:۔

گرے یوں ان کے سنگِ آستاں پر　　جبینِ عجز پہونچی آسماں پر

پاسِ ادب کا یہ عالم ہے کہ شکوہ طراز یاں تو در کنار اظہار مدعا کی بھی جرأت نہیں۔

حضور یار شکوۂ دل کا تو کیا ذکر　　گراں ہے مدعا اے دل زباں پر

اور اگر کبھی اس کی نوبت بھی آتی تو زبان سے نہیں بلکہ اشکوں کی خاموش روانی سے اپنی روداد وفا بیاں کرتے ہیں

اشکوں کی روانی ہے رودادِ وفا گویا　　خاموش یہ شکوے ہیں اک شاہدِ رعنا سے

یہ ہے ذوقِ محبت کی وہ متانت اور سنجیدگی جو صرف اہلِ نظر کا خاص حصہ ہے،

ان مثالوں سے تم کو کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جناب دل کے کلام میں نیاز و عقیدت اور اخلاص و وفا کی گرمی کس حد تک موجود ہے اور وہ کہاں تک بارگاہِ حسن کے ادب شناس ہیں، عام شعرا جن کی طبیعتیں نکتہ شناس نہیں ہوتیں، عقیدت کے جوش میں اکثر ابتذال اور ذلت و خواری کی حد تک پہونچ جاتے ہیں اور طرح طرح کی عامیانہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگتے ہیں جو عشق و محبت کی شانِ بلندی کے خلاف ہوتی ہیں مثلاً کسی کا شعر ہے

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا ذلیل　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

لیکن ہم اس حد تک جوشِ عقیدت کے قائل نہیں، غیرت و خودداری عشق کی شرط اولیں ہے، عقیدت کے یہ معنی نہیں کہ عاشق اپنے کو بالکل پست اور ذلیل کر دے، بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ حسن کی مرتبہ شناسی کے ساتھ ساتھ عشق کی عظمت کا احساس بھی قائم رکھے لیکن یہ ایسا نازک مرحلہ ہے جس سے صرف محرمانِ خاص ہی کامیابی کے ساتھ گزر سکتے ہیں، جناب دل کی حقیقت شناسی اور بلند نظری ناقابلِ انکار

ہو جاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انتہائی جوشِ نیاز و عقیدت کے عالم میں بھی عشق کی عظمت کا احساس ان کے دل میں موجود ہے، ان کے دل کا ذرہ ذرہ جوشِ نیاز سے لبریز ہے، محبوب کی ایک ایک ادا پر مٹ جانے کے لئے ہمہ تن تیار ہیں عجز و اُفتادگی ان کی معراج آرزو ہے، تیر ستم کے ٹکڑوں سے اپنے قلب و جگر کی آرائش کرتے ہیں، دوست کا ہر ظلم ان کے لئے پیام رحمت ہے، راہ طلب کی ہر ٹھوکر پر ان کے منھ سے بجائے اُف کے آفریں نکلتی ہے، نقشِ پا ان کو فردوسِ آرزو نظر آتا ہے، کوئے یار میں ہر ہر قدم پر آنکھیں بچھاتے چلتے ہیں، یہ سب کچھ ہے، تاہم ان کا آئینۂ عقیدت ابتذال و ذلت کی گرد سے پاک ہے، بے شبہ وہ بارگاہ حسن کے خادم ہیں لیکن ایسے خادم ہیں، جس کو اپنے حسنِ خدمت پر ناز ہے، جس کی جبینِ عقیدت کے سجدے ذلت و خواری کے سجدے نہیں ہیں، بلکہ وہ سجدہ ہائے شوق و نیاز ہیں، جن پر آستان یار کو بھی فخر زوجد ہے۔

کئے ہیں سجدے یہ کس نے کہ فرطِ نخوت سے دماغ عرش پہ ہے تیرے آستانے کا

حسن کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عشق صرف اس کا ایک پرتو ہے، بلکہ اس کے اندر کچھ مستقل کیفیتیں بھی ہیں اس احساس کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

سراپا شوق ہوں نقش وفا ہوں شکلِ حیرت ہوں مجھے بھی دیکھ او حسن خود آرا دیکھنے والے

یعنی صرف تو ہی نہیں ہے بلکہ میں بھی ایک قابلِ اعتنا چیز ہوں، گو ایک ذرہ حقیر ہی سہی۔

نگاہِ شوق میں وہ صلاحیت و استعداد ہے کہ جب جوشِ کیفیت میں اٹھتی ہے تو حریم حسن کے پردہ ہائے در اُلٹ جاتے ہیں،

جلوۂ رعنا کی فطرت ہے اسی حد تک حجاب جب نگاہ شوق اُٹھی پردہ ہائے در اُٹھے

کاش یہ ذوقِ نگاہ کی قابلیت ان لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتی جو حریم یار میں رسائی کے لئے درباں کی نگاہ کرم کے محتاج رہتے ہیں۔

نگاہ شوق بے شبہ اسی لئے ہے کہ جمال یار پر قربان ہو جائے، لیکن جناب دل اس کو اس شان کے ساتھ نثار کرتے ہیں کہ خود حسن کی رونق و زینت دوبالا ہو جاتی ہے۔

قربان ہو کے آج کسی کی نگاہِ شوق زینت فزائے حسن خداداد ہو گئی

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ جناب دل نے باوجود جوشِ عقیدت کے عشق کی شان عظمت کو بھی قائم رکھا ہے اور یہ ان کے حسنِ مذاق کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

تفصیلات مذکورۂ بالا کی بنا پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جناب دلؔ کا تغزل رندی و ہوسناکی کی تصویر نہیں ہے بلکہ قلب انسانی کے بلند اور شریفانہ جذبات و احساسات کا ایک باصرہ نواز مرقع ہے، جو ارباب ذوق کے دیدہ دل کے لئے اپنے اندر بہت کچھ سامانِ لذت رکھتا ہے، اُنھوں نے غزل گوئی کے پردے میں در اصل بلندترین اخلاق کی دعوت دی ہے، غیرت وخودداری، ایثار و وفا، اخلاص و عقیدت، ضبط و تحمل، صبر و استقامت، سوز و نیاز، ترک خودی، ذوق فنا ان کے نہال محبت کے برگ و بار ہیں، انھیں فضائل اخلاق کے مجموعہ کا نام حقیقی عشق ہے، جو روح انسانی کی حیات مخفیہ کو بیدار اور منور کرتا ہے، جو بزدل کو شجاع، رذیل کو شریف، پست کو بلند اور کمزور کو قوی بنا دیتا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے شعرا کی عام بدمزاقی نے عشق کی اس روحانی اور اخلاقی حیثیت کو بالکل غارت اور برباد کر دیا، اور غزل گوئی صرف مادی جذبات کی مصوری تک محدود ہو کر رہ گئی، جس کا لازمی نتیجہ ابتذال و پستی ہے، پتھرائی ہوئی آنکھیں، کٹی ہوئی رگیں، ڈوبی ہوئی نبضیں، جانکنی کی بے چینیاں، شور ماتم، گریہ و بکا، کیا اس عشق کے یہی آثار و علائم ہیں، جو طالبانِ ذوق کو حیاتِ ابدی کا پیام سنانا چاہتا ہے، جس کا مقصد تمھارے جسم کو نہیں بلکہ تمھاری روح اور تمھارے قلب و دماغ کو مشتعل اور بیدار کرتا ہے۔ اس بنا پر موجودہ رنگ تغزل کی اصلاح و تہذیب کے لئے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی روحانی اور اخلاقی عظمت و پاکیزگی کو خاص طور پر نمایاں کیا جائے، تاکہ مدعیان تغزل کو صاف نظر آجائے کہ وہ جس چیز کی تصویر کھینچ رہے ہیں، اس کو در اصل عشق سے کوئی تعلق نہیں۔

ہم کو نہایت مسرت ہے کہ جناب دلؔ نے بڑی حد تک اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اور حتی الوسع اپنی غزل گوئی کے دامن کو رکیک اور بازاری جذبات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان کا کلام پڑھکر عشق کی روحانی عظمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اُنھوں نے رقیب و عدو، وصل و نفس پرستی کے عامیانہ اور شرمناک جذبات سے اپنے کلام کو پاک رکھکر لکھنؤ کے مبتذل رنگ تغزل کی ایک بڑی حد تک اصلاح کی ہے، اور اگرچہ تقاضائے زمانہ کے لحاظ سے اپنے دامن شاعری کو جناب دلؔ لکھنؤیت کے اثر سے بالکل محفوظ نہ رکھ سکے، جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، تاہم خصوصیات مذکورۂ بالا کی بنا پر ان کا کلام موجودہ ذوقِ تغزل کے لئے ایک حد تک شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے، جناب دلؔ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے نزدیک وہ اس پائے کے شاعر ہیں کہ ان پر مذاقِ عامہ کی اصلاح و تہذیب کی بہت کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور وہ موجودہ رنگِ تغزل میں بہت کچھ تغیر پیدا کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے

میں آیندہ ان کے نتائج فکر و خیال کو لکھنویت سے قطعاً منزہ اور مبرہ دیکھنا چاہتا ہوں، اُستاد دراغ کے زمانہ کے مذاق کی یادا اب چھوڑ دی جائے تو بہتر ہوگا، جناب دل حریم محبت کے محرمانِ خاص میں سے ہیں، اس لئے انکی زبان سے اِس قسم کے اشعار سُن کر تکلیف ہوتی ہے۔

انھیں سفاک بننا ہو تو اُٹھیں میان کھینچیں　　　یہ کوئی بات ہو باندھے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
بال کھولے اب نہ آنا بیکسوں کی قبر پر　　　حوصلے کچھ بڑھ چلے ہیں خاک دامن گیر کے
کیا یہی انصاف ہے اے قاتلِ پیماں شکن　　　دل کے اوچھے زخم چرکے ہیں تری شمشیر کے
پہلے پہل یہ شوق ہو اسے گراں نہ ہو　　　نازک سہی ان کے ہاتھ میں تلوار چاہیئے
جس کی خلقت میں کجی ہو وہ نہیں مٹ سکتی　　　بل نکل جائے تری زلف کا ممکن ہی نہیں
وہ شب غم کا اندھیرا، وہ بھیانک منظر　　　تھا اجل کو بھی تردد مرے گھر آنے میں
یہ انداز نگہ، یہ جور کی عادت نہیں اچھی　　　بہت مشہور تیری کج ادائی ہوتی جاتی ہے
ملی راحت ہجوم یاس و غم میں خون رو رو کر　　　لگی دل کی بجھائی ہے تو کچھ کچھ دیدۂ تر نے

ان کو چاہئے کہ وہ اپنے ذوق و شوق کا یہی غلغلہ بلند کرتے رہیں ع

مشربِ اہلِ ذوق میں ذکرِ خودی حرام ہے

اور تشنگانِ محبت کو یہی درس دیتے رہیں۔ ع

تقاضائے وفا ہے بیکر ہستی مٹا دینا

اور ان کے لئے اسی عالم بیخبری و خود فراموشی کی سیر موزوں ہے جہاں

نالے ہیں نہ آہیں ہیں اثر ہے نہ دعا ہے

شاعر کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ کیا کہتا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کیسے اور کیونکر کہتا ہے، یعنی اسکے انداز بیان میں کس حد تک ندرت اور دلکشی ہے، چونکہ تاثیر شعر کی جان ہے، اس لئے شاعر کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرے، جو موثر اور دلآویز ہو، ورنہ اسکے بلند سے بلند تخیلات بھی ترانۂ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

ہمارے نزدیک شاعر کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی خیال کو اس دلکش انداز سے ادا کرے کہ سننے والے پر ایک کیفیت طاری ہو جاسے حافظ کو دیکھو ان کے خیالات میں فلسفیانہ دقت او رنکتہ آفرینی بہت کم نظر آتی ہے۔ (باقی آیندہ)

حیات وماوراء حیات

اس دور کے علماء طبعیات میں، سر آلیور لاج بڑے مرتبہ کا شخص سمجھا جاتا ہے اور اس نے حیات بعد الموت کے متعلق جو عملی تحقیقات کی ہے، وہ خواہ کتنی ہی ناقص و نامکمل کیوں نہ ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ "خیال وقیاس" کا اتنا ضخیم دفتر اپنے بعد چھوڑ گیا ہے کہ اس کو ٹھکرا کر آگے گزر جانا آسان نہیں۔ وہ نہ صرف اس بات کا قایل تھا کہ مرنے کے بعد روح قایم رہتی ہے، بلکہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ روح کا تعلق دُنیا اور اہلِ دنیا سے باقی رہتا ہے اور وہ اپنے تاثرات سے بھی مطلع کرتی رہتی ہے، چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کی روح سے گفتگو کی۔

بہر حال اس نے کسی روح سے واقعی گفتگو کی ہو، یا یہ خود اس کا استہواء ذاتی[1] (Auto Suggestion) ہو اس کے نظریوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں، ظاہر ہے کہ وہ اپنے اعتقاد ویقین کی کوئی ایسی علمی توجیہہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کی گنجایش نہ چھوڑے، اور اُس نے جو کچھ کہا ہے اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے کہا ہے جس کا دوسرا نام (Common sense) ہے۔ اس لئے بحث وتنقید کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ شغلہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کے ذوق کا مطالعہ اپنے ذوق کے لحاظ سے کیا جائے۔

وہ بھی دوسرے مفکرین کی طرح روح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرنا

---

[1] عمل مقناطیسی یا مسمریزم میں ایک عمل کا نام (Suggestion) ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو قوت ارادی سے اس حد تک متاثر کیا جائے کہ وہ عامل ہی کی خواہش کا پابند ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی ترجمہ عربی میں عام طور پر استہواء کیا جاتا ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے پوری طرح اس لفظ کے مفہوم پر حاوی ہے۔ (Auto suggestion) سے مراد خود اپنے ہی خیال سے متاثر ہو جانا ہے اس لئے اس کا ترجمہ استہواء ذاتی کیا گیا۔ (اڈیٹر)

جو ہمیشہ خشک گھاس پر لیٹنے کا عادی تھا آج مخمل و کمخواب میں بھی خشونت محسوس کرتا تھا اور اس کا وہ معدہ جو گروہ اُپلوں کی آنچ پر سکی ہوئی موٹی روٹیوں کو آسانی سے قبول کر لیتا تھا، اس قدر لطافت پسند ہو گیا تھا کہ اگر دودھ بھی چبا کر نہ پیا جاتا تو سوءِ ہضم کی شکایت ہو جاتی۔ وہ پہلے ایک مفلوک الحال موچی کی بیٹی تھی اور اب ایک رئیس کی محبوبہ!

کیا وہ حسین تھی ۔ ؟ یہ ایک احمقانہ سوال ہے۔ اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو محلوں میں زندگی بسر کرنے والا نواب سرسوتی ندی کے کنارے ماہی گیروں کی بستی میں جا کر چار دن ٹھہرنا بھی گوارا نہ کرتا چہ جائیکہ ہفتوں!

خود اس کے محل میں سیکڑوں پری تمثال لڑکیاں موجود تھیں، پھر اس لڑکی میں وہ کیا خصوصیت تھی جس نے نواب کو اس درجہ بیتاب بنا دیا؟۔ اس کا جواب نواب ہی دے سکتا ہے۔

اس نے اپنے سیاہ لانبے بال کو جو منتشر ہو جانے ہی کے لئے سنوارے گئے تھے اپنی مرمریں انگلیوں سے درست کیا اور کسی قدر کسمساتے ہوئے کروٹ لی۔ اس کی نظر کے سامنے خوبصورت تاروں کا بنا ہوا پنجرہ دریچہ کی محراب میں لٹک رہا تھا۔ جس کے اندر ایک نہایت خوشنما چڑیا بند تھی۔ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک فلسفی کی طرح غور کرنا شروع کر دیا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کا موازنہ خود اپنی زندگی سے کیا۔ کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ دونوں کے لئے بہترین سامان خورد و نوش، بہترین آسائش، خدمت کے لئے بہترین ملازم موجود تھے۔ رہنے کی چار دیواری بھی دونوں کے لئے نہایت خوشنما اور قابل دید تھی۔ مگر آزادی ۔ اُف! آزادی کا فقدان تھا۔ محل میں آنے سے قبل دیہات کی سادہ فضا میں صبح سے شام تک اس کا مشغلۂ حیات ایک غیر معین و بے ترتیب لائحۂ عمل کے تحت ہوتا تھا۔ کسی دن وہ مچھلیاں پکڑنے ندی کے کنارے چلی جاتی اور دن بھر جال لئے کنارے پر بیٹھی رہتی اور کبھی کشتی پر سوار ہو کر ساحل سے کچھ دور نکل جاتی۔ وہ خود موسیقی سے ناواقف تھی لیکن جب گاؤں کے دوسرے لڑکے مچھلیاں پکڑتے وقت گاتے تو وہ مست و بے خود ہو کر پانی میں انگلیاں تر کر کے ساحل کے قریب اُگنے والی گھاس پر چھینٹے دینے لگتی۔ گھر کا ایندھن ختم ہونے لگتا تو وہ بانس کی ٹوکری یا ٹین کا تسلہ لے کر مویشیوں کے ریوڑ کے پیچھے پیچھے جاتی اور صبح سے شام تک اتنا گوبر سمیٹ لیتی کہ اس کے اُپلے کئی ہفتے تک کافی ہو سکیں۔ اگر کسی روز اس کے باپ کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے کچے سوت کو بٹ دیتی۔ اس نے پرانی جوتیوں میں معمولی سلائی کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ کشتی میں سیر کرنے والے لوگوں کے بوٹوں پر پالش کرنا اسی کے ذمہ تھا۔ اس کا باپ ذات کا ماہی گیر لیکن پیشہ کے لحاظ سے موچی تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ جن کے ساتھ برسات کا تمام موسم وہ جھولا جھولکر گزارتی تھی وہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر "پیا" کو یاد کرتی لیکن نہیں جانتی تھی کہ "پیا" کس کو کہتے ہیں

وہ پریم کی نبسی بڑے شوق سے سنتی مگر اس جذبہ سے ناواقف تھی۔ کیونکہ پریم کے لفظ سے اس کے کان آشنا تھے۔ قلب ناآشنا۔ موسم گرما میں تمازتِ آفتاب سے اس کے بوسیدہ کپڑے پسینہ میں شرابور ہوجاتے۔ مگر یہاں کی عطریات کے مقابلہ میں پسینہ کی وہ بو اسے زیادہ مرغوب تھی۔ وہ کج فہم اور ناقص العقل ہونے کے باوجود اس رمز کو سمجھتی تھی کہ عطر پھولوں سے کشید کیا جاتا ہے اور پسینہ خود انسان کے جسم کا فشردہ ہے۔

محل میں اس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ پانی کے دو گھونٹ بھی پئے تو کنیز کے ہاتھوں سے ۔ اور وہ بھی چاندی کے کٹورے میں۔ اس کی روح بعض اوقات تڑپ اُٹھتی تھی اُپلوں کی آنچ پر پکی ہوئی جوار اور جوار کی روٹیوں کے ساتھ تیل میں بھنے ہوئے سرسوں کا ساگ کھانے کے لئے۔ آم اسے بہت مرغوب تھے۔ لیکن اس طرح کہ رس ان سے ٹپک ٹپک کر کپڑے کو آلودہ کردے اور وہ خود ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے ہی ہاتھوں سے دھوکر اس آلودگی کو صاف کردے ۔ وہ چاہتی تھی کہ جنگلی گلاب توڑتے وقت اس کی اُنگلی میں کانٹا چبھ جائے۔ محل کی چار دیواری میں سونے سے قبل اسکو اپنی سیج صد ہا قسم کے پھولوں سے مزین ملتی۔ اور اسے یہ سُن کر افسوس ہوتا کہ ایک بوڑھے مالی نے ان کو چنا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ گرمی کی سہانی راتوں میں نیند کا لطف اسی وقت آسکتا ہے جب مچھر خوب کاٹیں اور انسان بیدار ہو ہو کر سو جائے۔ نہ یہ کہ مسہری کے ریشمی پردے ایک بھُنگے کو بھی قریب نہ پھٹکنے دیں۔

یہ ضرور ہے کہ محل میں آنے کے بعد سے اس کی طبیعت کسی قدر نفاست پسند، آرام طلب اور عیش پرست ہوگئی تھی۔ تاہم بڑی بحث کے بعد اس نے نواب سے اجازت حاصل کرلی تھی کہ ہمیشہ سالگرہ کے دوسرے دن دیہاتی روایات کی یاد قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے سابق طرزِ معاشرت کا اعادہ کیا کرے گی۔ چنانچہ آج سالگرہ کا دوسرا دن تھا۔ اور اسی لئے وہ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ مسرور تھی۔ اس قدر مسرور کہ جوشِ مسرت میں اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اور اسی نیم عریاں حالت میں ریشمی پردہ کو حقارت کے ساتھ جھٹکتے ہوئے مسہری سے نیچے اُتر آئی۔

(۲)

وہ سیٹی بجاتا ہوا غیر ارادی طور پر کچھ سوچتا ہوا دریچہ کے قریب پہونچ گیا۔ اس کی متجسس نظریں صحنِ چمن میں کسی کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں۔ اس وقت وہ خود خالص مشرقی طرز کی پوشاک میں ملبوس تھا۔ لیکن کمرے کا باقی ماحول مغرب کی حیا سوز تہذیب کے زیرِ اثر عریانیات کا مجموعہ تھا۔ بالکل ننگی عورتوں کی تصویروں سے دیواروں کو زینت دی گئی تھی۔ یونانی صنمیات کی روایاتِ قدیم کو مادی شکل میں پیش کرنے والے مرمریں دبلوری مجسمے

طاقوں اور میزوں پر رکھے ہوئے تھے۔
نواب ابھی اپنے خیالات ہی میں محو تھا کہ دروازے پر لٹکنے والے پردہ میں جھنکار پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نسوانی قدموں کی ہلکی چاپ ۔ ایک کنیز اندر داخل ہوئی لیکن اس انداز کے ساتھ گویا طاق میں رکھی ہوئی کسی چینی کی مورت میں جان پڑ گئی ہے۔ اس نے شراب پیش کی اور نواب نے کوئی لفظ کہے بغیر اس آتشِ سیال سے اپنی تشنگی بجھائی۔
نواب کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ کنیزیں آتی تھیں اور کہہ جاتی تھیں کہ اب محل کی چار دیواری میں دیہاتی طرزِ زندگی کا کون سا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ بستر سے اُٹھنے کے بعد بیگم سب سے پہلے اس تالاب پر گئی جس میں شوقین مزاج نواب نے پانی کے مختلف جانور پال رکھے تھے ۔ رنگ برنگ کی خوبصورت مچھلیاں ۔ راج ہنس ۔ مرغابیاں ۔ قازیں ۔ سرخاب اور خدا جانے کیا کیا ۔ اس نے عنبریں بالوں کی عطریت رخساروں پر ملے ہوئے غازہ کی خوشبو، پھولوں کے گجروں میں بسی ہوئی مرمریں گردن کی مہک ۔ نرگسی آنکھوں میں تڑپنے والی سرمۂ دنبالہ دار کی ہلکی لہر ۔ صندل بھری مانگ کی گلنار رنگینی ۔ مصنوعی خال کی سرگیں ملاحت اور غرض یہ کہ ہر وہ شے جس سے تزئینِ جمال ہوئی تھی ۔ ملتانی مٹی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے ذریعہ سے ارادتاً دور کر دی ۔ گدلے پانی میں اس نے غسل کیا، مچھلیوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا ۔ کبھی راج ہنس کو سر پر بٹھا لیا اور کبھی سرخاب کو، اس کے نقرئی قہقہوں سے تمام فضا معمور تھی ۔ اس نے پانی کے چھینٹے دے دے کر قازوں کو ستایا ۔ پھر پاس کی جھاڑیوں میں چھپ کر اس نے کھدر اور مارکین کا لباس پہنا ۔ خود رو پودوں سے ہر قسم کے پھول توڑے اور یکجا گوندھ کر گلے میں پہن لئے ۔ اب اس کی کلائیوں میں بجائے طلائی پٹڑیوں اور منقش کنگنوں کے صرف کانچ کی چوڑیاں تھیں ۔ اس نے دیسی چمڑے کا گنوارا ہی جوتہ پہنا ۔ اور پانی کا گھڑا سر پر رکھ کر چل پڑی ۔ اپنے شاہی کمروں کی طرف نہیں بلکہ دربان کے جھونپڑے کی جانب جس کو عارضی طور پر خالی کرا لیا تھا ۔ وہاں جا کر وہ چکی میں جوار پیسنے لگی اور اسی انہماک میں خدا جانے کیا گاتی رہی ۔ پھر اُپلوں کی آنچ پر تین چار روٹیاں پکائیں ۔ پالک کا ساگ سرسوں کے تیل میں بھونا اس نے کھانا کھا کر مٹی کے آبخورہ سے پانی پیا اور تنکوں کے سخت بستر پر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی ۔ اپنے ماں باپ ۔ بھائی بہن اپنی سکھیوں ۔ اپنی بھینسوں اور گاؤں میں پلے ہوئے کتوں کو یاد کر کے اس نے رونا شروع کر دیا ۔ اور اس کے آنسو آنچل میں جذب ہوتے چلے گئے۔

نواب کو جب ان باتوں کی خبر ملتی تو وہ دل ہی دل میں افسردہ ہوتا۔ وہ پشیمان ہو رہا تھا کہ ایک دیہاتی لڑکی کو محل میں لاکر کیوں رکھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اس حسین دوشیزہ کو دیکھکر اس نے خیال کیا تھا کہ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے اگدڑی میں لعل کو چھپا کر رکھدیا۔ اس کو اپنے محل میں لاکر وہ خوش ہوا تھا۔ کہ قدرت کی ایک زبردست غلطی کی تصحیح کردی ہے۔ لیکن اب وہ سمجھا کہ انگارے جو یاقوت کی طرح چمکتے ہیں، دراصل یاقوت نہیں، اور یہ کہ خوبصورت خوشنما سانپوں میں بھی زہر یلا مادہ ہوتا ہے۔ جن کی سمیت کبھی دور نہیں ہوسکتی خواہ وہ صدہا سال تک تریاق کے انبار پر کنڈلی مارے بیٹھے ہیں۔ اس نے خیال کیا تھا کہ محل کی رنگین فضا میں اس دیہاتی لڑکی کے حُسن کو چار چاند لگ جائیں گے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ شیر کا بچہ انسان کی گود میں پل جانے کے بعد بھی اپنی بہیمانہ خصلت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

وہ تصورات کی دُنیا میں واقعات گزشتہ کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ ایک روز اپنے مصاحبوں کے ہمراہ مچھلی کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ سرسوتی ندی کے کنارے اسے کشتی میں ایک نوخیز لڑکی نظر آئی پھٹے پُرانے میلے کچیلے کپڑوں میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا سیاہ بدلیوں میں سے چاند جھانک رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو اپنی خدمت پر مامور کرلیا۔ لیکن وہ پھولوں کو صرف آنکھ سے دیکھ لینے کا قائل نہیں تھا۔ اس لئے چلتے وقت اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ غالبًا بڈھا باپ اس ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا مگر پانچسو روپے کی کثیر رقم نے اس کی زبان بند کردی۔ دولت ناممکن باتوں کو بھی ممکن کردکھاتی ہے۔

دختر دہقان جب شاہی محل میں آئی تو کئی روز تک ہر شے کو تعجب کی نگاہوں سے تکتی رہی۔ عرصہ تک اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کپڑے کے اندر سورج کی کرنوں جیسی چمک کس طرح پیدا ہوجاتی ہے۔ اور وہ اس قدر ہلکے اور مہین کیوں ہوتے ہیں۔ وہ صرف پکی اینٹ کے ٹکڑوں سے پاؤں مانجھنا جانتی تھی۔ کنیزوں نے اسفنج کے ٹکڑے اور ربڑ کے جھانوے دئے تو حیران رہگئی۔ کہ یہ کیا چیز ہوسکتی ہے اور اگر بروقت اسے منع نہ کردیا جاتا تو شاید وہ گلگونہ یا غازہ سے ایک اُنگلی بھر کر منھ میں رکھ لیتی۔ اسنے بانسری کے نغمے سنے تھے۔ ہارمونیم ستار اور رباب سے اسکے کان ناآشنا تھے۔ ناچ کا مفہوم اس کے ذہن میں صرف اس قدر تھا کہ کچھ عورتیں ایک حلقہ میں کھڑی ہوکر اور گھونگھٹ نکال کر اپنے اعضا کو ایک مخصوص طریقہ پر جنبش دیں۔ کبھی ان کا سر آگے کی طرف جھکے اور کبھی پشت کی جانب، بعض دفعہ پاؤں زمین پر زور سے مارا جائے اور بعض دفعہ ہلکا۔ اور اس تمام دوران میں وہ کچھ جھینپی سی شرمائی سی رہیں۔ محل کی بزم نشاط میں اس نے دیکھا کہ صرف ایک نوجوان عورت مجمع کے سامنے اس طرح رقص کرتی ہے کہ اکثر اس کا سینہ کمر تک اور ٹانگیں رانوں کے بالائی سرے تک برہنہ ہوتی ہیں۔ وہ بے حیائی کے اس منظر کو دیکھ کر ابتدا میں خود شرما جاتی تھی۔ وہ بمشکل سمجھ سکی

کہ آخر ناچ میں اس چیز پر کیوں زور دیا جاتا ہے کہ چھاتیاں اور کولھے بھی اپنی اپنی جگہ رقص کریں۔ مختلف قسم کے نرت دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ غالباً رقاصہ ہوا کے سمندر میں تیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ بازوؤں کو شانوں کے متوازی پھیلا کر چھوٹے چھوٹے دائرے بنانا اور اس کے ساتھ ہی اُنگلیوں کو اس طرح موڑنا گویا ان پر تشنج کی کیفیت طاری ہو رہی ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے دیہاتی گیتوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا تھا جو جذبات میں ہیجان پیدا کر کے انسان کو گناہ کی ترغیب دے۔ برخلاف اس کے یہاں شعر کا ہر مصرع بذاتِ خود ایک فخرِ معصیت تھا

نواب اپنے خیالات میں محو تھا اور ابھی کسی خاص نتیجہ پر نہ پہونچا تھا کہ آیندہ اس دیہاتی لڑکی کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہ اسے اطلاع ملی کہ بیگم گوبر کا ڈھیر سامنے رکھے ہوئے اُپلے تھاپ رہی ہیں۔ آتشِ غضب اس کے سینہ میں بھڑک اُٹھی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو محل کی چار دیواری سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور دربان کے جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔

قریب پہونچ کر اس نے دیکھا کہ محل میں رہنے والی بیگم نے گاڑھے کا لباس زیبِ تن کر رکھا ہے۔ آستینیں کُہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ اور دونوں کلائیاں نجاست سے آلودہ ہیں۔ اسے آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور کسی قدر جھک کر بولی۔ "آئیے! بابو جی!"

اس کہنے کے ساتھ ہی وہ مسکرائی اور یہاں تک مسکرائی کہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ایک عورت اور خاص طور پر شباب کے بوجھ سے لدی ہوئی عورت کا تبسم جب بڑھتے بڑھتے دلفریب مگر مدہم قہقہہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ساغر و مینا کے باہم ٹکرا جانے سے جلترنگ کی ایک خاص نوع کا نغمہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس نے گاؤں میں سُنا تھا کہ امیر آدمیوں سے "بابو جی" کہہ کر بات کرتے ہیں۔ اور دیہاتی معاشرت کا خیال کر کے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ نواب کو بھی "بابو" ہی کہا جائے۔

"بابو جی! میں نے تمھارے جوتوں کو صاف کر کے چمکا دیا ہے۔ اپنے نوکر کو بھیج کر منگا لو"۔

نواب نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ جھونپڑے کی دیوار کے ساتھ پانچ سات جوڑے جوتوں کے رکھے تھے۔ اسکی تیوری پر بل پڑ گئے۔ یہ اس کی شانِ امارت کی زبردست توہین تھی کہ ایک عورت جو اس کی زینتِ آغوش بن چکی ہو ایسے ذلیل کام کرے۔ مگر کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لے کر چند طلائی سکے اپنی جیب سے نکالے اور دخترِ کفش دوز کے سامنے زمین پر ڈال کر بولا کہ "لو یہ جوتے صاف کرنے کی اُجرت ہے۔ اسے اُٹھا لو"۔ اس نے وہ سکے اُٹھا لئے اور چلی گئی۔ یعنی جب یہ کھیل ختم ہونے لگا تو وہ پھر حقیقت سے ہم آغوش تھی۔ (مختار) طاہرہ دیوی شیرازی

ریاض مرحوم

ریاضؔ کی موت، ہندوستان کی موجودہ شاعری کو صدمہ پہونچانے والی ہو یا نہو، لیکن اخلاق شاعرانہ اُن کے اُٹھ جانے سے جتنا بھی سوگوار نظر آئے کم ہے۔

ریاضؔ کی سب سے بڑی خصوصیت جو متقدمین شعراء میں بھی کم نظر آتی تھی، چہ جائیکہ دورِ متاخرین، نجابت نفس و شرافتِ اخلاق تھی اور یہ کہنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ وہ شاعر پیدا ہونے سے پہلے انسان پیدا ہوئے تھے جن کو اُن سے ملنے کا موقع نہیں ملا وہ صرف اُن کی شاعری پر سر دھنتے تھے اور جو اُن سے مل چکے تھے، وہ انکی انسانیت پر جان دیتے تھے۔ ایسے لوگ جو عمر بھر کسی سے بدگمان نہ ہوئے ہوں۔ایک لمحہ کے لئے بھی دل میں کسی کی طرف سے جذبۂ انتقام کو گوارا نہ کرتے ہوں اور جو ایک بار رشتۂ محبت جوڑ لینے کے بعد اس کا توڑنا کفر سمجھتے ہوں۔ کہاں پیدا ہوتے ہیں ۔ اس ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود بھی ناممکن تھا کہ وہ خیرآباد سے لکھنؤ تشریف لائیں اور فرداً فرداً ہر اس شخص سے جاکر نہ ملیں جس سے کچھ بھی رسم قائم ہوگئی ہے ۔ یقیناً وہ مراسم بڑھانے کی کوشش نہ کرتے تھے، لیکن جو اسلوب ملنے کا ایک بار قایم ہو جاتا تھا اس کو نباہنے کے لئے وہ ہر ممکن تکلیف گوارا کرسکتے تھے۔ گرمی کی دھوپ میں پسینے سے شرابور ہو رہے ہیں، ایک ایک قدم اُٹھانا بار ہے، دم پھول رہا ہے، ہونٹ خشک ہیں، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، لیکن ریاضؔ کو آنا اور ملنا ضرور خواہ وہ ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو۔ ان کی عمر کا آخری حصہ اقتصادی دشواریوں کی وجہ سے نہایت سختی سے بسر ہوا اور دیگر ذاتی و خاندانی افکار کی وجہ سے وہ سراپا درد و الم تھے، لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ دوسرا اُن کی اس کیفیت کو محسوس کرسکتا۔ وہ شوخی و ظرافت، وہ رنگینی و رعنائی جو جواں سال ریاضؔ کے "فتنہ" و "ریاض الاخبار" میں نظر آتی تھی، بالکل وہی نوّے ۹۰ سال کے بوڑھے ریاضؔ میں بھی پائی جاتی تھی، اور حیرت ہوتی تھی کہ جس شخص کا بڑھاپا اس قدر شگفتہ ہے، اس کی جوانی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ جن حضرات کو ریاضؔ کی صحبت و معیت

نصیب ہوئی ہے، اُن سے پوچھئے کہ ریاض کیا چیز تھے، اور وہ اپنے احباب کی زندگی میں کتنے خلا پیدا کر کے گئے ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کا شاندار لہجہ، وہ شوخی وظرافت اور وہ خالص ادبی رنگ کی بات چیت —— جس وقت وہ اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات بیان کرتے تھے تو سننے والا "لذتِ تقریر" میں اس قدر محو ہو جاتا تھا کہ شاید ہی زاہدانِ مرتاض کو یہ محویت کبھی عبادت میں پیدا ہوتی ہو۔ اور بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ ریاض ہر وقت گفتگو کرتے رہیں اور ہم خاموش بیٹھے سنا کریں۔

پھر جو رنگ اُن کی گفتگو کا تھا وہی اُن کی تحریر کا تھا۔ نگار میں جو خطوط اُن کے شائع ہوئے ہیں وہ آج ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی خراجِ تحسین حاصل کریں گے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے ریاض نے جو عزت وشہرت حاصل کی، اس کا ذکر فضول ہے، کیونکہ وہ اپنے رنگ کے تنہا کہنے والے تھے اور اس "انفرادیت" میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔

الغرض ریاض کی موت ایسا معمولی سانحہ نہیں جسے آسانی سے فراموش کیا جا سکے، اور یہ ملک وقوم کی انتہائی بدنصیبی ہوگی اگر اس نے اس جوہر گرانمایہ کی یادگار قائم رکھنے کی کوشش نہ کی۔

پھر اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اُن کے کلیات کو شائع کیا جائے جسے وہ اپنے قلم سے مرتب کر کے چھوڑ گئے ہیں اور دوسری یہ کہ نثر اُردو پر جو احسانات انھوں نے کئے ہیں، ان کو سامنے لایا جائے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ریاض الاخبار اور فتنہ کے فایل فراہم کر کے خود اس خدمت کو انجام دوں اور میں بہت شکرگزار ہوں گا اگر اس باب میں اہلِ ذوق میری اعانت فرمائیں گے۔

نیاز

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم - اے - ایل ایل - بی منصف سہارن پور

گلدستۂ بہار" فارسی اور اُردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی دیوان کی ضرورت نہیں ہے۔ چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں علم ادب میں گلدستہ بہار ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہو مصرع۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۲۳۶ صفحے۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(ر۔ بیگم۔ از مسوری)

جولائی کے نگار میں آپ کا ایک خط شایع ہوا ہے جو مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکا آپ نے جو یہ عنوان قایم کیا ہے، ممکن ہے صرف ادبی اختراع ہو لیکن اصل مکتوب کے دیکھنے کے بعد چونکہ خواہ مخواہ واقعیت وحقیقت کا سا اثر دل پر ہوتا ہے اس لئے غالباً عنوان بھی صحیح ہوگا، پھر کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کا یہ خط نگار کے ذریعہ سے بھی مکتوب الیہ تک نہ پہونچا ہوگا اور کیا حقیقتاً آپ کا مقصود یہ نہ تھا کہ اس ترکیب سے کوئی اسے دیکھ لے؟ بہرحال اگر یہ سب کچھ حقیقت ہے تو بہت پرلطف حقیقت ہے اور تفصیل سننے کے لئے جی بے چین ہے، لیکن آپ کیوں کہنے لگے؟

(نگار) عام طور پر راز چھپانے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی سے اس کا ذکر ہی نہ کیا جائے، لیکن ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو مشتہر کر دیا جائے اس طریق پر کہ ہر شخص اس کا مفہوم اپنے ذوق کے لحاظ سے علحدہ علحدہ قرار دے۔ پھر اگر کسی میں یارائے ضبط نہ ہو یا اتنا گننے کا بھی موقعہ حاصل نہ ہو کہ:۔

یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن

تو بہتر صورت وہی ہے، جو آخر میں عرض کی گئی ــــ مگر خدا را، اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے یہ خط اسی اُصول کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔

آپ نے تو خیر اسی حد تک دلچسپی لی کہ مجھ سے داستانِ محبت پوچھنے بیٹھ گئیں، میں کیا کرتا اگر آپ

مطبوعات موصولہ

تاریخ مرثیہ گوئی

یہ مختصر سا رسالہ ہے جس میں جناب حامد حسن قادری نے مرثیہ گوئی پر تنقیدی اظہار خیال کیا ہے۔ ابتدا میں عربی و فارسی کی مرثیہ گوئی کے نہایت ہی مختصر بلکہ مقتصر ذکر کرتے ہوئے اُردو مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں خاندان انیس کو لے لیا ہے اور اسی پر یہ رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ مختلف مرثیوں کا اقتباس بھی پیش کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب جناب قادری نے بہت عجلت میں لکھی ہے (جیسا کہ دیباچہ میں انھوں نے خود ظاہر کیا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ اسے نامکمل ہونا چاہئے۔ ہمیں حیرت ہے کہ قادری صاحب نے اسکول کے پبلشروں کے تعمیل ارشاد میں اپنے ذوق و استعداد کی رسوائی کیونکر گوارا کی۔ یہ کتاب گیا پرشاد اینڈ سنز آگرہ سے ملسکتی ہے۔

ہندوستانی لسانیات

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے، پی ایچ ڈی، سے ناظرین نگار ناواقف نہیں۔ نگار کے دور وسطے میں آپ کے تحقیقی ادبی مضامین اکثر نگار میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب آپ ہی نے تصنیف کی ہے اور موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے پہلے حصہ میں زبان کے مقاصد اور اس کے ارتقا پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے زبانوں کی تقسیم پر بحث کی ہے اور دوسرے حصہ میں اُردو کی آفرینش اس کی مدریجی ترقی اور مستقبل پر ناقدانہ و محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا موضوع ہمیشہ سے تحقیق زبان ہی رہا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہو گا وہ ایسی چیز نہ ہو گی جو ہر جگہ مل سکے، جا بجا نقشے دے کر ہندوستان کی مختلف زبانوں کی وسعت و انتشار کو بھی سمجھایا گیا ہے اس کی قیمت ۶؍ ہر چند حجم کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ لیکن کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کو اور زیادہ گراں ہونا چاہئے تھا۔ یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کی اُردو خدمات

۴۰ صفحات کا رسالہ ہے جس میں ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب نے بتایا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ نے اس وقت تک اُردو زبان کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تک وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے مختلف علوم وفنون کی (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) ۲۴۵ کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں زیادہ حصہ تاریخ، جغرافیہ ومعاشیات کا ہے، اس کے بعد تذکرہ پر زیادہ توجہ صرف کی گئی اور پھر شعر وشاعری پر ۔۔ طبیعیات، کیمیا اور ریاضی کی کتابیں بھی فہرست میں نظر آتی ہیں اور فلسفہ واسلامیات کی بھی ۔۔۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان کی کسی اور درسگاہ نے اتنی قلیل مدت میں اسقدر اہم خدمات انجام دی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ نے دکن میں ایک نئی روح پیدا کردی ہے اور اگر وہاں کا ماحول جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کا زیادہ اہل ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہی خدمات خدا جانے کتنی اہمیت اختیار کرلیتیں۔

Les Contes Du Hub Tarang.

میاں خوب محمد چشتی احمد آبادی ایک صوفی تھے جو سولھویں صدی عیسوی میں پائے جاتے تھے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے صوفیانہ رنگ کی مثنوی خوب ترنگ کے نام سے ۱۵۱۵ء میں لکھی تھی۔ اس کو جناب ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب نے ایڈٹ کرکے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں مختصر سا دیباچہ بھی فرانسیسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جس میں مصنف کا نہایت مختصر سا حال دیگر مثنوی کی تقسیم پر بحث کی ہے۔ اگر اس دیباچہ کا ترجمہ اُردو میں بھی کردیا جاتا تو اہلِ ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ تحقیق زبان کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں

محمد رسول اللہ

یہ ایک لکچر ہے جو جناب محمد ابراہیم صاحب سب جج نے ڈیرہ غازی خاں میں بتقریب جلسۂ یوم النبی پڑھا تھا۔ اس کا موضوع یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ نے بنی نوع انسان پر کیا احسانات کئے اور فاضل لکچرر نے اس میں زیادہ تر رسم غلامی کو سامنے رکھ کر اس موضوع پر بحث کی ہے۔

رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل مقرر کا مطالعہ اس باب میں بہت وسیع ہے اور تاریخی و تمدنی حیثیت سے بحث کا کوئی پہلو انھوں نے نہیں چھوڑا ہے۔ اسوقت تمام دُنیا جس چیز کے لئے بیتابانہ دوڑ رہی ہے وہ آزادی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس شاہد کی سب سے پہلی جھلک جس نے دکھائی وہ

محمدکی ذات تھی۔

مضمون نہایت قابلیت سے لکھا گیا ہے اور ہر شخص کے نگاہ سے گزرنے کے قابل ہے۔ یہ رسالہ دفتر بلاغ امرتسر سے ۲ر کے ٹکٹ بھیجنے پر مل سکتا ہے۔

مذہب باب وبہا حصۂ اول امامیہ مشن کا سولھواں تبلیغی رسالہ ہے جس میں مذہب باب وبہا کے نشو ونما پر بحث کرتے ہوئے اس مسلک کے بانیوں کی کمزوریوں کو دکھایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک تبلیغی رسالہ میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نکالنے سے پہلے دوسروں کی آنکھ کا تنکا نکالنا ہمیشہ سے مبلغین مذاہب کا شعار رہا ہے۔ چونکہ ہم اصولاً تبلیغ کے سخت مخالف ہیں خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے اس لئے افسوس ہے کہ ہم اس کے مطالعہ کی سفارش نہیں کرسکتے۔ اس کی قیمت ۵ر ہے اور سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

چراغ امین جناب فکری سلطان پوری کے نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب فکری اپنے آپکو اصغر وجگر کا تبع ہونا ظاہر کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ایک کے "اسرار سخن" اور دوسرے کے رندانہ ولولہ کو اپنے کلام سے ظاہر کرسکیں۔

فکری صاحب آج کل کے نوجوان شعراء میں سے ہیں اور کافی اہلیت ترقی کی رکھتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا مجموعہ شایع کرنے میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا اور ایک اُن پر کیا موقوف ہے اسوقت ہر نوخیز اہل قلم اسی خبط میں مبتلا ہے اور طلب شہرت کے جذبہ سے بیتاب ہوکر وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ کسی تصنیف کے شایع کرنے کا زمانہ عمر کے چالیس سال گزرجانے کے بعد آتا ہے ـــ اس کی قیمت عہ ہے اور کنور احمد اعتبار حسین خاں ہارمیؤ ضلع سلطان پور سے مل سکتا ہے۔

مساوات اسلامیہ ۹۶ صفحات کا رسالہ ہے جسے جناب شیر محمد قادری کاکوروی نے مرتب کیا ہے موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ ہندوؤں میں چھوت چھات کا مسئلہ پیش ہے یہ کتاب بہت برمحل ہے اور مسلمانوں کے سامنے درس عبرت وبصیرت پیش کرتی ہے۔ کہ وہی قوم جس نے سب سے پہلے تفریق نسل وامتیاز کو مٹانا چاہا تھا، وہی آج اسی میں مبتلا نظر آتی ہے ـــ کتاب مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت ۶ر ہے اور مؤلف سے نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

ہمدرد صحت دہلی ایک طبی ماہوار رسالہ ہے جو کچھ عرصہ سے دہلی سے شایع ہو رہا ہے۔ اس نے حال ہی میں اپنا "اعادۂ شباب" نمبر ۲۰۰ صفحات پر شایع کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت محنت سے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ اس میں "تجدیدِ شباب" پر علمی و اصولی بحث بھی پائی جاتی ہے اور عملی و تجرباتی بھی۔ یادش بخیر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے بھی تین مضمون اس میں نظر آتے ہیں، جو اسوقت ہندوستان کے واحد "مجدد شباب" ہیں اور جنھوں نے حال ہی میں لکھنؤ کے ایک صاحب پر تجدیدِ شباب کا آپریشن کرکے اپنی حذاقت فن کو سب سے تسلیم کرا لیا ہے۔ اس کا معمولی اڈیشن ۶ ر میں ہمدرد منزل لال کنواں دہلی سے ملسکتا ہے۔

مؤتی مجموعہ ہے حکیمانہ و شاعرانہ اقوال کا جسے سید یوسف بخاری صاحب دہلوی نے مرتب کرکے نہایت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں جناب اختر انصاری کا تعارف نامہ ہے اور پھر راشد الخیری صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا تبصرہ۔ اس کے بعد قابل مولف نے ایک مقدمہ کے ذریعہ سے "اقوال" کے فلسفہ و تاریخ کو پیش کیا ہے اور پھر اقوال کا انتخاب ہے۔ انتخاب جو سو سے زاید عنوانوں پر مشتمل ہے بہت دلچسپ و مُفید ہے۔ اچھا ہوتا اگر ہر قول یا فقرہ کے سامنے یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور جناب سید محمد بخاری سے گلی امام، جامع مسجد دہلی کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

قانون مباشرت یہ کتاب ڈاکٹر فضل مُبین احمد صاحب دہلوی نے مرتب کی ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے لیکن ۴۰۰ صفحات میں زیادہ سے زیادہ ۴۰ صفحات اصل موضوع پر نظر آتے ہیں باقی صفحات جنسی کمزوریوں اور ان کے علاج کے لئے وقف ہیں۔ آلات جنسی کی طبی تشریح بھی ذریعۂ نقوش ظاہر کیگئی ہے اور ممسکات و ملذذات وغیرہ کے ساتھ ساتھ بعض امراض سوداوی کا علاج بھی بتایا ہے اگر اس کتاب سے نسخوں کو نکالدیا جائے تو کتاب صرف چند صفحات کی رہجاے اسلئے ہماری رائے میں اس کا نام بجائے "قانون مباشرت" کے اگر "مجموعۂ نسخہ جات" رکھا جاتا تو زیادہ موزوں تھا۔ اب رہا یہ امر کہ نسخے کیسے ہیں اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جبکہ اسی قسم کے سیکڑوں نسخے ہر طبی رسالہ اور ہر طبی کتاب میں آج کل نظر آتے ہیں طباعت و کتابت اچھی ہے لیکن چار روپیہ قیمت بھی بُری نہیں۔ یہ کتاب دفتر معارف طبیہ ردوگران دہلی سے مل سکتی ہے۔

محبت کے پھول ترجمہ ہے ٹیگور کے ڈرامہ کا جسے جناب فریدہ مچھلی شہری نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے۔ البتہ ایک آدھ جگہ فارسی اُردو کے اشعار استعمال کئے گئے ہیں وہ بے محل ہیں۔ قیمت ۸ ر ہے اور ۹۴ بلند ریہ الہ آباد کے پتہ سے ملسکتا ہے

کیوپڈ و شاعر

شاعر:-

اے کماں دارِ محبت اے شرارِ دل فروز
اے کہ تیری ہر نظر صد جلوۂ محفل فروز

تیرے تیروں سے جبینِ حسن پر سوداغ تھے
تیرے ترکش کی ہدف تھی لیلیٰ محمل فروز

تھیں ثریا کے تبسم میں تری انگڑائیاں
کسب کرتا تھا تری ضو سے مہِ کامل فروز

ہر ترنم تیرا سازِ حسن کی تھی زندگی
راہِ اُلفت میں تری ہر ہر ادا منزل فروز

رہبری سے تیرے طوفاں کیسے کیسے مٹ گئے
تو اندھیری رات میں اک شمع تھا ساحل فروز

شورشوں سے تیری رونق عشق کی محفل میں تھی
آگ تھا تو اور تیری آگ سب کے دل میں تھی

اب مگر کچھ سرد سی ہے گرمیٔ بازارِ عشق
عرصۂ ہستی میں گویا بند ہے پیکارِ عشق

ظلمتیں مایوسیوں کی دل پہ ہیں چھائی ہوئیں
کارفرما اب نہیں آتے نظر انوارِ عشق

اب مسلط ہیں نگاہِ عشق پر لاکھوں حجاب
اب کسی سینے میں پنہاں ہی نہیں اسرارِ عشق

کیا خبر تھی ایک دن یوں انقلاب آجائے گا
آہ کیا معلوم تھا بدلیں گے یوں اطوارِ عشق

حُسنِ عشوہ ساز کی نذریں نہیں ہوتیں قبول
اب کہیں بھی منعقد ہوتا نہیں دربارِ عشق

اب درائے کارواں سے وادیاں خاموش ہیں
اب نہیں پیوست پائے راہرو میں خارِ عشق

اب کہاں وہ شورشِ دار و رسن کی شوخیاں
زنگ ہو زنجیر میں خالی پڑی ہے دارِ عشق

چھن گیا فطرت سے کیا وہ رتبۂ عالی ترا
آہ کیا تیروں سے ترکش ہو گیا خالی ترا

کیوپڈ :-

مجھ کو فطرت نے بنایا پاسبانِ زندگی
میرے قدموں میں بچھایا گلستانِ زندگی

خواب سے اجسام کو بیدار میں نے کر دیا
ہر نظر سے میری لرزا آسمانِ زندگی

نصب میں نے اس کے خیمے تا بہ منزل کر دئے
جب چلا میرے قدم پر کاروانِ زندگی

حسن سے سجدے کرائے میں نے پائے عشق پر
عشق کو میں نے بنایا رازدانِ زندگی

بلبلِ بیتاب کو میں نے دیا درسِ فغاں
باغ میں گل کو بنایا نغمہ خوانِ زندگی

بیستوں اور نجد میں قائم ہوا رایت مرا
جمع جس کے سائے میں تھا اک جہانِ زندگی

یوں مرتب زندگی جاودانی میں نے کی
عالمِ حسن و وفا پر حکمرانی میں نے کی

میرے ہی جلووں سے ہاں معمور تھا بازارِ حسن
میرے ہی کاشانے کا اک نام تھا سرکارِ حسن

مصر اور یونان میں قائم کئے میں نے محاذ
خسروی میں عشق کی برپا ہوئی پیکارِ حسن

منکرانِ عشق کو چہ رنگ میں نے کر دیا
خون اس کا پی لیا جس نے کیا انکارِ حسن

میں نے قوموں کے دلوں میں پھونک دی غیرت کی آگ
چھا گئی افراد پر رخشانیِ آثارِ حسن

شام کو میں نے سجائی زلفِ رنگینِ شفق
صبح کو میں نے بنایا مطلعِ انوارِ حسن

میں نے کی جنسِ وفا ارزاں بساطِ دہر پر
میرے ناخن سے کھلا ہر عقدۂ دشوارِ حسن

مشرق و مغرب میں میخانے نئے قائم کئے
کارفرما ہر طرف تھا جذبۂ سرشارِ حسن

حسنِ برہم کا مٹا ڈالا غرورِ عشوہ ساز
عشق کے دل کو کیا میں نے امانت دارِ حسن

دہر میں بعد خدا فرمانروائی تھی مری
روح کی قوت سے دنیا میں خدائی تھی مری

عالمِ فانی میں آیا رفتہ رفتہ انقلاب
نوحۂ ماتم سے بدلا نغمۂ چنگ و رباب

ابر بن کر دہر پر لعنت ہوس کی چھا گئی
حسن اب ناکام تھا اور عشق تھا ناکامیاب

خود غرض تو موں نے اپنی حق پرستی چھوڑ دی
ذہن پر چھڑکی گئی مینائے باطل سے شراب

مادی راہیں بنائیں قافلوں نے ہر طرف
ہو گیا یوں جادۂ روحانیت کا سدِ باب

حسن کی آنکھوں میں اک خوابِ تغافل بھر گیا
عشق کا دل ہو گیا تشویشِ بے جا سے خراب

میں نے ترکش پر نظر ڈالی تو وہ خالی ملا
سرد ہو کر رہ گیا میری نظر کا التہاب

لوٹ لی اہلِ ہوس نے آہ وہ دنیا مری
حرص و پندار و خودی کے ڈالکر لاکھوں حجاب

تیر و پیکاں کے تصور سے بھی تھرّاتا ہوں میں
اب ہوس کے تیر اپنے دل پہ خود کھاتا ہوں میں

دیکھ وہ اک نوجواں مستِ بہارِ آرزو
جس کی نظروں سے عیاں ہے اضطرارِ آرزو

عشقِ صادق پہلے اسکی روح میں بیدار تھا
اب شبِ تاریک ہے اور خوابِ تارِ آرزو

عشق کے جذبوں سے پہلے تھا مقدس اسکا دل
اب اسے کہتی ہے دُنیا جرم کارِ آرزو

پہلے نازش تھی اسے سرگرمیِ جذبات پر
اب یہ ہے اعمالِ بد سے شرمسارِ آرزو

آرزو کی اس کے ہاتھوں ہو گئی مٹی خراب
کھو دیا اس کے تلوّن نے وقارِ آرزو

اب ہوس کی چھا رہی ہیں قلب پر تاریکیاں
پہلے اس کے دل میں روشن تھا شرارِ آرزو

تیر میرے کند ہیں ترکش مرا بیکار ہے
اب مجھے خود تیر اندازی سے اپنی عار ہے

اب بھی اک ہستی فروغِ عالمِ ایجاد ہے
اب بھی اک دل زندگی کی آگ سے آباد ہے

اب بھی ہیں اک روح میں اسرار کی چنگاریاں
اب بھی اک سینہ فساد و حرص سے آزاد ہے

وہ تری ہستی ہے اے شاعر وہ پیکر ہے ترا
واقفِ رازِ غمِ عالم ہے اور ناشاد ہے

جانتا ہوں تو نے دُنیا کو جگایا خواب سے
گونج اُٹھی تیری صدا تاروں میں مجھ کو یاد ہے

وہ امانت آج میں تفویض کرتا ہوں تجھے
دل مرا جس کی تپش سے مائلِ فریاد ہے

محرمِ کاشانۂ الہام ہے تیری صدا
قوتوں پر روح کی قائم تری بنیاد ہے

کام جو مجھ سے نہیں ممکن اُسے انجام دے
جاگ اے شاعر، دُنیا خستۂ بیداد ہے

تیرے قبضے میں متاعِ دو جہاں دیتا ہوں میں
لے تجھے یہ تیر، ترکش اور کماں دیتا ہوں میں

محمد صادق ضیا۔ چنیوٹی

مشاہدات

سحر کے نور کا عالم لئے نگاہوں میں ضیا بکھیرتا جاتا ہے کوئی راہوں میں
لبوں میں معنیِ عہدِ شباب رخشاں ہیں بہار جھوم رہی ہے حسین باہوں میں

شباب و شعر کی طغیانیوں کا ساماں ہے نظر نظر میں شبِ ماہتاب غلطاں ہے
بنا ہوا ہے ہر اک عضو موجِ صہبا سے تمہاری ذات طلسمِ بہارِ خنداں ہے

شام تھی اور شام کی تاریکیوں میں ہمنشیں ساحلِ دریا پہ محوِ سیر تھی اک نازنیں
اُس کا پیکر، شام اور دریا حقیقی چیز تھے بن گئے لیکن یہ سب مل جل کر اک خوابِ حسیں

اک سُبک رفتار لڑکی پیکرِ موجِ نسیم مُنھ اندھیرے باغ کی اک کنج تنہا سے ندیم
آرہی تھی سایہ کی مانند اور دھندلی فضا کر رہی تھی پیش مستقبل کی دنیائے عظیم

جب سیہ راتوں میں کالے بادلوں کے درمیاں آنکھ جھپکاتی ہیں رہ رہ کر فلک پر بجلیاں
کپکپاتی روشنی کی مختصر ساعت میں بھی دیکھ لیتی ہے نظر کتنے طلسماتی جہاں

عدم

اعتماد

جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں
ہے پردہ دارِ اعتنا بے اعتنائی عشق میں
ہوتی ہے بنیادِ وفا ہر بیوفائی عشق میں
جوہر شناسِ عشق ہے ناآشنائی عشق میں
ہستی ربابِ عشق کی
مضرابِ خاموشی سے ہے
شمعِ وفا کی زندگی
بادِ فراموشی سے ہے
نقشِ مرادِ عشق ہوں مٹ کر اُبھر جاؤنگا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

دل کا سکوں لیجاؤں گا
دل سے بھلا کر دیکھ لو
داغِ جگر بنجاؤں گا
دامن بچا کر دیکھ لو
آنکھوں ہی میں چھپ جاؤں گا
آنکھیں چرا کر ــــ دیکھ لو
ربطِ حبیبِ آرزو.... ٹوٹے، نہ ٹوٹا ہے کبھی
جذبِ لطیفِ رنگ و بو... چھوٹے، نہ چھوٹا ہے کبھی
سو بار بھی کھو دو، مگر!
کھویا نہیں جاؤں گا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے ــــ

قیدیٔ زنجیرِ وفا!
دل بھی ہے اور دلدار بھی،
پابندِ جذبِ عشق ہیں،
مجبور بھی مختار بھی
اس میکدے میں ایک ہیں
مدہوش بھی، ہشیار بھی
پروانہ ہوں اور بالیقیں ــــ پروانہ کر دونگا تمھیں
دیوانہ ہوں اور ایک دن
دیوانہ کر دوں گا تمھیں

بیتابیِ دل کی قسم
تم کو بھی تڑپاؤں گا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے

آخر تو ہوں چشم آشنا — خواب پریشاں ہی سہی
باقی تو ہے کوئی کشش — ربطِ گریزاں ہی سہی
دیکھو تو ہے کس کا رفو — میرا گریباں ہی سہی

بے خوابیاں دیکر مجھے
بے خواب ہوجاؤ گے تم
بیتابیاں دے کر مجھے
بیتاب ہوجاؤ گے تم
خلوت سے آؤ گے نکل — جس روز چھپ جاؤنگا میں
جتنا بھلاؤ گے مجھے
اتنا ہی یاد آؤں گا میں

روش صدیقی

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۲۳ء ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ جنوری ۲۴ء ۴ر۔ فروری ۴ر۔ مارچ ۴ر۔ اپریل ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۸ر۔ اگست ۴ر۔ جنوری ۲۶ء ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ نومبر ۱۲ر۔ دسمبر عہ۔ مارچ ۲۷ء ۴ر۔ اپریل ۴ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۴ر۔ دسمبر ۲۸ء ۸ر۔ فروری ۲۹ء ۴ر۔ مارچ ۴ر۔ جون ۸ر۔ مارچ ۳۰ء عہ۔ مئی ۴ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ نومبر ۴ر۔ دسمبر ۴ر۔ مئی ۳۱ء عہ۔ جولائی ۲ر۔ اگست ۳ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۳ر۔ نومبر ۳ر۔ دسمبر ۳ر۔ جنوری ۳۲ء ۱۲ر۔ فروری ۴ر۔ مارچ ۴ر۔ اپریل ۸ر۔ مئی ۴ر۔ جون ۴ر۔ جولائی ۴ر۔ اگست ۴ر۔ ستمبر ۴ر۔ اکتوبر ۴ر۔ نومبر ۴ر۔ دسمبر ۴ر۔ جنوری ۳۳ء عہ۔ فروری ۴ر۔ جولائی ۴ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر ۸ر۔ اکتوبر ۴ر۔ دسمبر ۴ر۔

منیجر نگار لکھنؤ

آیندہ جنوری ۳۵ء کا نگار

دہلی و لکھنؤ اسکول کی تمام اصناف شاعری پر ایک بے مثل بسیط تبصرہ ہوگا اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سے قبل آپ کو نہ کسی رسالہ میں نہ کسی بسوط تصنیف میں اتنا مفصل تذکرہ دونوں اسکولوں کی شاعری کا یکجا نظر آیا ہوگا۔

ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا، کیونکہ تمام مضامین جو معیار پر صحیح اتریں گے وہ سب کے سب درج کئے جائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ اس کا حجم سیکڑوں صفحات تک پہونچ جائے۔ اس ایک پرچہ کی قیمت علیحدہ دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، اس لئے آپ اپنی خریداری جاری رکھئے تاکہ یہ مجموعہ آپ کو بلا کسی مزید صرف کے مل سکے

منیجر نگار لکھنؤ

لمعات

اللہ اللہ، رنگ ہے کیا تسکین افزا ویرانوں کا ۔۔۔ دانشِ حیراں ڈھونڈھ رہی ہے نقشِ قدم دیوانوں کا
گیتی کے نظارے گم ہیں، حُسنِ ازل کے جلووں میں ۔۔۔ ہستی اک مجموعہ ہے کچھ بھولے ہوئے افسانوں کا
سوزِ محبت یکساں تھا، وہ خاک ہوئے، یہ خون ہوا ۔۔۔ دل ہی کی یہ ہمت تھی یہ کام نہ تھا پروانوں کا

اختر دنیا بھیدوں سے معمور ہے اتنی، کیا کہئے
ہستی کوئی صداقت ہے یا عنواں ہے افسانوں کا

نکتہ چیں بھی ہے، ستم کیش و خود آرا کوئی ۔۔۔ خامشی ہی سے کرے شرح تمنا کوئی
لاکھ ہر سانس میں ہو موت کا ہنگامہ بپا ۔۔۔ دل سے جاتی ہے مگر حسرت دنیا کوئی
ننگ ہے اے نگہِ شوق وہ نظارۂ حُسن ۔۔۔ آپ جب تک نہ ہو مجبورِ تماشا کوئی
ذکرِ ماضی مگر اس حال میں کس طرح سنوں ۔۔۔ نہ کہے مجھ سے یہ افسانہ خدا را کوئی
سعیِ اظہار سے کیا فائدہ اے حسرتِ دل! ۔۔۔ دردِ پنہاں کو نہ سمجھے گا، نہ سمجھا کوئی
غم اُٹھانے پہ بھی سمجھا نہ مآلِ ہستی ۔۔۔ سطح بیں، دہر میں مجھ سا بھی نہ ہوگا کوئی

کیا کہوں بیکسی عالمِ ہجراں اختر
دے تسلی بھی جو مجھ کو نہیں اتنا کوئی

چارہ کیا تھا رسمِ ابنائے زماں دیکھا کئے ۔۔۔ ہم دلِ برباد کو محوِ فغاں دیکھا کئے
دل نے کی اک آہ، اور پھر جل کے خاکستر ہوا ۔۔۔ اور ہم حسرت سے سوئے آسماں دیکھا کئے

رہروی میں کچھ اُٹھائے ناتوانی کے ستم　　اور کچھ رنگِ جفائے ہمرہاں دیکھا کئے
چھوڑتی ہے کسکو ہمدم، گردشِ رنگِ طرب　　دامنِ ہمت تہِ سنگِ گراں دیکھا کئے
اور ہم سے بیکسوں کا کون ہوتا غمگسار　　آپ ہی ہم اپنے مٹنے کا سماں دیکھا کئے
شاید اس طرزِ ستم کا نقطۂ آخر ہے موت　　زندگی بھر دل کو صرفِ امتحاں دیکھا کئے
زندگی بھر دل نے پائے زخمِ تازہ کے مزے　　اُن کو اپنے حال پر یوں مہرباں دیکھا کئے
چارہ آخر کار کیا تھا ہم اسیرانِ قفس!　　برق کے سائے میں اپنا آشیاں دیکھا کئے
زندگانی تھی ہماری گرچہ اک موہوم نقش　　اس سُبک روحی پہ اُن کو سرگراں دیکھا کئے
زندگی محض اک تصور، اور دنیا محض وہم　　عمر بھر خوابِ بہشتِ جاوداں دیکھا کئے

چین جیتے جی نہ ہم کو مل سکا اختر کہیں
ہر جگہ روئے زمیں پر آسماں دیکھا کئے

اختر

بہار ۲۳۶ صفحات کی نہایت ہی خوشنما چھپی ہوئی کتاب ہے جس میں جناب الیاس احمد صاحب ام اے، ال ال بی منصف سہارنپور نے تقریباً ۳۰۰ عنوانات پر بہترین اُردو فارسی شعروں کا انتخاب یکجا کر دیا ہے۔ ہر چند اس نوع کا انتخاب کوئی چیز نہیں ہے، لیکن اس سے قبل جتنی کوششیں کی گئیں ان میں دو نقص پائے جاتے تھے، ایک یہ کہ تنوع موضوع کے لحاظ سے وسیع استقصار نہیں کیا گیا اور دوسرے یہ کہ ذوق کی پاکیزگی کا بھی کم لحاظ رکھا گیا۔ یہ کتاب دونوں نقایص سے پاک ہے یعنی انسانی زندگی کے تقریباً تمام پہلو سامنے رکھکر انتخاب کیا گیا ہے اور کتنا اچھا انتخاب کیا گیا ہے کہ بقول غالب اگر الیاس احمد صاحب کے "دل کا معاملہ" رسوائی کی حد تک پہونچ جائے تو کچھ دور نہیں۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ معارف پریس اعظم گڈھ

رہنمائے تعلیم جوبلی نمبر ماسٹر جگت سنگھ صاحب پنجاب کے اُن لوگوں میں سے ہیں، جن کو اُردو زبان کی خدمت کا شوق عشق و شغف کی حد تک حاصل ہے۔ ایک ربع صدی سے زاید زمانہ گزرا کہ انھوں نے اپنا رسالہ جاری کیا اور اس میں اتنی تدریجی ترقی کی کہ پنجاب کے دورِ حاضر میں جبکہ خاص نمبروں کے نکالنے کا شوق وہاں جنون کی حد تک پہونچگیا ہے، انھوں نے بھی جوبلی نمبر شایع کر کے اپنی محنت و کاوش کی ایک غیر فانی مثال دنیائے ادب میں قایم کر دی۔ یہ نمبر صفحات کے لحاظ سے ایک ضخیم کتاب، مضامین کے لحاظ سے ایک مرجع دفتر اور تصاویر کی حیثیت سے ایک دلکش مرقع ہے، آیندہ جنوری کا پرچہ وہ ذکر اس نمبر کے نام سے اسی شان کا نکال رہے ہیں اور غالباً فروری نمبر جناب دل شاہجہانپوری کی شاعری کیلئے مخصوص ہوگا

فہرست مضامین مجموعۂ استفسار و جواب

دو مذہب باہم متقابل ہوجاتے ہیں اور ڈرامہ شروع ہوجاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہوسکتی کہ اسلام جن خیالات کو مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ بہ لحاظ نتائج اُن خیالات سے کہیں زیادہ تھے جنھیں مسیحیت اسوقت تک مشرقی تہذیب کے سامنے پیش کر چکی تھی۔

اسلام، جس نے ایک بے لاگ مذہب کا بدویانہ جوش پیدا کرکے غریب لیکن آزاد عربوں کو کرۂ زمین کی تسخیر پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ اسلام جس کے پیرو خیموں کے سوا کوئی گھر نہ رکھتے تھے اور جن کا منتہائے نظر خواب کی سی لانہایت دنیا کو اپنے بادپا گھوڑوں کی رفتار اور گرد و غبار کا طوفان سے آنے والی ہوا کے ساتھ مسخر کرنا تھا۔ ہاں وہی اسلام عہد وسطیٰ میں اس آرزوئے ناتمام کو لیکر نمودار ہوا جس کے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے اسیقدر وہ ہمیں عنان مستقبل میں غرق کرتی چلی جاتی ہے۔

جب فرمانروائے روم جسٹی نین نے پایۂ تخت یونان کی درسگاہوں کو بند کرکے ماہرین فنون اور علما کو سلطنت سے نکال دیا (یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جبکہ گریگوری اعظم نے پلاطینی کتبخانہ جلاکر خاک کر دیا تھا) تو وہ ایران کی دولت ساسانی کی ہی آغوش تھی، جس نے ان تمام خانماں برباد یونانیوں کو پناہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یاوری قسمت کی بھی بعض عجیب غریب شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ جب سرزمین رستم و اسفندیار پر اہل عرب کا استیلا ہوا اور وہ گنج بادآورد کے مالک ہوگئے تو یہی عرب تھے جنھوں نے قدیم تہذیب کے اندر جدید یوروپ کی بنیاد ڈالی یعنی جسوقت فضائے مغرب پر ظلمت کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، اُسوقت خلفائے اسلام یونیورسٹیاں کھول رہے تھے۔ نہریں جاری کر رہے تھے "جنات عدن" کی داغ بیلیں ڈال رہے تھے، مساحت، ریاضی، جغرافیہ وطب کا احیا کر رہے تھے۔ اور مفتوحہ ممالک کو کاروانسراؤں، مساجد اور محلات کی تعمیر سے آراستہ بنا رہے تھے، گویا ایک تاریک پس منظر میں الف لیلہ کی کوئی داستان طیار کی جا رہی تھی۔

عرب ذہنیت کا محیر العقول کمال یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی اپنی خصوصیت ہاتھ سے نہیں دی اور باوجود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہ کرنے کے تمام اذہان پر غالب رہی۔ عرب کی یہ ہنگامہ آرا بدویانہ لیکن متحد ذہنیت جو اخلاقی حدود سے بے نیاز اور مادی قیود سے مبرا تھی، محض اسی خصوصیت کے وجہ سے اپنے اور مفتوح اقوام کے خصائص میں ربط پیدا کرکے مغلوب قوموں کو انھیں متحدہ خصائص میں جذب کرلیتی تھی۔ مصر میں قبطی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ میں بربر، ایران میں عجمی اور ہند میں ہندوستانی بنکر اسلام نے نومسلم قوموں کو اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس جوش و خروش کے اظہار سے کبھی باز نہیں رکھا جو وہ ان قوموں میں پیدا کر دیتا تھا، الغرض اسلام جہاں کہیں

بھی پہونچا وہ لوگوں کے دلوں کا مالک بن کر رہا۔

جب رسول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے اعلان جہاد کیا تو مصر و شام کے فاتحین نے بازنطینی اور قبطی کنائس میں جو بھی ان کے سامنے آئے اپنے مذہب کے اثرات قایم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انھیں اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ پہلے کوئی مقام کتنا مقدس اور کس قدر متبرک تھا۔ وہ جہاں پہونچے مخلی بالطبع ہو کر پہونچے اور کنائس کے در و دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں اُن پر انھوں نے رنگ پھیر کر، قبلہ رُخ دیوار میں ایک محراب کھود لی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ مصری، یونانی یا رومی خرابوں میں جہاں کہیں اُن کو پرانے ستون یا فیلپائے ملے انھوں نے جمع کر کے سرا در بایہ کا خیال کئے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور اندرونی صحن میں فوارہ کے اردگرد وضو کے لئے متوازی قطاروں پر مخروطی شکل کی محرابیں قایم کر دیں۔

اس حال پر تین صدیاں گزر جاتی ہیں اور دورِ فتوحات ختم ہو جاتا ہے یعنی اسلام حدبِ ایران سے کوہستان پیری نیز تک پھیل جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب اپنی ولایات مفتوحہ میں جو طاقتیں انہیں کسمت پڑ گئی تھیں انھیں از سرِ نو بیدار کرتا ہے۔ اور اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اپنی روح عمل سے مفتوحہ اقوام و ملل کے قوائے عمل میں بیداری پیدا کر دے۔ تمام نخلستان جو افریقہ کے ریگستانوں اور ہسپانیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سفید سفید شہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو کنگورے دار فصیلوں سے محصور ہیں، جلدی جلدی محلات و قصور معہ سایہ دار درختوں کے پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کی راحت بخش ٹھنڈ میں آرام و آسائش حاصل کرنے کے لئے ریگزاروں کا سفر کر کے امراء آتے ہیں۔ اور اب جو فوج یا قافلہ ریگ رواں کے بے پایاں سمندر کو عبور کر کے آتا ہے تو اُسے سرابی منظر کے بجائے ایک گلابی یا نیلگوں دھندلکا نظر آتا ہے جس کے ہلکے پردہ میں مکانوں کی کرسیاں، محلوں کے پشتے گول ستون اور مینار جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم روح عین اُسوقت بھی جبکہ وہ بزعم خود اپنی مالک آپ تھی، کبھی اس قابل نہیں ہوئی کہ سراب یا ٹھنڈے سایہ سے زیادہ کسی چیز پر قابض ہو سکے۔ یہ سایہ بھی وہ سایہ تھا جو ایک ساعت کے لئے شعلوں کی دو چادروں کے درمیان جس پر سے فاتحین اسلام گزرے پیدا ہو جاتا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیلاب عظیم کی رو ختم ہو گئی جب وہ آرزوئیں جو ہمیشہ ان کے آگے آگے موج دریا کیطرح چلتی تھیں کسی بحرِ ذخار یا سلسلۂ کوہستان، یا بائزنطیم کی دیواروں یا فرنگی فوجوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکیں تو انھیں کسی اور راستہ کی تلاش ہوئی، اور چونکہ اب افق بھی مسدود ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے آسمان کیطرف

سر اُٹھایا اور اس طرح وہ بھی بائزنطینی گنبدوں کی صورت میں نمودار ہوئیں اور کبھی مصری محلات کی چھتوں کی شکل میں محلات شاہی کے جلوخانوں کی بھاری بھاری نیم دائرہ محرابیں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ اوپر کی طرف رخ کرنیوالی شکستہ محرابوں نے لے لی تھی۔ اسی طرح گنبد کے دائرہ نے بھی مخروطی صورت اختیار کرلی تھی اس کی وضع قدیم آشوری طرز کی ہوگئی تھی جو قبل اسلام آل ساسان کے ایران میں رائج تھی۔ یہ سبک بیضوی وضع کے گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والوں کی آرزوئیں ہیں جو فضا میں بلند ہوکر غائب ہوجانا چاہتی ہیں گنبد کے نچلے حصہ کو تنگ کردیا گیا یہاں تک کہ یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ وہ کہاں سے شروع ہوا ہے۔ اور اس طرح گویا لامحدود کائنات کے معلق ہونے کا راز سمجھ میں آجائے چودھویں صدی کی ابتدا میں ستون غائب ہوجاتے ہیں کیونکہ گرجاؤں کی عظیم سادگی کو دیکھ کر ان کے دل میں ریگستان کا تصور پیدا ہوتا تھا اور قدرتاً انھیں اس طرف مایل ہوجانا چاہئے تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی گنبد کے ساتھ ساتھ گرجا کی شکل کے بلند مینار بھی قائم ہوگئے جن سے موذنوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ترکوں نے جن کا ذوق ایرانی ظروف کے نقوش سے زیادہ وابستہ تھا، پھیلے ہوئے گنبدوں کی بائزنطینی گولائی قائم رکھی جو خود تو سیاہی مائل سرو کے جھنڈ میں چھپے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کے بلند مینار فضا میں اُبھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ترک گویا غیر شعوری طور پر بائزنطیم کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کا وارث بن گیا اور اس نے نہ ان رنگین پتھروں کے سلسلہ کو دیکھا جو نور صبح کے ساتھ جگمگا اُٹھتے اور ظلمت شب کے ساتھ ماند پڑجاتے ہیں۔ نہ ان کی نظر ان طلائی گنبدوں پر پڑی جن کی سطح پر رات ہونے تک آتش شفق کے شعلے کھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن ترکوں کو چھوڑ کر تمام مسلم ماہرین فن تعمیر مصر سے لیکر ہسپانیہ تک سربلند غرفوں اور لمبوترے گنبدوں کی طرف فطرتاً مائل رہے اور جو اظہار ہنرمندی کے لئے گنبدوں کی تقسیم وسطی حصص مساجد کی ترتیب اور متھیاروں کی وضع قطع بھی بدلدیتے تھے چنانچہ انھیں کبھی گول بناتے تھے کبھی چوکور کبھی ہشت پہلو کبھی صاف اور کبھی ابردار بناتے تھے۔ مصری مساجد البتہ روح صحرا کی طرح ہمیشہ سادہ اور صاف رہیں لیکن مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کی مساجد میں سیاہ و سفید پتھروں کے بنے ہوئے محراب دار چھتے رائج ہوئے اور گول ستونوں کی بلندی بھی دگنی ہوگئی گویا وہ کھجور کے درخت تھے جن کی چوٹیوں سے ان کے لمبے لمبے پتے نکلتے ہیں۔ قرطبہ کی عالیشان مسجد جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی جب مسلمان اپنے دین پر سختی کے ساتھ قائم تھے، قریب قریب ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کوئی گنجان جنگل۔ اس کے سایوں میں بیٹھ کر جو خاموش روشندانوں کی مسلسل قطاروں کے باعث اور بھی زیادہ تاریک ہوگئے ہیں انسان کو خیال گزرتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہیبت ناک دنیا میں پہونچ گیا ہے جس کا ادراک محال ہے۔

(۲)

مغرب اقصیٰ کے ماہرین فن تعمیر اپنے محرابدار چھتوں کی وضع قطع میں کافی تفریق پیدا کردیتے تھے ۔ ایک ایوان سے دوسرے ایوان کا منظر، ایک حجرہ سے دوسرے حجرہ کی صورت شکل، مسجدوں کی تعمیر، قصور شاہی کا نقشہ باہمدگر مختلف ہوا کرتا تھا۔ اُندلس کے محلات الحمرا، ایسی تعمیریں ہیں جہاں انسان کو سرخ، سنہرے، سیاہ، زمردیں یا فیروزی ایوان بھی نظر آتے ہیں اور ستونوں پر قایم ہونے والے عظیم الشان دالان بھی اور جہاں آراستہ باغات بھی ہیں اور شفاف مرمریں حوض بھی۔ ذیر درج چیزوں کی تصادیر سے اقتسائے مغرب کے ماہرین تعمیرات کا ذہن قطعی خالی تھا لیکن وہ یکسانیت رفع کرنے کیلئے اس امر کی سخت کوشش کرتے تھے کہ خطوط کے اختلاف سے خوبصورتی و دلکشی پیدا کی جائے چنانچہ تو سی محرابوں کے گوشے اندر کی طرف جھکنے لگے اور جھکتے جھکتے محراب کی صورت ایسی ہوگئی جیسے گھوڑے کے نعل۔ پھر محراب کو تنگ کیا گیا اور سامنے کا حصہ کم کرکے اس کے خطوط منحنی کردئے گئے۔ کناروں پر محراب در محراب بنائی گئی۔ یا شہد کی مکھی کے چھتہ کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے اور حاشیوں پر استرکاری کرکے بیل، بوٹوں سے مزین کردیا گیا۔ جب یہ کام بھی عام ہوگیا تو پچی کاری کا رواج ہوا اور پتھروں کو کھود کھود کر پھول پتیاں نصب کی گئیں۔

جب خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنانے کا کام کمال کو پہونچگیا تو اس کی دسترس سے مسجد بھی نہ بچیں اور یہاں بھی فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک نقش و نگار نظر آنے لگے۔ اور عربوں کو کافی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے بیل بوٹوں میں نئی نئی ترکیبیں اور نئی نئی باتیں پیدا کرتے۔ پر پیچ و خم گلاب کی بیلوں۔ مختلف ہندسی شکلوں، خوبصورت کتبوں اور طغروں میں انھوں نے اپنے ذوق آرائش کو صرف کردیا اور خطوط کے انحنا، اس کی عمودیت اور پیچ و خم کو اس قدر ترقی دی گئی کہ وہ مربعوں، دائروں، موٹی لکیروں، بیضوی شکلوں سے جیومیٹری کی سخت اور صحیح شکلوں تک پہونچ گئے اور وہ چیزیں جو دیوار سے علیحدہ ہوتی تھیں مثلاً منبر وغیرہ ان پر بھی جالیوں اور پر پیچ خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنائے گئے گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں اور محرابوں کو کسی نے غرفوں سے آنے والی روشنی کو تقسیم کرنے اور بعض اوقات گنبدوں اور گاؤدم میناروں کو ڈھانکنے کے لئے مشجر اور بیر کے تھان پھیلا دئے ہیں ۔ جیومیٹری کی شکلوں کے ذریعہ سے آرائش و زیبائش کا فن خود بخود کبھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مظاہر قدرت کے مطالعہ کا اور یقیناً اس نے اول اول کوئی نہایت سادہ شکل اختیار کی ہوگی، چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ گلکاری کا کام پھول پتیوں کا گلدستہ بنانے سے پیدا ہوا۔ جیسا کہ قاہرہ کی

ہے ابن طولون کی محرابوں کے اطراف میں بنے ہوئے پھول بوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جبکہ
جات کے بعد عربوں کا تخیل کسی قدر راحت پسند ہوگیا تھا اور اسے نازک ہونے کی فرصت ملگئی تھی جب چودھویں
صدی نے اپنا ضابطۂ آرائش و زیبائش وضع کیا تو اسوقت تخئیل عرب بہت بلند ہوچکی تھی۔ جب لوازم فن آرائش
و زیبائش میں کثیر الاضلاع وکثیر الزوایا اشکال کا استعمال رائج ہوا تو عرب جیومیٹری دانوں نے اس امر کی کوشش
کہ اس سے ایسے عام اُصول اخذ کئے جائیں کہ وہ ان اشکال سے عام زیبائش و تزئین کا کام لے سکیں چنانچہ
اسی وقت سے عربی فن نقاشی ایک صحیح و مستقل فن بن گیا اور اسنے اتنی ترقی کی کہ تصورات ربانی کو بھی انھیں
اشکال میں متشکل کر کے دکھا دیا۔

عربی روحانیت ریگستان میں پیدا ہوئی جہاں صرف فضائے بسیط کی حکومت ہے اور جس کا نہ کوئی آغاز
ہے نہ انتہا اس لئے انھوں نے بیل بوٹوں میں اتنی ترقی کی کیونکہ ان بیلوں کی بھی نہ کہیں ابتداء ہے نہ انتہاء اور
جن کو دیکھ کر نگاہ کا کسی ایک جگہ جا کر رک جانا محال ہے۔ یہ بیل بوٹے کیا ہیں گویا عالم ملکوت کی وہ آوازیں ہیں جنکو
پہلے اول ہم کسی اور جگہ سے پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن جب غور کرتے ہیں تو وہ اپنی ہی آواز معلوم
ہوتی ہے ۔۔۔ فن بھی خود زندگی کی طرح سے اصول ارتقار کا پابند ہے، اگر تکمیل فن کی خواہش کے بجائے
منطقی تحقیق کا ذوق رکھدیا جائے تو اس کے اندر جد وجہد فنا ہوجائے گی اور اس کا جوش و خروش سرد
ہوجائے گا اگر ریاضیات کو آرٹسٹ کے حلقۂ عمل میں داخل کیا جائے گا تو وہ ماہرین فن کے ہاتھوں میں صرف
کھلونا اوزار بن کر رہے گا جس کا مقصد فن تعمیر کی منطقی حیثیت نمایاں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر
کسی قوم کا فن تعمیر اسے سنگ تراشی یا بت تراشی سے روکتا ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بے معنی
خطوط کا غلام رہیگا اور اس کے اندر کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ عربوں نے آرٹسٹ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ ذی روح مخلوق کی تصویریں بنانے سے قطعی پرہیز
کرے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی تصویریں ہسپانیہ اور مراکش کے مساجد و قصور کی دیواروں پر نظر بھی آتی ہیں
لیکن تمام موحد قوموں کی طرح جو ریگستانوں میں بنیں قوم عرب بھی ذیحیات چیزوں کی اشکال و صور سے نفور ہونے
میں صرف اپنی جبلّت کی متابعت کرتی تھی۔ مذہب جبلّت کو صرف دور انحطاط و زوال میں دبا تا ہے لیکن جب
قوتیں عروج پر ہوتی ہیں تو جبلّت مذہب کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتی ہے۔ مصر و شام کے فنون اسلامیہ میں

وہی ریگستان کی عُریانیت، وہی ریگستان کی اُداسی اور وہی ریگستان کی شان و شوکت پائی جاتی تھی، مغرب اقصیٰ او ہسپانیہ کے ٹھنڈے حجروں کی گہرائیوں میں خلفاء آکر حکماء و فلاسفہ کی باتیں سنتے تھے اور جب ان کے فوجی رسالے فتوحات ملکی اور تاخت و تاراج کے بعد واپس آتے تھے تو یہ آکر لیموں کے درختوں کی خوشبو سے متمتع ہوا کرتے تھے اسلامی فن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جمے ہوئے خون میں سونے کی اینٹیں رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس فن نے مادی دنیا کی تمام موجودات کو حکم دیدیا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف سے امڈ کر آئے اور اس میں شامل ہو جائے۔ اور ایران میں تو یہ فن گویا ایک خیابان گل و ریاحین تھا۔ سرزمین ایران کو مشرقی سواحل بحرۂ روم کے ریتیلے میدانوں یا اندلس و مراکش کی وادیوں سے کوئی مشابہت نہیں جہاں سخت ظلمت اور آگ کے شعلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جانب غرب ان بالائی علاقوں میں جو وسطی ریگستان کے حدود پر واقع ہیں ا سطح آب سے تین ہزار میٹر بلند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار سے بہت دور اور اسی قدر ستاروں سے قریب ہیں، ہوا ایسی بلور کی سی صفائی پائی جاتی ہے نسیم جانفزا کے جھونکوں میں یہاں کے سفید مرغزار اور گلابی سبزہ زار ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ایسے بچھے نظر آتے ہیں جیسے نم آلود ریشم کے تھان۔ اور فصل بہار سے موسم خزاں تک یہاں کے کشادہ لالہ زاروں اور کھیتوں میں ہلکے سبز رنگ سے لیکر سنہرے زرد رنگ تک کا قسم کے موہوم رنگوں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں میں جہاں کبوتر اُڑتے رہتے ہیں اور بادلوں میں وہ تمام ہلکے اور نازک رنگ موجود ہوتے ہیں جو اوائل فصل بہار میں نظر آتے ہیں۔

جب کوئی ان شہروں کے قریب پہونچتا ہے تو وہاں کے بیضوی یا بلدار کمرخی گنبد اور ان کے بلند مینار سرو اور سال کے درختوں میں سے اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عجیب و غریب مناظر پیش کرتے ہیں گویا نیلے فیروزی، پیازی، سبز اور زرد رنگوں کو شبنم میں گھول کر افق کی سطح پر تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اس نظارہ کا لطف اس آرٹسٹ کو خوب معلوم ہے جس نے براہ کاروان صحرا کے نخلستانوں کی سیر کی ہے۔ شکستہ دیواریں، پھٹے ہوئے گنبد اور مینار جن پر سیاہ سفید خطوط کے نقش و نگار محو ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ جو روغن ان پر چڑھایا گیا ہے، وہی قدیم کلدانی روغن ہے جو ایران قدیم نے چین کو بتایا اور جو تاتاری ترکتازوں کے ساتھ پھر ایران میں آگیا۔ یہ البتہ ابھی تک شیشہ کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہے۔ سنہری گلکاریوں اور سفید کتبوں پر جو مختلف قسم کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں ان میں ان نبفشی، نیلے، سفید، لاکھی اور زرد رنگوں کی جھلک عجیب لطف پیدا کرتی ہے روغنی مسالہ کی تہ میں جڑے ہوئے دروازوں کی بلند چوٹیوں کے نیچے

فیروزوں، نیلم پاروں اور لاجورد کے مدہم رنگوں کی چمک کے باعث ایک متحرک خط شعاعی دکھائی دیتا ہے اندر کی جانب گنبدوں کی مدور خوشنمائی میں بیل بوٹوں کا جال بچھا کر اس میں ایسے شاخسانے نکالے گئے گویا آویزے لٹک رہے ہیں۔ بعض گنبدوں کے اندر شیشہ کی ایسی لوحیں نصب کی گئی جن سے چاروں طرف کرنیں پھوٹی پڑتی ہیں۔

قدیم زمانہ میں لوگ عجمی قالین دیواروں پر آویزاں کیا کرتے تھے جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا قلبہ رانی کرنے کے بعد سیاہی مائل زمین میں سبد ہائے گل پامال کر دئے گئے ہیں، لیکن سولھویں صدی کے آخر میں جب شاہ عباس اعظم صفوی نے اصفہان کی تعمیر کا حکم دیا تو ان قالینوں کی جگہ چمکدار روغنی اینٹوں نے لے لی۔ اُس وقت ایران میں جو طبقہ اہل فن کا پیدا ہوا اسے اُن لوگوں کی ہدایات اور مشوروں پر چلنا پڑا جنھوں نے روغنی مساجد کو تمام دولت زینت و زیبائش بخشی تھی۔ تاکہ جہانگیر اور رانی اور خصوصاً بہزاد کے موقلم کی جنبشوں سے اسلامی فن کو غیر معمولی علوئے مرتبت و رفعت حاصل ہو جائے، حرفت کوزہ گراں نے بھی جو دنیا میں سب سے قدیم اور پائدار پیشہ ہے، فن اسلامی کو اپنی طرف سے ضروری حصہ دیا۔ اس کی آراستگی جس میں ذی روح کی تصویریں زیادہ نہیں ہوتیں اپنی دلکش نوعیت کے لحاظ سے یقیناً بہت بلند ہے۔ ان ظروف پر گل و ریاحین لہلہاتے ہوتے ہیں، آسمان کی وسعتیں مع اپنے مرواریدی امواج سحاب کے نظر آتی ہیں اور سمندر کی پنہائیاں مع اپنی درخشاں سطح کے منقوش ہوتی ہیں۔ رنگین خطوط، رنگ کے چھینٹوں، پھولوں کے دستوں اور مختلف رنگوں کے اختلاط باہمی سے ایسے ایسے مناظر نقش کئے جاتے ہیں کہ تصور مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نقاشان عجم کا یہ چمنستان جس طرح اچانک وجود میں آیا تھا اسی طرح وہ بہت جلد افسردہ ہو گیا کیونکہ اس نے ضرورت سے زیادہ خوشبو اور درخشانی صرف کر دی تھی۔ یہ گویا ایک طلسمی خواب تھا جس کی مختصر سی فرصت میں ہندوستان کے تمام جذبات نفسانی، عجم کے تمام سلیقے اور تکلفات، چین کا تمام بطی السیر سائنس اور عرب کے تمام شاندار پرستانی خواب شامل ہو گئے تھے۔

عرب کے ریگستانوں سے لیکر جزائر جاپان تک اور مغرب اقصیٰ سے لیکر ہندوستان تک عجمی مصوری کے خزانوں کو لئے ہوئے ایرانی نقاشی ایک بحر عمیق کے مانند ہے جو تمام خواہشات نفسانی، جملہ کیفیات نشہ و سرور اور قدیم اقوام و ملل کی تمام آزاد و موثر خیال آرائیوں کا معجون مرکب ہے۔ وہ ایک باغ عدن تھا جہاں پھولوں بھرے مرغزاروں میں شیر پھرتے تھے۔ جہاں سبز سرخ اور نیلگوں ریشمی پوشاکوں میں مرد و عورت

کے نقوش قالینوں پر نظر آتے تھے۔ عجمیوں کے لئے توجسقدر بھی پھول ہوں اتنے ہی کم ہیں۔ تمام پتوں میں پھول ہیں۔ تمام قالینوں میں پھول ہیں۔ جہاں دیکھو وہاں پھول ہی پھول ہیں۔ بڑے بڑے پھول جن کے نقوش ان کاسہ ہائے چینی میں بھی موجود ہیں جن میں خواتین عجم طلائی چمچوں سے قندو گل کھایا کرتے تھے۔ میدانی مناظر کی تصاویر میں جہاں سُرخ، سبز اور سنہرے رنگ ایسی قدرتی ہم آہنگی پیدا کردیتے ہیں کہ فرشس تصویر پر نرم فرش مخملیں کا گمان ہوتا ہے شوخ و طناز خوبصورت راہوار گردنیں خم کئے سرپٹ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرکب پر ایک صاحب فخر و ناز راکب سوار ہے۔ کلائی پر ایک باز ہے اور ایک درخشاں طرۂ دستار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ محلات و قصور کے جلوخانے فرط گل ور یاحین سے مشجر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی روغنی ابردار دیواروں پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتیں بلوریں ہیں فرش رنگین قالینوں کا ہے، جہاں طلائی طاؤس اپنی زمردیں دُمیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ باغات ہیں جن میں جگہ جگہ سنگ سماق اور سنگ یشب کے گملے نصب ہیں۔ آب شفاف کے فوارے ہیں جو فضا میں موتی اُچھال رہے۔ درجہ بدرجہ پشتے ہیں، خیابانیں ہیں۔ اور برج ہیں جن کے رنگ گلابی، آسمانی یا دودھیا ہیں۔ شب کی تاریک گہرائیوں میں بھی یہ ایسے چمکتے ہیں جیسے طلوع آفتاب کے وقت برف۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائفۂ ارباب نشاط کنار آب بیٹھا ہوا نغمہ و سرود میں مصروف ہے، پختہ پھلوں کی فرحت بخش خوشبوئیں دماغ میں بسی ہیں جو درختوں میں پتوں کے اندر چھپے ہوئے چمکتے ہیں اور نکلتا ہوا چاند تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ستاروں کے ہار سے کوئی سچا موتی ٹوٹ کر گرا ہے......

یہ تمام دلفریب مناظر موئے قلم سے کھینچے گئے ہیں اور ان میں چمکدار رنگ بھرے گئے ہیں۔ ان میں تاریک رات کی معصومیت اور دن کی روشنی موجود ہے۔ یہاں الف لیلہ کے تمام وہ قصے موجود ہیں جو داستان گویان باستانی کے خواب و خیال میں آئے تھے۔ اور جنھیں وہ شام سے صبح تک خیمہ کے نیچے حلقہ جما کر بیٹھے ہوئے خوشمزاج مسافروں کو سنایا کرتے تھے۔

یہاں عجیب و غریب قومیں ہیں جو بحیثیت مجموعی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بعض وہ ہیں جو پشمینہ کی سفید عباؤں اور چغوں کے نیچے سرخ و سبز ریشم کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور جو اپنے گھوڑوں کے ساز کو زر و جواہر سے مزین کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ بناتے ہیں اور ان میں جواہرات جڑتے ہیں۔ وہ ابردار اور منقش ظروف مسی میں اپنا ثانی رکھتے ہیں۔ ان کو صرف خاموشی و سکوت میں غور و خوض کرنا آتا ہے اور جو کبھی ہنسنے پر آتے ہیں تو قہقہوں سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ اور جو کبھی کھانے پینے کا دور آتا ہے تو نوشا نوش میں

اپنی فطری متانت و سنجیدگی کو بھی بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔ ان کو نہ موت کی پرواہ ہے نہ زندگی کی فکر۔ ان کے استغراق و تصور کی بہشت میں حوریں آباد ہیں۔ ان کے شدید جوش مذہبی کا سوائے ان کی سخت کاہلی اور جمود کے اور کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وقت ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے معابد کو اسی لاپروائی سے منہدم ہو جانے دیتے ہیں جسقدر جوش وخروش سے انھوں نے ان کو تعمیر کیا تھا۔

موسم کی شدتوں، فطرتوں کے زبردست تضاد اور بدویانہ زندگی نے ان کو توازن روحی سے جس کو ہم اس قدر عزیز رکھتے ہیں بے پرواہ کر دیا ہے۔ دولتمند آدمی سو سو عورتیں رکھ سکتا ہے مفلس و نادار کے پاس پیالہ ایک بھی نہ ہو۔ اس طرح گویا نفسیاتی تجرید اور بدترین بہیمیت کے مابین ایک زبردست فصل ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغربی قومیں اس خلا کو اس طرح پُر کر لیتی ہیں کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو طے کر جاتی ہیں جنھیں ہیمانہ زندگی سے آگے بڑھ کر شجاعانہ زندگی کی منزل تک پہونچنا لازم ہے۔ ان مغربی اقوام میں ہمکو وہ مشرقی قومیں بھی شمار کر لینا چاہئے جو بلحاظ نسل اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے یورپین قومیں متعلق ہیں۔

بیشک یہی وجہ ہے کہ ایرانیوں نے جن کے ذہن غالبًا اسقدر وسیع نہیں تھے جتنے سامی النسل قوموں کے اپنے تاریخی کارناموں سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ارض النہرین کے قدیم تمدنوں کا کچھ نہ کچھ اثر مستقبل میں پیدا کرتے رہے۔ اور غالبًا یہی وجہ تھی کہ ساسانی اور اسلامی ایران کے درمیان فنون عجم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک روحانی مذہب بغیر بت پرستی کے ہی کام چلا سکتا ہے اور بجائے بتوں کو ترقی دینے کے معصوم روح کو ترقی دینا بہتر ہے مگر بت شکن شہنشاہوں کی حمایت میں جو یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر تصاویر کا تعلق مذہب سے نہیں تھا تو فنون لطیفہ کا تو تھا اور وہ ان کو ترقی دیا کرتے تھے۔ بہت کمزور ہے۔ کیونکہ فن کو فن کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے اور اس کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہو ایسا ہے جیسے تمام سرچشموں کا پانی دفعتًا خشک کر دیا جائے۔

اگر بت پرستی بائزنطیم کو نہیں بچا سکی تو اس کا باعث یہ تھا کہ بائزنطیم شجر یونان کا ایک سڑا ہوا پھل تھا مگر وہ بت پرستی ہی تھی جس نے مصر و یونان اور ہندوستان کو بنا دیا، جس نے قوم قوط کے انقلاب سیاسی کی بنجریں کھول دیں۔ اطالیہ اور فلینڈرس میں دور بیداری پیدا کر دیا اور جو یورپ میں تمام گزشتہ صدی کے قابل تعریف اور اہم دور تحقیق و تدقیق کو وجود میں لائی۔ تمام پائدار تمدن بت پرستی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہ مطالبہ ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ انسان ہمیشہ ریگستان میں رہا کرے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ریگستان کے لوگ گلستانوں

نغمۂ دل

(گزشتہ سے پیوستہ)

لیکن ایک ایک شعر ارباب ذوق کو تڑپا دیتا ہے، اس اعجاز و اثر کا حقیقی راز صرف انداز بیان کی جدت ولطافت ہے، غرض شاعرانہ حیثیت سے انداز بیان اور طرز ادا کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسکو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جناب دل کے کلام میں یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے، جس کا اندازہ ایک بڑی حد تک ان اشعار سے بھی ہوتا ہے، جو ان کے محاسن معنوی کے سلسلۂ تنقید میں اوپر نقل ہوئے ہیں، اس موقع پر چند خاص مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک اسیر قفس کی زندگی جس مجبوری اور بیچارگی کے عالم میں گزرتی ہے، اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

افسوس اک اسیر قفس کی تمام عمر وقفِ نظر شناسی صیاد ہو گئی

"نظر شناسی صیاد" کی ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو جسقدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے، اس کو ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔

ناکامانِ زندگی جس طرح بہار کامرانی کی خیالی نقش آرائیوں سے اپنے افسردہ قلوب کو تسکین دیتے رہتے ہیں، اس کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

محبوب کے دامن جھٹکنے کا انداز کوئی غیر معمولی خیال نہیں، لیکن جناب دل کا پیرایۂ بیان قابل داد ہے۔

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

جناب دلؔ اکثر تشریح کی بجائے اشاروں سے کام لیتے ہیں جن سے طرز ادا میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ ان کا خاص انداز معلوم ہوتا ہے مثلاً

بیخودِ عشق ہیں دل مائل فریاد نہیں
ہم پہ گزرا تو بہت کچھ ہے مگر یاد نہیں

دیکھو "بہت کچھ" کے اشارے نے اور پھر اس پر "یاد نہیں" کے ٹکڑے نے جو دلکشی اور اثر پیدا کر دیا ہے وہ تشریح کی صورت میں ناممکن تھا۔

کہنے کی ہے کیا حاجت احوال شبِ فرقت
گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

"تم نے بھی سنا ہوگا" کے ٹکڑے نے ایک معمولی سی بات میں غور کرو، جان ڈالدی ہے، کہا کچھ بھی نہیں لیکن دراصل سب کچھ کہہ گئے۔

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں
ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

بجائے "کیا شے" کے اگر صاف کہدیتے تو شعر کی تمام بلاغت برباد ہو جاتی، ابتدائے محبت کی غیر متعین کیفیت "ہائے کیا شے" نے جس خوبی کے ساتھ ادا کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

اگرچہ جناب دلؔ کے اندازِ بیان میں کوئی غیر معمولی جدت اور ندرت موجود نہیں ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طرز ادا میں ایک خاص روانی و برجستگی اور صفائی و دلآویزی عام طور پر محسوس ہوتی ہے، اس کا ایک خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو زبان اختیار کی ہے وہ غزل کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، یعنی صاف، شیریں، سادہ اور تصنع و تکلف سے پاک ہے اگرچہ فارسیت سے بھی ذوق آشنا معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس رمز سے واقف تھے کہ غزل کی لطافت ثقیل اور نامانوس فارسی ترکیبوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، چنانچہ بجز ہلکی اور شیریں ترکیبوں کے ان کا کلام اس ثقالت سے پاک و صاف ہے، لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ حتی الوسع شاعرانہ رنگینی کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، اس کا اندازہ کافی طور پر اشعار مذکورۂ بالا سے ہر صاحب ذوق بآسانی کر سکتا ہے، مزید مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

غزل گو شعرا میں اکثر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، اور یہ اُردو غزل گوئی کا ایک بڑا نقص ہے کہ باہم اشعار میں کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا، اگرچہ واقعہ نگاری اور تسلسلِ خیال کیلئے اور اصنافِ سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ موجود ہیں تاہم غزل میں بھی تسلسلِ خیال سے کام لیا جائے تو

بہتر ہے، جنابِ دل کے کلام میں اکثر عشق و محبت کی مختلف کیفیات کی مسلسل مصوری کی مثالیں نظر آتی ہیں، جن سے ان کی قوتِ نظم کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ابتدائے عشق کی ایک کیفیت مسلسل غزل میں بیان کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:۔

یاد ہے اے ہمنشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے

ایک دوسری غزل میں جس کا مطلع یہ ہے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

محبوب کی یاد کی تصویر کھینچی ہے

اس سلسلہ میں وہ غزل جس میں جناب دل نے اپنا نذرانہ خلوص و عقیدت پیکِ یار کی معرفت بھیجا ہے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے، جس سے ان کے جوشِ محبت اور گرمی نیاز کا اندازہ ہوتا ہے اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

شکیب و ضبط بھی اے پیکِ یار لیتا جا پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا

افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم ان غزلوں کو مکمل نقل نہیں کر سکتے، ناظرین خود ملاحظہ فرمالیں۔

اس مجموعہ کے آخر میں چند رباعیات اور مخمس ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دل صرف غزلگو نہیں ہیں، بلکہ اور اصنافِ سخن پر بھی قادر ہیں، اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہایت روانی اور صفائی کے ساتھ مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں، چونکہ ان میں کوئی نمایاں خصوصیت نظر نہیں آتی، اور طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، اور جناب دل سے رخصت ہوتے ہوئے اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ باوجود ان کے شاعرانہ فضل و کمال کے باوجود ان کی متانت اور سنجیدگی کے باوجود ان کی اخلاقی بلندی اور پاکیزہ خیالی کے ان کی لکھنویت اب تک میری نگاہوں میں کھٹکتی ہے، جو ان کے عارضِ کمال کا ایک بدنما داغ ہے۔

مرزا احسان احمد (بی اے، ال ال بی)

مکتوبات نیاز

استدراک جناب دل شاہجہانپوری

نغمۂ دل پر جناب نے اپنا قابل قدر وقت صرف کر کے جس فاضلانہ انداز سے ایک بسیط مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" کو پیش نظر رکھکر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو حقیقتاً کسی بحث پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف باہمی تبادلۂ خیال کی حیثیت رکھتا ہے

جناب نے مقدمہ میں حضرت نیاز کے مقدمہ کی بابت تحریر فرمایا ہو کہ "ضرورت سے زیادہ طویل ہے"۔ میرے خیال میں جناب کا مدعا یہ ہے کہ مقدمہ میں صرف شاعر کے کلام یا اس کے حالات سے بحث کرنا چاہئے۔ اور شاعری پر گفتگو کرنا غیر ضروری طوالت ہے اگر واقعی مفہوم یہی ہے تو اکثر دواوین کے مقدمات نہ صرف طویل بلکہ لاطایل سمجھے جائیں گے اور اس حقیقت سے آپ ہی کو زیادہ واقف ہونا چاہئے۔ پھر جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ غزلیات کی ترتیب قدیم طرز پر ردیف وار رکھی گئی ہے اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہو کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا یعنی ابتدا میں کلام کیسا تھا رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں یا تبدیلیاں ہوئیں، میرے محترم دوست، میں نے اس امتیاز کے لئے حرف قؔ اور جؔ لکھنا کافی سمجھا اس صورت میں اہل نظر کے لئے قدیم اور جدید کلام سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ کلام کے ردیف وار ہونے میں یہ زحمت پیش آتی ہے کہ اگر کسی غزل کے دیکھنے کی ضرورت ہو تو کل دیوان کی ورق گردانی ضروری ہو جاتی ہے۔ جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر ضخیم دواوین کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو زیادہ مفید اور بہتر ہو۔ شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا بلکہ کیا کہا اور کیسا کہا"۔ جناب کے خیال سے اس قدر اتفاق مجھ کو ضرور ہے کہ پست اور عامیانہ اشعار ضرور خارج کر دئے جانے چاہئیں لیکن شدت کے ساتھ انتخاب مصنف کی قدرت سے باہر ہے ہر شعر مصنف کی عرق ریزی کا نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی

نظر میں اکثر کو بہتر سمجھتا ہے ایسی حالت میں یہ کام اس کے بس کا نہیں اگر کسی دوسرے نقاد کو یہ خدمت سپرد کی جائے تو وہ انتخاب اسی نقاد کے مذاق کا مجموعہ ہو جائے گا ہر سخن سنج کی پسند جدا ہے۔ دور گزشتہ کا ذکر ہے ایک مشاعرہ میں کسی شاعر کے کلام پر جناب غالب ایک شعر کو تین مرتبہ پڑھوا کر داد سخن دیتے ہیں جس کیم مومن خاں خاموش ہیں اسی غزل میں جب شاعر دوسرا شعر پڑھتا ہے جناب غالب خاموش ہو جاتے ہیں اور مومن خاں اس شعر کو کئی مرتبہ پڑھوا کر داد دیتے ہیں، میرے دیوان پر معارف میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی، تاج آگرہ میں جناب سیماب اکبر آبادی اور حمایت اسلام لاہور میں حضرت ریاض خیرآبادی جب اظہار خیال فرماتے ہوئے منتخب اشعار پیش کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے انتخاب سے مختلف ہوتے ہیں۔ شوق سندیلوی نے اپنی سولہ غزلوں پر ستائیس مشاہیر سے اصلاح لی بعد ازاں اس کو اصلاح سخن کے نام سے چھپوا دیا آپ نے بھی اسے ملاحظہ فرمایا ہوگا، پھر کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ ایک استاد شعر کو قلم زد کر دیتا ہے اور دوسرا اسی شعر پر دو صاد بناتا ہے۔ یہ ہے اختلاف مذاق دنیاء شاعری کا اور یقیناً یہ سخت غلطی ہے کہ دیوان کسی ایک شخص کی رائے پر انتخاب کے بعد طبع کرایا جائے۔ بعض حضرات ایسے ہیں جن کے دل پر سرور انگیز تخیل اثر کرتی ہے، بعض یاس آفریں مضمون کو پسند کرتے ہیں کسی کے لئے نغمہ باعث دلکشی ہے اور کوئی نالہ و زاری پسند کرتا ہے، کہیں رنگ تصوف ہے اور کہیں فلسفہ۔ اگر دیوان صرف یاس آفریں خیالات کا مجموعہ بنا دیا جائے تو شگفتہ طبائع کی نظروں میں وہ کلام مرثیہ ہو جائے گا اور اگر نشاط انگیز کلام انتخاب کیا جائے تو صاحب درد کی نظروں میں۔ بے کیف ہوگا۔ آگے بڑھ کر جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے جناب دل نے آنکھیں کھولیں تو ملک میں امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا زانوئے تلمذ تہ کیا تو انھیں کے سامنے تہ کیا لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی تھی اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے۔ تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے" نیاز صاحب نے ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے "غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کہیں ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ نہ ملے" تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھی اس آرام جان تمنا کا ذکر نہ آئے مجھکو جناب دل کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعویٰ کا مقصد کیا ہے کیا اسکا یہ منشا ہے کہ جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں جو

مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعراء کے سرمایہ خیال ہیں۔ مثلاً شمع تربت۔ چراغ مزار بت سفاک گریہ و زاری۔ ناز و ادا۔ کوچۂ قاتل۔ گور غریباں وغیرہ ان کی جھلک جناب دل کے کلام میں بھی نظر آتی ہو اور یہ اثر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے" اس کے بعد آپ چند شعر نقل فرماتے ہیں اور اسکے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں دو شعر اور ملاحظہ ہوں"

ہوا سکی گھٹا چھائی چمن میں پھر بہار آئی — تمنا ہے کہ وہ گل پیرہن پہلو نشیں ہوتا
یہ بھیگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیف بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانیکا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہیں کیا پہلے شعر میں آرام جان تمنا کا ذکر نہیں، دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی اگر وصل نہیں تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے" یہ صحیح ہے کہ میری شاعری نے ایک لکھنوی اُستاد کے آغوش میں تربیت پائی تاہم مجھ کو تغزل میں عریانی اور رنگ ناسخ پسند نہیں آیا ممکن ہے کہ جناب کو وہ رنگ محسوس ہوتا ہو جس کو آپ لکھنوی کہتے ہیں اس امر کا آپ کو خود اعتراف ہے کہ یہ رنگ قدیم غزلوں میں نمایاں ہے۔ منت پذیر ہوں کہ جناب نے مخلصانہ پیرایہ میں مجھ کو آگاہ کیا مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ مذکورہ کے استعمال کو لکھنویت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے جبکہ شعراء دہلی کے کلام میں بھی بکثرت یہ الفاظ منظوم نظر آتے ہیں بہ نظر اختصار چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اصغر۔ وہ مست ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے — لحد کا پھول چراغ سر مزار نہ ہو
غالب۔ خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا
اصغر۔ محو ادا و ناز ہے یوں ہمہ تن نیاز ہے — پوچھ صنم پرست سے کیفیت نماز عشق
ذوق۔ تھا کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ — کھودا جو کنواں گنج شہیداں نکل آیا
" یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج — چشم و نگاہ عشوۂ و ناز و ادا صلاح
" میں جو شہید ہوں لب خندان یار کا — کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا
" جن کی نظر پڑ ہا ترا رخسار آتشیں — اُن کا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا
" ابکی دل لوں تو پھر اُس بت قاتل کو نہ دوں — جان دوں دل مال دوں ایمان دوں پر دل کو نہ دوں
" نہیں آتا نہ آئے رحم اے ذوق اس ستمگر کو — بلا سے خوش تو ہوتا ہے وہ میری آہ و زاری سے

میرے اشعار مرقومۂ بالا کی بابت اگر جناب یہ تحریر فرماتے کہ سطحی اور پامال ہیں تو ایک حد تک صحیح تھا لیکن شمع تربت چراغ مزار اور کوچۂ قاتل کو بالکل لکھنوی چیز سمجھنا درست نہیں۔ فصحاء دہلی کے یہاں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہر لفظ کا استعمال اپنے محل پر متین اور بے محل استعمال ہونے پر خلاف مذاق ہوجاتا ہے، میری رائے میں مجرد مستی اور رقص کا لفظ اُردو تغزل میں پسندیدہ نہیں لفظ مستی لغت میں ہوشیاری کے مقابل اور دوسرے مذموم معنی کا حامل ہے اسی طرح رقص کا لفظ اکثر محل پر مطربۂ عشوہ گر کی تصویر پیش کردیتا ہے جب وجد کا متین لفظ موجود ہے تو رقص کا لفظ بے محل کیوں استعمال کیا جائے یہ میرا خیال ہے اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے استعمال کو پسند فرماتے ہیں تو ان کی رائے ہے لفظ وصل کے استعمال سے مجھ کو انکار نہیں بشرطیکہ جماع کے مفہوم پر نظم نہو۔ معذور رہوں کہ دنیائے شاعری میں مجھ کو صراحتًہ اس مبارک لفظ کے استعمال کا موقع نہیں ملا، میں وصل سے ناآشنا ہوں، ہمیشہ مجبور رہا ہر شاعر کو اپنی بیتی کہنا چاہئے مجھ کو انبساطی مضمون نظم کرنے کا کم موقع ملا اکثر فریاد عاشقانہ جو مرثیہ کی حد تک نہ پہونچے میرا انداز ہے میرے محبوب کی بارگاہ میں رقیب کا بھی گزر نہیں گلۂ رقیب سے بھی ناآشنا ہوں میرے دو شعر نقل فرماکر جناب نے اظہار خیال فرمایا ہے، کہ اگر وصل نہیں تو کس کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ جناب نیاز نے اپنے مقدمہ میں لفظ وصل پر اظہار خیال فرمایا ہے مفہوم وصل کی بابت کوئی تذکرہ نہیں کیا صفحہ پانچ میں جناب نے تحریر فرمایا ہے "لیکن باوجود اسکے ہمکو جناب دل کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے" یہ صحیح ہے کہ میرے کلام میں سرور انگیز مضامین کم ہیں لیکن مجبور رہوں کہ میں نے فضاء شاعری میں اکثر نالہ کشی کی کبھی انبساط کا موقع ملا تو حالت وجد طاری ہوئی، رقص سے ناآشنا ہوں اسی طرح خمخانۂ محبت میں بدمستی سے بھی بے خبر ہوں، اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ جناب نے عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت سرود و رقص جوش و مستی کیوں قرار دی ہے عشق کی تعریف ملاحظہ ہو:۔ "عشق۔ بسیار دوست داشتن چیزے۔ نزد بعض اطبار مرضیت از قسم جنوں کہ از دیدن صورت حسین پیدا میشود و عبدالرزاق شارح ظہوری از شرح اسباب و فتوحات الحکم نقل کردہ است کہ عشق ماخوذ است از عشقہ و آن نباتے ست کہ آنرا سیلاب گویند چوں بر درختے پیچد آن را خشک کند۔ ہمیں حالت عشق است بر ہر دے۔ کہ طاری شود جسم را زرد کند"۔ یہ تعریف رقص و سرور کے منافی ہے، اہل لغت کی تعریف سے قطع نظر کیجئے، کامیاب عاشق ضرور رقص و سرود کا

شید انظر آئے گا اور رہجو رپیکر غم۔ تغزل صحیح کو جس حد تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ تخیل شاعر مضامین مجاز میں عُریاں نظر نہ آئے، محاکات تصوف اور وہ فلسفہ جس کو تغزل برداشت کرے نظم کرنا چاہئے۔

جس رنگ کو جناب نے لکھنوی خیال فرمایا ہے اس کی جانچ کے لئے آیئے دیکھیں تو سبھی شعراء دہلی کے کے یہاں بھی مثالیں ملتی ہیں یا نہیں سب سے پہلے خواجہ میر درد کے دیوان پر نظر پڑتی ہے جن کا مذاق شاعری متانت سے لبریز اور ابتذال سے پاک سمجھا جاتا ہے فرماتے ہیں:۔

کبود چرخ دیکھا تو سواری کے نہیں قابل
مہ نو سے ہے پیدا عیب اسکی بدرکابی کا

دل اُس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی
اسے بے خبر ہرا ہے یہ فرقہ سپاہ کا

جوں چاہئے اس طرح بیاں ہم سے نہو گا
کر اپنے دہن ہی سے تو وصف اپنی کمر کا

میرے بھی طرف تو کبھی آجا مرے یوسف
بڑھیا کی طرح میں بھی خریدار ہوں تیرا

کرے کیا فائدہ ناچیز کو تقلید اچھوں کی
کہ ہم جانے سے کچھ اور لاتو گوہر ہو نہیں سکتا

دیکھ کر حال پریشاں عاشقان زار کا
بانکے معشوقوں نے رسم زلف اب دی ہی اُٹھا

وہ مو کمر کہیں یہ ہوا ہے حجاب رات
تھا مثل زلف دل کو عجب پیچ تاب رات

گر کھنچے کھنچے چلتے جان اپنی تیغ کھوئے
کوئی زندہ دل کرے ہے اس مردہ شو بیعت

تا رنگہ یہ دل یاں دونوں طرف سے دوڑے
دو ونٹ مقابل آئیں جس طرح ریسماں پر

اگرچہ دختر رز کے ہے محتسب درپے
جو ہو سو ہو پر اسے ابتو یار کہتے ہیں

اگر مجھسے ملئے کبھو عیب کیا ہے
نہ بد وضع تو ہے نہ بدکار میں ہوں

اے رگ ابر یہ مژگاں بھی اگر ٹک برسیں
ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں

اگر میں نکتہ رسی سے ترا دہاں پاؤں
کمر کو پیا ہوں تو اسکے تئیں کہاں پاؤں

دور ہوں آمادہ میخوارگی یہ مے پرست
سر اگر کاٹے انھوں کا محتسب مثل کدو

واشد کبھی تو درد کے بھی ساتھ چاہئے
بندِ قبا سے کھولئے اسے گلبدن گرہ

گر مسیحا نفسی ہے یہی مطرب تو خیر
جی ہی جاتے ہیں چلے تیری ہر اک تان کے ساتھ

جیتا کسی کو چھوڑے نہ یہ گانٹھ زہر کی
زلف سیہ وہ سانپ ہے جسکا ہے من گرہ

کلبک آتش کیا کرے یوں تھکتے
چیونٹیوں کے گھر سدا ماتم رہے

شبخون کے لئے فلک پھرے ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں سے
بدنام کرے ہے دختر رز مئے اس کو نکال اپنے یاں سے
مشتاق اگر ترا کچھ لکھتے تو کیا عجب ہے ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے
کچھ اور رنج و غم کے سوا سوجھتا نہیں آتا ہے جبکہ یاد وہ کنج دہاں مجھے
کیوں تیغ تری دشمنی رکھتی ہو میرے ساتھ مجھ کو تو نہیں کام کسی کی بھی کمر سے
کیا جانئے کس کس کے تئیں آہ ڈسیں گی زلفوں نے تو بیطرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے
یا تو وہ راتیں تھیں یا اب یہ دنوں کا پھیر ہے ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں دبوایا گئے
وہ دختر رز کہ پھلتی پھرے اک جہان کو سنتے ہیں در و پاس بھی اک رات رکھی
تو چونکتا عبث ہے کسی بات کے لئے میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لئے
دنیا وہ فاحشہ ہے کسی سے نہیں بچی دیکھا جسے تو اُس کے یہ مردار ساتھ ہے
نہیں ہے بے سبب یہ خندۂ دنداں نما ترا کسی کے تو لہو پینے پہ یعنی دانت رکھتا ہے
زبس درد جدائی نے ترے بند بند کو مارا ہے اگر آزار بھی ہوتا ہے تو درد مفاصل ہے

اب فرمائیے یہ وہی مذاق ہے یا نہیں جس کو آپ لکھنوی مذاق کہتے ہیں اچھا اب جناب ذوقؔ دہلوی کے کلام پر بھی نظر ڈالی جائے جن کے دیوان کا بیشتر حصہ اسی مذاق میں ہے۔ مثالاً چند شعر پیش کئے جاتے ہیں

اس نزاکت پر نظر آتا کہ وہ رشک پری بال بھی باندھے جو مسی پر تو زلف حور کا
دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری بیشتر ہوتا ہے واں پیدا شجر کافور کا
دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہ پارہ کے میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہوگیا
دیکھنا اے ذوقؔ ہونگے آج واں لاکھوں کے خون پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا
ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل پریشاں تھا عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا یہاں باندھا
اس لعل لب کے بوسے لئے ہمنے اسقدر سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد
طفل اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑ کر پھر نہ اُٹھا کوچۂ چاک گریباں چھوڑ کر
صید دل کو کیونکر چھوڑے جبکہ دکھلائے ہو تو مچھلیاں دست حنائی میں مری جاں چھوڑ کر
سرخئی پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے اُٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر

تیرے دنداں سی زیب کی دیکھی جو بہار
اوس سی پڑ گئی گلشن میں گلِ سوسن پر

یہ جتنے سرو ہیں سب اسکے قد پر زہر کھاتے ہیں
چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک

تاب دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر
کوئی کھا جائے نہ ہیرے کی کنی خوب نہیں

کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق
زلف واں شانے پہ لٹکی درد یاں شانے میں

دنبالہ سے سرمہ کے دھواں ہیں تری آنکھیں
کہ بیٹھیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں

خال سرمہ کا تمھیں چاہیئے زیبائش کو
اخترِ سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

تم مسی ملکر نہ غرفہ سے نکالا منھ کرو
اور نہیں گر مانتے۔ تو جاؤ کالا مُنھ کرو

جب دیکھے اسکو تھام کے دل بیٹھ جائے ذوق
جب ناز سے کھڑا ہو وہ رکھ کر کمر پہ ہاتھ

جوں پنجِ شاخہ تو نہ چلا اُنگلیاں طبیب
رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ

کھائے داغِ آتشیں رخسار سے
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے

اسنے مارا رُخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہیئے بہرِ کفن چادرِ مہتاب مجھے

کشتہ ہوں میں کس چشمِ سیہ مست کا یا رب
ٹپکے ہے جو مستی مری تربت کے شجر سے

نہیں مژگاں کی دو صفیں گویا
اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے

لیتے ہیں شبِ وصل میں ہم اُن کے جو بوسے
وہ لب پہ سحر رنگ مسی کو نہیں پاتے

چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چناں او چنیں ہے

آتشِ خورشید سے دیکھا نہیں اُٹھتے دھواں
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے

نعل شکلِ مہ نو جب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے

بعدِ مُردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا

تو آنکھ میں نہ سرمۂ دنبالہ دار دے
مفتونِ چشم کو یہیں اک بار مار دے

چھلا نہیں تو چھلے کا گل اے نگار دے
کچھ تو نشانی اپنی مجھے یادگار دے

ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر تجھ کو ٹال کے کیسا

کرتی ہے زیر برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

پہونچا تھا شب کمند لگا کر وہاں رقیب
سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

جناب غالب جن کا دیوان فلسفۂ عشق اور جذبات سے لبریز ہے اور دھول دھپا تک پہونچکر خود ہی پیش دستی کرنے لگے ہیں، فرماتے ہیں:-

پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مرزا داغ دہلوی کا کلام اکثر عریاں ہے بہ نظر اختصار صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک — مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

دور حاضر کے مشاہیر دہلی صرف زبان کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں بکثرت نمونہ کلام اس رنگ میں ہے جسکو جناب "لکھنوی" کہتے ہیں بہ نظر طوالت قطع نظر کرتا ہوں اب ہمارے مکرم جناب اصغر گونڈوی کے کلام پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے اپنے منتخب دیوان میں فرماتے ہیں،

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر — ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ چاہیے

اس رخ رنگیں سے آنکھیں سینکیئے — ڈھونڈئے اب آتش ایمن کہاں

زاہد سادہ لوح کو وہم تھا اشتباہ تھا — مصحف رُخ سے حل ہوا مسئلۂ جواز عشق

جلوۂ رنگیں اُتر آیا نگاہ شوق میں، — ہم لطافت جسم کی اے نیمتن دیکھا کئے

نقش قدم رہیں اسی جان بہار کے — اک نگھڑی پڑی ہے لحد پر گلاب کی

سب مزے کر دئے خورشید قیامت نے خراب — میری آنکھوں میں تو بادہ ردئے دلآرام ابھی

ہستیٔ غیب سے گہوارۂ فطرت ...... — خواب میں طفلک عالم ہے سراسر مدہوش

اے دل شوخ و حیلہ جو زیر کمین رنگ و بو — طائر قدس کو بھی دے دامگہ مجاز میں

جہاں بھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم — ارے بڑا غضب اے چشم سحر کار کیا

موج نسیم صبح کے قربان جائیے — آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے

الغرض محض الفاظ نہ لکھنوی ہوتے ہیں نہ دہلوی، بلکہ ان کا محل استعمال لکھنوی وغیر لکھنوی شاعر کی خصوصیت کو ظاہر کر سکتا ہے بشرط آنکہ پہلے یہ امر باور و تسلیم کر لیا جائے کہ لکھنؤ میں کوئی جذباتی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا اور دہلی میں سوائے حقیقی عشق کرنے والوں کے کسی اور نے شاعری کی ہی نہیں ورنہ یوں تو جس طرح ابتدا سے امیر و میرزا کا کلام خالی نہیں بالکل اسی طرح ناسخ و پیروان ناسخ کے یہاں بھی صحیح عاشقانہ جذبات مل سکتے ہیں۔

حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہانپوری

موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے

افسوس ہے، کہ خوش اعتقاد لوگ، موجودہ زمانہ کی "ترقیٔ موہوم" سے مرعوب ہو کر، انسان کی موجودہ ترقی کا صحیح اندازہ لگانے سے بالکل قاصر ہیں۔ علم تمدن کا ماہر، نہایت آسانی سے قطعی طور پر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مسئلۂ ارتقاء (Evolution) کو نظر انداز کر بھی دیا جائے، تو صرف بہتر غذا، اچھا ماحول، اور عمدہ تعلیم و تربیت کی بنا پر، انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ سدھاری جا سکتی ہے۔ وہ اپنی مدلل گفتگو سے تمھیں اس بات کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ "افراط و تفریط" "سرمایہ داری" اور "مزدوری" کے جھگڑوں کی وجہ صرف ایک ناقص اقتصادی اُصول ہے۔ وہ تم سے یہ بھی منوا چھوڑے گا کہ انسان باوجود "قصوروار" ہونے کے موجودہ زمانہ کی "منظم بے ترتیبی" (Ordered Disorder) سے اسی درجہ بری الذمہ ہے جس قدر ایک پتنگا (جو غیر ارادی طور سے شمع پر جل مرتا ہو) الزام خودکشی سے وہ، بطور مشاہدہ، بین طریقہ سے تمھیں دکھا دے گا کہ ایک بازی گر کی توانائی اور چستی اور ایک مفلوج شخص کی خمیدہ پیٹھ میں جو فرق ہے وہ مشروط ہے، نہ کہ فطری۔ اس کے علاوہ، علم معاشرت کا ماہر یہ بھی ثابت کر دکھائے گا کہ انسان کی مذموم ترین خصلت اور ناپسندیدہ ترین حرکت "طبعزاد" یا "جبلّی" نہیں، بلکہ وہ نتائج ہیں اُن "مدافعانہ حملوں" کے جو ہماری "خود ساختہ سماجی پابندیاں" ہمارے فطری اوصاف پر کرتی رہتی ہیں۔

وہ شخص جو "انقلاب پسند" ہو، یا وہ شخص جو کھلے میدان میں لڑنے سے احتراز کرتا ہو، یا وہ شخص جو، خواہ مخواہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے پر تُلا ہوا ہو، یا وہ شخص جو گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہو اور ہمیشہ نباتات ہی پر گزر کرتا ہو، — ڈاکٹر ہو یا وکیل، پادری ہو یا اُصولِ اخلاقیات کا معلم، ورزش میں طاق ہو، یا سپاہی ہو، شکاری ہو، یا موجد، سیاست داں ہو یا... کوئی بھی ہو — سب کے سب ایک آدھ نسخہ انسان کی ترقی و بہبودی کے لئے پیش کرتے ہیں، اور تقریبًا ان لوگوں کی ہر مجوزہ اصلاح، دائرۂ امکان کے اندر ہی

ہوتی ہے۔ اور ایک نہ ایک بُرائی کی بیخ کنی ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہے .... لیکن ان لوگوں کے نظریہ کے مطابق "ترقی" کا معیار، ہر مجوزہ اصلاح کا عملی طور پر پورا ہو جانا، اور ہر فرد بشر کا "دماغی" اور "جسمانی" ترقی کے اُس بلند ترین کنگرہ پر پہونچ جانا ہے، جس پر بہت ہی تھوڑے لوگ اب تک بدقت تمام پہونچ سکے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُنھیں، ایک مصلح کے "تگ و دو" کے لئے ایک وسیع اور لق و دق میدان نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے لئے بہت سی عظیم الشان منازل مقصود ہیں، جن کی دشوار گزار گھاٹیوں کے عبور کرنے کا شوق ہر اولوالعزم شخص کے دل میں موجزن ہے۔ اور اسی لئے انسان کے واسطے ترقی کا ہر دروازہ کھُلا ہوا ہے! ــــ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ انسانی نسل کا کوئی فرد بھی بام ترقی کے اُن سر بفلک چوٹیوں (جن کی جانب وہ روز ازل سے للچائی نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے) کے گرد پا کو بھی نہ پا سکا!

تاہم، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "اگر" ہم سب کے سب کمر ہمت باندھ کر اول الذکر مصلح کے بتائے ہوئے راستہ کو شروع سے آخر تک طے کریں، تو یقیناً دُنیا ترقی کے میدان میں بہت دور نکل جائے!... لیکن نہ تو یہ "اگر" امید افزا معلوم ہوتا ہے، .... نہ وہ "اگر" کہ "اگر آسمان گر پڑے تو چڑیاں پکڑلوں!" سچ تو یہ ہے کہ انسان اُس بتائے ہوئے دشوار گزار راستہ پر کبھی گامزن نہوگا، اس کی ہمت اور قوت ارادی، اس کام کے لئے ناکافی ہے، اور وہ صحیح معنی میں ان مقاصد کے پورے ہونے کا سچے دل سے متمنی بھی نہیں ہے کیونکہ ہماری تمنائیں اکثر و بیشتر "سطحی خواہش" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ "کیا تو بہتر انسان بننا چاہتا ہے؟" تو وہ نہایت دیانتداری سے جواب میں "ہاں" کہیگا۔ یا تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ "تم ایک لاکھ روپیہ لوگے؟" تو وہ بھی بصد آرزو "ہاں" کہیگا۔ لیکن وہ دیانت دار انسان، جو ایک "بہتر انسان" بننا چاہتا ہے، اپنے سابق طرز عمل کی لکیر پیٹتا ہی اب تک نظر آتا ہے! اور وہ آوارہ گرد جو ایک لاکھ روپیہ کی تمنا رکھتا ہے، دس شلنگ بھی کمانے کی زحمت گوارا کرنا پسند نہیں کرتا! یہی وجہ ہے کہ بیشمار لوگ، جو تمام عمر لاکھوں روپیہ کی وراثت کے ملجانے کی اُمید پر زندگی کی گھڑیاں گنتے رہے، جب مرے تو اس طرح کہ کبھی پانچ پاؤنڈ بھی بہ یک وقت ان کے پاس جمع نہو سکا۔ اس سے انکار نہیں کہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اکثر فقیر، پھٹے پُرانے اور بوسیدہ گودڑیوں میں دم توڑتے ہیں، لیکن ان کی جھولیاں اشرفیوں سے پُر ہوتی ہیں، .... جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُن کی خواہش روپیہ کے جمع کرنے کی اسقدر زبردست ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب رہتے ہیں۔

علم اقتصادیات کا ماہر جانتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی مانگ نہ ہو، اس کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اور یہ مقولہ، سیاست، اخلاقیات اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے صادق آتا ہے۔ کسی چیز کا فراہم ہوجانا "طلب صادق" پر منحصر ہے۔ اس لئے محض تمناؤں کے ہجوم اور زبانی جمع خرچ سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کسی قوم یا فرقہ نے ابتک تربیت گاہ تمدن کی ابتدائی تعلیم اور تشکیل سے باہر قدم نہیں نکالا ہے ...... اور اس معمولی سی ترقی کے مدارج بھی، کسی "جذبۂ رفاہ عام"، کے ماتحت نہیں، بلکہ تعصبانہ ضد، اور وحشت بربریت کے ذریعہ سے طے ہوئے ہیں۔ انگلستان کے ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل کو دیکھو..... کیا یہ اس امر کی تشریح نہیں کرتا کہ "تعلیمیافتہ جماعت"، ایک ایسے سیاسی اصلاح کے نافذ کئے جانے پر جس کی ضرورت بین اور ناگزیر ہو، آپس میں لڑمریں اور یہ مسودۂ قانون اس وقت تک "قانون" بنکر نافذ نہ کیا جا سکا، جب تک برمنگھم کے "شرفاء" نے سینٹ جیمس کے مذہبی حلقہ کے "شرفاء" کا، فوجی ساز و باز کے ساتھ گلا گھونٹنے کا انتظام نہ کرلیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا نفاذ ابتک نہ ہوا ہوتا اگر اس کے "مفاد" کے منطقی بحث و مباحثہ کے علاوہ، "طاقت" اور "زور" سے کام نہ لیا گیا ہوتا ..... ملکہ الیزبتھ کی طرح ہوش گوش رکھنے والا خود مختار اور مطلق العنان حکمراں کالج کے اُن سن رسیدہ طلباء کی جماعت کثیر کی بہ نسبت (جو ۱۸۸۴ء کے قبل تک اپنے "قدیمی استحقاق" کی بنا پر حکومت کرتے چلے آتے تھے، اور جو ۱۸۸۴ء کے بعد سے، جب "حق رائے زنی" ہر بالغ شخص کو عطا ہوا کبھی بہتر طریقہ سے حکومت کرتا۔

موجودہ زمانہ میں اُن فلسفیوں کی جگہ، جو ہر فعل کی اصلیت اور خوبی وہ اس کے افادی نقطۂ نظر سے جانچتے تھے، فیبین سوسائٹی (Fabian Society) نے لے لی ہے۔ اس سوسائٹی کے شائستہ، باضابطہ اور سکون پسند طریق عمل کے قابل قبول ہوجانے کا واحد ذریعہ بس یہی ہے کہ ہر فرد بشر اس کے اصول پر ٹھنڈے دل سے غور کرے، سمجھے اور بے چون و چرا قبول کرلے۔ لیکن آج (Fabian) کا نام اُنھیں مقامات میں جہاں آج سے تئیس برس پہلے لفظ (Socialist) "قاتل" اور "فتنہ پرور" کے مرادف سمجھا جاتا تھا، کیوں اسقدر عزت سے لیا جاتا ہے؟ اس لئے نہیں کہ دُنیا کی سرمایہ دار حکومتوں کو اس سوسائٹی کے "حسن تدبیر" پر غور و خوض کرنے کا اور عمل پیرا ہونیکا ذرہ برابر بھی خیال ہو..... بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنے "طریق عمل" سے تشدد، تہدید اور استبداد کے عناصر کو نکال کر، مفلس اور قلاش عوام الناس کی "انقلاب پسند جماعت" کی صدائے احتجاج کا صرف قلع قمع ہی نہیں کردیا بلکہ موجودہ نظام حکومت، اور طرز تمدن کو اس واحد خطرے سے، جس سے وہ حقیقتاً خائف تھے۔ بالکل بےفکر بنادیا!

بلاشبہ اگر اقوام عالم، آج بھی (Fabians) کے طریق عمل پر کار بند ہو جائیں، تو اس کی پابندی اُتنی ہی سختی کے ساتھ برتی جائے گی، جس طرح، موجودہ زمانہ میں قوانین ملکیت کی۔ اور (Fabians) کا "اُصول" عمل قانون" کی حیثیت اختیار کر لیگا اور اس کے مخالفین یا تو جُرمانہ دینے پر مجبور کئے جائیں گے، یا کھڑے کھڑے فروخت کر دئے جائیں گے، یا بالآخر انھیں ۔ جس طرح موجودہ قوانین کی عدول حکمی پر سزا ملتی ہے،۔۔۔ پھانسی دیدی جائے گی۔

لیکن سرِ دست، سرمایہ دار طبقہ (Fabians) کے ان "اُصول" کو "قوانین" کی اہمیت حاصل کرتے ہوئے نہ دیکھ کر،...... ان سے خایف نہیں ہے۔ لیکن، برخلاف اس کے یہ طبقہ غارتگروں اور قاتلوں کی خفیہ سازشوں سے ڈرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ طبقہ حتی الامکان، اس حقیقت کو طشت ازبام ہونے نہیں دیتا کہ بالآخر اُن ذرایع میں جو یہ (یعنی سرمایہ دار طبقہ) "حقوق ملکیت" (Proprietary rights) کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے، اور اُن ذرایع میں جو ایک "بم انداز" (Bomb Thrower) اپنے ذاتی خیال کے مطابق انسان کے فطری اور پیدایشی حقوق کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے۔۔۔ جہاں تک اخلاقی فرائض کا سوال درپیش ہے ۔ کچھ بھی فرق نہیں۔

سرمایہ دار حکومت، (Fabian Society) کی پیٹھ "شاباش" کہکر ٹھونکتی ہے۔ برخلاف اس کے مساوات عامہ کا علمبردار (Socialist) ۔۔۔ جو کھلے الفاظ میں یہ کہدیتا ہے کہ مساوات عامہ کے حاصل کرنے کے لئے وہ انقلاب چاہئے جس میں "انقلاب پسند" جماعت مخالف جماعت کو جو "ڈرانے، دھمکانے اور مارنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی" "گمراہ کن" تصور کیا جاتا ہے۔ اور اُس کو قید سخت اور محنت شاقہ کی سزا شاید اس غرض سے دی جاتی ہے کہ سرمایہ دار حکومتوں کی "عدم تشدد انہ لن ترانیوں" کے پول کھل جائیں! اور ان قیدیوں کو معلوم ہو جائے کہ سرمایہ دار حکومتیں یوں لاکھ عدم تشدد کا سبق اپنی زبان سے رٹا کریں، اور دوسروں کو حفظ کروانے کی کوشش کیا کریں، لیکن جب کبھی ان کے نام و نمود کو ایک ہلکی سی ٹھیس بھی لگ جانے یا لگ جانے کا اندیشہ ہو، تو یہ (یعنی سرمایہ دار حکومتیں) فوراً "عدم تشدد" کے ازبر سبق کو دفتر پارینہ کا کرم خوردہ باب سمجھ کر صاف بھول جاتی ہیں اور پھر "تشدد" و "استبداد" کے حربوں سے کام لینے لگتی ہیں۔

تو کیا ہم "صلح جو" اور "سکون پسند" ذرائع کے توسل سے نسل انسانی کی ترقی کا خیال اُٹھا دیں؟ اور "بم اندازی" اور "خفیہ سازشوں" پر اُتر آئیں؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ یہ دونوں طریقے بیکار ہیں۔

لیکن، غالباً بم انداز کا یہ کہنا حق بجانب ہوگا "کیا تم نے ابھی ابھی اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ کوئی چیز بغیر لاٹھی کے زور کے نہیں حاصل ہوتی؟ کیا Gladstone کو یہ تسلیم نہ کرنا پڑا تھا کہ (Irish Church) کی مخالفت توپ سے سر کی گئی نہ کہ غیر متعصبانہ جذبات (Humanitarian) کے اثر سے؟

ہم کو ان سوالات کا جواب بیوقوفی اور بزدلے پن سے "نفی" میں نہیں دینا چاہئے ...... حقیقتاً "بم انداز" کے قول کا مجھے اعتراف ہے .... بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کسی مساوات عامہ کے سب سے زبردست حامی کے پاس کچھ اپنی ذاتی جائداد ہو تو اُس کا طرز عمل بھی قدیم زمینداروں سے ـــــ ہرگز جداگانہ نہ ہوگا۔

غور سے دیکھا جائے تو پارلیمنٹ میں، "مخالفین کی صف بندی" کو "جنگ" پر صرف اسی قدر امتیاز حاصل ہے، جتنا ایک ایسی فوج کو (جو بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈالدے) Waterloo اور Trafalgar پر! ـــــــــــ میں ان مندرجہ بالا "اعترافات حقیقت" کا ہدیہ

(۱) ان (Fenians) کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھوں نے سادہ لوح آئرلینڈ کے باشندوں سے ـــــ جو اُن کے مظالم سے تنگ آکر امریکہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے ـــــ اس غرض سے روپیہ وصول کیا کہ اُنھیں کے پس ماندہ رشتہ داروں پر و نیز ان کے سیاسی و مذہبی عقائد پر آئرلینڈ پہونچ کر حملہ کیا جائے۔

(۲) و نیز اُن خفیہ پولیس حضرات کی خدمت میں جو سیدھے سادھے کم عمر مزدوروں کو بہکا کر، پاس ہی کے کسی لوہار کی دوکان سے "بم" لانے کو کہتے ہیں، اور بعدۂ وہ اُنھیں گرفتار کر کے سزائے دائم الحبس دلواتے ہیں۔

(۳) و نیز اُن برّی، اور بحری سپہ سالاران فوج کی خدمت میں جو دشمنوں کے شرایط اور پیام صلح کو ٹھکرا کر ایک آخری "ناقابلِ قبول شرط التوائے جنگ" (Ultimatum) پیش کر کے گولہ اور بارود کے منہہ برسانے لگتے ہیں۔

لیکن کیا فائدہ کہ انسان بجائے "نرمی" اور "انسانیت" کے "سختی" اور بجائے "غور و خوض" کے "جلد بازی" اور "ناعاقبت اندیشی" سے کام لے؟ کیا آج انگلینڈ آئرلینڈ کے قلعوں کے مسمار کر دئے جانے سے بہتر حالت میں ہے؟ یا کیا اس خیال کی ذرا سی بھی گنجایش ہے کہ ایک ایسی قوم کو، جو بھیڑ بکریوں کی طرح

مظالم برداشت نہ کرے اور بعدہٗ چند ایسے مستقل مزاج مصلحین کی سرکردگی میں اُن تینوں اول الذکر اشخاص کے سروں کو قلم کردے اس انقلاب سے کچھ بھی فائدہ ہوا ہوگا۔

فرض کرو کہ (Gun powder plot) کامیاب ہوتا اور (Fawkes) کا خاندان ہمیشہ کیلئے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو جاتا تو کیا اس ردو بدل سے انگلستان کی موجودہ قومی یا انفرادی حالت میں ذرہ برابر بھی فرق ہوتا؟ ......نہیں۔

فرانس میں "مجرموں" کے سر کاٹنے کی مشینوں (Guillotine) کا استعمال انسانی تحمل اور برداشت کی حد سے زیادہ کیا گیا۔ اس لئے اگر (Marie antoinette Fonquier) کی طرح اپنے قاتلوں سے یہ پوچھتی کہ "کیا میرا سر قلم کرنے سے تمھیں روٹیاں سستے داموں ملیں گی؟" تو اسکا یہ سوال ہرگز بے محل نہ ہوتا..... فرانس کو اس خونریزی سے کیا ملا؟ ...... امریکہ ہی کی طرف دیکھو! یہ مانا کہ وہاں نہ تو (Star Chamber) ہے، اور نہ ایسے جاگیردار ہیں جنھیں جاگیریں بشرط خدمات جنگ دی گئی ہوں۔ مگر امریکہ میں لکھ پتی اور کروڑ پتی ہیں جن کے کارخانجات برقی تار اور مسلح نوکروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ کیا امریکہ کی "جنگ آزادی" کے اُن نتائج کو جو آج ظہور میں آرہے ہیں اگر (Washington) اور (Franklin) قبل سے جانتے ہوتے تو کیا وہ اس کی حمایت کرتے؟ ہرگز نہیں۔

جو کام کرامول، قیصر اور نپولین اپنے زبردست شاہی اقتدار اور رعب داب کے باوجود نہ کرسکے وہ چند جوشیلے اور تلون مزاج جرائم پیشہ ہرگز نہیں کرسکتے۔

ایک گمراہ، اور بد باطن یہودی بھی —— جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے ابتک لوگوں کو بغاوت پر خفیہ طور سے اُبھارتا رہا ہو —— یہ تسلیم کرنے میں شاید پس وپیش نہ کرے گا کہ کتا اپنی قے کی ہوئی غذا کو دوبارہ کھانے پر فطرتاً مجبور رہتے، اور اسی طرح سور بھی فطرتاً مجبور رہے کہ دھلنے کے بعد وہ کیچڑ میں لوٹے ..... بعینہ اسی طرح ہم لوگوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک انسان کی فطرت نہ بدل دیجائے، وہ، باوجود "اصلاحات" اور "انقلابات" کے "اصنام" ہی کا پرستار اور حرص و ہوا ہی کا بندہ بنا رہیگا

انسان کی ابتدائی ترقی جس نے موجودہ زمانہ میں ایک ایسی تہذیب اور طرز معاشرت قائم کر رکھی ہے جن کا دار و مدار محض تجارتی مفاد کے اُصول پر ہے! لفظ "ترقی" کے صحیح مفہوم کی صرف تسمیہ ہے ....لیکن انسان کی "حقیقی ترقی" کا دور بھی آکر رہیگا.... اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ابھی سے ہم لوگوں کو

"پیغام فنا" کی بھی دھمکی دے رہا ہے ؎ — موجودہ "ترقی موہوم" کے تعمیری عناصر، مثلاً "جنگ" اور "مقابلہ" "حقیقی ترقی" کے دور میں بجائے سودمند ثابت ہونے کے، انسان کے لئے اسی قدر تخریبی اور مہلک ثابت ہوں گے جس طرح وہ اوصاف جو شیر کو۔ جب تک وہ جنگل میں رہتا ہے ــــ "جنگل کا بادشاہ" کہے جانے کے قابل بناتے ہیں، اور جب وہ آبادی کی طرف رُخ کرتا ہے، تو اُنھیں اوصاف کی وجہ سے وہ بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے!

اس طویل بحث کے بعد اب ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی (Social life) کا انحصار "بلند مقاصد" اور "عقل سلیم" پر ہے۔ "جنگ" اور مقابلہ گرچہ ترقی کے "دور اولین" میں بہترین افراد کو منتخب کرنے کے لئے نہایت کار آمد ذرائع ثابت ہوئے.... تاہم "مزید ترقی" کے دور میں یہ بہت ہی تباہ کن اسباب تنزل بن جائیں گے، دور کیوں جاؤ اُن اقسام کے حیوانات اور نباتات ہی کو دیکھو جو صدیوں کے انتخابات کے نتائج ہیں، دفعتاً جب سلسلۂ انتخاب متروک ہو جاتا ہے، تو وہ "وحشی" اور "خودرو" ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح جب "جنگ" "مقابلہ" اور "حرص و ہوا" کی گرم بازاریاں زوروں پر ہوں گی، تو ان کا اصلی مطلب (یعنی قوم و ملت کے بہترین افراد کو منتخب کرنا) فوت ہو جائے گا، اور وہ موجودہ نظام مملکت اور طرز تمدن کے ضامن ہونے کے بجائے، تخریبی پہلو اختیار کر لیں گے، اور ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکائیں گے اور موجودہ تہذیب ــــ جو تجارتی مفاد کے اُصول پر قائم ہے؛ (Commercial Civilization) اور موجودہ طرز تمدن اس سرعت سے "مائل بہ تنزل" ہوں گے کہ دیکھنے والا یہ دیکھ کر کہ صدیوں کی ترقیاں چشم زدن میں پیوندِ خاک ہو گئیں، انگشت بدنداں رہ جائیگا!

ایسے ایسے اتفاقات من گڑھت قصے نہیں ہیں،...... بلکہ اوراق تاریخ بھی شاہد ہیں کہ قبل اسکے کہ عوام الناس، ترقی کے اُن مدارج پر پہونچ سکیں، جو اعلیٰ ترین اور ارفع ترین انسان کے لئے مخصوص ہیں، انحطاط نے اُنھیں آدبایا ہے۔

اس لئے ہم لوگوں کو یہ خیال خام اپنے سروں سے بالکل نکال ہی دینا چاہئے کہ انسان کی موجودہ نسل کامل "ترقی" کی صلاحیت رکھتی ہے:

ہمیں وہم و گمان ہوتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ہم کو کسی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اسکا انسداد کر دیتے ہیں۔ اور اسی لئے ہم ترقی...... کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں.... حالانکہ ہم یہ بھول جاتے ہیں

کہ بہت سی بُرائیاں جن کی ہم گرفت کر سکتے ہیں، وہ زمانۂ دراز کے خفیہ گر مسلسل اختلاط کے نتائج ہیں، جواب "امراض کہنہ" کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں!... ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کی ناقص اصلاحیں "کہنہ امراض" کو اچھا نہیں کر سکتیں... اور رونا تو اس کا ہے کہ زندگی کے جن جن شعبوں میں ہم مائل بہ تنزل ہیں وہاں ہمارے عمدہ اور قابل صد تحسین عادات و اطوار، حرکات و سکنات خود ہماری نظروں میں بُرے معلوم ہونے لگتے ہیں اور برخلاف اس کے بُری باتیں بھلی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم "ترقی" کے دھوکے میں اچھی چیزوں کے عوض بُری چیزوں کو اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم لوگوں کی سیاسی تباہی ہمارے بڑے ہی پرجوش مصلحین قوم ہی کے ہاتھوں ہونے کو ہے۔

(ماخوذ از برنارڈ شا)		محمد عثمان۔ ام۔ اے۔ بی۔ ال۔ وکیل ہزاری باغ

تراب شاہ

(۱)

جمیل اور میں ساتھ ساتھ منصفی کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن تقدیر کی ستم ظریفی سے جمیل ایل ایل۔ بی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کے باوجود منصفی کے امتحان میں فیل ہو گیا اور میں قانون سے طبعًا متنفر ہونے کے باوجود کانپور کا منصف بنا دیا گیا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ مجھ نوگرفتار بلا نے شروع کے دو تین سال کس طرح کاٹے۔ کالج کی آزاد فضا میں سرکاری ملازمت عبارت تھی تعیش و حکمرانی سے لیکن عالم تخئیل سے دنیائے حقیقت میں آنے کے بعد معلوم ہو گیا کہ یہاں حاکم رہکر محکوم اور مسرور رہکر مغموم بننا پڑتا ہے۔ کوئی تجویز لکھی اور دل میں کھٹکے لگ گئے کہ کہیں ملزم اپیل نہ کر دے جو حکامانِ بالا کے بے پناہ اعتراضات سے دوچار ہونا پڑے۔ معائنہ کا دن آیا اور جان سن سے نکل گئی۔ پیشکار کو ہدایتیں کی جا رہی ہیں کہ دیکھئے صاحب مسلیں بے ترتیب نہ رہنے پائیں میز کی چادر پر روشنائی کا دھبہ نہ پڑے۔ خلاصہ یہ ہے کہ علیگڈھ یونیورسٹی کے ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود کانپور کے قیام میں آزادانہ زندگی بسر نہ کر سکا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ جن حضرات سے ملنے کو دل چاہتا تھا ان سے ملنا آئینِ حکمرانی کے خلاف تھا اور جن سے ملنا ضروری تھا وہ ملنے کے قابل نہیں تھے۔ شروع شروع میں شوکت۔ انوار وغیرہ سے پینگ بڑھائے دو دو بجے رات تک برج بھی ہوا پک نک پارٹی بھی ہوئی جشن کئے لیکن ادہر تو عوام الناس میں یہ مشہور ہو گیا کہ منصف صاحب بالکل صاحبزادے ہیں "ہو حق" کے علاوہ کچھ نہیں آتا ادہر حکامان بالا نے تنبیہ کی غرض مجبور ہو کر یہ رنگ بدلنا پڑا متین و سنجیدہ بنے تو سابقہ ایسے حضرات سے ہوا جن کا مطمح نظر وجاہت دنیوی حاصل کرنا تھا۔ آج کیا ہے خاں صاحب طلعت زماں تشریف لا رہے ہیں۔ وجہ تشریف آوری پوچھئے تو ایک نیازمندانہ

انداز سے سر جھکا کر ارشاد فرمائیں گے "جی کچھ نہیں یونہی سلام کرنے حاضر ہوگیا" حالانکہ اس "جی کچھ نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ خانصاحب خان بہادری کے خطاب کی دھن میں ہیں اور اسی لئے ہر حاکم کی (خواہ وہ منصف ہی کیوں نہو) دربار داری کی جاتی ہے۔ ان سے فرصت ملی تو لالہ ہری چند داس آنریری منصف نے کرم فرمایا۔ جناب اس لئے تشریف لاتے ہیں کہ ان کی آنریری منصفی میں رخنہ اندازی نہونے پائے اور جناب کا تمام تر وقت یہ ثابت کرنے میں گزرتا ہے کہ خود بدولت ہندو مسلم تعصبات سے بہت بالاتر ہیں بلکہ کچھ فطری رجحان دینِ اسلام کی طرف ہے حالانکہ ان کے رقیب محمد زماں خاں براہین قاطعہ سے ان کا مسلم کش ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں فاروق احمد خاں دیکھنے میں سیدھے سادھے مگر ان کے کاٹے کا منتر نہیں خدا جانے کتنے حکام کو بدنام کرکے کانپور سے نکلوا چکے ہیں۔ ان کا کام ہے حکام کا آلۂ تفریح بن جانا۔ شعر اچھا خاصہ موزوں پڑھ سکتے ہیں مگر جب پڑھیں گے توڑ مروڑ کر تاکہ لوگوں کو بیساختہ ہنسی آجائے انگریزی انٹرنس تک پڑھے ہیں لیکن اورجنیل ناول کو اورنجیل ناول پڑھ کر ایک معصومانہ انداز سے اورنجیل کے معنے بھی پوچھیں گے تاکہ ان کے بھولے ہونے میں کسی کو شک نہ رہے۔ کبھی کسی مقدمے میں سفارش نہیں کریں گے مگر کچہری میں آپ کے بچے کی دوا لیکر یا کوئی مضحکہ انگیز عذر پیش فرماکر اپنی صورت ضرور دکھا جائیں گے اور اپنے ادنےٰ تبسم سے بے تکلفی کا ثبوت دیکر فریقین سے یا کم از کم مدعاعلیہ سے کچھ نہ کچھ وصول فرمالیں گے۔ خود انصاف کیجئے کہ اس قسم کے لوگوں سے میری کیا دلچسپی ہوسکتی تھی اور اپنی جگہ پر اندازہ فرمائیے کہ اس بے کیفی زندگی میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں جمیل صاحب کا کانپور آنا میرے لئے کس حد تک طرب انگیز ثابت ہوا ہوگا؟

(۲)

جمیل آئے تو پورا ایک دن بقول نظیری "سخن گزشتہ" اور "گلہ ہائے دراز" کی نذر ہوگیا۔ اب تک کانپور نہ آنے کی شکایت ہوئی سال میں دو تین دفعہ آنے کے وعدے ہوئے۔ وکالت اور منصفی کے عیوب شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ بیان کئے گئے اور آخرکار باتوں کا ذخیرہ ختم ہوجانے کے بعد انداز استغنا کے ساتھ آرام کرسیوں پر دراز ہوگئے۔ دونوں کو احساس تھا کہ آج باتیں بہت کافی کی جاچکی ہیں مگر کبھی کبھی میں بحیثیت میزبان اور جمیل بحیثیت مہمان یہ خیال کرکے کہ یہ خاموشی فریقین پر بار نہو طرح طرح کے لایعنی سوالات کرکے اس طلسم سکوت کو توڑتے رہتے تھے۔ جمیل کے ساتھ تنہا رہنے کی خواہش کے

باوجود دل چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص آجائے اور "جمیل تمھارے یہاں کھانا کون پکاتا ہے،" "عباس تم نے یہ میز کتنے میں خریدی" کے بجائے کوئی دلچسپ گفتگو شروع ہوسکے اور ایسی حالت میں فاروق صاحب کا آنا بسا غنیمت معلوم ہوا۔ فاروق صاحب نے معمولی تعارف کے بعد جمیل صاحب کے کانپور تشریف لانے پر یہ مصرع پڑھ کر اظہار ابتہاج فرمایا اور حسب معمول اس مصرع کو مصرع نہ رہنے دیا۔ ع وہ آئیں گھر میں ہمارے یہ خدا کی قدرت ہے اس مصرع نے یاد بخیر حامد حسین کی یاد تازہ کردی اور میں نے ذرا مسکرا کر جمیل سے کہا "ہمارے خانصاحب بھی دوسرے حامد ہیں۔ موزوں شعر پڑھنا تو گویا قسم ہے" فاروق صاحب اپنے ہم مشرب کا ذکر سنکر فرمانے لگے "عباس صاحب یہ حامد کون بزرگوار ہیں؟" میرے جواب دینے سے قبل جمیل صاحب نے اپنی بپتا شروع کردی "حضرت کیا عرض کروں کہ حامد کتنی خوبیوں کا شخص تھا بس یہ سمجھئے کہ لاجواب تھا۔ نثار بے مثل دبے نظیر تھا آئینہ مسلم یونیورسٹی میں بھانت بھانت کے جانوروں پر پھبتیاں وہی چست کرتا تھا ہاں شعر و شاعری سے طبیعت کو لگاؤ نہ تھا لے دیکے ڈاکٹر اقبال کی کبھی اسے حقیقت منتظر والی غزل یاد تھی لیکن اسے بھی جب پڑھا غیر موزوں مگر صاحب کیا آدمی تھا واللہ صحیح معنوں میں دوست کہے جانے کا مستحق۔ فرسٹ ایر سے ہملوگوں کا ساتھ ہوا اور آخر تک اس طرح نباہی کہ باید و شاید۔ کیوں عباس تراب شاہ والے معاملے میں اس کا ساتھ دینا یاد ہے؟" تراب شاہ کا نام آنا تھا کہ میں اپنی ساری متانت و سنجیدگی بھول کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ میں نے ہنسی کو روکنے کی ناکام سعی کرکے کہا "تراب شاہ نام قوم مسلم" جمیل صاحب نے اضافہ فرمایا "ولدیت نامعلوم عمر تخمیناً ۴۰ سال" اور اس تشریح کے بعد ہم لوگوں نے مصنوعی متانت و سنجیدگی سے باری باری حسب ذیل حلیہ بیان کرنا شروع کیا "دوہرا بدن گندمی رنگ" "خونیں آنکھیں ڈاڑھی چڑھی ہوئی" "ماتھے پر تلوار کا نشان داہنے رخسار پر ایک بڑا سا مسہ" "زیادہ تر گیروے لباس میں رہتا ہے مگر کبھی کبھی انگریزی کپڑے بھی پہن لیتا ہے" فاروق نے ذرا تنگ ہوکر دریافت کیا "جمیل صاحب کیا تراب شاہ کوئی خدا رسیدہ فقیر تھے" جی فقیر و قیر تو کچھ نہیں تھے ہاں ایک نامی گرامی ڈاکو ضرور تھے۔ آپ نے کبھی فرخ آباد کے مشہور ڈاکو داراب شاہ کا نام سُنا ہے؟ بس یہ تراب شاہ انھیں کا بھتیجہ مشہور تھا لیکن صاحب اس کے کارنامے داراب کے کارناموں سے کہیں زیادہ وقیع ہیں" "اجی کہیں زیادہ!" میں نے پر وثوق لہجہ میں کہا "یہ سمجھئے کہ علیگڈھ یونیورسٹی کا بچہ بچہ اس سے کانپتا تھا۔ مضبوط سے مضبوط قفل کمروں میں ڈالے جاتے تھے مگر پھر بھی آئے دن یہ فریادیں سننے میں آتی تھیں کہ تراب شاہ کمرے کا قفل توڑ کر روپیہ پیسہ سوٹ بوٹ کھانے پینے کا سامان

نکال لے گیا اور لطف یہ ہے کہ ۔۔۔ "تراب شاہ کا وجود ہی نہ تھا"، جمیل نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر" فاروق صاحب بولے "جب اس کا وجود ہی نہیں تھا تو اس نے یہ چوریاں کیونکر کیں اور اس کا حلیہ آپ حضرات کو کیوں حفظ ہے؟ مگر صاحب اس کا وجود تھا ضرور اگرچہ وہ وجود تخئیلی ہی کیوں نہ ہو اور حق تو یہ ہے کہ وجود تخئیلی ازدیاد شہرت کا سبب ہوتا ہے۔ سری کرشن کو دیکھئے نا۔ اگر ان کو محض پیغام اعظم تسلیم کر لیا جاتا تو وہ عوام الناس کے دلوں کو اتنا مسخر نہیں کر سکتے تھے جتنا ان کی خیالی تصویر نے کرشن بھگوان بن کر کیا۔ حضرت غوث الاعظم کی شخصیت بحیثیت مصنف غنیۃ الطالبین یا بحیثیت ایک صوفی صافی کے اتنی جاذب نہیں ہے جتنی قطب ربانی محبوب سبحانی محی اموات خواجہ کائنات کے اضافہ سے ہو جاتی ہے۔ پھر کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیالی کرشن بھگوان، یا فرضی 'محبوب سبحانی' نے کارہائے نمایاں انجام نہیں دئے؟ کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ان "جلیل القدر ہستیوں" نے لاکھوں عقیدتمندوں کی بیماری کو مبدل بہ صحت نا امیدی کو مبدل بہ اُمید کر دیا؟ جب یہ باتیں قابل تسلیم ہیں تو پھر تراب شاہ کی تخئیلی ہستی سے انکار کیوں کیجئے اور اس کے کارناموں پر ایمان لانے سے کیوں ابا کیجئے؟ فاروق صاحب نے انداز معصومانہ سے سوال کیا، عباس صاحب آپ کی فلسفیانہ تقریر تو ہمارے سمجھ میں آئی نہیں اب یہ فرمایئے کہ کیا واقعی تراب شاہ ایک فرضی نام تھا اور آخر یہ نام رکھا کس نے؟" "مجھسے سنئے" جمیل نے مسکرا کر کہا "عباس اور میں ایک دن بغیر اجازت لئے ہوئے قریب شام مچھلی کا شکار کھیلنے گئے۔ ہوا تیز تھی کوئی مچھلی لگی نہیں ہم نے سوچا لاؤ نہا ہی ڈالیں۔ بنسیاں اور کپڑے کنارے پر رکھدئے اور جھم سے نہر میں کود پڑے۔ پیراک ہم دونوں اچھے تھے میر مچھلی کے شاگردان خاص میں شمار ہوتا تھا دور تک پیرتے ہوئے چلے گئے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی صاحب کپڑے اور بنسیاں غائب کر لے گئے ہیں۔ پہلے تو یہ سمجھ کر کسی بے تکلف دوست نے کرم فرمایا ہے دو چار آوازیں مرتضےٰ خاں وغیرہ کو دیں پھر لاکھوں قسمیں خدا اور رسول کی دیں اظہار ناراضگی کیا اس قسم کے تکلیف دہ مذاق کرنے والے پر تبرا بازی ہوئی شدید انتقام کی دھمکیاں دی گئیں مگر جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو چار و ناچار کنارے پر آکر بیٹھ گئے۔ عباس اس زمانے میں شرلاک ہومز کے افسانے بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے انھوں نے یہ ترکیب بتائی کہ رات کے دس بجے تک یہیں بیٹھے رہو اس کے بعد یونیورسٹی چلو کوئی پوچھے تو کہدینا کہ عینک کا فریم بدلوانے شہر گئے تھے وہاں سے قلعہ کی طرف ہوتے ہوئے واپس آرہے تھے راستے میں ایک لمبے تڑنگے بدمعاش نے کپڑے وپڑے سب اتروا لئے خیر صاحب کوئی گیارہ بجے کے قریب باب الرحمۃ پہونچے۔ سپاہی نے پہلے تو یہ ہئیت کذائی دیکھکر اندر

آنے سے روکا لیکن جب نام دریافت کیا اور ہماری فرضی داستان سنی تو ہمیں لئے ہوئے پرو وائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں چلا گیا۔ ہم نے یہاں بھی اپنی بپتا دہرادی۔ پہلے تو پرو وائس چانسلر صاحب کو کچھ یقین نہیں آیا فرمانے لگے آپ کو پولیس میں بیان دینا ہوگا لیکن اگر آپ سارا حال مجھسے بیان کردیں تو میں اس معاملہ کو ختم کردوں گا لیکن جب ہم دونوں نے بیان دینا بھی منظور کرلیا تو وہ کچھ نرم پڑ گئے دو بڑے تولئے منگوا کے دئے اور کہنے لگے اس وقت تو آپ اپنے کمرے میں جائیں صبح ۸ بجے تشریف لایئے کوتوال شہر آپ کے بیان لیگا۔ میں سونچا کہ برے پھنسے اور میں نے عباس سے کہا بھی کہ میاں صبح ۸ بجے سے پیشتر پرو وائس چانسلر صاحب سے سارا حال بیان کردو بہت کریں گے کچھ جرمانہ کردیں گے خیر اس پولیس کی پکڑ دھکڑ سے تو بہتر ہے مگر صاحب یہ تو —" جمیل کو اتنی دیر تک مصروف تکلم دیکھ کر مجھے غبطہ ہونے لگا تھا میں نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے شرلاک ہومز ثانی کا لقب عطا فرمائینگے مگر خدا کے لئے فاروقی صاحب آپ ہی بتائیں کہ اگر میں جمیل کے کہنے پر عمل کرلیتا تو کیا حشر ہوتا بغیر پاس کے شہر جانا پہلا جرم، ابجے تک واپس نہ آنا دوسرا جرم پرو وائس چانسلر سے غلط بیانی کا ارتکاب تیسرا جرم کہئے یونیورسٹی سے نکالے جانے میں کیا کسر باقی رہجاتی؟ پولیس کو بیان دینے میں کوئی خطرہ ہی نہ تھا بڑے شہروں میں ایک آدھ بدمعاش رہتے ہی ہیں کوتوال شہر کو ہم پر غلط بیانی کا شبہ کیوں ہونے لگا تھا اور اس کے علاوہ —" "للہ بات نہ کاٹا کرو" جمیل نے ذرا جھنجھلا کر کہا "مجھے قصہ تو ختم کرلینے دیا ہوتا ہاں صاحب خلاصہ یہ ہے کہ میں نے عباس کی رائے پر چلنا بہتر سمجھا اور صبح ہی صبح اپنے روم فیلو حامد کو بھی اس راز میں شریک کرلیا۔ حامد کوتوال شہر کے دور کے رشتہ دار تھے اور ان سے کافی مدد ملنے کی توقع تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے پرو وائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئے کوتوال صاحب ہم لوگوں کو حامد کی وجہ سے جانتے تھے نہایت نرمی سے تمام داستان بیان کرنے کو کہا۔ ہم نے لہجہ میں سوز و گداز پیدا کرکے اپنی بپتا سنائی فرمانے لگے اس کا حلیہ آپ کو یاد ہے۔ یہاں پر میں رکا مگر عباس نے خدا جانے کس کتاب میں کس شخص کا حلیہ دیکھا تھا کہ تیزی کے ساتھ وہی حلیہ بیان کرنا شروع کردیا جو ہم لوگ کچھ دیر پیشتر آپ کو سنا چکے ہیں۔ جب داہنے رخسار پر بڑے سے مسہ کا ذکر کیا تو کوتوال صاحب کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی ارشاد ہوا کہ آپ بالکل درست فرماتے ہیں موضع نیول پور میں جو ڈکیتی ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں چوکیدار نے بیان کیا تھا کہ ایک ڈاکو کے گال پر بڑا سا نشان تھا غالباً

بوکھلاہٹ میں وہ مسئلہ کو نشان سمجھا بلکہ چوکیدار تو اس کا کچھ نام بھی بتاتا تھا۔ تراب شاہ تو نام نہیں بھتا عباس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ کوتوال صاحب نے مشکوک نظروں سے عباس کو دیکھا فرمانے لگے نام آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ عباس نے بلا کسی جھجک کے کہنا شروع کیا جی کیا عرض کروں جب ہم لوگ چلنے لگے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس میں رپورٹ کرنا تو تھانیدار سے کہدینا کہ اگر تمھیں ناکوں چنے نہ چبوائے تو راجپوت کا لڑکا نہیں اور تراب شاہ نام نہیں۔ اب تو کوتوال صاحب کی برہمی کی کوئی انتہا نہیں رہی کہنے لگے صاحبزادے تمھارے تراب شاہ ایسے سینکڑوں آدمی کا سے پانی بھجوا چکا ہوں وہ ہے کیا چیز۔ کوتوال صاحب تو برہم ہو رہے تھے اور ہمارے پرو وائس چانسلر صاحب خندۂ زیر لب فرما رہے تھے۔

میں ڈرا یہ کہ کہیں عباس کے آخری فقرے سے وہ کھٹک نہ گئے ہوں اور اس لئے چپ چاپ جازت لیکر واپس چلا آنا بہتر سمجھا۔ دوسرے دن حامد سے معلوم ہوا کہ پرو وائس چانسلر صاحب اپنے ایک چپراسی کو ساتھ لیکر کوتوال صاحب کے پاس گئے ان کا خیال تھا کہ چپراسی نے ان کی بیگم صاحبہ کا نیکلس چرایا ہے مگر چپراسی لاکھوں قسمیں کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ کل شب کو میں نے ایک آدمی کو جس کے گال پر بڑا سا مسئہ تھا آپ کی کوٹھی کے پاس دیکھا تھا کوتوال صاحب اس بیان پر بہت ہنسے کہنے لگے فرمائیے جناب اب یہ لڑکوں کا مذاق تھا یا اصلیت؟ میری عمر پولیس کی ملازمت میں بسر ہوئی ہے میں ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں کہ کون آدمی سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق میں عباس اور جمیل کے بیان کو مذاق پر محمول کردوں تو یہ نیکلس کا واقعہ ان کے بیان کی تائید کرتا ہے آپ ہی فرمائیں کہ آخر چپراسی کو تراب شاہ کا حلیہ کیسے معلوم ہوا؟ اسے بھی جانے دیجئے نول پور کے چوکیدار کو کیا غرض تھی کہ وہ فرضی حلیہ بیان کرتا؟ اس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر حامد سے بھی دریافت کیا قسمیں کھاتے ہیں کہ عباس اور جمیل کے بیان میں مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آپ کی خوشی ہے تو میں چپراسی پر تشدد کرنے کے لئے طیار ہوں مگر یہ یاد رکھئے کہ نیکلس کا ملنا منحصر ہے تراب شاہ کی گرفتاری پر اور وہی ہوا کہ کوتوال صاحب اسکے تشدد کے باوجود چپراسی نے اعتراف جرم نہیں کیا۔ نیکلس کا قصہ مشہور ہونا تھا کہ تراب شاہ کالج کی چاردیواری کے علاوہ شہر میں بھی بہت کافی مشہور ہو گئے۔ کہیں نقب زنی ہوئی تراب شاہ کا ذکر خیر موجود کوئی قتل ہوا قاتل تراب شاہ فرض کئے گئے۔ یونیورسٹی کے کسی طالب علم کی کوئی چیز گم ہوئی تراب شاہ ملزم ٹھہرائے گئے۔ اسی زمانہ میں ایک مقامی اخبار نے تراب شاہ کے کچھ مجرمانہ اقوال

واقعات بھی سپردِ قلم فرمائے تھے مثلاً تراب شاہ روپیہ کو دو انگلیوں سے توڑ سکتا ہے اس کا روسیوں سے ساز باز ہے نہایت معتبر ذریعہ سے اطلاع ملی ہے کہ اس کے پاس کئی سو بندوقیں بھی ہیں غرض سال ڈیڑھ سال تک ایک ہنگامۂ عظیم برپا رہا متعدد کانسٹبلوں نے بارہا اسے شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا لیکن گرفتار آخر وقت تک نہ کر سکے اور جب دو تین ماہ تک کوئی نیا جرم نہیں ہوا تو ارباب حل و عقد نے بجائے خود یہ طے کر لیا کہ تراب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ جتنے واقعات تھے وہ بے کم و کاست عرض کر دئے اب تراب شاہ کی حقیقی یا فرضی ہستی کا بہتر فیصلہ آپ خود فرما سکتے ہیں" فارق صاحب کچھ فرمانے والے تھے کہ میں بول اُٹھا "مگر جمیل تم نے ایک خاص واقعہ بیان نہیں کیا۔ فاروق صاحب ایک دن ہمارے کمرے کا بوائے امین کسی ضرورت سے شہر گیا واپس آیا تو سراسیمہ و بدحواس میں نے پوچھا خیر تو ہے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، کہنے لگا میاں ڈگی تال کے پاس ایک آدمی ملا تھا جسکے گال پر بڑا سا مسّہ تھا مجھسے پوچھنے لگا تم عباس صاحب یا جمیل صاحب کو جانتے ہو میں نے کہا کیوں تمھیں کیا کام ہے کہنے لگا کام کیا جب ملنا تو کہدینا کہ تراب شاہ نے سلام کہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید کسی چیز کو چرانے کے لئے بوائے نے یہ قصہ گڑھ لیا ہو مگر ہمارے کمرے سے ایک تنکا بھی چوری نہ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بوائے کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اور کیا واقعی کوئی شخص ایسا موجود تھا جس کا حلیہ ہمارے بیان کردہ حلیہ سے ملتا تھا؟ فاروق صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "عباس صاحب کیا خوب کہا ہے غالب مرحوم نے کہ "عالم تمام ایک حلقۂ دام خیال ہے"، اور جمیل اس مصرع پر بے اختیار ہنسنے لگے۔

طالب صفوی

ضرورت ہے شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ منداور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے —— معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئیے، اور عمر ۳۰ سال سے زاید نہ ہو۔ یو۔پی کے باشندہ کو ترجیح دی جائے گی —— اڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں —— خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے:۔ ا۔ن۔ ذریعہ منیجر نگار۔ لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(اصغر گونڈوی کی شاعری)

ادیب محترم دامت افادالکم — مجھے اس بات کا اعتقاد ہے کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنی رائے کے خلاف کوئی صدا بلند ہوتے ہوئے سن نہیں سکتے۔ آپ کا طرزِ عمل شاہد ہے کہ اگر کسی نے آپ کو گالیاں بھی دی ہیں تو آپ نے اس کو بھی شائع کر کے معقول جواب دیا ہے لہذا میں اس کی امید نہیں رکھتا کہ آپ اس مضمون کو محض اس لئے واپس کر دیں گے کہ یہ آپ کے ریویو کا جواب ہے۔ آپ اس کی مخالفت میں جو چاہیں وہ نوٹ لکھدیں لیکن براہ عنایت اپنے رسالہ میں جگہ دیکر اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیجئے۔ اور مجھے رہین منت بنائیے مضمون کسی قدر طولانی ضرور ہے لیکن اس سے بہت زیادہ طولانی مضامین آپ کے رسالہ میں نکل چکے ہیں

نیاز کیش

شمس الدین

مندرجۂ بالا کتاب پر نگار ماہ جون ۱۹۳۴ء میں اڈیٹر کا ریویو میری نظر سے گزرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم فرصتی کی وجہ سے اڈیٹر صاحب نے پوری کتاب نہیں دیکھی۔ یہ رائے ان کی بیشک صحیح ہے کہ پہلی ہی نظر میں ذاتیات کا گمان کر کے اس کتاب کی نسبت خراب رائے قایم ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص شروع سے آخر تک کتاب دیکھ جائے گا تو مجبوراً اس کو اپنی رائے بدلنا پڑے گی اس سبب سے کہ کتاب

بھری ہیں اصغر صاحب کہیں بھی مخاطب نہیں ہیں اور نہ ان کو براہ راست چیلنج دئے گئے ہیں بلکہ چیلنج انکے مداحین کو دئے گئے ہیں جنھوں نے ایک ہنگامہ اُٹھا کر اصغر صاحب کے مقابلہ میں تمام شعرا کو ذلیل کر کے انصاف پسند لوگوں کے دلوں کو تکلیف پہونچائی ہے۔

میں اُسی کتاب کے صفحہ ۸۴ و ۸۵ سے ایک فقرہ سرکوب صاحب کا لکھتا ہوں " دنیا جو چاہے سمجھ لے لیکن حقیقت میں میں اصغر صاحب کے خلاف نہیں ہوں بلکہ اُن لوگوں کے خلاف ہوں جو اصغر صاحب کی شاعری سے بخوبی واقف ہیں پھر بھی ان کو خلاف واقعہ بڑھاتے ہیں " اور صرف اسی ایک فقرے پر موقوف نہیں ہے بلکہ تمام کتاب اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے کہ اصغر صاحب کی مخالفت محض اُن کے مداحوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اصغر کے مقابلے میں مشاق اور قادر الکلام شعرا کی توہین و تذلیل کرتے ہیں۔ اصغر کے دوستوں کو تو اصغر کی توہین ناگوار ہوتی ہے لیکن کسی دوسرے کو باکمال شعرا کی توہین و تذلیل اصغر ایسے شخص کے مقابلہ میں جو ایک نشست میں دو ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے ناگوار نہیں ہوسکتی۔ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ کر ایک شخص بھی یہ رائے قائم نہیں کر سکتا کہ سرکوب کو یا اس کتاب کے کسی مضمون نگار کو اصغر سے کچھ ذاتی مخاصمت ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ معرض بحث میں اصغر صاحب ہی ہیں اس سبب سے نتیجہ جو نکلتا ہے وہ اصغر ہی کے خلاف نکلتا ہے اسی دھوکے میں آکر اڈیٹر صاحب نے بغیر کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھے ذاتی مخاصمت کا گمان کر لیا۔

ہم اڈیٹر صاحب کے نہایت ممنون ہوں گے اگر وہ اصغر صاحب یا اُن کے دوستوں سے دریافت کر کے کوئی واقعہ ایسا لکھدیں جس سے اس کا شبہ بھی ہو سکے کہ سرکوب صاحب کو اصغر صاحب سے کوئی ذاتی رنج یا خصومت ہے۔ مبصر کی کسی اشاعت میں ایک مضمون سرکوب صاحب کا شائع ہوا ہے جسمیں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ میرا اور اصغر کا ساتھ تین برس تک انڈین پریس میں رہا ہے اس درمیان میں میرے اور ان کے تعلقات ایسے خوشگوار رہے ہیں کہ کسی قسم کی شکر رنجی تو درکنار کبھی کسی معاملہ میں رائے تک میں بھی اختلاف نہیں ہوا لیکن مجھکو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اصغر صاحب نہایت کم مشق شاعر ہیں اور فن شعر سے بالکل ناواقف۔

اصغر صاحب بھی اس کو مانتے ہیں کہ مجھ سے اور سرکوب صاحب سے کوئی ذاتی خصومت نہیں ہے اڈیٹر صاحب خود ان سے دریافت کر سکتے ہیں۔

بھلا سرکوب ایسے بے نیاز شخص کو کسی سے ذاتی خصومت شاعری کے معاملہ میں کیا ہو سکتی ہے جس کو نہ شہرت کی پروا نہ تعریف کی، ان کا کلام قریب قریب ہر ادبی رسالہ میں شائع ہوا کرتا ہے لیکن اُن کے نام سے نہیں بلکہ دوسروں کے نام سے، یہ الزام اُن پر بہت صحیح ہے کہ وہ اپنے نام سے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسروں کو اشعار کہہ کر بلا معاوضہ دیدیا کرتے ہیں جس سے اصغر صاحب بھی بخوبی واقف ہیں اگر کسی کی فرمایش سے کچھ اپنے نام سے کبھی پڑھتے بھی ہیں تو اُس کو محفوظ نہیں کرتے اس وقت ایک مصرع بھی اُن کے پاس محفوظ نہیں ہے لوگ اُن پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ ان جواہر پاروں کو کیوں ضایع کردیتے ہیں تو اُس کا جواب یہی ملتا ہے کہ یہ میرے جذبات نہیں تھے بلکہ دوسروں کی فرمایش سے مجبور ہو کر میں نے کہا تھا اسکے حکم کی تعمیل ہوگئی پھر اب ان کے رکھنے کی کیا ضرورت ہے غرض یہ کہ اُن کا مزاج ہی ایسا نہیں ہے کہ اُن سے شاعری میں کسی سے ذاتی خصومت ہو سکے۔ یہ جھگڑا ذاتی خصومت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسوجہ سے ہے کہ وہ اصغر کی قابلیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور مداحان اصغر جو اصغر کو باکمال شعرا پر ترجیح دیتے ہوئے اُن کو ناگوار ہوتا ہے۔

اس سے اڈیٹر صاحب بھی واقف ہیں کہ اصغر کے مداحوں نے کیا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ نگار ہی کے کسی اشاعت میں مرزا احسان احمد کا مضمون شایع ہوا ہے جس میں اصغر کے مقابلے میں شعرائے لکھنؤ کے ذلیل کرنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا یہاں تک الفاظ ہیں کہ "اصغر لکھنؤ کے گزشتہ و موجودہ شاعروں سے بہتر ہیں" مرقع میں ذوقی صاحب نے جو زہر اگلا ہے اس سے بھی غالباً اڈیٹر صاحب ناواقف نہ ہوں گے اس میں بھی یہاں تک لکھا گیا ہے کہ جس حدِ کمال پر شعرائے سابقہ وحال کی شاعری ختم ہوجاتی ہے وہاں سے اصغر کی شاعری شروع ہوتی ہے کیا کسی کی تعریف کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے مقابلے میں استادان گزشتہ و موجودہ ذلیل کئے جائیں۔ اسی اصغر کی شاعری حصۂ اول میں اڈیٹر صاحب بیخود فیض آبادی کا مضمون ملاحظہ کرلیں کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اصغر امام المتغزلین پیغمبر ذوقِ سلیم ہیں انھوں نے بڑے بڑے عفاریت سخن کو میدان شاعری میں پچھاڑ دیا ہے اور مخالفین اصغر کو جو گالیاں دی ہیں وہ بھی دیکھ لیں۔ خبیث۔ کمینہ۔ کم ظرف۔ شیطان علیہ اللعن کا شاگرد سب کچھ بنا دیا ہے (مضمون نمبر ۲ دیکھئے) یہ مداحان اصغر کی تہذیب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اصغر کے موافقین اور مخالفین دونوں کے مضامین اسی کتاب میں بطور سوال وجواب کے ہیں تو کوئی شخص کیسے یہ رائے قائم کریگا کہ اصغر کی ذاتی مخاصمت کی بنا

یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اڈیٹر صاحب کے نزدیک سرکوب صاحب تو انسان نہیں ہیں لیکن مداحان اصغر انسان ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اس میں اصغر صاحب کا کچھ قصور نہیں ہے تو مخالفین اصغر کا بھی کچھ قصور نہیں ہے کیونکہ وہ اصغر صاحب سے کتاب بھر میں کہیں مخاطب نہیں ہیں بلکہ اُن کے مداحان سے مخاطب ہیں۔ اثر اس کا اصغر صاحب پر پڑے یا کسی اور پر وہ تو مداحان اصغر کی خبر لیتے ہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ اگر انسانیت سے مداحان اصغر سے کہا جاتا تھا کہ یا کسی شخص کی ایسی تعریف نہ کرو جو دوسرے کو ناگوار ہو تو بگڑ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اصغر کی تعریف ابھی ہوئی کہاں قیامت تک اگر تعریف ہوگی تب بھی ایک شمہ اُنکی حمد و ثنا کا بیان نہ ہوسکے گا۔ ایسا گروہ جو زبان اور محاورے کی غلطیوں کو اضافۂ زبان سمجھے جو شعر کی خامیوں کو عمق خیال کرے جو غلط اور ناقص شعروں کی تاویل کرکے اپنی سمجھ پر فخر کرے اور دنیا کو ناقابل اور نافہم خیال کرے اس کی سرکوبی سوائے اس کے اور کسی طرح نہیں ہوسکتی تھی کہ اُن لوگوں کو چیلنج دیدیا جائے کہ اچھا اصغر کو میدان امتحان میں لائیے تاکہ آپ کی سمجھ کا امتحان ہوجائے کہ جب آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اصغر کا شعر ہے اُسوقت آپ اُس کو پیغام خداوندی سمجھتے ہیں یا جب نہیں معلوم ہوتا اُس وقت بھی آپ اصغر کے شعر کی تعریف کرتے ہیں چنانچہ اصغر کی ایک غزل کے جواب میں جس کی تعریف میں علی گڑھ میگزین میں بہت مبالغہ کیا گیا تھا اُسی قسم کے اشعار بہت کم وقت میں کہکر ان کے مداحوں کے سامنے پیش بھی کردئے گئے ہیں جو اُسی کتاب کے صفحہ ۳۵، ۳۶ میں ہیں اصغر کی بیجا تعریف کرکے عرش پر چڑھانے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصغر کے دماغ میں یہ بات سماگئی کہ ہمچو من دیگرے نیست، اور لطف یہ کہ اپنی قابلیت کے ثبوت میں اصغر صاحب صرف یہی بات پیش بھی کرتے ہیں کہ میری تعریف بڑے بڑے لوگ کرتے ہیں لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تعریف تو بہت سے وجوہ کی بنا پر ہوجاتی ہے آپ میں کچھ ذاتی جوہر بھی ہے یا نہیں تو اسکا جواب صرف خاموشی میں ملتا ہے۔ اصغر کا غرور اور مداحان اصغر کا جوش توڑنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کا راز شاعری فاش کردیا جائے اس کو ذاتی مخاصمت سے تعبیر کرنا ہٹ دھرمی ہے اگر کسی شخص کو اخلاقی سبق دیا جائے کہ ہر شخص کی اُسی قدر تعریف کرو جس کا وہ مستحق ہے اور دوسروں کی تذلیل کرکے دنیا کو رنج نہ پہونچاؤ تو آپ اس کو ذاتی مخاصمت سمجھیں گے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ مداحان اصغر نے جو خلاف واقعہ ان کو بڑھایا اس کے جوابات ہوچکے تھے اسکی کیا ضرورت تھی کہ وہ سوال و جواب ایک کتاب کی صورت میں ایک جا کردئے جائیں اس سے تو

یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اصغر کے ذلیل کرنے کے واسطے یہ کام کیا گیا اور اسی کو خصومت کہتے ہیں تو یہ اعتراض بھی وہی شخص کرے گا جس نے غور سے وہ پوری کتاب نہ پڑھی ہوگی جو شخص غور سے پڑھے گا اسکو مداحانِ اصغر کا کیرکٹر معلوم ہو جائے گا کہ واقعہ سے انکار کرنے میں ان کو کچھ باک نہیں ہوتا غلط بیانی اور دروغ گوئی میں شیر ہوتے ہیں۔ طالب علم نے جو یہ لکھا کہ مداحان اصغر باوجود چیلنج دینے کے کبھی اصغر صاحب کو میدان امتحان میں نہیں لائے اس کی نسبت ایک مداح نے جس نے اپنا نام راستگو رکھا ہے یہ لکھدیا کہ یہ بالکل جھوٹ واقعہ ہے اور سراسر اصغر صاحب پر بہتان ہے (مضمون نمبر ۳ دیکھئے) یہ ظاہر ہے کہ کسی اخبار کے پرچے کوئی کہاں سے تلاش کرکے بر وقت لاتا لہٰذا وہ مضامین اکٹھا کر دئے گئے تاکہ بر وقت ضرورت پیش ہوا کریں۔ غرض یہ کہ اس کتاب کی ترتیب کا باعث بھی مداحان اصغر ہوئے اگر وہ غلط بیانی اپنا شیوہ نہ قرار دیتے تو کتاب بھی مرتب نہ ہوتی۔ سرکوب نے کتاب کے ترتیب کی غرض جو دیباچے میں لکھی ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے اس سے بھی اصغر صاحب کے ساتھ کوئی ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ اصغر کو روکنے کی غرض سے کتاب مرتب ہوئی ہے میں اس کو یہاں لکھے بھی دیتا ہوں۔

"میں نے اس امید پر اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے کہ شاید مداحانِ اصغر کو یہ خیال آجائے کہ اب ہماری شرم وحیا کے چرچے ملک میں بہت زیادہ ہونے لگے لہٰذا اخباروں اور رسالوں کے صفحات کو الگ کرکے اپنی غیرت داری کا زیادہ ثبوت نہ دینا چاہئے۔"

غرض یہ ہے کہ سرکوب صاحب کو کوئی ذاتی مخالفت اصغر صاحب سے نہیں ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ مداحانِ اصغر کی بیجا سختیوں اور ترجیح بلا مرجح سے ان کو ایک قسم کی ضد ضرور پیدا ہوگئی ہے کہ ہم اصغر کے کل راز رفتہ رفتہ کھولدیں گے ابھی پہلا حصہ ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اس سے زائد راز اصغر صاحب کے کھلیں گے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سرکوب کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کی دل آزاری اور اُن کے ذلیل کرنے کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کا جواب تو یہی ہے کہ اصغر کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت چھوٹے آدمی ہیں پھر وہ کیوں اس قدر بڑھائے جاتے ہیں۔ بندہ پرور اس کتاب کے واسطے یہ نام نہیں ایجاد کیا گیا بلکہ یہ اُن کا بہت پرانا تخلص ہے اس کتاب کی ترتیب سے بہت قبل

ان کی نظمیں سرکوب کے نام سے اودھ پنچ وغیرہ میں موجود ہیں ایک شخص کے دو تخلص کوئی نئی بات نہیں ہے بہت لوگوں کے ایسے تخلص تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں کا تخلص شیفتہ بھی تھا اور حسرتی بھی اگر آپ کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ کہاں پر وہ سرکوب تخلص کرتے ہیں اور کہاں پر حامد۔

میری رائے میں اڈیٹر صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اصغر صاحب سنجیدگی اور انسانیت کی وجہ سے چیلنج کو قبول کر کے میدان امتحان میں نہیں آتے اور اُن کے نہ آنے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ میں یہی عرض کروں گا کہ یہ اڈیٹر صاحب کی نیک نفسی ہو ورنہ واقعہ یہی ہے کہ اصغر صاحب اپنی کمزوری کی وجہ سے میدان امتحان میں نہیں آتے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ تو محض قیاس کی بنا پر کہتے ہیں اور جس شخص نے ان کی کمزوری اور شعر کہنے سے عاجز رہنے کا راز کھولا ہے اس نے تجربہ کیا ہے۔ تین برس تک اس کا اور اصغر صاحب کا ساتھ ایک ایسے ادبی کام میں رہا ہے جس میں شعر کہنے کی بھی ضرورت ہوتی تھی وہاں پر انسانیت کو کام میں لانے کا کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ نوکری کا معاملہ تھا لہذا اُس کا تجربہ اڈیٹر صاحب کے قیاس سے کہیں زیادہ وقیع ہے یہ زبردستی ہو کہ آپ اپنے قیاس کو کسی کے تجربے پر ترجیح دیں اور اگر اڈیٹر صاحب اس کو نہ مانیں گے تو ہم مجبوراً وہی عرض کریں گے جو مخالفین اصغر نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ جس شاعر کو اڈیٹر صاحب سنجیدہ انسان سمجھتے ہوں اس کو اسی قسم کے چیلنج دیکر دکھا دیں کہ وہ میدان امتحان میں نہیں آتا اور اپنی ناقابل برداشت بدنامیوں کے زہر کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ اڈیٹر صاحب کی رائے صحیح ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب کی جرارت ہی نہ ہوگی کہ کسی مشاق شاعر کو وہ اس قسم کے چیلنج و یدیں اس سبب سے کہ ڈریں گے کہ وہ میدان امتحان میں آکر ان کو ذلیل کر دے گا۔ ایسی جرأت صرف اُسی شاعر کی نسبت ہو سکتی ہے جس کی کمزوری اور عاجزی کا یقین ہو اور یقین بغیر تجربے کے نہیں ہو سکتا چونکہ سرکوب صاحب کو تجربے سے یقین ہو گیا تھا اس وجہ سے مداحان اصغر کو چیلنج دئے گئے اور ان کے تجربے کو لوگوں نے صحیح مان لیا۔

کیا انسانیت کے خلاف یہ نہیں ہے کہ باکمال شاعروں کی اپنے مقابلہ میں توہین کرائی جائے لیکن اس سے اصغر صاحب کبھی نہیں چوکتے کبھی بحث کر کے ان سے دیکھئے کہ وہ اپنے مقابلہ میں کسی کو سمجھتے ہیں۔ جب تک گنجائش تھی اسوقت تک اصغر صاحب پر جو اعتراضات ہوتے تھے ان سے کے

جواب لکھنے میں انسانیت کو دخل نہیں دیا جاتا تھا اب جب سوائے اس کے اور کوئی گنجایش نہ رہی کہ اصغر میدان عمل میں لائے جائیں تو عصمت بی بی بے چارگی " ہو کر سب کے سب انسان بن گئے۔ اگر اڈیٹر صاحب کو کسی شخص کی بابتہ ذاتی تجربہ ہو جائے کہ وہ شعر کہنے سے عاجز ہے اور اس کے امتحان میں نہ آنیکا سبب لوگ اس کی انسانیت ظاہر کریں اس وقت، تو اڈیٹر صاحب اس کی انسانیت کے قایل نہ ہونگے لیکن سرکوب صاحب پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو کوئی چیز نہ سمجھیں اور اڈیٹر صاحب کے قیاس کو صحیح سمجھ کر اصغر کی انسانیت کے قائل ہو جائیں۔ اڈیٹر صاحب کے اُصول کے مطابق تو ہر جاہل شخص اپنے عالم ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اڈیٹر صاحب کو اس کو عالم ماننا پڑے گا اس سبب سے کہ جہل اور علم کا فیصلہ صرف امتحان کر سکتا ہے اور امتحان اڈیٹر صاحب کے نزدیک خلاف انسانیت ہے لہذا جاہل کو عالم ماننا انھیں واجب ہو جائے گا۔ اڈیٹر صاحب کوئی انسان خواہ ملک سیرت ہی کیوں نہ ہو کسی بات پر قدرت رکھتے ہوئے اس بات کے متعلق اپنی بدنامی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مضمون چونکہ طول ہو گیا ہے اس وجہ سے ہم اس مبحث کے شواہد پیش کرتے ہوئے اس وقت اس لئے ڈرتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب طوالت کا الزام رکھکر مضمون کو واپس کر دیں گے لہذا اڈیٹر صاحب سے صرف اتنی استدعا کرتے ہیں کہ وہ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیں۔ چھوٹی سی کتاب ہے تین گھنٹے سے زاید وقت ان کا نہیں خراب ہوگا اگر کتاب دیکھنے کے بعد بھی ان کی رائے یہی قائم رہے کہ اصغر انسانیت کی وجہ سے میدان عمل میں نہیں آتے تو دوسرے حصہ کا انتظار کریں جس میں اس کا پتہ دیا گیا ہے کہ اصغر کی کونسی غزل کس کی کہی ہوئی ہے اور اس کا ناقابل تردید ثبوت بھی ہے۔

بعض لوگ جن کے دماغ فونوگراف ہیں اصغر صاحب کے کہنے سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سرکوب صاحب تخریبی کام کر رہے ہیں اور اصغر صاحب کے مداح تعمیری کام کرتے ہیں اگر تعمیری کام کے یہی معنی ہیں کہ دنیا کو دھوکا دیا جائے اور ایک شخص جو سیر بھر کا ہے وہ من بھر کا کر کے دکھایا جائے اور تخریبی کام یہ ہے کہ اُس دھوکے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے تو میری رائے میں دنیا کو تخریبی ہی کام کرنا چاہئے۔ تخریبی کام تو یہ ہے کہ کسی اچھے کام میں خرابی ڈالی جائے اس کو کوئی انصاف پسند اچھا کام نہیں کہہ سکتا کہ واقعہ کے خلاف کوئی شخص بڑھایا جائے اور دوسرے باکمال حضرات اُس کے مقابلے میں گھٹائے جائیں بعض آدمی جو یہ کہتے ہیں کہ اگر اصغر اپنے کو اپنے دوستوں کے ذریعہ سے بڑھاتے ہیں تو اس

آپ بھی بڑھائیے یہ کیا ضرورت ہے کہ آپ ان کو گھٹا کر آپس میں رنجش پیدا کیجئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا ون سی اخلاقی تعلیم ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو دھوکا دیتا ہے تو آپ اس کے دھوکے کو کیوں طشت ازبام تے ہیں آپ بھی دنیا کو دھوکا دیجئے۔ مان لیجئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک شخص دوسروں سے غزل کہلا کر ھتا ہے تو کیا آپ اس کے اس راز کو فاش نہ کیجئے گا بلکہ خود بھی دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھیئے گا اصل اسوقت جو اصغر صاحب کی بابت بحث ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک فریق تو ان کی شہرت پر جاتا ہے سرا فریق اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر میرے تجربے کو تم غلط سمجھتے ہو تو اس کا امتحان کرلو پ کہتے ہیں کہ امتحان انسانیت کے خلاف ہے پھر آخر فیصلہ ہو تو کیسے ہو۔ عجب زبردستی ہے کہ اپنے ربے پر خاک ڈالو اور جو ہم کہتے ہیں اس کو بلا دلیل مانو۔

ہم اس کو مانتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب کو یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی ہوگی لیکن ان کو سرکوب صاحب ھی تکلیف کا احساس ہونا چاہئے کہ جس شخص کی قابلیت سے وہ واقف ہوں اس کی نسبت ایسے فاظ دیکھ کر کہ وہ گزشتہ اور موجودہ شاعروں سے بہتر ہے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی اور اس تکلیف سے اثر ہو کر اگر انھوں نے اصغر کا راز کھولدیا تو کیا گناہ کیا۔

اس وقت تک اس کتاب پر آٹھ دس اخباروں اور رسالوں میں میں نے ریویو دیکھے سوائے یٹر نگار کے اور کسی کا ریویو میں نے اس کتاب کے خلاف نہیں دیکھا ممکن ہے جیسے انھوں نے کتاب کے دیکھے قیاس پر ریویو کردیا ایسا ہی اور بھی کسی نے کیا ہو لیکن میری نظر سے نہیں گزرا غرض ہ جن لوگوں نے کتاب کے اندر رہ کر رائے قایم کی ہے وہ اس کتاب کے خلاف نہیں ہوئے ۔ ہر صاف پسند کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب نے اصغر کا راز افشا کرکے ملک پر احسان کیا ہے اور بیجا یش کرنے والوں کا سدباب کر دیا ہے۔ ان مضامین کے یکجا ہوجانے سے اصغر کی اصلی قابلیت ظاہر دینا ہر شخص کے لئے آسان ہو گیا ہے اور لوگوں کو اس کا سبق حاصل ہو گیا ہے کہ کسی شخص کی تعریف بنے میں اس کو حد سے زیادہ نہ بڑھانا چاہئے۔

سرکوب صاحب خود انسان ہوں یا نہوں لیکن یہ تو اڈیٹر صاحب کو ماننا پڑے گا کہ انھوں نے ھان اصغر کو انسان بنا دیا اس سبب سے کہ جب سے کتاب نکلی ہے اصغر صاحب کی مداحی بند ہو گئی ہے اور اس کی امید نہیں ہے کہ کتاب کو دیکھکر کوئی غیرت دار اصغر کی ایسی مداحی کرے جس میں

استادان گزشتہ یا موجودہ کی توہین وتذلیل ہو اور یہی مقصد اُس کے مرتب کرنے کا تھا کہ مداحان اصغر انسان بن جائیں معلوم نہیں اڈیٹر صاحب کس کو اچھا سمجھتے ہیں انسان کو یا انسان گر کو۔

جیسا متعلم ہوتا ہے معلم ویسی ہی تعلیم دیتا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مداحان اصغر پر انسانیت کا اثر نہیں ہوتا تو غیر انسان بن کر انھوں نے سب کو انسان بنا دیا۔ ہر کام کے نتیجہ پر غور کرنا چاہئے سرکوب صاحب کو جیسی اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے شاید ہی کسی کو ہو کہ ہنگامہ اصغر کو انھوں نے فرو کیا اور مداحان اصغر کی زبان بند ہو گئی۔

(نگار) اس طویل مراسلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) سرکوب الہ آبادی نے اپنی کتاب جو "اصغر گونڈوی کی شاعری" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے اصغر پر کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان کی حمایت میں دوسرے شعراء کو بُرا کہتے ہیں

(۲) اصغر صاحب واقعی شاعر نہیں ہیں یا یہ کہ اگر ہیں تو بہت کم مشق۔

(۳) سرکوب صاحب بہت بے نیاز شخص ہیں اور باوجود بہترین شاعر ہونے کے وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے، اس لئے انھیں اصغر صاحب سے کیا عناد ہو سکتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پہلے میں نے اس کتاب کو بالاستیعاب نہیں پڑھا تھا لیکن دوبارہ جب مراسلہ نگار صاحب کے اصرار پر میں نے اسے پڑھ لیا، تو بھی کسی دوسرے نتیجہ پر نہیں پہونچا۔

اگر معاملہ صرف اصغر کے مداحوں کا تھا (جیسا کہ مراسلہ نگار صاحب لکھتے ہیں) تو پھر اصغر صاحب اور ان کی شاعری کو درمیان لانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن چونکہ اصل مقصود تو یہی ظاہر کرنا تھا کہ اصغر کو شعر کہنا نہیں آتا، اس لئے تمام مباحث سے نتیجہ یہی ایک نکالا گیا ہے۔ پھر مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ اصغر صاحب اگر شعر اچھا نہیں کہتے تو خواہ مخواہ ان کی شاعری کو سراہا جائے، میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ مداحانِ اصغر، اپنے ممدوح کو اچھالنے کے لئے دوسروں کی توہین وتذلیل کریں اور یقیناً میرے نزدیک یہ امر بھی پسندیدہ نہیں کہ اصغر صاحب (اگر وہ واقعی شاعر نہیں ہیں) اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے پر اصرار کریں۔ لیکن یہ تمام باتیں اس کو کیونکر مستلزم ہو سکتی ہیں کہ اصغر کی شاعری کے سلسلہ میں اصغر کی ذات کو سامنے لایا جائے۔

اس سلسلہ میں سرکوب یا کوئی اور نقاد یہ کہہ سکتا ہے کہ جب بحث یہ آن پڑے گی کہ اصغر شعر کہنا جانتے ہیں یا نہیں تو لامحالہ ان کی ذات اس میں شامل ہو جائے گی ــــ یہ توجیہہ بالکل درست ہے لیکن مجھے گفتگو اسی میں ہے کہ اول تو اس بحث کے اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو اسکے لئے کوئی قوی دلیل موجود ہونا چاہئے ــــ چیلنج قبول نہ کرنا، یا مشاعرہ میں سب کے سامنے غزل نہ کہہ سکنا یا طرح پر غزل کہنے میں پس وپیش کرنا، یہ ایسے دلایل نہیں ہیں کہ اصغر کے غیر شاعر ہونے کے ثبوت میں کوئی وزن رکھ سکیں۔

ایک شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت ہر شخص کی فرمایش یا ہر طرح پر شعر کہنے کے لئے طیار ہو جائے، بلکہ میرے نزدیک ایک حقیقی شاعر کبھی اس کی پابندی کر ہی نہیں سکتا، اور جو لوگ اس "وسے بر ندش" قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے ہیں وہ اکتسابی شاعر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انھیں "متشاعر" کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اصغر کے خلاف اس نوع کے دلایل پیش کرنا، میرے نزدیک اُنکی شاعرانہ اہلیت کو اور زیادہ مستحکم کرنا ہے نہ یہ کہ انھیں اُن کے شاعر نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اصغر پُرگو شاعر نہ ہوں اور ان کا دماغ بہت کم شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے (خواہ وہ سال میں ایک ہی بار کیوں نہ ہو) تو شعر کیسا کہتے ہیں ــــ اور اس صورت میں زیادہ سے زیادہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ صرف ان کے کلام پر رائے زنی کریں نہ یہ کہ سرے سے ان کے شاعر ہونے ہی کا انکار کر دیں ۔ اگر سرکوب صاحب کے پاس کوئی ثبوت اس امر کا ہوتا کہ اصغر نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے وہ فلاں شخص کی فکر کا نتیجہ ہے تو بیشک دوسری بات تھی، لیکن محض چیلنج یا طرح وغیرہ کے جھگڑوں کو سامنے لاکر ایسا حکم لگانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

اصغر صاحب کا کلام اس وقت تک جتنا شائع ہو چکا ہے اس کے دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ شاعر پیدا ہوئے ہیں اور جب وہ کوئی شعر کہتے ہیں تو کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ کسی شخص کا شاعر پیدا ہونا یا جذبات سے متاثر ہو کر کوئی شعر کہنا اسکو ضروری نہیں قرار دیتا کہ جب وہ کوئی شعر کہے تو اچھا بھی ہو اور اس میں کوئی غلطی نہ پائی جائے اسلئے بحث کا دائرہ محدود ہو کر صرف اتنا رہجاتا ہے کہ اصغر کا کلام کیسا ہے اور اس پر اگر دیانت دارانہ تنقید کی جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔

میں اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زیادہ بار اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں اس لئے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں، لیکن مجملاً و مختصراً سلسلۂ سخن میں اس موقعہ پر بھی اتنا ظاہر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اصغر صاحب جذباتی شاعر ہیں، فطرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اور جب اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے لئے ان کو موزوں الفاظ مل جاتے ہیں تو بے مثل شعر کہہ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوتے تو شعر بھی ناقص رہجاتا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اصغر صاحب کے خلاف یہ ہنگامہ زیادہ تر مذہبی اختلاف کی بنا پر ہے یعنی سرکوب صاحب چونکہ شیعہ پارٹی کے سردار ہیں اس لئے وہ اصغر صاحب کی مخالفت کرتے ہیں جنھوں نے الہ آباد ہوکر ایک جماعت شیعوں کی سنیوں کے خلاف فراہم کرلی ہے ــــ میں اس باب میں سوائے اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے نزدیک ایک انسان کا بدترین جذبہ یہی ہے کہ وہ اختلافِ مذہب کی بنا پر دوسرے انسان کا دشمن ہو جائے اور اگر اس میں کچھ بھی شائبۂ صحت ہے تو میں سرکوب صاحب سے تو نہیں، کیونکہ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں ہے لیکن اصغر صاحب کی بارگاہ میں ضرور عرض کروں گا کہ وہ اپنی انسانیت کو اس نوع کے ذلیل و رکیک جذبہ سے مجروح نہ کریں کیونکہ ایک حقیقی شاعر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں انسان بھی ہو اور انسانیت کا اقتضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کی مخالفت کرے۔

اگر شیعہ جماعت کی طرف سے واقعی کوئی زیادتی ہو، تو بھی اصغر صاحب کو انتقام کی پست سطح پر اُتر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو صوفی منش انسان ہیں اس لئے ان سے زیادہ اس رمز کو کون سمجھ سکتا ہے کہ:-

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

دو ادبی شاہکار

باب الاستفسار

ایک ادبی بحث

کچھ عرصہ ہوا جناب دردؔ شاہجہانپوری نے اپنی حسب ذیل غزل اشاعت کے لئے میرے پاس بھیجی :-

اُف کہ بربادیِ دل جی سے بھلاتے ہی بنی
پھر تری انجمنِ ناز میں آتے ہی بنی

یاد اب تک ہے وہ نیرنگِ جنوں کا عالم
ہر قدم پر سر پُر جوش جھکاتے ہی بنی

ہائے اس چشمِ ندامت کے وہ خاموش گلے
شکوۂ جور و ستم دل سے بھلاتے ہی بنی

توبہ تھرا اُٹھی جب سامنے ساقی آیا
بادہ پیتے ہی بنی جام اُٹھاتے ہی بنی

رحم کر رحم نہ چھیڑ اب دلِ مغموم کا ذکر
اُف وہ بستی جسے ویرانہ بناتے ہی بنی

آگیا فرق یہ کیوں آج تری فطرت میں
وقتِ حیرت تجھے کیوں سامنے آتے ہی بنی

چیخ اُٹھے، جب غمِ کونین سے دونوں عالم
کچھ سمجھ کر ہمیں یہ بار اُٹھاتے ہی بنی

ہائے مجبوریِ دل یاد کوئی جب آیا
نالہ کرتے ہی بنی اشک بہاتے ہی بنی

پردۂ گل سے کیا کس نے تقاضائے نظر
دھجیاں جیب و گریباں کی اُڑاتے ہی بنی

یاد جب آئی وہ کھوئی ہوئی دنیائے قفس
آگ گھبرا کے نشیمن کو لگاتے ہی بنی

ہر خلش میں تھا کچھ اس رنگ کا اے دردؔ سکوں
آرزومندِ ستم دل کو بناتے ہی بنی

میں نے ان کو جواب میں لکھا کہ غزل خوب ہے لیکن ردیف کا اقتضاء یہ ہے کہ مفعول ہر جگہ مونث ہو

اور آپ نے مونث و مذکر دونوں اس ردیف کے ساتھ استعمال کئے ہیں اس لئے مطلع کیجئے کہ اساتذہ کا طرزِ عمل کیا رہا ہے۔

درد صاحب نے جواب میں داغ کی ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں واقعی تذکیر و تانیث کی کوئی تفریق نہ تھی، میں نے پھر لکھا کہ دل صاحب سے دریافت کیجئے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے اس کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب درد صاحب کی طرف سے یہ ملا:۔

محترمی۔

سلام مسنون۔ تاخیرِ جواب کا باعث میری علالت تھی جناب کا استفسار قبلہ دل صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ "مصدر کی علامت یائے معروف سے بدلکر فصحائے دہلی بولتے ہیں اور مصدر کو بجائے فعل استعمال کرتے ہیں جیسے مٹھائی کھانی تھی لیکن فصحائے لکھنؤ کہتے ہیں کہ مصدر۔ اسم مذکر ہے اور کوئی اسم مذکر یائے تانیث کی تصریف قبول نہیں کرتا اس لئے مٹھائی کھانا لکھنا چاہئے لیکن فصحائے لکھنؤ کے کلام میں اکثر مثالیں اس کلیہ کے خلاف ملتی ہیں۔

ناسخ۔ اگر دہلیز چھونے کی تجھے تعزیر دینی تھی ہمارے ہاتھ بندھوا نپے دروازے کے بازو سے
امیر۔ آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہوگئی ہے چلئے چمن میں نرگس بیمار ہوگئی ہے
جلال۔ جب اٹھ کے جاتے کہ دم توڑتے دم نزع جو ہونی تھی وہ تمہارے ہی روبرو ہوتی

حضرت داغ کا یہ شعر

ذلتِ عشق سے ہے وہاں عزت شکوۂ آبرو سکے نہ بھی

یہاں نہ بنی کے ساتھ بات مقدر مانی جاسکتی ہے مگر

"جب رگ کا خون بستگی دم پر چاکِ دل کو رفو کئے نہ بنی"

میں مصرعۂ اولیٰ کے ساتھ کوئی لفظ مقدر نہیں سمجھا جاسکتا۔ میری رائے میں یہ مسئلہ زبان سے متعلق ہے اور زبان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں۔ تاہم میں حضرت نیاز کی قابلانہ رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتا ہوں۔" معلوم کرکے مجھے بھی بتانا" امید ہے کہ جناب رائے عالی سے سرفراز فرمائیں گے۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں جناب سے دریافت کیا تھا کہ آپ موجودہ شعراء میں سب سے زیادہ کس کو پسند فرماتے ہیں غالباً گرامی نامہ تحریر فرماتے وقت آپ کو اس استفسار کا خیال نہیں رہا میں اعادہ کرتا ہوں تغزل میں تنوعِ خیال سے کیا مقصود ہے ہندی شاعری اس نقطۂ نظر سے اُردو شاعری سے بہتر ہے یا کمتر۔ مسائل ذیل کو تغزل سے کیا تعلق ہے اور اگر نہیں ہے تو مستند شعراء کے کلام میں اس قسم کے اشعار کیوں ملتے ہیں۔

جبر و اختیار۔ بے ثباتی دنیا۔ انسان اور اس کی حقیقت۔ شکوۂ فلک۔ شکوۂ بے مہری زمانہ۔ مے و مینا۔

حافظ کا دیوان اس قسم کے مسائل سے بھرا پڑا ہے مولانا شبلی ''حیاتِ حافظ'' میں ان کو تنوعِ خیال کی مثالوں میں درج کرتے ہیں۔ اُردو شاعری میں بھی متقدمین سے لیکر متاخرین تک سب ہی اس پرکار بند نظر آتے ہیں برخلاف اس کے ہندی غزل میں یہ مسائل دیکھنے میں نہیں آتے۔

مجھ پر جناب کی بڑی نوازش ہوگی اگر شرح و بسط کے ساتھ اس استفسار پر روشنی ڈالیں۔ نیاز کیش

درد

(نگار) اس خط کے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر ضرور پہونچا کہ اس محل پر اہل دہلی و اہل لکھنؤ دونوں نے تذکیر و تانیث کے اختلاف سے اعتنا نہیں کیا ہے، لیکن مجھے اطمینان ابھی تک نہیں ہوسکا ہے اور اسلئے میں اساتذۂ فن سے اپیل کرتا ہوں کہ اس باب میں وہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

درد صاحب کے دیگر استفسارات کا جواب درج ذیل ہے:—

(۱) موجودہ غزلگو شعراء میں، حسرت موہانی سے زیادہ میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) تغزل میں تنوعِ خیال کا تعلق صرف انھیں جذبات سے ہونا چاہئے جو عشق و محبت کی دنیا کے لئے مخصوص ہیں اور یقیناً ہندی شاعری اس لحاظ سے زیادہ دلکش ہے اُردو شعراء نے فلسفہ و تصوف وغیرہ

خدا جانے کیا کیا شامل کر کے غزل کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

جبر و اختیار، شکوۂ زمانہ، بے ثباتی دنیا وغیرہ سب کی غزل میں کھپت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ دائرۂ سخن وہی عشق و محبت ہو اور اس کی پوری پابندی اگر کسی نے کی ہے تو وہ صرف سعدی ہے۔ حافظ کا ذوق صرف رندانہ غزل گوئی ہے اور ایک بدمست رند جوش و ولولہ میں سبھی کچھ کہہ جاتا ہے، لیکن اس کو معیاری تغزل نہیں کہہ سکتے۔

اُردو فارسی شاعری کا فرق اس باب میں یہ ہے کہ فارسی زبان کی شیرینی و وسعت ہر مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح کھینچکر عشق و محبت سے ملا سکتی ہے اور اُردو میں اس کی گنجائش نہیں۔

نور و نار

گزارش :-

پیاری مرے خلوص بھرے آنسوؤں کا نور　　میرے جنوں کا راگ، مرے عشق کا سرور
پہونچا ہے دور کے کسی روشن دیار میں　　حُسنِ ازل کے دائمی فردوس زار میں
جس سرزمیں کو زہرہ و ناہید ہیں رواں　　جا کر جہاں ٹھہرتے ہیں تاروں کے کارواں
اُس سرزمیں سے آئی ہے تو میرے دیس میں　　موسیقیوں کی روح ہو عورت کے بھیس میں
آئی ہے تاکہ ٹھہرے یہاں رات کے لئے　　میرے غریب دل کی مدارات کے لئے
گو تو ہے ایک پیکرِ محسوس جانِ من　　آنکھیں ہیں تیرے حُسن سے مانوس جانِ من
لیکن ترا وجود طلسمِ خیال ہے　　تخلیقِ رنگ و نور کی حدِّ کمال ہے
آنکھیں تری بنی ہیں فرشتوں کے زہد سے

اے کہکشاں سے اُتری ہوئی پاک نازنیں　　ہیں تیرے انتظار میں اُس دیس کے مکیں
جا میرے غمکدے میں نہیں کچھ بجز الم　　ہے میری کائنات محبت کا تلخ غم
جا اپنے رنگ و نور سے معمور گھر میں جا　　اس غمکدے سے دور "مسرت نگر" میں جا

جواب :-

اے اُلفت و نیاز کے پابند نوجوان　　بہتر ہے ارضِ نور سے یہ تیرا خاکداں

میرے وطن میں عشرتِ جاوید ہے مکیں بے شک جمالِ زہرہ و ناہید ہے مکیں
میرے وطن میں نور کے چشمے بھی ہیں رواں

بے فائدہ گروہ "بیابانِ نور" ہے اُس نور زار میں مرا دل غم سے چور ہے
اُکتا گئی ہوں نور سے ہے نار کی تلاش جذباتِ آتشیں کے تپش زار کی تلاش
تیری جنوں نواز نگاہیں عجیب ہیں ڈوبی ہوئی گداز میں آہیں عجیب ہیں
آئی ہوں تیری چاہ میں میں کتنی دور سے برباد کر نہ مجھ کو عبث ذکرِ نور سے
آغوشِ اشتیاق میں اس طرح لے مجھے
بس اپنے دل کی آگ سے تو پھونک دے مجھے

عدم

فراق

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

مرے نیاز عشق سے بسا ہے آستاں ترا
مری شمیم شوق سے کھلا ہے گلستاں ترا
ہر اک خواب ہے مرا اگرچہ رازداں ترا

جنوں فشانیاں مری
ترے قریب ہیں بہت
بہت کہانیاں مری
تجھے حبیب ہیں بہت

مگر مجھے تری قسم ہنوز تجھسے دور ہوں

اگرچہ جذب عشق سے
جہاں ہے تو وہاں ہوں میں
نہاں ہوں کائنات سے
ترے لئے عیاں ہوں میں
تو نور ہے میں طور ہوں
تو راز ہے بیاں ہوں میں

مری طواف گاہ ہے ہر ایک رہگذر تری
وہیں گیا ہے دل مرا جہاں گئی نظر تری

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

حدود کا نشاں ہو کیوں
سجودگاہِ عام ــــ میں
مغائرت کا ذکر کیا
حدیقۃ السلام میں
کچھ امتیازِ "ما و تو"
نہیں ہے اس نظام میں

حریم نازِ دوست میں کچھ احتساب ہی نہیں
جہاں حبیب ہے وہاں کوئی حجاب ہی نہیں

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

تصورات کے خدا
تصورات میں ہے تو!
تخیلات کی دعا
تخیلات میں ہے تو!
مری حیات تجھسے ہے
مری حیات میں ہے تو

مرے ہر اک خواب میں ترا خیال ہی تو ہے
مرے ہر اک خیال میں ترا وصال ہی تو ہے

مگر مجھے تری قسم
ہنوز تجھسے دور ہوں

روش صدیقی

فردوسِ خیال

آسماں رات کو تاروں سے بھرا ہوتا ہے　　ہاں جب ایسے میں کوئی نغمہ سرا ہوتا ہے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

چاندنی رات میں جب مست ہوا چلتی ہے　　جیسے پنکھا کوئی مخمور پری جھلتی ہے
میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

گرمیوں کی شبِ پُرکیف کے سناٹے میں　　گلفروشوں کی جب آتی ہیں حسیں آوازیں
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

فصلِ باراں میں جب آتی ہے گھٹا گھر گھر کے　　اور جذبات اُبھرتے ہیں دلِ کافر کے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

جب گلی میں کوئی درویش صدا کرتا ہے　　خوش رہو، میرے میاں! سائیں دُعا کرتا ہے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

راہ میں جب کوئی دوشیزہ نظر آتی ہے　　اور بُوئے زلف کی چلتے میں سُنگھا جاتی ہے
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

کوئی کہتا ہے جب افسانۂ حُسن و اُلفت　　کھولتا ہے دریچۂ حُسن و الفت
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

یاد جب آتے ہیں عیش و غمِ اُلفت کے دن　　ہائے وہ عشق کی پُرلطف اذیت کے دن
میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

دل کے ارمان ہوا کرتے ہیں جب زیرِ غور　　دل تو جذبات کی شدت سے دھڑکتا ہے، اور
میں کسی دوسری دُنیا میں چلا جاتا ہوں

اخترؔ انصاری

اعتراف شکست

مجھے اعتراف شکست ہے
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب

نہ حریف لذت غم ہوا
نہ خموش رہ کے جفا سہی
نہ رہین درد و الم ہوا
نہ ستم سہے ، نہ بلا سہی
نہ وفا کا پاس کیا ذرا
نہ ملامت رفقا سہی
یہی ننگ عشق میں کم ہے کیا؟
یہ ادائے لطف و کرم ہے کیا؟
یہ جدید طرز ستم ہے کیا؟
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب
مجھے اعتراف شکست ہے

تری ہر نگاہ بلا اثر
مرے دل پہ اب بھی ہے حکمراں
تری ہر ادائے جمیل کا
نہ دل سے اب بھی ہوں قدرداں
ترا ہر تبسم دلربا
مرے واسطے اب بھی ہے جانستاں
مگر اے جمیلۂ خوبرو
نہ وہ میں ہوں اور نہ وہ آرزو
نہ وہ شوق ہے ، نہ وہ جستجو
نہ خدا کے واسطے چھیڑ اب
مجھے اعتراف شکست ہے

یحیٰی نقوی

عورت سے خطاب

ایک مشتِ خاک کو جب مل گیا حُسن و شباب
ساغرِ گل میں نظر آئی محبت کی شراب

نور کے سانچے میں ڈھل کر آئی تصویرِ بہار
اب نظر آنے لگی آغوشِ آدم کا نگار

اے کمالِ صنفِ نازک، اے محبت کی پری
تیرے جلوے عیش پرور، تو ہے جنت کی پری

تو بہشتی حور تھی، اب باوفا عورت بنی
روح کی پاکیزگی سے پیکرِ عصمت بنی

آسمانِ آرزو کا تو کوئی سیّارہ ہے
تو شہابِ حُسن ہے، یا دلربا مہ پارہ ہے

تیری آمد سے ہوا قائم محبت کا نظام
ورنہ رہ جاتی یونہی تکوینِ عالم ناتمام

تو دلوں کے واسطے لائی ہے صہبائے حیات
موجزن تیرے اشاروں پر ہے دریائے حیات

تیری آنکھوں سے عیاں ہے ایک طوفانِ شباب
شعلۂ سینا ہے تجھ میں، تو ہے جنت کا جواب

تیرے جلووں کی نمائش منظرِ جوشِ جمال
معجزہ قدرت کا، ترکیبِ عناصر کا کمال

تو وہ قوت ہے نہیں جسکی ہے کوئی انتہا
تو ہے ایسی انتہا، جس کی نہیں ہے ابتدا

کہربائی قوتوں سے کام جب لیتی ہے تو
سنگدل کو مسکرا کر موم کر دیتی ہے تو

شعر و موسیقی کے نغمے ہیں تری آواز میں
اک جہانِ دلکشی ہے تیرے ہر انداز میں

مرد کی مونس ہے تو، اور ہمدم و دمساز ہے
اور تکوینِ جہاں کا تو مقدس راز ہے

عیش کی تصویر تو ہے رو کلفت کے لئے
ہے محبت تیرے دم سے، تو محبت کے لئے

آسمانِ عشق کا تو خوشنما مہتاب ہے
تو سراپا ذوقِ انسانی کا دلکش خواب ہے

فطرت واسطی

Bombay

بمبئی کے ساحل پر

کارواں در کارواں رنگینیاں | میکدہ در میکدہ کیفِ شراب
حُسن کی رعنائیوں کا ازدہام | چاندنی کی نزہتیں زیرِ نقاب
جلوۂ فطرت کی لالہ کاریاں | شاہدِ معنی کا شیریں پیچ و تاب
ہلکی ہلکی وہ گلابی ساریاں! | ریشمی زرتار پلّو برق تاب
وہ شلوکے جامدانی، نیلگوں! | اُن سے وہ چھنتا ہوا رنگِ شہاب!
وہ نگاہیں وہ تڑپتی بجلیاں! | اور وہ شاداب چہرہ وہ شباب!
ہلکا ہلکا سا تبسم زیرِ لب | حُسن کی گستاخیاں وہ بے حجاب!
قامتِ نازک میں ہلکی سی لچک | نرم رو موجوں میں جیسے پیچ و تاب
وہ تمناؤں کے پیکر دلنواز! | "زندگی ہے یا سکون آمیز خواب"

شام کی رنگینیاں ہیں بیشمار | چھپ رہا ہے رفتہ رفتہ آفتاب
حُسن و اُلفت کا اعادہ ہو چکا | مانگ لے کچھ اے دلِ حسرت مآب

بمبئی کے ساحلوں کو اے شمیم
اک نظر ہی دیکھ لینا ہے ثواب

شمیم نعمانی نیازی

انقلاب

چل چکا ہے خوابِ ہستی پر فسونِ انقلاب　　"خود فراموشی" بدلکر "خود نما" ہو جائیگی
بڑھ رہا ہے شعلۂ مغرب بداماں صد خروش　　آتشیں بادِ مخالف جانفزا ہو جائیگی
ڈالدی جائیگی پائے غم میں زنجیرِ شکست　　مشکلِ حالات خود "مشکلکشا" ہو جائیگی
روند ڈالا جائیگا اقبالِ ظلمت پاؤں سے　　"تیرگی" مٹ کر "جہاندار ضیا" ہو جائیگی
سر کو ٹکرائیگا دیواروں سے "دورِ انحطاط"　　چار سو شانِ ترقی رونما ہو جائیگی!
ٹوٹ جائیگا جہادِ قومیت کا سلسلہ　　روحِ مذہب - دیکھنا بے آسرا ہو جائیگی
ٹھوکریں کھائیگا پھر سرمایہ دارِ حیلہ گر　　حکمرانی "زہر" - دولت "سنکھیا" ہو جائیگی
زندگی کی کشمکش سے ہوگی تکمیلِ وجود　　"شامِ غربت" صبحِ عیشِ جانفزا ہو جائیگی!

خود بخود فطرت پہ تب گویا شباب آجائیگا
کروٹیں لیتا ہوا پھر "انقلاب" آجائیگا

اختلاطِ مشرق و مغرب میں وقفہ تا بکے　　دیکھنا اُڑ جائیگی مذہب پرستی ایکدن
حورِ جنت اور انساں کے تقدس کا خیال　　لوگ سمجھیں گے اسے ظلمت پرستی ایکدن
عقل پست و فہم پست، انسانکا سوز و ساز پست　　دولتِ اسلاف ہو جائیگی سستی ایکدن؟
برق کی ہلکی سی رَو اسکو جلا دیگی کبھی　　یا سراپا برق بن جائیگی ہستی ایکدن

ہے اسیدم جستجوئے "تازہ ویرانی" مجھے
عرش کے تارے دکھا دے میری حیرانی مجھے

شمیم نعمانی نیازی

جنوری ۳۵ء کیلئے

حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر بلحاظ انفرادی خصوصیات
(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ
(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰،۲۰ شعر
(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰،۲۰ شعر
(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
(۱۱) دکن اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۲) پنجاب اور اُردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کی خدمات
(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ و نعت میں
(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری
(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور بہترین
(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور بہترین
(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا
(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا
(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعرا جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
(۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟
(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۳۰) مستقبل میں آپ کو اُردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟
(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعرا جنھوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو
(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا۔
(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعرا ہیں جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔

فہرست مضامین مجموعۂ استفسار و جواب

رۂ معصوم (۷۵) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۷۶) ابوالعتاہیہ کے متعلق چند سوالات (۷۷) فرقۂ معتزلہ کے مختلف
رتے (۷۸) ایک برہم مستفسر کے چند استفسارات (۷۹) کھدر، جن، تعویذ، اُردو لغت (۸۰) بت غالیہ مو (۸۱) اسمائے نجوم
۸۲) بروج اسمار کی حقیقت (۸۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۸۴) ہسپانیہ و اندلس (۸۵) حکومت مصر (۸۶) اسماعیلیہ
ہب (۸۷) اعداد متحابہ (۸۸) ادبیات (۸۹) ستاروں کی تعداد (۹۰) بوقلموں (۹۱) کلام مسجع (۹۲) علی محمد باب (۹۳)
ہب و عقل (۹۴) طوفان نوح (۹۵) دیباچہ کی اصلیت (۹۶) رامائن و مہا بھارت (۹۷) ابدالی اور درانی (۹۸)
لعۂ گوالیار (۹۹) سید جلال (۱۰۰) خلفاء عباسیہ مصر (۱۰۱) ہنولا اور اجرام فلکی (۱۰۲) مرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۳)
نح فروش نیشاپور (۱۰۴) تشبیہات چشم (۱۰۵) عرب میں گودنے کا رواج (۱۰۶) دیبل کی جائے وقوع (۱۰۷) طبقۂ نسوال
ور تعلیم (۱۰۸) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۱۰۹) شاعری کی بعض اصطلاحیں (۱۱۰) عربی میں تقسیم علوم (۱۱۱) حقیقت و
باز (۱۱۲) عالم یقین و عالم جبروت (۱۱۳) چند اصطلاحات شاعری (۱۱۴) صلوات الوسطیٰ (۱۱۵) ظفر کا غیر مطبوعہ کلام۔
۱۱۶) اوزون فردوسی (۱۱۷) تاناشاہ (۱۱۸) تھیاسوفکل سوسائٹی (۱۱۹) ٹمی چری (۱۲۰) فیروزہ حصار (۱۲۱) برہمو سماج
۱۲۲) مستنا پور (۱۲۳) اڑھائی دن کا جھونپڑا (۱۲۴) مثنوی مولانا روم کا ایک شعر (۱۲۵) پرانا قلعہ داتا گنج لاہوری (۱۲۶)
نزل اور اصطلاح صوفیہ (۱۲۷) منصور حلاج اور نعرۂ قابلی فرعون (۱۲۸) بعض الفاظ کے معنے (۱۲۹) کس کا شعر ہے۔
۱۳۰) کیکاؤس و کیخسرو (۱۳۱) ملا دوپیازہ کی قبر (۱۳۲) میر شیر علی افسوس (۱۳۳) کیا زیب النساء کے شعر ہیں (۱۳۴)
ری ییسن کیا ہے (۱۳۵) الف لیلہ (۱۳۶) شیخ بدر عالم شیخ بایزید (۱۳۷) زبان اُردو کی ابتداء۔ سہرا (۱۳۸) عشق محبت
۱۳۹) دوسرے کروں میں آثار حیات (۱۴۰) اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال (۱۴۱) انکل سام (۱۴۲) استعارے
ا شاعری (۱۴۳) امیر دوست محمد خاں (۱۴۴) حافظ کے دو شعر (۱۴۵) ہم اسد اللہم وہم اسد اللہیم (۱۴۶) فرقۂ اسماعیلیہ
۱۴) ابن رشد و شیخ الرئیس (۱۴۸) ابوالفضل کی قبر اور غالب کا ایک شعر (۱۴۹) عرفی اور شاہزادہ سلیم (۱۵۰) زحل اراونس
توبن (۱۵۱) عمر انسانی (۱۵۲) نسبتی تھانیسری (۱۵۳) عہد اسلام کے سکے (۱۵۴) سرطان (۱۵۵) ملکۂ جین (۱۵۶)
ورۂ فاتحہ (۱۵۷) ہالہ اور مد و جزر (۱۵۸) مونٹ کارلو (۱۵۹) حالی کا ایک شعر (۱۶۰) نظریۂ تکہرب (۱۶۱) انسولین۔
۱۶۲) انقضائے انسانی کی دوسری منزل (۱۶۳) قصر الحمراء (۱۶۴) بعض اصطلاحات کا ترجمہ (۱۶۵) ارسطو کا مدفن
۱۶۶) یاجوج ماجوج (۱۶۷) مثنوی کا ایک شعر (۱۶۸) ہندی اور عربی شاعری (۱۶۹) نیو پلوٹنزم (۱۷۰) بیدل کے
بعض اشعار (۱۷۱) مثنوی کا ایک شعر (۱۷۲) اپریل فول (۱۷۳) مشتری (۱۷۴) امریکہ کی دولت۔

جتنا کہ اپنے لڑکے کی آوارگی سے اغماض کرنا۔ اسی پر آپ اور صورتوں کو بھی قیاس کر لیجئے۔ مثلاً آپ کو اپنی بیوی کی عصمت پر شبہ ہو تو کیا کرنا چاہئے؟ وہی جو آپ کی بیوی اُس صورت میں کرتی جب اسے آپ کی عصمت پر شبہ ہوتا وہ آپ کو سمجھاتی، مناتی، ڈراتی، دھمکاتی اور اگر اس پر بھی آپ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تو وہ خلع لیکر کوئی اور شوہر تلاش کر لیتی لیکن یہ تو نہ کرتی کہ آپ کو پکڑ کر پردہ میں بٹھا دیتی یا آپ کے کان اور ناک کاٹ لیتی یا چھُرا لیکر آپ کو ذبح کر دیتی جیسا کہ اکثر مردوں کے متعلق آئے دن سُنا جاتا ہے۔ ان مثالوں کی وجہ سے مجھے مجبوراً اس جگہ ایک اور ایسی بحث کا چھیڑنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے میں چاہتا تھا کہ ابھی شروع نہ کروں۔

میں نے اپنے اکثر تعلیم یافتہ احباب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ چونکہ مرد جسمانی اعتبار سے عورت کے بہ نسبت قوی ہوتا ہے اس لئے اُس میں اور عورتوں میں کسی طرح کی مساوات ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس جسمانی تفوق کی بنا پر مرد عورتوں کو نہ صرف پردہ میں رکھ سکتا ہے بلکہ عند الضرورت اُن کے ساتھ ایسے بہیمانہ افعال کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ مرد کا عورت سے جسمانی قوت میں زیادہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت عورت کو مرد کا مطیع رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن کیا اس منطق کا لازمی اقتضا یہ نہ ہوگا کہ آج سے بجائے اسکے کہ آپ اپنے گھوڑے پر سواری کریں آپ کا گھوڑا آپ پر سواری کرنے لگے گا اسلئے کہ وہ یقیناً جسمانی قوت میں آپ سے زیادہ ہی ہے۔ غالباً صرف یہ ایک مثال آپکو اُس احمقانہ مغالطہ سے نکالنے کے لئے کافی ہو جائے گی کیونکہ بدقسمتی سے اس کائنات کی بیشتر مخلوق جسمانی اعتبار سے آپ کے بہ نسبت قوی تر ہے کسی اور مخلوق کو جانے دیجئے خود انسانوں ہی کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جسمانی اعتبار سے اتنا فرقِ عظیم ہے کہ اگر یہ اُصول جائز قرار دے لیا جائے تو آج ہم سب اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھنے کے بجائے افریقہ کے ریگستانوں میں بوجھ ڈھوتے پھریں گے۔

(باقی آیندہ)

محمد اعظم خاں، ام۔ اے

ضرورت ہے شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئے، اور عمر ۳۰ سال سے زاید نہ ہو۔ یوپی کے باشندہ کو ترجیح دی جائے گی — اڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں۔

خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے:— ا۔ ن۔ بذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

بدمعاش

چالیس دن سے وہ برابر چل رہا تھا، ہر جگہ کام تلاش کر رہا تھا اور اُس نے اپنا وطن ولیا وری کام نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک اچھا نجار ستائیس سال کا قوی اور شریف انسان دو ماہ سے خاندان والوں کی روٹیاں توڑ رہا تھا۔ وہ جو کہ خاندان کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اُس کے لئے کرنے کو کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ عام بیروزگاری کے سلسلے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے۔ گھر میں روٹی کی قلت تھی، دونوں بہنیں کام کاج کرتیں لیکن مضبوط اور تنومند راڈل دوسروں کے ٹکڑے توڑتا اور خود کچھ نہ کرتا تھا۔ اُس کے کرنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

اُس نے گاؤں کے اکثر و بیشتر آدمیوں سے سُنا تھا کہ وسطِ فرانس میں کام مل سکتا ہے۔

اس لئے وہ کاغذوں اور اسناد سے مسلح ہوکر اور سات روپیہ لیکر چل کھڑا ہوا کاندھے پر ایک نیلے رومال میں جو لکڑی کے سرے سے بندھا تھا ایک جوڑا جوتا ایک قمیص اور دو پتلون لپٹے ہوئے تھے۔

وہ بغیر سستائے ہوئے دن رات دھوپ اور بارش میں چلا آرہا تھا اور اُس سرزمین کا جہاں کاریگروں کو کام ملتا ہے کہیں پتہ نہ تھا۔

پہلے پہل اُس کا مصمم ارادہ تھا کہ چونکہ وہ نجار ہے اس لئے سوائے نجاری کے اور کوئی کام نہ کرے گا۔ لیکن تمام کارخانوں میں جہاں جہاں اُس نے اپنے آپکو پیش کیا اسے کہا گیا کہ اُنھوں نے کام کی کمی کے باعث آدمیوں کو کم کر دیا ہے اس لئے اس نے بھی اپنے روپیوں کو قریب الختم دیکھکر ارادہ کرلیا کہ جو کام بھی اسے مل جائیگا کرلیگا۔

اس کے بعد وہ باری باری مزدور، سائیس اور سنگ تراش کا کام کرتا رہا۔ وہ لکڑیاں چیرتا، کنوئیں کھودتا، کیچڑ بہاتا، ایندھن کے گٹھر باندھتا، پہاڑوں پر بھیڑوں کو چراتا، اور سب کچھ کرتا، صرف چند پیسوں کی خاطر۔ کیونکہ اُسکو صرف عارضی کام ملتا تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو نہایت ہی کم اُجرت پر پیش کرکے کاشتکاروں اور کام لینے والوں کو لالچ دلانے کے بعد۔

اب ایک ہفتہ سے اُس کو کوئی کام نہ ملا تھا۔ اُس کے پاس ایک جھنجی کوڑی نہ تھی۔ اُس کی زندگی کا انحصار اُن

چند روٹی کے ٹکڑوں پر تھا جن کو اُس نے راہ چلتے بھیک سے حاصل کیا تھا۔

جھٹ پٹا ہونے لگا تھا، اور تھکا ماندہ راڈل بھوکا، شکستہ دل، برہنہ پا، سڑک کے کنارے گھاس پر چلا جا رہا تھا کیونکہ جوتے کبھی کے پھٹ چکے تھے۔ خزاں کا آخری موسم تھا اور سنیچر کا دن۔ گہرے سیاہ بادلوں کا آسمان پر ہوا تعاقب کر رہی تھی اور درختوں کی پتیاں زور سے ہل رہی تھیں۔ ہوا سے بارش کی آمد کا احساس ہو رہا تھا۔ دیہاتی علاقہ اسوقت بالکل سنسان تھا۔ کھیتوں میں کہیں کہیں لانبی گھاس ضرور اُگی ہوئی تھی ورنہ ساری زمین کفِ دست کی طرح بالکل صاف تھی۔

راڈل بھوکا تھا —— ایک گرسنہ درندے کی طرح بھوکا، اُسے ایسی وحشیانہ بھوک لگ رہی تھی جو بھیڑیوں کو انسانوں پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔ تھکن کی وجہ سے وہ جلد جلد چلنے لگا تاکہ راستہ جلد طے ہو جائے اور سُرخ آنکھوں اور خشک منھ کے ساتھ اُس نے اپنی لکڑی اس موہوم اُمید پر اُٹھالی کہ سب سے پہلے راہرو کو جو راستے میں اپنے مکان کو واپس جاتا ہوا ملیگا اس کو مار کر روٹی چھین لیگا۔

اُس نے سڑک کے کنارے ہل چلائی ہوئی زمین پر اس خیال سے نظر ڈالی کہ کچھ آلو ہی ملجائیں۔ اگر آلو ملجاتے تو وہ لکڑیاں جمع کرتا، کسی گڑھے میں آگ روشن کرتا اور اپنا پیٹ بھر لیتا۔

لیکن یہ ختم سال کا زمانہ تھا اور گزشتہ شام کی طرح اُس کو کچھ کچے ٹنڈے کھانے کو ملے جن کو چبتے چلتے اُس نے کھیت سے اُکھاڑ لیا تھا۔

گزشتہ دو دن سے وہ بہ آواز بلند باتیں کر رہا تھا اور اُس کی رفتار کو اُس کے خیالات کے انہاک نے تیز تر کر دیا تھا اس سے قبل اُسے یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ جس کام کو اُس نے جی لگا کر اپنی ساری کوششیں صرف کر کے سیکھا تھا۔ محض بیکار تھا اور اب تھکن، تلاش معاش کا دیوانہ وار تعاقب، اور اس کے متعلق کورے جواب، ذلتیں، راتوں کو سبزے پر سو جانا، فاقے، لوگوں کا اُس کے ساتھ نفرت انگیز سلوک، اُن کا متواتر سوال کرنا: "تم اپنے گاؤں میں کیوں نہیں رہتے ؟" اپنی قوت بازو سے کام نہ لے سکنے کا رنج، بچھڑے ہوئے والدین کی یاد، کوڑی کوڑی کی محتاجی —— یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اُس کے دل کو نفرت و غصہ سے معمور کرتی جا رہی تھیں جو ہر روز بلکہ ہر گھنٹہ ہر منٹ بڑھ رہا تھا۔ اور بے اطمینانی کی ایک فریاد مختصر جملے کی صورت میں بلا ارادہ اُس کے مُنھ سے نکل جاتی تھی۔

روڑوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے جو اُس کے برہنہ پاؤں کے نیچے لڑھک رہے تھے وہ چیخ اُٹھا۔ "مصیبت مصیبت —— حرامزادی مصیبت —— دو آنے نہیں ملے —— دو آنے تک نہیں ملے —— اور اب بارش ہو رہی ہے۔

حرامزادی بارش"۔

وہ قدرت کی ناانصافی پر جل رہا تھا اور سارے انسانوں کو برا ٹھیرا رہا تھا۔ کیونکہ اندھی فطرت ناانصاف بے رحم اور ظالم ہے۔

"حرامزادی" اُس نے ہلکے بھورے رنگ کے دھوئیں کو چھتوں میں سے نکلتے ہوئے دیکھ کر دانت پیستے ہوئے پھر دہرایا۔ اور سوچنے لگا کہ اُن میں سے کسی ایک مکان میں گھس کر اُس کے رہنے والوں کو مارے اور اُن کی بجائے خود دسترخوان پر جم جائے۔

"مجھے زندہ رہنے کا اب کوئی حق نہیں —" وہ کہنے لگا۔ "جبکہ وہ مجھے بھوکوں مار ڈالنا چاہتے ہیں — اور پھر میں چاہتا کیا ہوں؟ صرف مزدوری کرنا — سور کے بچے! اور اُس کے اعضا کی تکلیف، بھوک کی تکلیف اور دلی اذیت نے ایک اُس قسم کی شوریدہ سری پیدا کردی جس کا باعث شراب ہوا کرتی ہے۔ اور اُس کے دماغ میں یہ معمولی خیال پیدا ہوگیا کہ:- "مجھے زندہ رہنے کا حق ہے اس لئے کہ میں سانس لیتا ہوں، اس لئے کہ ہوا ہر ایک کے لئے ہے۔ کسی کو مجھے روٹی سے محروم رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

مینھ برس رہا تھا، موسلا دھار اور منجمد کرنے والا۔ وہ ٹھیر گیا اور بڑبڑانے لگا:- "ہائے مصیبت — گھر پہنچنے سے پہلے اور ایک مہینہ سڑکوں پر بسر کرنا پڑے گا —" کیونکہ اب وہ اپنے گاؤں کو واپس جا رہا تھا اس خیال سے کہ وہاں کچھ نہ کچھ کام ملنا آسان تھا — بشرطیکہ وہ ہر اُس کام کو کرنے پر آمادہ ہو جو اُس کو مل جائے۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ سڑکوں پر مارا مارا پھرے جہاں ہر شخص اُس کو مشتبہ نظر سے دیکھتا تھا۔

نجاری کا بازار چونکہ سرد تھا اس لئے وہ مزدوری بیلداری یا سنگتراشی کر لیا کرے گا اور اگر اس طرح روزانہ صرف دس آنے مل جایا کریں تو بس گزر کے لئے کافی تھا۔

اُس نے اپنے پھٹے رومال کو گردن پر لپیٹ لیا تاکہ ٹھنڈا اور سرد پانی پشت اور سینے پر نہ ٹپکے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس کو احساس ہوگیا کہ کپڑے اندر تک بالکل بھیگ گئے ہیں اور اُس نے حسرت سے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی — ایک بے زبان جانور کی سی حسرتناک نظر جو یہ نہ جانتا ہو کہ اپنے جسم یا سر کو کہاں چھپائے اور دنیا میں کہاں پناہ لے۔

رات نے تاریکی میں کھیتوں کو پوشیدہ کر دیا۔ کچھ فاصلے پر ایک مرغزار میں اُسے ایک سیاہ ٹیلہ سا نظر پڑا — گائے! وہ گڑھے پر سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بغیر کسی خیال کے وہ کر کیا رہا ہے، گائے کی طرف جانے لگا۔

جونہی وہ قریب پہونچا گائے نے اپنا سر اُٹھایا راڈل سوچنے لگا:۔ "کاش ایک کٹورا ہی ہوتا تو کچھ دودھ پی لیتا" وہ گائے کو گھور کر دیکھنے لگا اور گائے اُس کو گھورنے لگی۔ اس کے بعد یکایک اُس نے زور سے ایک لات لگائی اور کہا "اُٹھو!" گائے آہستہ آہستہ اُٹھ گئی اور اُس کا وزنی تھن لٹکنے لگا۔ اس کے بعد وہ اُس کی ٹانگوں کے درمیان چت لیٹ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کے گرم اور متعفن تھنوں کو دبا کر بہت دیر تک دودھ پیتا رہا۔

لیکن برفیلی بارش اور زور سے ہونے لگی اُسے سردی لگ رہی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے اُسی مکان کو دیکھ رہا تھا جس کے دریچے کی روشنی درختوں میں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔

گائے پھر دوبارہ بیٹھ چکی تھی۔ وہ بھی اُس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اُس کی دی ہوئی غذا کے شکریہ میں اُس کا سر سہلانے لگا۔ شام کی سرد ہوا میں گائے کی کثیف اور بدبودار سانس اُس کے نتھنوں سے اس طرح نکل کر جیسے دو نلکیوں سے بھاپ نکلے، اس کے منھ پر لگ رہی تھی۔

"تجھے تو سردی نہیں لگ رہی ہے" اُس نے کہا۔

پھر وہ اپنے ہاتھ اُس کے سینے اور ٹانگوں پر پھیرنے لگا تاکہ گرم ہو جائیں۔ پھر اُسے اُس کے گرم پیٹ کے نزدیک گٹھری بن کر لیٹنے اور رات گزار دینے کا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے جگہ نکال کر اپنا سر اُس کے تھن کے قریب جو ابھی ابھی خالی ہوا تھا رکھ دیا اور پھر تھک کر چوُر چوُر ہونے کے باعث اُس کی آنکھ لگ گئی۔

کئی مرتبہ وہ پشت یا سینہ اکڑ جانے کی وجہ سے جاگ اُٹھا اور پھر دوسرے حصۂ جسم کو جو ہوا کے رُخ پر تھا جانور کے جسم سے لگا کر فوراً ہی غافل سو گیا۔

مُرغِ سحر کی بانگ نے اُسے بیدار کر دیا۔ صبح ہو رہی تھی بارش رُک چکی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا۔

گائے اپنی تھوتھنی زمین پر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھوں کے بل جھک کر اس کی چوڑی ناک کا بوسہ لیا۔ "خدا حافظ۔ میری سندری۔" اُس نے کہا —— تو بڑی اچھی گائے ہے —— خدا حافظ۔"

اس کے بعد اُس نے پھٹا کوٹ پہنا اور چل کھڑا ہوا۔

دو گھنٹے تک وہ سیدھا ایک ہی سڑک پر چلتا رہا۔ اس کے بعد کچھ ایسا تھک گیا کہ بے اختیار ہو کر گھاس پر بیٹھ گیا۔

اب دن نکل چکا تھا کلیسا کے گھنٹے بج رہے تھے اور عورتیں سفید ٹوپیاں اور مرد نیلا لباس پہنکر پیادہ یا گاڑیوں میں ہمسایہ گاؤں کی طرف اتوار کا دن اپنے دوستوں یا عزیزوں کے ساتھ گزارنے کے لئے جانے لگے۔

ایک موٹا کاشتکار تقریباً بیس بھیڑوں کو جن کی تنظیم اور باقاعدگی ایک تیز قدم کُتّے کے ذمہ تھی ہانکتا ہوا چلا جا رہا تھا راڈل نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "کیا آپ کے پاس کچھ کام مل سکتا ہے؟ —— ایک ایسے مزدور کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو" اس نے بُری نظروں سے دیکھ کر کہا "میرے پاس اُن لوگوں کو جو سڑک پر ملا کرتے ہیں کوئی کام نہیں"۔

نجّار پھر دوبارہ سڑک پر بیٹھ گیا۔

وہ بہت دیر تک گاؤں والوں کو دیکھتا رہا کہ کوئی اچھی، مہربان شکل والا نظر آئے تو پھر اُس سے درخواست کرے۔ اُس نے ایک بڑے آدمی کو جو فراک کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک طلائی زنجیر اُس کے پیٹ پر پڑی ہوئی تھی منتخب کیا۔ اس نے کہا "میں دو ماہ سے روزگار تلاش کر رہا ہوں۔ ابتک کوئی نوکری نہیں ملی اور اب میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے"

مالدار آدمی نے جواب دیا، "کیا تم نے وہ اعلان جو اِس ضلع کے حدود پر چسپاں ہے نہیں پڑھا کہ یہاں بھیک کی ممانعت ہے، میں یہاں کا حاکم ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم یہاں سے فوراً نہ چلے گئے تو میں تم کو گرفتار کروا دونگا۔

راڈل کا ضبط رخصت ہوتا جا رہا تھا اس نے جھلا کر کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں تو مجھے گرفتار کرلیجیے، کم از کم میں بھوکا تو نہ مروں گا" اور وہ پھر دوبارہ سڑک پر بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ بعد دو پولیس کے سپاہی سڑک پر آتے ہوئے نظر پڑے۔ وہ خراماں خراماں، ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ سورج کی کرنیں اُن کی چمکیلی چرمی ٹوپیوں، زرد چہروں اور نارنجی کلغیوں پر پڑ رہی تھیں اور وہ ایسے رعب و داب سے چل رہے تھے گویا کہ وہ مجرموں کو ڈرانے اور اُن کو خوفزدہ کرکے بھگا دینے کے لئے آرہے ہیں۔

نجّار سمجھ گیا کہ وہ اُس کے لئے آرہے ہیں لیکن وہ اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کو اُن کا مقابلہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ وہ گرفتار کرلیں۔ اپنا بدلہ وہ بعد میں لیتا رہے گا۔

اپنے خاص فوجی انداز سے بے ڈھنگے قدم رکھتے ہوئے —— بطخ کی طرح —— وہ اس طرح چلے آرہے تھے گویا کہ اُنھوں نے اُس کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ پھر یکایک اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے اُنھوں نے اُس کو دیکھا، ٹھٹکے، اور اُس کو دھمکی دینے والی پُرخشونت آنکھوں سے گھورنے لگے۔ سارجنٹ پوچھتا ہوا آگے بڑھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"سستا رہا ہوں" اُس نے خاموشی سے جواب دیا۔

"تم آ کہاں سے رہے ہو؟"

"اگر میں تم کو اُن سارے مقامات کے نام بتلاؤں جہاں جہاں سے میرا گزر ہوا ہے تو کامل ایک گھنٹہ لگ جائیگا"

"جاؤ گے کس جگہ؟"

"ولیا وری کو"

"وہ کہاں ہے؟"

"مانشی میں"

"کیا وہ تمھارا وطن ہے؟"

"ہاں"

"تم نے اُس کو چھوڑا کیوں تھا؟"

"تلاش معاش کی خاطر"

سارجنٹ کانسٹبل کی طرف مُڑا اور اُس شخص کے لہجے میں، جو ایک ہی قسم کی جھوٹی بات متعدد مرتبہ سُنکر بھڑک اُٹھا ہو، چلّایا:-

"سب بدمعاش یہی کہتے ہیں۔ لیکن میں اُن کی چالوں کو سمجھتا ہوں"

اس کے بعد اُس نے پوچھا:-

"تمھارے پاس کچھ کاغذات ہیں؟"

"ہاں"

"مجھے دکھاؤ"

راؤل نے اپنی جیب سے کاغذات نکالے — سارٹیفکٹ، میلے، بوسیدہ، پھٹے پُرانے کاغذات، اور اُن کو افسر کے حوالے کردیا۔

دوسرے نے اٹک اٹک کر پس و پیش کرتے ہوئے، ہجے کر کے پڑھا اور ساتھ ہی ٹھوکٹھیک ظاہر کرتے ہوئے جھنجھلا کر اس طرح واپس کردیا جیسے کسی شخص کو اُس سے زیادہ مکّار آدمی نے دھوکا دیا ہو۔

چند منٹ غور کرنے کے بعد اُس نے پھر اپنی تفتیش شروع کردی:-

"تمھارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"نہیں"

"کچھ بھی نہیں"۔

"ایک پیسہ نہیں؟"

"ایک پیسہ نہیں"

"پھر تمھاری گزر کیسے ہو رہی ہے؟"

"جو کچھ مل جاتا ہے اُس پر"۔

"تو تم بھیک مانگتے ہو؟"

"ہاں جب ضرورت پڑے"۔ راؤل نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔

لیکن سپاہی نے کہا۔ "میں تم کو آوارہ گردی اور شاہراہ عام پر بھیک مانگنے کی "علت" میں گرفتار کرتا ہوں۔ کیونکہ نہ تو تمھارا گھر ہے اور نہ کوئی وجہ معاش۔ اور تم کو اپنے ہمراہ چلنے کا حکم دیتا ہوں"۔

نجار اُٹھ کھڑا ہوا۔

"جہاں چاہو لے چلو"۔ اُس نے کہا اور اپنے آپ کو دونوں افسروں کے درمیان کر کے، گو انھوں نے ابھی اِس کا حکم نہ دیا، اُس نے اپنی بات اس طرح پوری کردی:-

"چلو مجھے قید کردو۔ جب بارش ہو گی تو سر چھپانے کا تو آسرا رہے گا"۔

وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جس کے مکانوں کی چھتیں پون میل کے فاصلے سے بے برگ اشجار میں سے نظر آ رہی تھیں۔

جب وہ گاؤں میں سے گزر رہے تھے تو نماز کا وقت تھا۔ چوک آدمیوں سے پُر تھا۔ فوراً ہی ان کی دو قطاریں مجرم کو جاتا دیکھنے کے لئے بن گئیں جس کے ساتھ شریر لڑکوں کی ایک پوری فوج تھی۔ مرد اور عورت سب قیدی کو نفرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اُسکو سنگسار کر دینا چاہتے تھے، اُس کی کھال کو ناخنوں سے نوچ نوچ کر اُس کو قدموں سے کچل ڈالنا چاہتے تھے۔ اُن کو حیرت تھی کہ آیا وہ چور ہے یا کوئی قاتل۔ قصاب جو ایک پُرانا تجربہ کار سپاہی تھا کہنے لگا:- "وہ زانی ہے"۔ تمباکو فروش کا خیال تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اُسے ایک کھوٹی چونّی دی تھی۔ اور لوہار کو یقین تھا کہ بیوہ مالٹ کا لاپتہ قاتل جس کی تلاش پولیس چھ ماہ سے کر رہی تھی یہی تھا۔

میونسپل کونسل روم میں جہاں کہ پولیس والے اُسے لائے تھے راؤل نے حاکم کو اجلاس پر اور اُس کے پہلو میں مدرس کو بیٹھے دیکھا۔

مجسٹریٹ نے کہا:۔ "آہا! آخر تم آ گئے۔ میں نے کہا تھا کہ تم کو قید کر دیا جائیگا۔ اچھا سارجنٹ واقعہ کیا ہے؟"
سارجنٹ بولا:۔ "ایک آوارہ گرد جس کا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ ظاہری اسباب گزر اوقات۔ اُس کو اپنے بیان کے مطابق آوارہ گردی اور بھیک مانگنے کی علت میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اُس کے پاس سارٹیفکٹ اچھی حالت میں موجود ہیں۔"
مجسٹریٹ نے کہا:۔ "مجھے کاغذات دکھاؤ۔" اُن کو اُس نے لے لیا، پڑھا، پھر دوبارہ پڑھا۔ اور واپس کرتے ہوئے حکم دیا:۔ "اس کی تلاشی لو۔" راڈل کی تلاشی لی گئی۔ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔
"آج صبح کو تم سڑک پر کیا کر رہے تھے؟" اُس نے مزدور سے دریافت کیا۔
"میں کام کی تلاش میں تھا۔"
"کام کی تلاش —— شاہراہ عام پر؟"
"تو پھر کیا جنگل میں چھپ کر تلاش کرنے سے مجھے کام مل جاتا؟"
دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف النسل درندوں کی حریفانہ نفرت سے گھورنے لگے۔
مجسٹریٹ نے کہا:۔ "اب تو میں تمھیں چھوڑے دیتا ہوں لیکن پھر دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔"
"آپ قید ہی کر دیں تو بہتر ہے۔" نجار نے جواب دیا۔ "میں سڑکوں پر بہت کافی گھوم چکا۔"
"خاموش!" حاکم نے درشتی سے کہا۔
اس کے بعد اُس نے پولیس والوں کو حکم دیا:۔ "اس کو گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر لیجا کر چھوڑ دو۔"
"کم از کم مجھے کھانے کو تو کچھ دیجئے۔" مزدور نے کہا۔
وہ غضبناک ہو گیا:۔ "کھانا کھلایا جائے ابھی تو باقی رہ گیا ہے۔ آہا! ہا! ہا! خوب!"
لیکن راڈل بغیر کسی جھجک کے کہتا رہا:۔ "مجھے بھوکوں مرنے کے لئے چھوڑنا گویا جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور کرنا ہے اور یہ تم بڑے بڑے توند والوں کے لئے اچھا نہ ثابت ہوگا۔"
مجسٹریٹ کھڑا ہو گیا تھا اُس نے اپنا حکم دہرایا:۔ "اس کو یہاں سے جلد لیجاؤ۔ ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔"
دونوں پولیس والوں نے نجار کے بازو پکڑے اور روانہ ہو گئے۔ اُس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔
گاؤں سے نکل کر پھر ایک مرتبہ اُس نے اپنے آپ کو اُسی سڑک پر پایا۔ پولیس والے اُس کو دو میل تک لے گئے اور وہاں پہونچکر سارجنٹ نے کہا:۔

"چل رفوچکر ہو جا ــــ اِس علاقے میں پھر قدم نہ رکھنا ورنہ میں پھر ٹھیک کردوں گا"
راڈل جواب دئے بغیر اور اس سے بےخبر کہ وہ کہاں جا رہا ہے چل کھڑا ہوا۔ وہ سید ہا پندرہ یا بیس منٹ تک کچھ ایسی بدحواسی کے عالم میں چلتا رہا کہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔
لیکن یکایک جب وہ ایک چھوٹے سے مکان کے قریب سے جس کا نصف دریچہ کھلا ہوا تھا گزرا تو قورمہ کی مہک نے اُس کو کشاں کشاں دروازے کے سامنے لا کھڑا کیا۔
بھوک، حریصانہ، وحشیانہ اور دیوانہ کر دینے والی بھوک نے اس کے حواس سلب کر لئے۔
"خدایا ابکی دفعہ اُن کو کچھ نہ کچھ دینا "پڑیگا" اُس نے زور سے فریاد کناں لہجے میں کہا اور دروازے کو اپنی چھڑی سے کھٹ کھٹایا۔
کسی نے جواب نہ دیا۔ اُس نے چیختے ہوئے زور سے کھٹ کھٹایا: "ارے کوئی ہے؟ دروازہ کھولو!"
اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اُس نے دریچے کے پاس جا کر اُس کو اپنے ہاتھ سے ڈھکیلا اور باورچی خانے کی مقید ہوا، گرم گرم قورمے اور گوبھی کی مہک باہر آنے لگی۔
ایک چھلانگ میں بچارا کمرے کے اندر تھا۔ میز پر دو نشستیں تھیں۔ مکان والے اپنے کھانوں کو چولہے پر رکھ کر نماز کے لئے گئے ہوئے تھے۔ شراب کی دو بوتلوں کے درمیان روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔
راڈل نے پہلے روٹیوں پر حملہ کیا اور اس بے رحمی سے اُن کو توڑنے لگا گویا کسی آدمی کا ٹیٹوا دبا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ حریصانہ بڑے بڑے لقمے بنا کر کھانے لگا۔ لیکن فوراً ہی اُسے گوشت کی خوشبو چولہے کی طرف لےگئی اور اُس نے دیگچی پر سے تھالی اُٹھا کر کانٹے کو جلدی سے اندر ڈالا اور گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا۔ اس کے بعد اُس نے گوبھی، گاجر اور پیاز سے رکابی بھر لی اور اُس کو میز پر رکھ کر خود بیٹھ گیا۔ گوشت کے چار ٹکڑے کئے اور اس طرح کھانے لگا گویا اپنا ہی گھر ہے۔ جب اُس نے تقریباً سارا گوشت اور ترکاری کی کافی مقدار چٹ کر دی تو اُس کو تشنگی محسوس ہوئی اور وہ اُٹھ کر چولہے کے قریب سے ایک بوتل اُٹھا لایا۔
جونہی اُس نے شراب کو اپنے جام میں دیکھا اُس نے تاڑ لیا کہ برانڈی ہے ــــ شراب گرم ــــ اُسکی رگ رگ میں آگ لگا دینے والی! اسقدر سردی سہنے کے بعد یہ چیز اچھی رہی ــــ اور وہ پینے لگا۔
چونکہ مدت سے اُس نے نہیں پی تھی، اس لئے وہ اُس کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ دوسرا جام اُس نے بھرا اور دو گھونٹ میں چڑھا گیا۔ یکایک اُس کے چہرے پر رونق آگئی۔

وہ کھاتا رہا لیکن نسبتاً کم تیزی سے، چبا چبا کر اور روٹی کو شوربے میں تر کرکے۔ اُس کا سارا جسم خاص کر پیشانی جہاں خون کی روانی بہت تیز ہوگئی تھی، نہایت گرم تھی۔ یکایک فاصلے پر گھنٹے بجنے لگے، نماز ختم ہو رہی تھی۔ نجّار دفعتاً کھڑا ہوگیا اور بچی ہوئی روٹی کو ایک جیب میں اور برانڈی کی بوتل کو دوسری میں رکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دریچے کے پاس گیا اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

سڑک پر اب بھی سناٹا تھا۔ وہ چھلانگ مار کر باہر نکل گیا اور اپنی راہ ہولیا۔ لیکن بجائے شاہراہ عام پر جانے کے وہ کھیتوں میں سے جنگل کی سمت بھاگنے لگا۔

وہ مستعد، قوی اور بشاش معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ ایسا پھرتیلا ہوگیا تھا کہ کھیتوں کی درمیانی باڑھ سے دونوں پاؤں ملاکر ایک چھلانگ میں کود گیا۔

جونہی وہ درختوں کے نیچے پہونچا اُس نے جیب سے بوتل نکالی اور چلتے چلتے پینے لگا۔ اس کے بعد اُس کے خیالات پریشان ہوگئے۔ آنکھوں کے سامنے دھندلکا سا آگیا اور اُس کی ٹانگیں ایسی لچکیلی ہوگئیں جیسے کمانی۔

اب وہ خنک اور ترکائی پر چل رہا تھا اور اس فرش مخملی کو دیکھ کر ایک بچّے کی طرح بے اختیارانہ اُس کا دل کودنے کو چاہنے لگا۔ اُس نے ایک دوڑ لگائی، سر نیچے اور پاؤں اوپر کردئے، اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور پھر اُسی طرح قلہ بازیاں لگانے لگا۔

یکایک اُس نے اپنے آپ کو ایک تنگ گلی میں پایا اور ایک ماما کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں دو برتن دودھ سے لبریز لئے ہوئے گاؤں کو واپس جارہی تھی۔

وہ آگے کی طرف جھکا ہوا اُس کو گھورنے لگا اور اُس کی آنکھیں کُتّے کی طرح جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو، چمکنے لگیں ماما کی بھی اُس پر نظر پڑی، اُس نے سر اُٹھایا، کھِل کھِلا کر ہنس پڑی اور پکار کر کہنے لگی: "کیا تم گا رہے تھے؟"

اُس نے کچھ جواب نہ دیا اور نالے میں کود پڑا اگرچہ اُس کا کنارا چھ فٹ بلند تھا۔

"اللہ! تم نے تو مجھے ڈرا دیا!" یکایک اُس کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر ماما نے کہا۔

لیکن اُس نے اُس کی بات مطلق نہ سُنی۔ وہ پئے ہوئے تھا۔ اُس کے حواس ایک جذبہ سفے جو بھوک سے بدرجہا زیادہ تکلیف دہ تھا سلب کرلئے تھے۔ شراب اور ایک بے قابو کردینے والی خواہش نے اُس شخص کی طرح جو دو مہینے سے لذّاتِ دنیوی سے محروم کر دیا گیا ہو، جو مدہوش ہو، نوجوان ہو، پرجوش ہو، اور جس کے جسم میں فطرت کی پیدا کی ہوئی تمام خواہشات نے آگ لگا رکھی ہو، اُس کو پاگل بنا دیا۔

لڑکی اُس کی صورت، اُس کی آنکھوں، اُس کے نصف کھُلے ہوئے مُنھ اور اُس کے پھیلے بازوؤں سے خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹی۔

راڈل نے اُس کے بازو پکڑ لئے اور ایک لفظ کہے بغیر، اُس کو سڑک پر ڈال دیا۔ برتن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑے۔ اس کے بعد وہ چیخنے لگی۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اُس سنسان مقام پر چیخنا لاحاصل ہے اور اب اچھی طرح یہ سمجھ جانے کے بعد کہ وہ اُسکی زندگی کا درپے نہیں، اُس نے اپنی نارضامندی کا کچھ زیادہ اظہار نہیں کیا۔

جب وہ اُٹھی تو گرے ہوئے برتنوں کے خیال سے یکایک اُسے غصہ آگیا اور اپنے پاؤں سے کھڑاؤں اُتار کر اُس کی طرف جھپٹی کہ اگر وہ دودھ کے پیسے نہ دے تو مار مار کر اُس کا بھُرکس نکال دے۔

لیکن راڈل ـــ جس کا نشہ اب ہرن ہو چکا تھا اور اپنے کئے پر بے انتہا خوفزدہ تھا، اُس کے حملے کی اصلی غایت کو نہ سمجھ کر، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور وہ پتھر پھینکنے لگی جس میں سے چند اُسکی پُشت پر لگے۔

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا۔ اس کے بعد اُسے کچھ ایسی تھکن محسوس ہونے لگی جو اُسے زندگی بھر نہ ہوئی تھی اُس کی ٹانگیں کمزور ہوگئیں اور سر گھومنے لگا۔ جو کچھ گزر چکا تھا سب اُس کے دماغ سے محو ہوگیا اور کچھ سوچنے اور غور کرنے کے قابل نہ رہا۔

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ بعد وہ غافل سو رہا تھا۔

وہ چونک کر جاگ اُٹھا۔ اور آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے دو چمکیلی چرمی ٹوپیوں والے آدمیوں کو اپنے اوپر جھکا ہوا اور پکڑ کر مُشکیں باندھتے ہوئے دیکھا۔

"میں جانتا تھا کہ تم کو دوبارہ گرفتار کرنا پڑے گا" سارجنٹ نے طنز سے کہا۔

راڈل نے کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پولیس والوں نے اُس کو جھنجھوڑا اور اگر وہ صدائے احتجاج بلند کرتا تو وہ سختی کا سلوک کرنے کو تیار تھے کیونکہ اب وہ اُن کا شکار تھا ـــ اچھا شکار ـــ اِن مجرموں کے شکاریوں کا کیا ہوا قید خانے کا شکار، جس کو وہ دوبارہ نہیں چھوڑنے والے تھے۔

"چلو!" سارجنٹ نے حکم دیا۔

سب روانہ ہوگئے۔ شام ہو رہی تھی۔ موسمِ خزاں کی اُداس اور نامبارک شفق حدِ نظر تک پھیل چکی تھی۔

بیراگ کا بروگ

(بہ سلسلۂ جولائی)

(۶)

گزشتہ واقعہ کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے اور اسوقت تک راجہ رتن گڈھ کی طرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جو کملا کے روزانہ معمول یا اسکے خیالات کی موجودہ رفتار میں حارج ہوتی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ مبادا اس کا باپ سوامی جی کے خلاف کوئی نامناسب حکم صادر کرے یا اُن کو یہاں سے نکل جانے کی ہدایت کرے، لیکن چونکہ راجہ رتن گڈھ بہت سنجیدہ شخص تھا اس لئے جب بعد کو اس مسئلہ پر غور کیا تو کوئی ایسا طریق عمل اختیار کرنا اس کو مناسب نہ معلوم ہوا، جو سارے قصبہ کو چونکا دیتا اور لوگوں کو سرگوشیوں اور قیاس آرائیوں کا موقعہ دیتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے سوامی جی کو نکلوا دیا تو یقیناً لوگوں کو خیال پیدا ہوگا کہ اس میں کوئی معاملہ کملا رانی کا ضرور شامل ہے کیونکہ اب یہ تقریباً ہر شخص کو معلوم ہوگیا تھا کہ کملا، اُن کی چیلی ہوگئی ہے اور ممکن ہے اس سے کوئی بدنامی پیدا ہوجائے اور جگدیش پور والوں تک بھی اس کی خبر پہونچ جائے۔ اس لئے وہ کملا کے سامنے یہ کہنے کو تو کہہ گیا کہ سوامی جی کو آج ہی نکلوائے دیتا ہوں، لیکن بعد کو جب تنہائی میں اس نے غور کیا تو فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، کیونکہ اگر ایک طرف اس کو بدنامی کا خیال تھا تو دوسری طرف اپنی بیٹی کی مشتعل طبیعت سے بھی واقف تھا اور وہ ڈرا کہ سختی کہیں اور زیادہ ضد نہ اس میں پیدا کردے۔

اس نے سب سے زیادہ کارآمد تدبیر یہ سوچی کہ جسقدر جلد ممکن ہو کملا کی شادی کردی جائے، چنانچہ اس نے جگدیش پور اطلاع دی کہ چونکہ وہ ہندوستان کے تمام مقدس مقامات کی جاترا کے لئے جانا چاہتا ہے، اس لئے اگر شادی مہینہ کے اندر ہی اندر ہوجائے تو مناسب ہے، اس نے اپنے یہاں کے پنڈتوں کے ذریعہ سے جگدیش پور کے پنڈتوں کو بھی دے دلاکر ملا لیا اور آخرکار یہ بات طے پاگئی کہ اگلی پورنماشی کو بارات آئے گی، اور ریاست میں نہایت تیزی سے تمام اہتمامات ہونے لگے۔

صبح کا وقت ہے بادل گھرے ہوئے ہیں، کبھی کبھی بجلی چمک اُٹھتی ہے اور کملا حسب معمول سوامی جی کے پاس بیٹھی ہوئی گفتگو میں معروف ہے۔

سوامی جی ــــ "میں نے سُنا ہے کہ اگلی پورنماشی کو تمھاری شادی ہونے والی ہے"

کملا ــــ "ہاں، مہاراج، سُنا تو میں نے بھی ہے"

سوامی ــــ "یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دس ہزار تولہ سونا اور ۹ من چاندی گلائے جانے کا حکم دیا گیا ہے"

کملا ــــ "ہاں یہ بھی میں نے سنا ہے"

سوامی ــــ "اتنی گراں قیمت کس چیز کی ادا کی جا رہی ہے۔ محبت کی ؟ نہیں۔ بلکہ تمھارے ہونے والے شوہر کی، اور صرف اس لئے کہ وہ تم کو تمھارے دیس اور تمھاری ماں باپ کی آغوش سے جدا کر دے، کملا، تمھیں معلوم ہے کہ اتنا سونا کتنی بیگناہ مخلوق کا خون بہا کر فراہم کیا گیا ہے، کیا تم جانتی ہو کہ اتنی چاندی کتنی عرق آلود پیشانیوں کی تمناؤں کو پامال کر کے حاصل کی گئی ہے۔۔ کاش زیور سے لدی ہوئی دُلھنیں سمجھ سکتیں کہ دنیا کی کتنی بد دعاؤں کا بار اُن کے جسم پر ہے اور اُن کے زرکار لباس کتنے مجروح جسموں کے ریشے سے طیار کئے گئے ہیں، اُف! دولت کے یہ خونچکاں کھیل قدرت دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کہتی، دُنیا کی فضا میں ہر طرف فریاد و آہ کی صدا گونج رہی ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں" ــــ ہاں، کملا، تمھارے لئے کیا کیا زیور طیار کئے جا رہے ہیں، کتنا قیمتی ٹیکا تمھاری پیشانی کے لئے تجویز ہوا ہے۔ کتنی زرکار ساریاں تمھارے جسم کے لئے انتخاب کی گئی ہیں"

کملا یہ سُنکر خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔ تھوڑے انتظار کے بعد سوامی جی بولے "کیوں، کیا تم کو میرا کہنا ناگوار ہوا۔ آہ، کملا، معلوم نہیں، میں کیوں تم سے تمام وہ باتیں کہدیتا ہوں جو صرف پرمیشور کے سامنے کہنے کی ہیں"

کملا نے اپنی گردن، لانبی صندلی رنگ کی سڈول گردن اُٹھائی اور حزیں و ملول نگاہوں سے سوامی جی کی طرف دیکھ کر بولی ــــ "مہاراج، کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا پرمیشور کے سامنے نہیں ہے، کیا اس نے یہ سب کچھ نہیں سُنا"

سوامی ــــ نہیں کملا وہ ایسی باتیں اسی وقت سنتا ہے جب سولی پر چڑھ کر کہی جائیں، ہتیلی پر سر رکھ کر

سُنائی جائیں ۔میں بزدل ہوں، کم ہمت ہوں ۔ اُس سے تو کہہ سکتا نہیں تم سے کہتا ہوں ۔
حالانکہ مجھے سمجھنا چاہئے کہ تم راجہ کی بیٹی ہو اور راجہ کی بیٹی کا شوہر بھی راجہ ہی ہوا کرتا ہے"

ٹھیک اسی وقت نہایت تیز کوندا لپکا اور اتنی سخت گرج ہوئی کہ ساری پہاڑی گویا ہل کر رہ گئی ۔ کملا جو باوجود مضبوط دل رکھنے کے بھی آخر کار ایک عورت ہی تھی اور عورت بھی کمسن، محلوں میں پلی ہوئی، ڈر گئی اور سہم کر اسقدر سمٹی کہ سوامی جی کے جسم سے، اس کا جسم مل گیا اس حال میں کہ دونوں جسموں کی عریانیوں کے درمیان صرف ہلکی ریشمی ساری کا پلو حائل تھا ۔ سوامی جی نے بے اختیارانہ اس کے نرم و نازک اور لچیلے جسم کو اپنے ہاتھوں سے سنبھال کر اپنے سے اور زیادہ قریب کر لیا، لیکن فوراً ہی گویا کہ یہ اتصال خود بجلی کا احساس تھا، ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے ۔ ایک طرف وہ شرمائی ہوئی علیحدہ بیٹھی کانپ رہی تھی اور دوسری طرف سوامی جی کا دل جلدی جلدی دھڑک کر فوارے پر فوارے خون کے تمام جسم میں دوڑا رہا تھا ۔

(۷)

رتن گڈھ سے سوامی جی کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ وہ کیوں دفعتاً اس طرح چلے گئے اور کہاں ؟ کملا کا باپ بہت خوش ہے کہ وہ کملا کی بارات آنے سے پہلے ہی غائب ہو گئے ورنہ ممکن تھا کہ دولہا کے کانوں تک بھی کوئی بات پہونچتی اور کملا کی بدنامی کا باعث ہوتی ۔ خود کملا کی کیا کیفیت ہے، اس کا جاننے والا سارے رتن گڈھ میں سوائے اس کے دل کے اور کوئی نہیں ۔

آخری ملاقات کے بعد دو دن تک کملا خود شرم کی وجہ سے سوامی جی کے پاس نہیں گئی اور جب تیسرے دن وہاں پہونچی تو اُس جگہ کو خالی پایا جہاں زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ دو بجلیوں کے تصادم نے اس کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا ۔ وہ حیران تھی کہ سوامی جی کہاں چلے گئے اور گئے تو اطلاع کیوں نہیں دی ۔ وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ کوئی چیز سینہ کے اندر سے اُٹھ کر منہ کو آ رہی ہے، اس کا بدن کانپ رہا تھا، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی میں کوئی نہایت وسیع خلا پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس کے اندر گرتی جا رہی ہے ۔ وہ تھر تھرا کر اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سوامی جی بیٹھا کرتے تھے، کبھی وہ فرش کی چٹانوں کو دیکھتی اور کبھی در و دیوار کے پتھروں کو گویا ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ سوامی جی کہاں گئے ۔ لیکن اس سوال کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا ۔

اس نے سوچا اور اپنے خیال میں بالکل صحیح سوچا کہ شاید اس دن کے واقعہ نے سوامی جی کو برہم کر دیا لیکن اس نے جو کچھ کیا وہ بالکل غیر اختیاری بات تھی ۔۔۔ اس خیال کے آتے ہی اُسوقت کا پورا منظر اسکی نگاہوں کے

سامنے آگیا — وہ بجلی کی کڑک، وہ اس کا سہمکر سوامی جی سے لپٹ جانا اور اپنے جسم میں غیر معمولی گرمی محسوس کرکے فوراً علٰحدہ ہوجانا۔ اس کے بعد اس کا شرماکر دیر تک خاموش بیٹھے رہنا —— اس کے بعد وہ جزئیات کی تنقید میں محو ہوگئی اور غور کرنے لگی کہ سوامی جی کے جسم سے اس کا جسم مس ہونے کے بعد جو کیفیت اس پر طاری ہوئی وہ کیا تھی۔ کیا اس نے کوئی خاص لذت محسوس کی، بیشک محسوس کی لیکن شاید اس کا تعلق دو جسموں کے ظاہری اتصال کے سوا قلب سے نہ تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز اس کو کھینچ رہی ہے اور اس کھنچ جانے میں اس کو لطف آرہا ہے —— اگر واقعی سنسنی کو لطف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے —— سوامی جی کے جسم سے ملکر اس کا جی یہ کیوں چاہنے لگا کہ وہ فاختہ کی طرح پر سمیٹ لے اور وہیں سمٹ کر رہجائے، غالباً اس لئے کہ ہوا سرد تھی، بارش ہورہی تھی۔ تاہم اس میں برہمی کی کیا بات تھی کیا سوامی جی کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا گنہگار جسم اُن کے پاک جسم سے مس ہوگیا۔ لیکن خود انھوں نے کیوں اپنی آغوش میں اس کو بھینچ لیا تھا، اگر اس کا جسم اس قابل نہ تھا تو علٰحدہ کرنے کے بجائے اس کو اپنے سے اور زیادہ قریب کیوں کرلیا۔ خیال و تصور کی جہان بین اسی حد تک پہونچی تھی کہ وہ پھر دفعتہً ٹک گئی —— اس کے چہرہ کی سفیدی میں سُرخ سُرخ لکیریں دوڑنے لگیں، کنپٹی کی رگیں تڑپنے لگیں، کان کی لَو گرم ہوگئی، گردن کی شریان خون کی روانی سے اُبھر آئی، پیشانی کے نیلگوں عروق زیادہ نمایاں ہوگئے آنکھوں میں دھواں سا بھر کر چند موٹے موٹے قطرے آنسوؤں کے پلکوں تک آکر رُک گئے اور ایک ایسی کیفیت کے ساتھ جو ذرا اور بڑھ جائے تو ربودگی اور جنون کا فرق مٹادے، ایک چٹان کا کنارہ پکڑ کر اُٹھ بیٹھی اور دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا ہونا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کی تلخی کو نہایت شدت سے محسوس کرتی جاتی تھی کہ سوامی جی کے ساتھ اسکا تعلق بہ نسبت روح کے شاید جسم سے زیادہ تھا اور یہ اس کے نفس کا فریب تھا کہ اسوقت تک اس حقیقت سے اسے بیخبر رکھا۔ لیکن کیا محبت کوئی اختیار کی چیز ہے، اور کسی کو دیکھتے رہنے کی آرزو کوئی گناہ ہے وہ بے اختیار کہہ اُٹھی :- "آہ سوامی، آپ کیا کرگئے، جب تک پاس تھے، دوری کا خیال بھی چنداں تکلیف دہ نہ تھا اور اب کہ آپ دور —— خدا جانے کتنی دور —— ہیں، نزدیکی کا تصور بھی سکون پہونچاتا نظر نہیں آتا —— کیا اسی کا نام محبت ہے۔ اُف کتنی تکلیف دہ چیز ہے، کیسی دہکا دینے والی آگ ہے — وہ اگر مجھ سے خفا ہیں تو میں اُن سے پوچھوں گی کہ کیوں — اور اگر انھوں نے کہا کہ "تم مجھے محبت میں مبتلا کرنا چاہتی تھیں" تو میں سوال کروں گی کہ کیا محبت بُری چیز ہے اور اگر انھوں نے کہا کہ ہاں، تو پھر —— مگر نہیں وہ ایسا نہیں کہہ سکتے

اُف، اس وسیع دُنیا میں انھیں کہاں ڈھونڈھوں، وہ اب کیوں ملنے لگے، ہاں، وہ تو مجھے تباہ کرنے آئے تھے سو تباہ کرچلے ۔ بہتر ہے ۔۔۔۔۔" اس کی آواز بھرانے لگی، وہ خاموش ہوگئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آئے لیکن پلک تک آکر رُک جانے کے لئے نہیں بلکہ ڈھلکنے کے لئے، اُس کی ساری کے آنچل میں جذب ہوکر اتنے حصہ کو اور زیادہ رنگین بنا دینے کے لئے ۔۔۔

(۸)

رتن گڈھ کا قلعہ، نہایت قدیم راجپوت وضع کا قلعہ ہے، وہی چاروں طرف خندق، اور پُل وہی دروازے کے پھاٹک، وہی فصیلیں اور اسی طرح کے بیسیوں پیچ در پیچ راستے جو محل کے مختلف حصوں تک پہونچکر ساری عمارت کو بھول بھلیاں بنا دیتے ہیں۔

ریاست کے اکثر ذاتی کارخانے محل کے اندر ہی واقع تھے اور وہ سونار خانہ بھی جہاں آج کل رانی کملا کے جہیز کے لئے زیور طیار ہورہا تھا، اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع تھا۔ باہر دروازہ پر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے ہیں اور ایک فوجی افسر آنے جانے والوں کی نقل وحرکت کو نہایت غور سے دیکھتا جاتا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال نظر آتا ہے جس کے اندر چار بڑی بڑی بھٹیاں دہک رہی ہیں اور چاندی سونا پگھلا پگھلا کران سوناروں کو تول تول کر تقسیم کردیا جاتا ہے جو درجنوں کی تعداد میں ہال کے کنارے کنارے چاروں طرف، اپنے تمام آلات واوزار لئے ہوئے مصروف کار ہیں۔ کوئی سونا کوٹ کوٹ کر اس کے بڑے بڑے پتر طیار کررہا ہے، کوئی جنتر سے تار نکال رہا ہے، کہیں صیقل ہو رہی ہے، کہیں ٹانکے دئے جارہے ہیں۔ الغرض ہتوڑیوں، دھونکنیوں، خرادوں اور رنہائیوں کی مختلف قسموں کی آوازوں سے ملکر ایک عجیب قسم کی دماغ خراش صدا گونج رہی ہے۔ ہال کے ایک گوشہ میں دروازہ ہے جو ایک مختصر سے کمرہ میں کھلتا ہے، جہاں ایک سردار کی نگرانی میں تمام زیور تُلنے کے بعد ذخیرہ کے کوٹھری میں رکھدیا جاتا ہے۔

سردار خوشحال سنگھ جو راجہ کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں اس خدمت پر مامور ہیں اور دوسرے لوگوں سے جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اسی وقت گول پگڑی باندھے ہوئے ایک چوبدار ہاتھ میں چاندی کا عصا، سُرخ بانات کی وردی پہنے آتا ہے اور ایک چٹھی دیکر چلا جاتا ہے۔

سردار خوشحال سنگھ اس کو پڑھکر کچھ گھبرا سے جاتے ہیں اور فوراً اُٹھ کھڑے ہوکر سپاہی کو حکم دیتے ہیں کہ آج سے رات میں بھی کام ہوگا اور ذخیرہ کی کوٹھری میں جاکر ایک دوسرے سردار سے پوچھتے ہیں کہ ۔۔۔۔

اس وقت تک طیار شدہ اشیاء کی فہرست کیا ہے"

—— "چاندی کے اسباب میں دس ہاتھیوں کی آرائش معہ زنجیر، عماری، ٹیکہ اور کرن پھول کے طیار ہوچکی ہے اور دس کے لئے اور طیار ہونا باقی ہے۔ اسوقت تک ڈھائی سومن چاندی صرف ہوچکی ہے اور باقی ڈھائی سومن خزانہ سے آچکی ہے"

خوشحال سنگھ —— "اچھا ڈھائی سومن چاندی اور آئے گی کیونکہ دس ہاتھیوں کی آرائش اور طیار کرنا ہے سونے کی چیزیں کیا کیا طیار ہوچکی ہیں؟

—— "اسوقت تک دس ہزار تولہ گلایا جاچکا ہے اور ۳۰۰ سٹ کھانے کے بن چکے ہیں، البتہ صیقل ہونا باقی ہیں"

خوشحال سنگھ —— "بہتر ہے، پانچ ہزار تولہ سونا کل تک اور آئے گا، مہاراجہ کا حکم ابھی ابھی مجھے ملا ہے کہ پندرہ دن میں سب کام مکمل ہوجانا چاہئے"

یہ کہکر خوشحال سنگھ باہر نکلا ہی تھا کہ پنڈت جہیش دت وید آگئے اور دونوں ایک گوشہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

وید —— "کہئے سردار جی، آج کل تو آپ بہت مصروف ہوں گے"

"ہاں آج سے تو راتوں میں بھی کام ہوگا، دن بہت کم رہگئے ہیں اور ابھی آدھا کام بھی نہیں بن سکا"

وید —— "مگر مجھے تو اُمید نہیں کہ ابھی یہ بیاہ ہوسکے"

سردار —— (چونک کر) کیوں، کیا بات ہے وید جی"

وید —— "رانی کملا کی بیماری بڑھتی جاتی ہے اور مجھے امید نہیں کہ وہ اتنی جلد اچھی ہوجائے گی"

سردار —— "سچ بتائیے، کوئی خطرہ تو نہیں ہے"

وید —— "سردار جی، خطرہ کی نہ کہو، انسان ہر وقت خطرہ میں ہے، معمولی زکام بھی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے اگر بڑھ جائے اور قسمت میں بچنا ہو تو کنوئیں میں گر کر بھی زندہ نکل آتا ہے، مگر ہاں اس میں شک نہیں کہ اسوقت تک کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور راجکماری کو اختلاج بڑھتا ہی جارہا ہے"

سردار —— (نہایت آہستہ سے) کرن سنگھ جی تو بہت خوش ہوں گے۔ اور سچ پوچھو تو اُن کے کنور سے زیادہ موزوں کوئی ہو بھی نہ سکتا تھا۔ ریاست کے سب سے بڑے جاگیر دار کا بیٹا، خوبصورت جوان پڑھا لکھا

قابل۔ ویدجی جس وقت سوچتا ہوں کہ نہ جانے کتنی پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی دولت آج رتن گڑھ سے باہر چلی جارہی ہے تو میری حالت عجیب ہوجاتی ہے"

وید۔۔۔۔۔ "سردار جی! آپ کو معلوم نہیں کہ یہ شادی تو صرف دولت ہی کے لئے کی جارہی ہے، آپ کو معلوم نہیں کہ جگدیش پور والوں نے اس معاملہ میں کتنی کوشش کی ہے، اور بیچ میں سرکار انگریزی کو ڈال کر ہمارے مہاراج کو راضی کیا ہے، ورنہ وہ خود نہ مانتے تھے۔ پر اب کیا ہوسکتا ہے، وہ تو جو کچھ ہونا ہے ہوکر رہیگا"

سردار۔۔ "کرن سنگھ کے کنور بھی تو سنا ہے باہر چلے گئے ہیں اور وہ شادی میں شریک نہ ہوں گے"

وید۔۔۔۔۔ "ہاں، وہ آج کل نہیں ہیں، میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ وہ اسی کوشش میں گئے ہیں کہ یہ شادی کسی طرح نہ ہونے پائے (نہایت آہستہ سے کان کے پاس مُنھ لیجاکر) بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ راجہ کرن سنگھ نے ایک گمنام خط جگدیش پور اس مضمون کا بھجوایا ہے کہ راجکماری کا چال چلن اچھا نہیں اور سوامی جی سے انکا تعلق ہوچکا ہے"

سردار۔۔۔۔ (چونک کر)۔ ہاں، یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا، کیا مہاراج کو بھی اس کا علم ہوچکا ہے"

وید۔۔۔۔۔ مہاراج کو تو اس کا علم نہیں ہوا۔ اور نہ ہوتا ہی اچھا ہے، ورنہ معلوم نہیں کیا نتیجہ ہو، سردار جی سچ پوچھو مجھے تو اس شادی کا نتیجہ بہت بُرا نظر آتا ہے اور میرا ماتھا ٹھنکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا۔ پرمیشر اچھا ہی اچھا کرے"

(باقی) نیاز فتحپوری

(نوٹ) یہ فسانہ ماہ آئندہ میں ختم ہوجائے گا۔

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماں

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہی نشاں باقی

اعلیحضرت خسرو دکن مدظلہ العالی کا مندرجۂ عنوان پیام جب میں نے پہلے پہل سُنا تو مجھ پر تھوڑی دیر تک ایک عجیب کیفیت طاری رہی میری نگاہوں کے سامنے عہدِ ماضی کی تاریخ اپنے اوراق اُلٹنے کے لئے بے چین ہو گئی وہ تاریخ جس میں "سلاطین سلف" کی شاہانہ سطوت و جبروت کے نقوش ابتک اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ تاریخ جس کے اوراق پر عظمت و اقتدار کے ایسے ایسے مناظر ثبت ہیں جنھیں زمانہ کبھی فراموش نہ کرسکے گا۔ غزنویوں کا دبدبۂ فتحمندی، غوریوں کا آئینِ ہوشمندی غلاموں کے ستاروں کی بلندی، خلجیوں کی فراست و دانشمندی۔ تغلقوں کی خسرو پرستی، اور تیموریوں کا تدبر و اسلامی رواداری تاریخ کے حافظہ میں ابھی اُسی طرح باقی ہے اور فضائے بسیط میں خاندانِ تیموری کے آخری تاجدار کا یہ اخلاقی درس بھی اب تک محفوظ ہے کہ:-

ظفر آدمی اُس کو نہ جانئے گا گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غرض "بھارت ورش" کی اسلامی حکومتیں ان تاریخی اوراق میں میری ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے اس طرح آئیں کہ دلی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور محمد شاہ رنگیلے کی عیش پرستی کا آفتاب لبِ بام آچکا ہے "اختر پیا" کی لکھنوی رنگ رلیاں سازشوں کا شکار ہونے لگی ہیں۔ بنگالے کے سورما شجاعت کے وہ جوہر کھو چکے ہیں، جن سے محرومی النسان کو صرف پہاڑوں میں روپوش ہونے کی تعلیم دے سکتی ہے، "تاناشاہ" کی مرہٹہ نوازی حضرت راجو کا نام لیتے لیتے قلعہ سے باہر ہو گئی ہے، نظام شاہیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ عادل شاہیوں کا

عدل صرف زبانوں پر رہ گیا ہے، بہمنیوں کی عقیدت حضرت گیسو دراز کے قدموں پر نثار ہو چکی ہے، یہ تمام مناظر یکے بعد دیگرے میرے سامنے آئے اور میں "آہ یاد ایام" کہکے خاموش ہو گیا۔

یہ تو خیر قصۂ ماضی تھا مگر جب عہد حاضر کی اسلامی حکومتوں پر نظر پڑی تو دیکھتا ہوں کہ ترکی خلافت کی ذمہ داریوں کا بار اپنے دوش سے اُتار چکا ہے اور اس کو اب عالمگیر اخوت اسلامی سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ایرانی رضا شاہ کے فہم و تدبر کا امتحان لے رہے ہیں اور عالم اسلامی سے بے خبر ہو کر اپنی خیر منا رہے ہیں، حجاز کی مرکزیت کعبہ کے احترام اور پیغمبر اسلام کی خوابگاہ ہونے کی وجہ سے گو ہمیشہ قایم رہے گی۔ لیکن یہاں کے تپتے ہوئے ریگستان مین اب کاروانِ رفتہ کے نقش قدم مسکراتے نظر نہیں آتے۔ خاک عراق کے منافق ذرّے آج بھی اس تاریکی سے آزاد نہیں ہوئے جو حسین کی مظلومی نے ان پر ثبت کی تھیں، دریائے نیل کی موجیں مدت ہوئی اپنی "آزاد روانی" سے محروم ہو چکی ہیں، افغانستان کی طوائف الملوکی سے کس کو اُمید ہو سکتی ہے کہ وہاں آرام سے پاؤں پھیلانے کی کبھی اجازت مل سکے گی۔

ان مایوس کن حالات نے ماضی کی طرف پھر لوٹایا تو پایۂ تخت ہند کے وزیر اعظم حضرت آصفجاہ اول کی آل اندیشی تاریخی اوراق میں سامنے آگئی، یہ وہ زمانہ ہے جب تیموری سلطنت کے سنبھلنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، "رنگیلے عہد" میں ہر کس و ناکس کے دل پر مایوسی کے بادل چھا چکے تھے، ہر دماغ معطل ہو چکا تھا "رنگیلی قوتین" جواب دے چکیں تھیں اور رہبری کے توقعات اُٹھ چکے تھے مگر ایک صرف حضرت آصف جاہ اول کا تنہا دماغ تھا جن کو دکن میں اپنا اور مسلمانوں کے بھٹکے ہوئے گلّہ کا مستقبل مطمئن اور شاندار نظر آ رہا تھا، انھوں نے خاندان تیموری کی عظمت و عزت کو سنبھالنے کا ارادہ کر لیا۔ مالوہ سے بزرگان دین کی دعائیں لیتے "سیدوں" کی سرکشیوں کو دباتے "نادری غصہ" کی شعلہ افگن آگ کو بجھاتے اور دہلی کے تخت کو "خدا حافظ" کہتے ہوئے اپنے مفوضہ صوبہ (دکن) میں داخل ہو گئے اور ہر مذہب و ملت کو اپنی پناہ میں لیکر عبادت الٰہی میں سربسجود ہو گئے۔ یہی تھے جنھوں نے ایسے وقت میں "دین حنیف" کو زندہ رکھا ورنہ کون تھا جو ہندی مسلمانوں کے زخموں کا اندمال کر سکتا۔ کیونکہ طوفان انقلاب نے جس قوم کی تباہی میں اندلسیوں کی طرح کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی اس کا آخری ٹھکانا سلطنت آصفیہ کے سایۂ عاطفت کے سوا اور کہاں ہو سکتا تھا خدا حضرت آصف جاہ اول کی روح کو آسودہ رکھے۔ جن کے شاہانہ عزایم کے صلہ میں مسلمانان ہند کو دکن میں امن و آسایش سے سانس لینے کا موقع مل گیا۔

حضرت اقدس و اعلیٰ اسی دودمان عالی کے ساتویں بادشاہ ہیں حضور نے بزرگان سلف کی سنت کو قائم رکھکر عالم اسلامی کو عموماً اور مسلمانان ہند کو خصوصاً یہ مژدہ جانفزا سنایا ہے کہ تمھاری ٹوٹی ہوئی امیدوں کا سہارا اور تمھارے بکھرے ہوئے اجزا کا "نشان" سلطنت آصفیہ کے نام سے باقی ہے۔ (خدا ابدالآباد تک اس نشان کو باقی رکھے) اس سے وابستگی تمھارا اسلامی حق ہے اور اس کی وسیع آغوش تمھارے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے، تم نے جس خواب ماضی کو تصور کی آنکھوں سے دیکھا ہے اُس کی تعبیر عہد حاضر میں اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ لو!

حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے ایک ایسا جاں نواز پیام دیا ہے جو عالم اسلامی کیلئے یقیناً نوید حیات ہے، مصرعۂ اول میں سلاطین سلف "ایک ایسا ٹکڑا ہے جس کا معنوی اثر فریاد کی صورت میں مسلمانوں کی مضمحل روحوں پر چھا جاتا ہے۔ اس غم کا مداوا جو کر سکتا ہے اس درد کو دلوں کے پنہاں گوشوں سے جو نکال سکتا ہے اس اضطراب اور اس احساس بربادی کو مسلمانوں کی دم توڑتی ہوئی قوم کی روحوں سے جو مٹا سکتا ہے وہ عہد حاضر میں حضرت بندگان عالی ہی کی شاہانہ ذات ہے۔ جب ہی تو مصرعۂ ثانی میں ارشاد ہوتا ہے کہ

مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اس دلکش نغمہ کو سُن کر اطمینان و مسرت کو دعوت دیجئے، اس جمیل پیغام کو پڑھکر اپنی خوش نصیبی کو مبارکباد دیجئے، اور اس "روح پرور" "صلائے عام" پر لبیک کہکر زندہ ہو جائیے کیونکہ یہ پیام تمام ان برادران اسلام کے لئے ہے جن کی جبینوں سے اقصائے ہند کی بیشمار مسجدیں اب بھی آباد ہیں اور جن کی روحوں میں اب بھی حجازی نغمے پرورش پا رہے ہیں۔ یہ بشارت اس صبر آزما احساس شکستگی کے بعد ملی ہے، جب مسلمانان ہند کے سروں سے عظمت و اقبال کا سایۂ ہمایوں اُٹھ چکا تھا۔ اسی سے متاثر ہو کر مولانا حالؔی نے اپنی شاعرانہ زبان میں اس طرح فریاد کی تھی کہ:-

جاؤ نش تھے للکارتے جن رہگزروں میں | دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی | اس دین میں اب فقر بھی باقی نہ غنا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے | پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

مولانا حالؔی زندہ ہوتے تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے سُنتے کہ ان کی فریاد صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی بلکہ سلطنت آصفیہ کے "قصر معلّیٰ" تک پہونچکر رہی اور "فریاد رس" نے اس کا جواب شاعرانہ زبان میں دے کر تنہا حالؔی کی بےچین روح کو نہیں بلکہ جملہ مسلمانوں کو سکون پہونچا دیا جسکے اظہار تشکر

میں مسلمانانِ ہند کی زبانوں سے ہمیشہ یہ دُعا نکلتی رہے گی۔

"خدا ہمارے بادشاہ دکن کو سلامت رکھے"

ہوشؔ بلگرامی

فصاحت لکھنوی کی اصلاحیں

فصاحت لکھنوی، امانت لکھنوی کے بیٹے تھے، اور اُن کے انتقال کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ میں نے خود ۱۹۰۹ء میں سندیلہ کے مشاعرہ میں ان کو غزل پڑھتے سُنا اور اس کے بعد بھی وہ کئی سال تک زندہ رہے تغزل ان کا بالکل لکھنوی رنگ کا تھا اور سوائے رعایت لفظی یا محاورہ وزبان کے ان کی غزل میں اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ امانت کی واسوخت جن حضرات نے دیکھی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کے بیٹے کا رنگ شاعری کیا ہونا چاہئے تھا۔

بہرحال وہ لکھنؤ کے اساتذہ میں ضرور تھے اور جس حد تک زبان کی صفائی کا تعلق ہے اُن کے اُستاد تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہوسکتا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ نواب داراب علیخاں (تیموری شاہزادہ) کو بھی ان سے نسبت تلمذ حاصل تھی۔ نواب داراب علی خاں سطوت تخلص کرتے تھے اور فصاحت سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔

اتفاق سے حیدرآباد کی لائبریری میں سطوت کا قلمی دیوان نظر سے گزرا جو فصاحت کا درست کیا ہوا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ سطوت کی شاعری نہایت ہی ادنیٰ قسم کی شاعری ہے لیکن فصاحت نے جو اصلاحیں دی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کو کس قدر ملکہ حاصل تھا۔ چند نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

سطوت کا شعر ہے:۔

آج تو مجھ سے اے سطوت ترا دل شاد ہوا باہیں گردن میں مری ڈال کے کہتا ہو وہ شوخ

شعر کی سخافت ظاہر ہے اور لفظ (اے) اتنی بُری طرح دبکر نکلتا ہے کہ پورا شعر نظری ہونے کے قابل تھا، مگر فصاحت نے اپنی اصلاح سے اس میں ایک رنگ پیدا کردیا۔ ان کا اصلاح کیا ہوا شعر یہ ہے:۔

باہیں گردن میں مری ڈال کے سطوت وہ شوخ ہنس کے کہتا ہے کہ اب تو ترا دل شاد ہوا

سطوت :۔ بیکار غم فراق کا کھایا غضب کیا کیوں اس صنم سے دل کو لگایا غضب کیا

اس شعر میں ایک نہایت نازک غلطی یہ تھی کہ لفظ (کیوں) دوسرے مصرعہ میں بیکار رہے۔ فصاحت نے اس کو محسوس کرکے دوسرا مصرعہ یوں کر دیا :۔

دل اپنا اس صنم سے لگایا غضب کیا

اب پورا شعر صاف ہوگیا اور زبان کی روانی پیدا ہوگئی۔

سطوت :۔ افسوس دشمنوں کی نگاہوں پہ چڑھ گیا مجھ کو صنم نے پاس بٹھایا غضب کیا

بظاہر اس شعر میں کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا، لیکن ذوق محسوس کرتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں کسی بات کی کمی ضرور پائی جاتی ہے۔ فصاحت نے اس کمی کو اس طرح دور کیا :۔

محفل میں اس نے پاس بٹھایا غضب کیا

سطوت :۔ آئے وہ میری قبر پہ ہمراہ غیر کے دل خود دکھا تھا اور دکھایا غضب کیا

ایک نقص تو اس شعر میں یہ تھا کہ قبر کا ذکر کرکے شاعر نے مفہوم بالکل سہل کر دیا تھا، کیونکہ مرنے کے بعد دل دکھنے اور دکھانے کا معاملہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں (دکھا تھا) کے بجائے (دکھا ہوا تھا) ہونا چاہئے تھا ۔۔ استاد فصاحت نے اصلاح دیکر یہ دونوں نقص دفع کر دئے اور روانی پیدا کر دی۔

آئے ہمارے گھر میں وہ ہمراہ غیر کے دکھتا ہوا دل اور دکھایا غضب کیا

بلایا غیر کو اس شمع رو نے اپنی محفل میں مرا دل مثل پروانہ جو جل جاتا تو کیا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) بالکل زاید ہے ۔ اصلاح نے اس نقص کو دور کر دیا :۔

مرا دل صورت پروانہ جل جاتا تو کیا ہوتا

سطوت :۔ قتل کرنے جب بلایا اس بت سفاک نے ناتوانی سے قدم آگے بڑھا کر رہ گیا

خیر مفہوم و مضمون تو جیسا ہے ظاہر ہے، لیکن فنی نقطۂ نظر سے ایک نقص یہ ہے کہ ضمیر نہ ہونے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون قدم آگے بڑھا کر رہ گیا اور دوسرے یہ کہ قدم بڑھانا خود فرطِ ناتوانی کے منافی ہے۔

فصاحت نے اس شعر میں اصلاح دیکر اس کو بہت بلند کر دیا ملاحظہ ہو :۔

شرم آئی پیشِ منعم، جب گیا بہر سوال کچھ نہ بولا منھ سے ہاتھ اپنا بڑھا کر رہگیا

سطوت :۔ خزاں کے ہاتھ سے کیا آج ہی پامال وہ گلشن ہزار افسوس کل جس باغ میں شورِ عنادل تھا

چونکہ دوسرے مصرعہ میں لفظ (باغ) موجود ہے، اس لئے پہلے مصرعہ میں لفظ (گلشن) بیکار ہے علاوہ اس کے سلاست و روانی بھی مفقود ہے۔ فصاحت نے اس میں بھی خوب اصلاح دی ہے :۔

گلستاں ہائے کیا آباد تھا فصلِ بہاری میں کہیں کوکو تھی قمری کی، کہیں شورِ عنادل تھا

سطوت :۔ عجب تقدیر ہے وہ نزع میں آئے تھے بالیں پر نہ کی کچھ بات اُن سے لب ہلانا ہمکو مشکل تھا

پہلے مصرعہ میں لکھنوی زبان کے لحاظ سے (نزع میں آنا) بالکل بے معنی سی بات تھی کیونکہ نزع اک کیفیت کا نام ہے اور جب تک اس کے ساتھ کوئی اور لفظ وقت کے معنے مین استعمال نہ کیا جائے مفہوم پیدا نہیں کرتا۔ دوسرے مصرع مین (نہ کی کچھ بات اُن سے) بھی بہت ڈھیلی بات تھی۔ اصلاح سے یہ دونوں نقص دور ہو گئے :۔

وہ بالیں پر ہمارے نزع کے ہنگام آئے تھے بھلا کیا بات کرتے لب ہلانا ہم کو مشکل تھا

سطوت :۔ نہایت آرزو ہے آکے پہلو میں وہ بُت بیٹھے خداوندا کسی دن تو بر آئے مدعا دل کا

پہلے مصرعہ میں (نہایت آرزو) بالکل غلط اور لفظ (بُت) بیکار تھا۔ اصلاح ملاحظہ ہو :۔

وہ دلبر آکے پہلو میں مرے بیٹھے یہ حسرت ہے

سطوت :۔ تڑپ کر تیری فرقت میں نکل جائیگا سینہ سے بہت مشکل ہے اب ایجان ہمکو تھامنا دل کا۔

اس شعر میں معشوق سے خطاب بہت غیر دلچسپ بات تھی اور (فرقت) کا اظہار بھی گراں گزرتا تھا۔
فصاحت نے اس شعر میں نہایت پاکیزہ اصلاح دی ہے :۔

تڑپ کر دیکھنا اک دن نکل جائیگا سینہ سے بہت مشکل ہی اُلفت میں عزیز و تھامنا دل کا

زبان و بیان دونوں حیثیت سے شعر پاکیزہ ہو گیا۔

سطوت :۔ تنگ ہوں زیست سے فرصت جو مجھے دیتا ضعف اپنے پاؤں سے میں ایدل سوے قاتل جاتا

پہلے مصرعہ میں لفظ (ضُعف) "ضوف" ہو کر ادا ہوتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں (پاؤں) "پاؤون" ہو جاتا ہے۔ فصاحت کی بالغ نظری نے اپنی اصلاح سے یہ دونوں نقص دور کر دئے :۔

تنگ تھا زیست سے مانع مجھے ہوتا جو ضعف اپنے ہی پاؤں سے میں جانب قاتل جاتا

سطوت :۔ بدمزہ ہو کے مجھے قتل ہی کرتا شاید کان تک اس کے اگر شور سلاسل جاتا

معنی کے لحاظ سے شعر بہت رکیک ہے اس لئے فصاحت نے پہلا مصرعہ بدل دیا :۔

اپنے دیوانہ پر آتا اسے کچھ رحم ضرور

سطوت :۔ باغباں نالوں کی تاثیر نہیں کیوں ہوتی گوش گل تک نہیں کیا شور عنادل جاتا

پہلا مصرعہ بالکل مبتدیانہ ہے اور دوسرے مصرعہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا یعنی تاثیر نہ ہونے کی کوئی کیفیت ظاہر نہیں کی گئی۔ اصلاح بہت پاکیزہ ہے :۔

باغباں ہنسنے پہ اس کے ہی تعجب مجھ کو

لفظ (ہنسنے) سے دوسرے مصرعہ کا ثبوت پیش کر دیا گیا۔

سطوت :۔ افسوس وہ حسیں نہ رہے، وہ نہ ہم رہے وہ صحبتیں گئیں وہ زمانہ گزر گیا

دوسرا مصرعہ صاف تھا، لیکن پہلا بالکل لچر تھا۔ فصاحت نے اس کو بدل کر اک لطف پیدا کر دیا :۔

اب وہ حسیں رہے نہ وہ افسوس ہم رہے

سطوت :- حسینوں پہ کیوں ہائے عاشق ہوا مجھے بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا ،
دوسرے مصرعہ میں (بیٹھے بیٹھے) کا استعمال بے محل تھا، اس لئے فصاحت نے اسے یوں کر دیا :-
مجھے بیٹھے بٹھلائے کیا ہو گیا

سطوت :- عجب حال ہے مجھ سیہ بخت کا بہار آئی سودا ہوا ہو گیا ،
پہلے مصرعہ میں صرف سودا کی رعایت سے (سیہ بخت) لایا گیا تھا، فصاحت نے پہلا مصرعہ بدلکر شعر میں جان ڈالدی :- ترے وحشیوں کا عجب حال ہے
(ترے وحشیوں) کے فقرہ نے عجب لطف پیدا کر دیا

سطوت :- زلفوں نے آکے ڈھانک لیا رُوئے پر ضیا ٹوٹا جو بند رات کو اس کے نقاب کا
فصاحت نے اس میں صرف ایک لفظ کا تغیر کیا ہے یعنی (آکے) کی جگہ (بڑھکے) بنا دیا ہے، لیکن اسی ادنیٰ تغیر نے اک کیفیت پیدا کر دی۔

سطوت :- بعد مُردن یہ محبت کا اثر باقی ہے کف افسوس ملے جب ہیں انھیں یاد آیا
پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) ہونا ضروری تھا اس لئے اُستاد نے یہ اصلاح دی :-
بعد مُردن بھی یہ اُلفت کا اثر باقی ہے

سطوت :- جب سے کہ عاشقِ مژہ یار ہو گیا اک تیر تھا کہ دل سے مرے پار ہو گیا
پہلے مصرعہ میں (جب سے کہ) نہایت ہی ثقیل تھا اور دوسرے مصرعہ میں (اک تیر تھا) کہنا بالکل بے محل تھا کیونکہ (جب سے) کہنے کے بعد اس کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب مٹ گئے :-
ہے سمجھے عاشقِ مژہ یار ہو گیا یہ تیر ہائے دل سے مرے پار ہو گیا

سطوت :- مُنھ رکھ کے چشمِ یار پہ آزار ہو گیا نرگس کا پھول سونگھ کے بیمار ہو گیا

مطلع بنانے کی کوشش میں شاعر نے اس شعر کو بالکل مہمل کر دیا تھا۔ اصلاح سے مطلع تو باقی رہا نہیں لیکن شعر خاصہ ہو گیا۔

منھ رکھ کے چشم یار پہ غش آگیا مجھے ۔۔۔ نرگس کا پھول سونگھ کے بیمار ہو گیا

سطوت :- بہتر ہے ہجر یار سے سطوت جو آئے موت ۔۔۔ صدمے اٹھائے زیست سے بیزار ہو گیا

انداز بیان کی ژولیدگی ظاہر ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یوں ادا ہونا چاہئے تھا کہ "اتنے صدمے اُٹھائے کہ زیست سے بیزار ہو گیا"۔ اصلاح کی پاکیزگی قابل داد ہے :-

آخر کو زہر کھا لیا سطوت نے ہجر میں ۔۔۔ اس درجہ اپنی زیست سے بیزار ہو گیا

سطوت :- عجیب مجھ کو مزہ ملگیا فقیری میں ۔۔۔ خدا سے مانگ کے میں ملک و مال کیا کرتا

پہلے مصرعہ میں محض وزن پورا کرنے کے لئے بجائے (ملا) کے (ملگیا) استعمال کیا گیا تھا اس لئے فصاحت نے اس کو یوں بنا دیا :- ۔۔۔ عجیب مجھ کو ملا ہے مزہ فقیری میں

سطوت :- ہجر میں تیرے صنم جان لبوں پر آئی ۔۔۔ بخدا اسپہ تری یاد سے غافل نہ ہوا

پہلا مصرعہ بہت کمزور تھا اور دوسرے مصرعہ میں لفظ (بھی) ضروری تھا۔ اصلاح سے دونوں عیب مٹ گئے :-

صدمۂ ہجر سہے، جان لبوں پر آئی ۔۔۔ لیکن اسپر بھی تری یاد سے غافل نہ ہوا

سطوت :- ہم کریں نالے اگر جا کر میان کوئے دوست ۔۔۔ ایک ہو دم میں زمین و آسمان کوئے دوست

دوسرے مصرعہ کی لغویت ظاہر ہے۔ اصلاح پاکیزہ دی گئی :-

تنگ اپنی زیست سے ہوں ساکنان کوئے دوست

سطوت :- در و دیوار سے ٹکرا کے سر اپنا پھوڑا ۔۔۔ تو جو آیا نہ مجھے گھر میں نظر آج کی رات

اس میں اُستاد نے دوسرے مصرعہ کے (تو) کو (وہ) کر دیا اور اس میں کلام نہیں کہ اس ذرا سے تغیر سے شعر

بہت پُر لطف ہوگیا۔

سطوت:۔ یا غیر کو یا مجھ کو صنم گھر میں بلاؤ   بس کہد دو ہی تم کو جو ہے مدِ نظر آج

پہلے مصرعہ کی بیہودگی اس قابل تھی کہ پورا شعر کاٹ دیا جاتا لیکن جناب فصاحت نے ایسا نہیں کیا اور اسی کو یوں بنا دیا:۔

یا غیر کو یا مجھ کو صنم گھر سے نکالو

سطوت:۔ دم میں خود ہونگے فنا اے یار کیا انکو ثبات   کھیل سے آکر حبابوں کو لبِ ساحل نہ توڑ

پہلے مصرعہ میں (دم میں خود ہوں گے فنا اے یار) کا ٹکڑا بہت بُرا تھا۔ اُستاد نے مصرعہ بدلکر یوں کر دیا:۔

خود فنا ہو جائیں گے اے شوخ انکو کیا ثبات

سطوت:۔ اے آسماں ملا مرے محبوب سے مجھے   دیکھوں گا اس کو میں تو مرا ہوگا غم غلط

اصلاح یہ دی گئی ہے:۔

کہتے ہیں ہجر میں مجھے سب دیکھکر عزیز   ذکر وصال چھیڑئے، ہو جائے غم غلط

سطوت کا دیوان کافی ضخیم ہے اور ہر جگہ فصاحت کی اصلاحوں سے مزین نظر آتا ہے۔ مجھے حیرت اس پر نہیں کہ انھوں نے کیسی پاکیزہ اصلاحیں دی ہیں بلکہ تعجب اس پر ہے کہ انھوں نے ایسے لغو ومہمل کلام پر اتنا وقت کیوں ضایع کیا۔ لیکن اگر یہ صرف اُن کی وسعتِ اخلاق تھی، تو فصاحت کو شاعر سے بھی بڑھکر ولی کامل ماننا پڑے گا، کیونکہ اس سے نیچے درجہ کا انسان تو اتنا اور ایسا ایثار کبھی نہیں کر سکتا۔

جنوری ۳۵ء کا نگار

حسب معمول ضخیم شائع ہو رہا ہے جو مکمل تبصرہ ہوگا لکھنؤ اور دہلی اسکول کی شاعری پر۔ نہ اس سے قبل کسی رسالہ میں اتنا مکمل تذکرہ آپ کو نظر آیا ہوگا، اور نہ کسی کتاب میں۔ ایک پرچے کی قیمت کا اندازہ عہ لگایا جاتا ہے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری جاری رکھئے اور اگر خریدار نہیں ہیں۔ تو جلد خریداروں میں اپنا نام درج کرا کے اس کو مفت حاصل کیجئے۔ اس صورت میں آپ سے علحدہ کچھ قیمت نہیں لی جائے گی۔

منیجر نگار

شبِ بہار

جب رات کو ظلمت ہی ظلمت عالم پہ مسلط ہوتی ہے
جب چادرِ غفلت اوڑھے سب مخلوقِ الٰہی سوتی ہے
جب ابر اُمنڈ کر آتے ہیں اور بن کے سکوں چھا جاتے ہیں
پیمانۂ گُل کو صہبائے شبنم کے لئے ترساتے ہیں
پوشیدہ نظر سے جب تاروں کی مست ادائیں ہوتی ہیں
ہوتا ہے فضا میں سناٹا، مخمور ہوائیں ہوتی ہیں
اشجارِ چمن کی شاخوں کو جب نیند کے جھونکے آتے ہیں
اور نکہتِ گل کے خُم کے خُم گلشن میں لنڈھائے جاتے ہیں۔
پھر پی لی ہے میں نے پیت کی مے محسوس میں ایسا کرتا ہوں
پھر مجھکو کسی سے اُلفت ہے محسوس میں ایسا کرتا ہوں

اختر انصاری دہلوی

نقشِ نگار

عشق کی وحشت سرا میں پہلے خود کھویا مجھے — ڈھونڈتے پھرتے ہو اب لیکر ید بیضا مجھے
وسعتِ ذوقِ نظر اُف رے تری معراجِ شوق — اب خدا ہونیکا خود اپنے پہ ہے دھوکا مجھے
مجھ سے یہ بیگانگی اور غیر سے یہ التفات — میری نظروں میں کیا جاتا ہی کیوں رسوا مجھے
چشمِ عالم درسِ خودداری دئے جاتی مگر — تیری نظروں نے بنایا شورشِ بیجا مجھے
عرش والوں نے مجھے سمجھا تھا خاکستر نشیں — جستجوئے یار نے دیکھا فلک پیما مجھے
مجھ پہ یہ تشہیر کی تہمت غلط یکسر غلط — تو نے یوں بیساختہ کیوں بزم میں دیکھا مجھے

جس ادا سے طور کو سرمہ کیا تھا اے نگار
وہ ادائے دلنشیں اک بار پھر دکھلا مجھے

سروپ سہائے نگار

وقت کا راگ

جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے فضائے دہر میں
ایک لافانی سفر در پیش ہے شام و سحر
جا رہا ہوں اپنے مقصودِ سفر سے بے خبر
اور بھی ہیں قافلے میری طرح گرمِ سفر
ہیں ستارے بھی رواں اپنے دیاروں کی طرف
گم شدہ ارضِ وطن کے خلد زاروں کی طرف
اور انساں بھی ہیں ذوقِ جستجو سے بیقرار
تھک کے گو رستے میں گہری نیند سو جاتے ہیں یہ
موت کے خاموش ویرانے میں کھو جاتے ہیں یہ
آہ انساں یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ وقت ہے
اور مری تابِ سفر ہے اُن کے دم سے برقرار
(گو مرے دامن پہ آسودہ ہے صدیوں کا غبار)
ہے اُمیدوں کے اُفق پر دائمی طلعت کا نور
موت کے جھونکوں سے بجھ جاتے ہیں روحوں کے شرار
پھر مگر ہوتے ہیں شعلے زندگی کے آشکار
ہو اگر مجھ کو نہ انسانوں کی ہمراہی نصیب
دلشکن مایوسیوں سے مضمحل ہو جاؤں میں
بیدلی کے کیفِ مرگ آموز میں کھو جاؤں میں
اور مِل جائے مری ہستی سراسر خاک میں
بزمِ ہستی میں حوادث کا گزر کوئی نہ ہو
زندگی کوئی نہ ہو شام و سحر کوئی نہ ہو

عدم

سنئے ، ایک بات ضروری عرض کرنا ہے۔ کل دلدار خانصاحب کا خط آیا۔ وہ کہتے ہیں اگر اسوقت غفلت سے کام لیا گیا تو پھر ایسا موقعہ ہاتھ نہ آئے گا — چونکہ موقعہ محل کی باتیں آپ زیادہ سمجھتے ہیں اس لئے میں نے جواب دینے سے قبل یہ مناسب سمجھا کہ آپ کی رائے اس معاملہ میں لیلوں۔

یہ بالکل درست ہے کہ میں اس کام کی تکمیل کے لئے بیتاب ہوں اور یہ بھی غلط نہیں کہ خانصاحب میرے ہوا خواہ ہیں اور ایک حد تک صائب الرائے بھی، لیکن مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ اگر اس کے بعد بھی کاربرآری نہ ہوئی تو پھر سوائے سر پھوڑ کر مر جانے کے اور کوئی صورت باقی نہ رہیگی۔

بار بار آپ کا احسان اُٹھانے میں تو چنداں حرج نہیں، لیکن یہ مسلسل مایوسیاں کس سے برداشت ہونگی۔ بہر حال، آپ کے جواب کا منتظر ہوں، اور جواب بھی وہ جس میں میری "خاطر داری" کا لحاظ مطلق نہ کیا جائے بلکہ صرف مصلحت و عاقبت بینی کا۔

ارے یار، چپ بھی رہو۔ اب کیوں کہتے ہو — اُف، اُف،

عرفی مگو بہ تیرہ شب ہجر حرف مے
حرفے ست ایں کہ در شب مہتاب گفتنی ست

یہ تم نے کیا کہا، یہ میں نے کیا سنا — معاذ اللہ!

باور کرو جس وقت وہ صحبت یاد آجاتی ہے تو دل تڑپ کر رہ جاتا ہے — تمہارے کہنے کی ضرورت تھی، میں تو وہاں اُڑ کر پہونچتا، لیکن باور کرو، بہت درماندہ ہوں "اتنا درماندہ کہ اب کیا کہوں"۔

قصۂ غم سنا کر تمہاری مسرتوں کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تمہاری کامرانیوں کی خبر سُنکر اسوقت میں اپنی ناتمامیاں بھی بھُلائے بیٹھا ہوں۔

کتنے دن قیام کا ارادہ ہے — کل چائے کے وقت میں نے شکردان کھولکر دیکھا تو شکر کے اندر ایک چیونٹا ملا خشک مرا ہوا۔ میں نے سوچا کہ دیکھئے، جان بھی وہیں دی اور دفن بھی وہیں ہوا — سو بھائی تمہاری خواہش تو قریب قریب یہی ہوگی لیکن میں جانتا ہوں کہ اتنی فرصت زمانہ کب دیتا ہے، بہر حال وہاں سے آنا پڑے گا اور اسی لئے پوچھا کہ کب تک اس کی توقع۔ (غالباً اندیشہ، زیادہ صحیح لفظ ہوگا) کی جائے۔

میرا سلام عرض کر دو اور کہو کہ کیوں صاحب اِدھر سے گزر جانا اور بات تک نہ پوچھنا۔ بہتر ہے ہمانے بھی

اگر اس غصہ میں شیشہ کا شیشہ خالی نہ کر دیا تو میرا نام مفتی صدر الدین آزردہ نہیں۔

میں اور شغل بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں (آزردہ)

ہنسو، ہنسو، ہاں، خوب ہنس لو۔۔ کا ہے کو کبھی ایسا موقعہ ہاتھ آئے گا۔ میں بیوقوف تھا کہ وہاں جاکر یہ رسوائی اٹھائی، اور تم۔ ہاں بھئی، تمہاری فراست، و دانشمندی کا کیا کہنا، کہ یہاں کہتے کہتے زبان گھس گئی لیکن تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تم لاکھ عذر کرو، لیکن بخدا یہ سارا مظلمہ تمہاری گردن پر ہے۔ نہ تم خاموش رہتے، نہ مجھ سے یہ حرکت ہوتی کہ:۔

اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

شامت جب آتی ہے تو اکثر احباب ہی کے وساطت سے آتی ہے۔ پھر اب فرمائیے کیا ارادہ ہے۔ تم سے تو خیر انتقام لینا چنداں دشوار نہیں۔ گیا اور تمہاری تسبیح توڑ کر رکھدی، دلایل الخیرات چھپا کر گم کر دی، جانماز گھسیٹ لی اور یہ کچھ نہ سہی تو تیمم کا تودہ ہی اٹھا کر پھینک دیا۔ تمہارے رُلانے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اُس "شقی" سے کیونکر عہدہ برآ ہوں، نہ خدا کا قایل نہ رسول کا، نہ کسی پیر کا معتقد نہ ولی کا۔ نہ دل میں مروت نہ آنکھوں میں لحاظ۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی ۔۔ یہ بتاؤ تو جانوں۔

میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ چند دن میں یہاں آئیں گے، اس لئے کیوں نہ وہ دروازہ ان کے لئے مسدود کر دیا جائے جہاں کی آستاں بوسی اُن کا دین و ایمان ہے۔۔ پوچھو اس کا کیا ذریعہ ہے؟

تم نے اُن میر صاحب کو دیکھا ہوگا جو تنبورہ لئے ہوئے "قاچار" کے مکان کی طرف اکثر جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔ وہ ہیں اُن کے اُستاد۔ اور مجھ سے وہ عقیدت رکھتے ہیں اس لئے کہ مجھ سے زیادہ ان کا کوئی مداح نہیں۔ نہ یہ میرا کہا ٹال سکتے ہیں نہ وہ ان کا۔۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ اس ذریعہ سے ایک جنگ کرادوں۔ باور کرو میں اسکا دوست ہوں، لیکن یہ تباہی منظور ہے اور وہ خانماں بربادی منظور نہیں۔۔ وہ تو ہوگئے ہیں پاگل، اس لئے اگر ان کے طرزِ عمل سے خفا ہو کر بیٹھ جاؤں تو پھر کون اس کشتی کو بھنور سے نکالنے والا ہے؟ کیا تم؟۔ کیوں نہ ہو، ماشاء اللہ!

یاد فرمائی کا شکریہ ۔ آپ نے ..... صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، خدا کرے صحیح ہو، لیکن میری رائے اُن کے نسبت یہی ہے کہ

کم چنیں دیوانۂ ہشیار پیدا می شود

آپ اپنی فطرت کے لحاظ سے فرشتہ ہیں، اس لئے ساری دنیا کو بے گناہ جانتے ہیں، میں ایسا نہیں ہوں، اس لئے سمجھتا ہوں کہ معصوم صورتوں میں کیسی کیسی قبیح سیرتیں چھپی رہتی ہیں۔ بہرحال آپ اپنے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، آپ کی مرضی ہے جو جی میں آئے کیجئے۔ لیکن مجھ سے رائے نہ طلب کیجئے میں تعمیل ارشاد پنڈت جی سے ملا، اُن کے اندازِ گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ اس باب میں براہ راست آپ ہی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور میری وساطت پسند نہیں۔ اور یہ بھی ٹھیک۔ آپ لینے والے وہ دینے والے، میں کون؟ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

تمہارا خط ابھی ابھی ملا۔ یعنی ۱۰ ستمبر ٹھیک دس بجے دن کو۔ اور اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ باتیں مزہ کی تھیں، جی لگ گیا۔ خیر، بُزرگی وُزرگی تو میں جانتا نہیں، لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ میرزا مظہر اپنے ذوق کے لحاظ سے واقعی "جانِ جاناں" تھے۔

اگر تم نے ان کے کلام کا غایر مطالعہ کیا ہے تو اس کے ماننے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ وہ نہایت رنگین و لطیف طبیعت رکھتے تھے اور ذوقِ شعر کے لحاظ سے تو فارسی اُردو دونوں میں ان کا جواب نہ تھا۔

رہگیا سوال تاباںؔ کا، سو تذکرہ نویس کچھ کہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اُن سے شدید محبت کرتے تھے۔ تاباںؔ کے غیر معمولی جمیل ہونے پر سب کو اتفاق ہے، رہگئے میرزا صاحب، سو ان کا یہ ذوق خود اُن کے کلام سے ظاہر ہے۔ ہرچند امرد پرستی کا اظہار فارسی شاعری میں ایسی معمولی بات ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے امرد پرست ہونے پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، لیکن میرزا صاحب کے یہاں یہ رنگ کچھ عجیب و غریب کیفیت لئے ہوئے ہے۔

اس قسم کے اشعار کم و بیش تمام شاعروں میں پائے جاتے ہیں، لیکن میرزا صاحب جس تکرار و لذت کے ساتھ اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں وہ دوسروں کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے، چند شعر سناتا ہوں۔

الہٰی باطل من عشق نوجوانے ہست دگر چگونہ تواں کرد یا بدعی منظہر

تم کہو گے کہ "نوجوان" مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی، بہتر ہے ایک شعر اور سنو:-

کنوں در جائے سر پیچ مرصع سنگہا دارد بطفلاں مظہر ما بسکہ اُلفت بیشتر دارد

ممکن ہے تم یہ کہو کہ طفل چھوٹے بچے کو کہتے ہیں اور اس سے امرد پرستی کو کوئی تعلق نہیں، لیکن خود میرزا صاحب نے طفل کے کیا معنے لئے ہیں، یہ بھی سن لو:-

عشقبازاں مرید طفلان اند پیر ایں قوم نوجوان باشد

طفل سے مراد اُن کی نوجوان ہے یا نہیں؟ اب کیوں نہیں بولتے۔ اچھا اور لو:-

عاقبت از بہر تحصیل کمال جذب عشق شد مُرید نوجوانے گرچہ مظہر پیر بود

میرسں باعث ضعف قوائے مظہر ما کہ گشتہ پیر ز بیداد نوجوانے چند

مظہر تو دشمن خودی اے خاناں خراب دل می دہد بدست سپاہی پسر کسے؟

خویش را مظہر بدست دلبرے بفروختم بہر بیعت پیری مجستم جوانے یافتم

بعض اشعار میں تو انھوں نے اشارہ تک کر دیا ہے مثلاً:-

من از رنگیں ادائیہائے اشعارش گماں دارم کہ مظہر میل با رعناں جوانے میرزا دارد

اور ایک جگہ تو اس سے بھی زیادہ کھل گئے ہیں:-

کفر و دیں امروز مظہر نازہا دارد بہ من سرو رعنا ساخت عشق میرزا را جا مرا

اس کی تحقیق شاید تم نے کی ہو گی کہ وہ حیدر آباد گئے یا نہیں لیکن دکن کے سانولے سلونے لڑکوں سے انھوں نے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس شعر سے عیاں ہے:-

گشتہ ام محو سوادِ خط سبزان دکن دلنشیں اُفتاد نقش حیدر آبادی مرا

یہ تو وہ اشعار ہیں جن میں کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں، ورنہ یوں تو جھلک نہ معلوم کتنے اشعار سے نمایاں ہے۔
ایک شعر سنو کس قیامت کا کہہ گئے ہیں:-

سرازیں تیغ بُردن آساں نیست آہ، مظہر خم سلام کسے

میں تو مظہر کے ذوقِ شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست تھے یا کیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے آگاہ نہیں کہ "حسنِ مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہوتا ہے۔ گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ محبت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری

سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں۔ میں محبت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ اس کی لذت باقی رہے۔ عورت کے ساتھ جانماز کا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں

پیر و مرشد،

آپ اس محبت سے فرمائیں اور میں تعمیل نہ کروں۔ یہ آپ نے کیا کہا، میری فطرت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ:۔

ہر آنکہ بندہ بخواند مرا خدائے من است

چہ جائیکہ آپ، جن کے الطاف میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں۔ آپ مطمئن رہئے، امکان سے بھی زیادہ اگر کوئی صورت کوشش کی ہو سکتی ہے تو وہ بھی صرف کر دی جائے گی اور توقع ہے کہ ناکام نہ رہوں گا۔
کل صبح اول وقت نماز پڑھکر (نماز اس لئے کہ آپ کو میرے خشوع و خضوع کا یقین ہو جائے) راجہ صاحب سے ملوں گا اور کہوں گا کہ سرکار یہ معاملہ میری موت و زیست کا ہے، اس لئے اگر مجھے ہلاک کر کے دنیا کی رونق آپ واقعی تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں، تو خیر، بات دوسری ہے، ورنہ جس طرح ممکن ہو، بشیر کو صدر دفتر میں تبدیل کر دیجئے وہ پوچھیں گے اس سے تمھاری موت و حیات کا کیا تعلق ہے، میں عرض کروں گا کہ پیر و مرشد کی تمنا یہی ہے اور ان کی کسی آرزو کا پورا نہ ہونا میرے لئے موت سے بدتر ہے" ۔ امید تو ہے کہ مان جائیں، لیکن اگر یہ تدبیر نہ چلی تو پھر ایک صورت اور میرے ذہن میں آئی ہے۔ آپ سے اس لئے نہیں کہنا چاہتا کہ کہیں شرعی جواز و عدم جواز کی بحث نہ چھڑ جائے اور آپ مجھے اس سے باز رکھیں۔

عزیز، کیا پوچھتے ہو کیا عالم ہے۔ موسم کو دیکھتا ہوں اور یہ شعر پڑھتا ہوں

بہار ہند بود برشگال ہاں، غالب
دریں خزانکدہ ہم موسم شرابے ہست

اُف یہ کالی کالی گھٹائیں، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، اور ادھر

سفالینہ جام من از مے تہی

کل، یوسف کا خط آیا ہے، لکھتے ہیں آ رہا ہوں۔ میں تمھیں خط بھیجتا ہوں، خدا کرے تم بھی جواب میں لکھو کہ

آرہا ہوں - ہائے، ہائے - ابھی نہ یوسف پاس نہ عزیز قریب، لیکن تصور ہی سے بے قابو ہوا جاتا ہوں — کیا تمھیں میری اس بے بسی و بیکسی پر بھی رحم نہ آئے گا۔

تم کہو گے کہ یہاں آکر کیا کروں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک جگہ نہ بیٹھ سکنے کا عذاب جو خدا نے تم پر مسلط کیا ہے وہ یہاں بھی ساتھ آئے گا، سو، سُن لو کہ تمھارے آنے کے بعد میں خود یہاں نہیں ٹھیروں گا۔ اور دو چار دن کیلئے یا جب تک تم کہو گے بالکل خارج البلد رہوں گا۔

سر پھوڑنے کے لئے نہ یہاں پہاڑوں کی کمی ہے اور نہ دشت نوردی کے لئے جنگلوں کا نقدان — چلو تمھارا انتظام تو ہو گیا رہا میں اور یوسف، سو ہم دونوں گاؤں کے کسی جھونپڑے میں رات کو جس وقت بادل گرج رہے ہونگے مینہہ برس رہا ہوگا کہیں دور سے آنے والی بانسری کی آواز کو سنتے رہیں گے اور تڑپتے رہیں گے۔ مگر ظالم تو کب میرا کہا مانتا ہے۔

کبھی کود کی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی

کل ہی اجین سے واپس آیا ہوں - تم بہت یاد آئے - چندراوتی کا گانا تھا۔ لطف آگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مع اپنی آواز کے دل میں سمائی جارہی ہے۔ عمر ۳۰ سال سے متجاوز، لیکن چمپئی رنگت اور نقشہ کی دلآویزی ہنوز باقی ہے۔ اچھو میاں بھی تھے اور ڈاکٹر شریف الحسن بھی — ان کی ترکیب سنئے، ایک صاحب نے تو "بھیرویں بہار" کی راگنی میں ان کی شاگردی اختیار کی۔ اور دوسرے نے ایمن میں ان کی صاحبزادی کی — یہاں انتہائی مایوسی میں بے اختیار جی چاہا کہ طبلہ اپنے سر پر دے ماروں یا سر طبلہ پر پٹک دوں، لیکن میر منور علی صاحب مجھ سے زیادہ تیز نکلے اور طبلہ کے ساتھ سارنگی کو بھی سنگوا کر بیٹھ گئے — کیا کہوں یہ چار دن کس خود فراموشی کے عالم میں بسر ہوئے ہیں — یاران مخلص کا ایک جگہ بیٹھ جانا بھی واللہ، کتنی بڑی نعمت ہے۔

فی الحال میرا ارادہ لکھنؤ آنے کا نہیں ہے، لیکن اگر زمانہ نے فرصت دی اور مکروہات نے پیچھا چھوڑا تو نومبر کے پہلے ہفتہ میں چار دن کے لئے ضرور آؤں گا۔ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اور جب سے یہ سُنا ہے کہ تم نے وہاں اپنا گھر بسالیا ہے تو بیتابی اور بڑھ گئی ہے۔

ممتاز - یہ تم نے کیونکر جانا کہ مجھے گھر کی محبت نہیں اور گھر گیا بھاڑ میں، کیا تمھاری محبت بھی نہ ہوگی، لیکن پیارے یہ بتاؤ کہ وہاں قیام کی صورت کیا ہے۔

سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیثیست صحیح
نتواں مُرد بہ سختی کہ من آنجا زادم

خدا کرے تم زندہ رہو کہ اس پیار سے کبھی کبھی پوچھ لیتے ہو، ورنہ اب اور کون پوچھنے والا باقی رہگیا ہے بہرحال آؤنگا اور وطن کی ویرانیوں پر آنسو بہانے جلد آؤں گا - خدا حافظ

میرے عزیز دوست -

میرا معاملہ ان کے ساتھ کیا ہے، اب یہ نہ پوچھئے۔

نے رخصتِ اشکے نہ فراغتِ آہے
دارم بہ رخِ یار غریبانہ نگاہے

میں یونہی پُر دل تھا آپ نے ہمدردی فرماکر اور غضب ڈھا دیا- آپ کو کیا خبر کہ کتنی بار رو رو کر سینہ ہلکا کرنے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن دل ہے کہ اُمنڈا چلا آرہا ہے، آپ اپنے منھ سے کیوں کہیں، مجھے خود اسکا اعتراف ہے کہ تنگ ظرف ہوں، تنگ حوصلہ ہوں، درد کی تاب نہیں، ضبط کا یارا نہیں، اور کس کس سے اس حقیقت کو دُہراتا پھروں کہ

مرا صبر بے کم است و درد بسیار است ی نالم

آپ کی ہمدردیوں کا شکر گزار ہوں اور آپ کی چارہ سازیوں کا ممنون، لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں- ایک زمانہ تھا کہ مجھے خودداری کا احساس تھا اور سعی و طلب میں بیقرار رہتا تھا لیکن رفتہ رفتہ نہ وہ خودداری باقی رہی نہ سعی و طلب کی وہ بیقراری، یہاں تک کہ اب زندگی کا مفہوم بجز

تنہا ملول بودن و تنہا گریستن

کے اور کچھ نہیں ہے -

محترمہ - اشعار ملے اور تمام اُن درد سامانیوں کے ساتھ جو بقول آپ کے آپ کی زندگی کا سہارا، لیکن میرے

نزدیک موت کا کفارہ ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں "موج کوثر و تسنیم" کے لئے دنیا نے کتنی بار مجھ سے مطالبہ کیا اور میں نے ہمیشہ یہ کہکر ٹالدیا کہ دیکھا جائے گا۔ میں کسی سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کون ہیں اور کیوں اپنے کلام کی اشاعت گوارا نہیں فرماتیں۔

آپ کا یہ شعر:۔ بانسری بج رہی تھی دور کہیں
رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

ابتک فضائے شاعری میں گونج رہا ہے۔ اب آپ نے دوسری صدائے دردناک سے تڑپا دیا۔ معاذاللہ!

کس نے مجھ کو پکارا صحرا میں
ہائیں آئی کدھر سے یہ آواز

جنگل کے سناٹے میں کسی عاشق آوارہ کا یہ محسوس کرنا کہ کوئی اُسے پکار رہا ہے، ایسی مکمل تصویر انتہائے وحشت و اُلفت کی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

دشت کو چھوڑ کے میں اسکی گلی میں پہونچا
کیا کہوں تجھ سے تو واں اور بھی ٹھیرا نہ گیا

میری ہلاکت کے لئے یہی شعر کیا کم تھا کہ آپ نے مقطع لکھکر اور قیامت کردی:۔

ہم بھی جا پہونچے تھے یہ دیکھنے کیسی ہے نسیم
حال اُس غمزدہ کا ہم سے تو دیکھا نہ گیا

باور کیجئے کہ آپ سے ملنے اور آپ کی داستانِ غم سننے کے بعد بھی مجھ پر اتنا اثر نہیں ہوا، جتنا آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ جو نگاہ آئینہ سے اچٹ کر آتی ہے وہ زیادہ قاتل ہوتی ہے۔

آپ کب ایک لکھوائیں گی۔ غالباً محرم میں۔ "ہاں، نہیں" دونوں صورتوں میں آپ کا سکوت ہی مناسب ہے۔ میرا لطفِ انتظار آپ کیوں غارت کریں۔

مکتوبات نیاز

—— "نہیں راجکماری، آپ کے دشمن بیمار ہوں، موسم بدل رہا ہے، اسی لئے طبیعت مضمحل رہتی ہے، خود میرا یہی حال ہے"
کملا، (تھوڑی دیر سوچکر) آپ ہی آپ) —— موسم بدل رہا ہے —— اسی لئے طبیعت مضمحل رہتی ہے۔
(سوشیلا سے) اچھا تو پھر یہ علاج کیوں ہو رہا ہے۔
سوشیلا۔ "راجکماری، علاج کسی بیماری کا تو نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ مبادا موسم کی خرابی سے مزاج ناساز ہوجائے"
کملا یہ سنکر آنکھ بند کئے پھر دیر تک خاموش لیٹی رہی اور پھر دفعتہً بولی۔ "سوشیلا، چترکوٹ تمھیں معلوم ہے کہاں ہے"
سوشیلا۔ "ہاں معلوم کیوں نہیں، سوامی جی اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے، یہ مقام انھیں بہت پسند ہے۔
کملا۔ "ہاں، تو پھر اس موسم کو کیوں نہ بدلدیا جائے۔ چلو چترکوٹ چلیں، سُنا ہے وہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اور ممکن ہے کہ......" خاموش ہوگئی۔
سوشیلا۔ "مناسب ہے لیکن دس دن کے اندر جانا اور واپس آنا —— مجھے تو اُمید نہیں کہ مہاراج مان جائیں"
یہ سنتے ہی کملا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، شال اُتار کر پھینکدی، اور کمرہ میں اِدھر سے اُدھر بیتابانہ ٹہلنے لگی —— سوشیلا سہمی ہوئی ایک کنارے کھڑی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اسوقت کملا کس اُلجھن میں گرفتار ہے۔
وہ ٹہلتے ٹہلتے دفعتہً میز کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور دیر تک دواؤں کو غور سے دیکھتی رہی۔ ایک شیشی کو ہاتھ میں لیا، دیکھا اور رکھدیا، دوسری کو لیا اور رکھدیا —— اس کے چہرہ کا رنگ غیر معمولی طور پر بدل رہا تھا، پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں جو نقاہت کی وجہ سے یونہی زیادہ نمایاں ہوگئی تھیں، اسوقت ابلی پڑ رہی تھیں۔
—— دوا - علاج - شفا —— احمق دنیا کی احمقانہ تدبیر، دل کی پھانس کو نہ دیکھ کر یہ پاؤں کے کانٹے نکالنے والے بیوقوف روح کے درد کو نہ سمجھکر پیشانی پر صندل لگانے والے کم عقل"
—— وہ یہ کہتی ہوئی پھر ٹہلنے لگی اور دفعتہً ایک جگہ ٹھٹھک کر بولی۔ "سوشیلا، یہ شیشیاں، یہ گلاس، اُٹھا کر پھینکدے یہ چیزیں مجھے بیمار ڈالدیں گی میں اب یہ زہر نہیں پی سکتی"
سوشیلا، جو پہلے ہی سے سہمی ہوئی تھی، یہ سُنکر تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر اس حکم کی تعمیل کی تو مہاراج کو کیا جواب دیگی اس لئے اس کے قدم جہاں تھے وہیں جمکر رہگئے —— اب کملا کا غصہ اور تیز ہوگیا اور وہ بغیر کسی انتظار کے میز کے پاس گئی اور ایک ایک کرکے تمام دوائیں پاس کی کھڑکی سے نیچے پھینکدیں۔ اور ایک ایسے سکون کے ساتھ جو بعض وقت انتہائی غیظ کی حالت میں پیدا ہوجاتا ہے۔ پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔"
یہ واقعہ ایسا معمولی نہ تھا کہ چھپا رہتا۔ آن کی آن میں راجہ کو خبر پہونچ گئی اور وہ گھبرایا ہوا خود کملا کے پاس آگیا۔

راجہ۔ "کیوں کملا، کیا حال ہے، یہ دوائیں کس نے پھینکدیں"

کملا۔ "میں نے"

راجہ۔ "کیوں، کیا بات ہوئی"

کملا۔ "کوئی بات نہیں، مہاراج، میں دوائیں پیتے پیتے گھبرا گئی ہوں اور اگر واقعی میں بیمار ہوں تو مجھے افسوس ہو کہ اسوقت تک ان میں سے کسی دوا نے اپنا کام نہیں کیا"

راجہ۔ "بہتر ہے، میں علاج بدلدوں گا، لیکن تمھیں غصہ تو نہ کرنا چاہئے تھا، طبیعت اور زیادہ بگڑ جائے گی"

کملا۔ "مہاراج، علاج کی تبدیلی بالکل بے سود ہوگی اور مجھے معلوم ہے کہ میں یہاں اچھی نہیں ہوسکتی"

راجہ۔ "پھر تم کہاں اچھی ہوسکتی ہو"

کملا۔ "چترکوٹ میں"

راجہ۔ "چترکوٹ! چترکوٹ! وہاں کون علاج کرنے والا ہے"

کملا۔ "رام چندر جی کے وہ چرن جو بن باس کے وقت وہاں پہونچے تھے اور جن کے نشان اب بھی اس جگہ موجود ہیں"

راجہ جو خود بھی واہمہ پرست ہندو تھا، یہ سنکر خاموش ہوگیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ "لیکن یہ تو دیکھو کہ اب دن کتنے باقی رہ گئے ہیں، تم اگر وہاں گئیں بھی تو ٹھہر نہیں سکتیں"

کملا۔ "میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں واپس آجاؤنگی"

راجہ (کچھ سوچکر) بہتر ہے اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو جاؤ، کیونکہ تمھاری صحت کے لئے میں دنیا کی ہر مصلحت قربان کرنے کے لئے طیار ہوں۔

---

(۱۰)

چترکوٹ کوہستان بندھیاچل کے اس حصہ کا نام ہے جہاں رام چندر جی نے بن باس کی حالت میں اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کئے تھے اور اسی لئے یہ مقام ہندوؤں کے یہاں جاترا کی نہایت مقدس جگہ سمجھا جاتا ہے، تمام سال زائرین کا سلسلہ آمد و رفت قایم رہتا ہے اور بعض فقراء نے تو اپنا استھان ہی یہاں بنالیا ہے۔ بعض نے پہاڑ کی چٹانوں پر کٹیاں بنالی ہیں، بعض نے بڑی بڑی چٹانوں کے سایہ میں پناہ لے رکھی ہے، بعض نے کوہستانی چشموں کے پاس جھونپڑیاں ڈال لی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو یونہی کھلی ہوئی جگہوں میں دھونی رما کر بیٹھ گئے ہیں۔

کملا صبح کو یہاں پہونچی اور اسی وقت سے کسی جستجو میں لگ گئی۔ نہ اب اس میں نقاہت پائی جاتی تھی، نہ کسی بیماری کا نشان، نہ اس کے چہرہ پر زردی تھی نہ اعضا میں اضمحلال۔ وہ پیادہ پا، ناہموار پتھروں پر ہرنی کی طرح دوڑتی پھرتی تھی اور اس طرح جستجو میں مصروف تھی گویا وہ ایک ایک چٹان کو اولٹ کر دیکھ لینے پر تلی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ میلوں کے گرد میں پھیلی ہوئی سادھوؤں کی آبادی کا تھوڑی دیر میں جایزہ نہ لے سکتی تھی، صبح سے شام ہوگئی اور آخر کار ایک ایسے استھان پر جو چشمہ کے کنارے ہونے کی وجہ سے بہت دلکش و سکون بخش تھا، وہ تھک کر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسوقت استھان خالی تھا اور سادھو کسی ضرورت سے دروازہ بند کرکے باہر گیا ہوا تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا، چڑیاں چشمہ سے پانی پی پی کر جھاڑیوں میں بسیرا لینے کے لئے جمع ہو رہی تھیں، ان کی نرم و دلکش آوازوں سے پہاڑی گونج رہی تھی اور سایہ بڑھتے بڑھتے تاریکی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ دفعتہً کملا کی آنکھ کھلی اور سب سے پہلے جس چیز پر اسکی نگاہ پڑی وہ سوامی جی کی صورت تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگی کہ یہ کوئی خواب تو نہیں ہے اور جب اسے یقین ہوگیا تو وہ پھر تھرا کر گرنے لگی۔ سوامی جی نے ہاتھ بڑھا کر اس کو سنبھال لیا اور کہا:-

"کملا، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، تم یہاں کیونکر آئیں"

کملا خاموش، سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی اور ایک خفیف سی مگر نہایت سریع لرزش اس کے تمام جسم پر طاری تھی وہ کچھ نہ بولی۔ سوامی جی نے پھر پوچھا، پھر کوئی جواب نہ ملا۔ پورے پندرہ منٹ اسی حال میں گزر گئے اور آخر کار جب سوامی جی نے یہ کہا کہ "کملا، بہت دیر ہوگئی ہے، چلو میں تم کو تمھارے ٹھکانے پہونچا دوں" تو وہ چونکی، جانے کے نام سے اسکے دل پر چوٹ سی لگی اور بولی۔ "ٹھکانے پہونچانے، یا ٹھکانے لگانے، مہاراج میں یہاں سے جانے کے لئے نہیں آئی ہوں" یہ سنتے ہی سوامی جی کی حالت عجیب ہوگئی، چہرہ پر غیر معمولی رنگ دوڑ گیا، ہاتھ پاؤں میں بےچینی سی محسوس ہونے لگی، اعصاب میں بجلی سی دوڑ گئی اور کملا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھے اور کہا کہ "اندر آؤ، یہاں سردی ہے اور تمھارے جسم پر ساری کے سوا کچھ نہیں"

دونوں اپنی جگہ ایک دنیائے تصور بنے بیٹھے ہیں، اور اگر ان کے اس عالم خیال کی کوئی مرئی تصویر لیجا سکتی تو شاید اس کا کوئی منظر اس حال سے خالی نہ ہوتا کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہیں۔ کچھ دیر بعد سوامی جی نے اٹھکر چراغ جلاتے ہوئے کہا۔ "کملا تمھارے بٹھانے کے لئے میرے پاس تو کوئی بوریا بھی تا بعد موجود نہیں"۔ کملا نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اسی عالم محویت میں گردن جھکائے بیٹھی رہی۔

سوامی جی نے چراغ جلا کر کٹی کے ایک کونے سے لیٹتے ہوئے کہا۔ "کملا، تم آج میری مہمان ہو، اور میں حیران ہوں کہ تمھاری کیا سیوا

مجھ سے ہو سکتی ہے"۔۔۔۔۔ کملا نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

سوامی جی نے اس کے قریب آکر اس کا شانہ چھو کر کہا۔ "کیوں، کملا، کیا کچھ خفا ہو، جو جواب نہیں دیتیں"۔ شانہ پر ہاتھ کا لگنا تھا کہ کملا کی حالت ایسی ہوگئی گویا وہ شاخ بید ہے جس سے تیز ہوا کا جھونکا گزر گیا ہے، سوامی جی نے گھبرا کر پوچھا "یہ کیا حال ہے"، لیکن یہ پوچھنا قیامت ہوگیا کیونکہ وہ سنتے ہی بے اختیارانہ ایک جسم بیجان کی طرح ان کی آغوش میں گر پڑی اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک پڑی رہی۔ جس وقت اُس کی آنکھ کھلی تو سوامی جی غائب تھے اور ان کی ایک تحریر سامنے پتھر پر رکھی ہوئی تھی۔

"کملا، میں نے اپنی زندگی میں دو عہد کئے تھے، ایک یہ کہ میں کبھی اس جسمانی لذت سے آشنا نہ ہوں گا جس سے تم بیتاب ہو کر میرے پاس آئی تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگر کبھی مجھ سے ایسی لغزش ہوگئی تو پھر دنیا میں زندہ نہ رہوں گا۔ یاد کرو رتن گڈھ کی وہ صبح جب بجلی سے ڈر کر تم مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ میں کبھی اس لذت کو محو کرنے میں کامیاب نہیں ہوا جو زندگی میں سب سے پہلی بار ایک نوجوان عورت کے جسم کے اتصال سے مجھے حاصل ہوئی تھی، اگر یہ کہوں کہ میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تو یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا، اگر میں اسے شراب کی بدمستی سے تعبیر کروں تو یہ بھی غلط ہوگا۔ وہ ایک کیفیت تھی ناقابل اظہار، ایک لذت تھی ناقابل بیان۔ تم چلی گئیں اور میں نے کامل دو گھنٹے غور کیا کہ کیا میرا عہد ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن آخر کار میرے نفس نے دھوکا دیکر مجھے یہ باور کرایا کہ یہ جو کچھ ہوا صرف اتفاق تھا، قصد و ارادہ نہ میری طرف سے تھا اور نہ شاید تمہاری طرف سے، تاہم میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر تم پھر مجھ سے ملیں تو ممکن ہے مجھے اس لذت کی یاد پھر بیتاب کر دے۔

میں چترکوٹ چلا آیا، یہ خیال کر کے کہ تم بھی چند دن میں مجھے بھول جاؤ گی اور میں بھی۔۔۔ لیکن شام کو جب ناگہاں میں نے تمہیں یہاں پایا تو مجھے معلوم ہوا کہ نہ تم مجھے بھلا سکی ہو اور نہ میں تمہیں۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ میرا نفس جو دھوکا ایکبار مجھے دے چکا ہے، اسکی پاداش کا وقت آگیا ہے اور مجھے اس کے لئے طیار ہو جانا چاہئے چنانچہ میں تمہیں اندر لے گیا، یہ سمجھکر کہ مجھے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دینا ہے اور جسوقت تم میری آغوش میں آکر بیہوش ہوگئیں، تو میں نے اپنی وہ تمام قربانیاں پیش کر دیں، میں کہ اسوقت تک میں نے کبھی کسی عورت کے جسم کو قصداً نہیں چھوا تھا، تم کو اپنے سے اسقدر قریب دیکھکر بالکل دیوانہ ہوگیا تھا اور نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تمہاری آنکھوں تمہارے لبوں، تمہاری پیشانی، تمہارے ہاتھ، تمہارا سینہ، اور تمہارے پاؤں کو کس کس طرح اور کتنی بار چوما، اور آخر کار جب میں آپنے غلبۂ نفس سے تھک کر چور چور ہوگیا تو کتنی دیر تک تم کو اپنے سینہ سے لپٹائے ہوئے پڑا رہا۔

تم یہی چاہتی تھیں نا؟ ۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے دُنیا میں کسی اور لذت کی جستجو نہیں ہو سکتی، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب میں عہد کے دوسرے حصہ کو پورا نہ کروں۔ جان دینے سے زیادہ سہل دنیا میں کوئی بات نہیں اور شاید اچھا ہوتا اگر میں تمھارے پاس ہی دم توڑتا، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے تم بعض الجھنوں میں گرفتار ہو جاؤ یا میرا خط دیکھنے سے پہلے ہی مبادا خود جان دیدو یہاں سے دور اتنی دور کہ تمھارا وہم و خیال بھی نہیں پہونچ سکتا، اپنا عہد پیمان پورا کرنے جا رہا ہوں اور تم یہ یقین کرو کہ میں نے اسے پورا کر دیا اور اس دنیا میں اب تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکتیں ۔۔ تاہم مری ایک التجا ہے، اگر تم نے اسے پورا کیا تو خیر ورنہ تم سے شکوہ و شکایت کرنے اب کون آتا ہے ۔

ایک تو یہ کہ تم جیتر کوٹ سے فوراً رتن گڈھ جاؤ اور اپنے دل پر اس طرح قابو رکھو کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو، دوسرے یہ کہ تم شادی ضرور کرو، لیکن یہ شادی صرف اس لئے ہوگی کہ تم بدنام نہ ہو، تمھارے باپ کی خواہش پوری ہو جائے ورنہ تمھاری روح تو پہلے ہی سے میری تھی، اب تمھارا جسم بھی میرا ہی ہو چکا ہے، اور اُسے میرا ہی رہنا چاہئے ۔

---

(۱۱)

اس واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور راجکماری کملا شادی کے بعد جگدیش پور جا چکی ہے ۔۔

راجہ جگدیش پور ایک معمولی دل و دماغ اور نہایت ادنیٰ خصایل کا نوجوان ہے ۔۔ جس کا کچھ علم تو کملا کو شادی سے پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن شادی کے بعد جب وہ یہاں پہونچی تو اور زیادہ پست کنندہ حالات معلوم ہوئے۔ دنیا بھی کہتی تھی اور کملا خود بھی جانتی تھی کہ اس نے شادی صرف دولت کی طمع میں کی ہے لیکن ایک تو اپنے باپ کی بات کا پاس، دوسرے سوامی جی کی وصیت، وہ اس باب میں بالکل خاموش رہی اور اس نے شادی کی تمام رسمیں اس طرح ہو جانے دیں گویا کہ وہ کوئی پتھر کی مورتی ہے ۔

جگدیش پور پہونچنے کے بعد کملا کو معلوم ہوا کہ یہ اس کے شوہر کی پہلی شادی نہ تھی، بلکہ یہ شرف اس سے قبل ایک فرانسیسی عورت کو عرصہ ہوا حاصل ہو چکا ہے جو رانی کی حیثیت سے محل میں حکومت کر رہی ہے ۔۔ یہ ایک کمرہ میں جو اس کے لئے مخصوص تھا، جا کر پڑ رہی اور کامل ایک ہفتہ تک نہ اس نے اپنے شوہر کی صورت دیکھی نہ اُس نے اپنی بیوی کی ۔۔ وہ لاکھوں کی دولت پا کر اپنی فرانسیسی محبوبہ کے ساتھ ہر وقت نشۂ شراب میں بدمست رہتا تھا اور اسے دین و دنیا کا کوئی ہوش نہ تھا ۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا، محل برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا، ڈیوڑھی پر شہنائی بج رہی تھی، اور کملا ہاتھ منھ دھو کر برآمدہ میں نکلی ہی تھی کہ خادمہ آئی اور بولی کہ "مہاراج نے یاد فرمایا ہے"۔۔ اس نے کچھ دیر تامل کیا، سوچا کہ یہ ایک ہفتہ کے بعد اسے کیوں یاد کیا جا رہا ہے۔

پوچھا۔ "کہاں یاد کیا ہے" جواب ملا "باغ کی بارہ دری میں"۔ کملا نے سوال کیا۔ "کوئی اور بھی ہے"۔ خادمہ نے کچھ رکتے ہوئے جواب دیا کہ "مجھے معلوم نہیں"۔

کملا جس طرح کھڑی تھی اسی طرح چلنے کے لئے طیار ہوگئی اور متعدد زینے اور کمرے طے کرنے کے بعد جب وہ صحن باغ میں پہونچی تو دیکھا کہ سامنے راجہ بیٹھا ہوا ہے اور اس کے پہلو میں اس کی فرانسیسی بیوی بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ پہلے تو یہ ٹھٹھکی لیکن پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھی اور قریب جاکر کہا کہ "میں حاضر ہوں"۔

راجہ کے سامنے میز پر شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، اور ایک گلاس شراب سے لبریز اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے غضب آلود نگاہوں سے کملا کو دیکھا اور پھر شراب کا ایک جرعہ لیکر پوچھا کہ "کیا تم شراب نہیں پیتیں"۔

—— "نہیں، مہاراج، مجھے اس کی عادت نہیں ہے"۔

—— "اگر میں تم کو حکم دوں تو بھی نہیں پیوگی"

—— "یقیناً نہیں"

وہ غصہ سے بیتاب ہوگیا اور ماتھے پر شکنیں ڈالکر ریشخند کے ساتھ بولا کہ:۔

"ہاں، سچ ہے، سادھوؤں کے ہاتھ سے پریم کا جام پینے والیاں، ہمارے ساتھ کیوں شراب پینے لگیں"۔ ان الفاظ کا کملا کے دل و دماغ پر ایک بجلی کا سا اثر پیدا ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ بڑھکر اس کا منھ نوچ لے، لیکن اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا اور وہاں سے واپس آنے لگی۔

راجہ نے کہا۔ "کہاں جاتی ہو، خبردار جو آگے قدم بڑھایا"۔

کملا پلٹ پڑی اور فوراً بڑھکر گلاس اسکے منھ پر پھینک مارا اور میز اُلٹ کر اس طرح خاموش کھڑی ہانپنے لگی گویا کہ وہ کوئی بپھری ہوئی شیرنی ہے۔ راجہ نے جو اس وقت غصہ سے اندھا تھا، فوراً اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور بولا کہ سنبھل جا۔ کملا جس کے لئے اب زندگی کوئی معنی نہ رکھتی تھی، کڑک کر بولی کہ "نامرد، مجھے ڈراتا ہے"۔ یہ کہکر اس نے اپنی قمیص کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پھاڑکر سینہ آگے کردیا اور بولی کہ "بڑا راجپوت ہے تو ہاتھ اُٹھا اور فیر کر"۔ ظاہر ہے کہ اس طعن کی تاب وہ کیا لاسکتا تھا۔ چشم زدن میں ریوالور کی نال کملا کے سینے کے سامنے آئی اور ایک دھماکے کی آواز نے اس "بیراگ کے بروگ" کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

اس کے دوسرے دن اخباروں میں صرف یہ خبر دیکھنے میں آئی کہ:۔

"راجکماری کملا، کل شام کو موٹر میں جارہی تھیں کہ دفعۃً کسی درخت سے تصادم ہوا اور پسلیاں ٹوٹ کر فوراً دم نکل گیا"۔

نیاز

چار مُصلح

وہ نقاش تھے۔ وہ مصور تھے۔ وہ معلمِ اخلاق تھے، ماہرِ نفسیات تھے۔ وہ ڈرامہ نگار تھے، ناول نویس تھے۔ وہ بے نظیر شاعر تھے، بے مثل فلسفی تھے۔ وہ حاذق حکیم تھے، کامل طبیب تھے۔ وہ منجم تھے، رمال تھے۔ وہ مذہبی پیغمبر تھے۔ قومی مصلح تھے۔ مگر انسان تھے خدا نہیں تھے۔

ان کی قوتِ تفہیم حیاتِ انسانی کے اسرارِ سربستہ کی عقدہ کشائی کر سکتی تھی۔ وہ اپنی روح کے اعماق میں پہونچکر، دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان رموز کا پتہ لگا لیتے تھے جو ماورائے ادراک ہوں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل ان کے لئے آسان تھا۔ وہ ستاروں کی حقیقت سمجھتے تھے۔ پرندوں کی زبان جانتے تھے۔ نظامِ شمسی ان کے سامنے بازیچۂ اطفال تھا۔ مریخ میں بسنے والوں سے ہمکلام ہونا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ وہ قدیم روحوں کو بلا سکتے تھے۔ وہ قیافہ شناس تھے۔ رنگِ رخ سے تاثراتِ قلبی معلوم کر لیتے تھے۔ ذی الحس تھے۔ قوی الفہم تھے۔

انھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا ہم جنسوں کی اصلاح کا۔ وہ متفق تھے دنیا میں انقلاب پیدا کرنے پر۔ وہ متمنی تھے فرسودہ رسوم و قیود سے آزاد ہو کر ایک جدید نظامِ معاشرت قائم کرنے کے ــــ وہ بدل دینا چاہتے تھے ماضی کو حال میں اور حال کو مستقبل میں۔

وہ چاروں جمع ہوئے عظمتِ رفتہ کی یادگار ایک شکستہ آثار گنبد میں جہاں صدیوں سے حیاتِ انسانی نے سانس نہیں لیا تھا ــ وہاں ان کے لئے نہ مرمریں میزیں تھیں نہ آبنوسی کرسیاں۔ نہ ان کے تجربات کے لئے معمل نہ مطالعہ کے لئے کتب خانے نہ پروازِ تخئیل کے لئے شاعرانہ فضا۔ نہ پیچیدہ مسائل پر بحث و تمحیص کے لئے عالمانہ ماحول۔ وہ ان بے ثبات چیزوں سے بالکل بے نیاز تھے مستغنی محض تھے۔ ان کے دماغ ان کے معمل تھے۔ ان کے دل ان کے کتب خانے۔ وہ تمام علوم میں، ہر علم کے تمام شعبوں میں تحصیل کمال کر چکے تھے۔

مسلسل سات ہفتہ تک وہ ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں جمائے غور کرتے رہے اور اس نتیجہ پر پہونچے۔ کہ تمدنِ عالم میں تدریجی انقلاب پیدا کیا جائے۔ لیکن ابتدا کس پہلو سے ہو؟ ــــ یہ فیصلہ نہ کر سکے۔ انھوں نے پھر سوچنا شروع کیا۔ گیارہ ہفتے گذر گئے۔

آخر ایک نے کہا " املاک میں مساوات نہایت ضروری ہے۔ سرمایہ داری کو دنیا سے نیست و نابود کر دینا چاہیئے۔ کسی شے پر قبضۂ انفرادی نہ ہو۔ تمام پیداوار، تمام آمد و خرچ متعلق ہو پوری قوم سے۔ لیکن قومیت کسی ملک کے مخصوص دائرے تک محدود نہ ہو۔ بلکہ قوم نام ہو۔ اقصائے عالم میں بسنے والی تمام نوعِ انسان کی ہئیتِ اجتماعی کا"۔

پندرہ ہفتہ بعد دوسرے مصلح کے رنگِ رخ پر اطمینان کے آثار نظر آئے اور اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا " مسئلۂ ازدواج قابلِ ترمیم ہے بلکہ لائق تنسیخ ہے۔ شادی کا موجودہ مفہوم حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ تعلقاتِ جنسی قائم ہوں لیکن بغیر کسی مخصوص رسم و رواج کے بغیر کسی مشروط عہد و پیماں کے۔ اصناف کو کامل آزادی ہو۔ کوئی کسی کی زوجہ نہ بنے۔ کوئی کسی کا شوہر نہ ہو۔ نہ ماں اپنے بیٹے کے لئے ناجایز ہو نہ بیٹا اپنی ماں کے لئے حرام سمجھا جائے۔ بھائی کو بہن سے احتراز نہ ہو۔ بہن اپنے بھائی سے اجتناب نہ کرے۔ کسی کو ضبطِ تولید کی ضرورت لاحق نہ ہو۔ کسی کے دل میں افزائشِ نسل کی تمنا نہ رہے نوزائیدہ بچوں کی پرورش صرف حکومت کی طرف سے ہو۔ حکومت ہی انھیں تعلیم دے۔ بادشاہ ان کا مربّی ہو۔ اور وہ بادشاہ کے متبنّے کہلائیں عزیز و اقارب کا رشتہ قائم نہ ہو۔ صرف باہمی محبت تعلقات کی وسیط بنے"۔

سترہ ہفتہ بعد تیسرے مفکر نے نظر اٹھائی، گرد و پیش کی چیزوں پر نگاہ ڈالی۔ اور اطمینان کا سانس لیکر کہا۔ " ہم کو دنیا سے کام کاج کا قلع قمع کر دینا چاہیئے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ رہے۔ ہر کام از خود ہو جایا کرے۔ سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہمیں جدید ترین آلات اور انکشافاتِ حاضرہ سے امداد لینی چاہیئے۔ آہنی انسان ہماری خدمت کریں۔ مشینوں اور برقی قوتوں کے ذریعہ فصل تیار کیجائے بجلی ہمارے خورد و نوش کا انتظام کرے۔ صرف سورج کی شعاعیں اور کہربائی لہریں ہماری معالج ہوں۔ ہمارا کام صرف اس قدر ہو کہ ہم ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر فضائے بسیط کی سیر کرتے پھریں مطالعۂ قدرت شغلِ حیات بن جائے اور بس"۔

اکیس ہفتہ بعد چوتھے فلسفی نے اپنے طلسمِ محویت کو توڑا اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی قدر بلند لہجہ میں کہا " مذہب نام ہے فرسودہ توہمات کے گمراہ کن مجموعہ کا جس کی دورِ حاضرہ میں ضرورت نہیں وہ عقائد جنکی صداقت کا تجزیہ منطقی استدلال کی رو سے غیر ممکن ہو، لائق پذیرائی نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب تک خدا کے غیر حقیقی وجود کا تصور ذہنِ انسانی پر مسلط رہیگا۔ وہ ہر قسم کی ترقی سے محروم رہینگے۔ لہذا خدا اور مذہبیت کے نقوشِ باطل کو لوحِ قلب سے مٹا دینا چاہیئے"۔ وہ عرصۂ دراز تک ایکدوسرے کے نظریہ پر غور کرتے رہے۔ کہ کون سا زیادہ افضل ہو نیز یہ کہ اسے کس طرح دائرۂ عمل میں لایا جائے۔ آخر وہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ سب سے پہلے کرۂ ارض سے نوعِ انسان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اور غالباً انھوں نے اس تجویز کو دائرۂ عمل میں لانے کے لئے اپنی ہی چار ہستیوں سے ابتدا کی۔ کیونکہ دوسرے دن اسی گنبد میں مردہ حالت میں ملے جہاں صدیوں سے حیاتِ انسانی نے سانس نہیں لیا تھا۔ تاہم کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہاں دنیا کی اصلاح کے لئے چار نظریے قائم ہوئے اور ہو کر رہ گئے۔

فضل حق قریشی دہلوی

باب الاستفسار

مذہب و مذہبیات

(جناب سید احمد صاحب نظرؔ حسینی علم۔ سرائے بوہیرہ۔ حیدر آباد دکن)

میں آپ سے ایک مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں سیکڑوں مذاہب وجود میں آئے اور فنا بھی ہو گئے۔ اقوام عالم نے ہزاروں قوانین بنائے اور مٹا ڈالے۔ ہر قوم نے اپنے اخلاق کا ایک جداگانہ معیار قائم کیا تھا۔ لیکن کسی مذہب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دین فطرت ہے اور ہمیں بھی ان کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوا کہ ان کے پیش کردہ مذہب کی صورت سے دین فطرت ہونے کی صلاحیت ظاہر نہیں ہوئی البتہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دین فطرت ہے اور اس کا غائر مطالعہ کرنے سے اس میں جامعیت اور فطرت کے عین مطابق ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ بھی کہ وہ آدم سے تا ایندم موجود ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانہ صداقت سے خالی نہیں رہا تھا البتہ اقوام عالم نے غلطی سے مذہب کے خط و خال مٹا کر بزعم خود مذہب کو ایک نئی صورت میں ڈھال دیا۔ اور بعد میں گمراہ ہو گئے۔

وجہ تحریر ہذا یہ ہے کہ میں جناب کے خاص خیالات اس مسئلہ پر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا جو صورت اسلام کی اس وقت پیش نظر ہے آیا وہی اصلی ہے جسے آپ مولویوں کے اسلام کے نام سے تعبیر فرماتے ہیں یا کوئی اور۔ بصورت ثانی کیا اس وقت اسی غلطی کا اعادہ تو نہیں ہو رہا ہے جو گزشتہ اقوام نے کی تھی۔ اور جو بالآخر گمراہی پر منتج ہوئی۔ اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ آیا مذہب کو دنیا کا ساتھ دینا چاہئے یا دنیا کو مذہب کا۔ اس لئے انسانی فطرت میں یہ داخل ہے کہ ہمیشہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ پھر اخلاق و قانون کی بندش جس کی بنیاد مذہب کے اصول پر رکھی جاتی ہو ضروری ہے یا نہیں۔ اور ایسی تحدید جو مذہب قائم کرتا ہو انسان کے لئے مفید ہو یا مضر۔ علمائے یورپ و اسلام نے کیا ایسی تحدید کو مضر بتلایا ہو۔ یا کامل آزادی کو ضروری قرار دیا ہو۔ براہ کرم نگار کے ذریعہ ان مسائل پر روشنی ڈالئے تو عنایت ہے۔

(نگار) آپ نے اپنے استفسار کے ذریعہ سے معنًا وکنایۃً چند دعوے پیش کئے ہیں:۔
ایک ۔۔۔ یہ کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری دین ہونے کا دعویٰ کیا اور غائر مطالعہ کرنے سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
دوسرا ۔۔۔ یہ کہ اسلام کا وجود "آدم سے تا ایندم" دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے، لیکن اقوام عالم غلطی سے اسکی صورت مسخ کرتے رہے۔
تیسرا ۔۔۔ یہ کہ اگر زمانۂ حال کے مولویوں کے بتلائے ہوئے اسلام کو اصلی اسلام نہ سمجھا جائے تو یہ غلطی و گمراہی ہوگی ۔۔ اور
چوتھا یہ کہ ۔۔۔ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا چاہئے، مذہب دُنیا کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے ان دعاوی پر کوئی تنقید کروں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "دین فطرت" کا کوئی مفہوم متعین کر لیا جائے۔

غالبًا آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ "دین فطرت" سے مراد وہی دین ہو سکتا ہے جو "فطرت انسانی" کے اقتضا کے مطابق واقع ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ جس میں فطرتِ انسانی کے اصلاح کی اہلیت پائی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "فطرت انسانی" کا اقتضا کیا ہے اور اس کی اصلاح و ترقی کیا معنی رکھتی ہے۔

اس سلسلہ میں جب آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان ترقی کی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اسے دفعتہً حاصل نہیں ہوئی، بلکہ لاکھوں سال کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ درندوں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، اس کے بعد حجری عہد آیا جب پتھر کے آلات و اوزار طیار کر کے تمدن کی بنیاد اس نے قائم کی پھر اسنے اور ترقی کرکے کاشت و زراعت شروع کی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نے اپنے ذہن و دماغ سے کام لیکر مشینیں ایجاد کیں جہاز بنائے، ریل طیار کی، بجلی کو اپنے قابو میں کیا اور تمام موجودات عالم پر مالکانہ متصرف ہوگیا۔

اچھا فرض کیجئے کہ مذہب ہمیشہ سے ہر زمانہ میں موجود رہا ہے (جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے) اور کوئی نہ کوئی نبی یا پیغمبر ہر دور میں پایا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نبی یا مُصلح اپنے ہی دور کے انسانوں میں سے منتخب ہوتا ہوگا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عہد وحشت کے انسانوں کا پیغمبر عہد حجری کا انسان رہا ہو یا عہد حجری کا پیغمبر عہد فلزاتی کے انسان کی طرح ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مذاہب عالم میں جو تدریجی ترقیاں ہوئی ہیں وہ بھی انسان کے ذہنی ارتقاء کی پابند تھیں جب انسان بالکل وحشی تھا تو اس عہد وحشت کے پیغمبر نے اس کو بُت پرستی سکھائی اس کے بعد جب انسان آہستہ آہستہ متمدن ہوتا گیا تو پیغمبروں کی تعلیم بھی اسی کے ساتھ بدلتی گئی یہاں تک کہ وہ خدا جو کسی وقت صرف پتھر کی مورت تھا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ایک مجرد قوت میں تبدیل ہو گیا۔

اس بیان سے آپ کے چاروں دعووں کی تردید ہوگئی، لیکن بہ خیال مزید وضاحت میں سلسلہ وار آپ کے ہر دعوے کو لیکر بتانا چاہتا ہوں کہ بدقسمتی سے آپ کسی ایک بات میں صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچے۔

ا۔۔ آپ کا یہ کہنا کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی نے فطری ہونے کا دعویٰ کیا اور غائر مطالعہ سے بھی اس کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے بالکل بے بنیاد ہے، کیونکہ جو مذہب جس زمانہ میں پیدا ہوا وہ اسی زمانہ کے انسانوں کے عقول واذہان کے مطابق پیدا ہوا اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اُسے فطری نہ کہا جائے، کیونکہ فطرت انسانی زیادہ سے زیادہ جس خیال کو قبول کر سکتی تھی اسی کو مذہب نے پیش کیا، اور اس سے آگے مذہب بڑھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ مذہب کے مبلغ بھی تو آخر اسی دور کے ہوا کرتے تھے اور وہ اس حد سے آگے کیونکر بڑھ سکتے تھے جس حد تک انسان کی ذہنی ترقی اُن کے دور میں ہو چکی تھی۔

۲۔۔ آپ کا یہ فرمانا کہ اسلام کا وجود آدم سے تا ایندم دنیا میں ہمیشہ پایا گیا ہے لیکن اقوام عالم غلطی سے اس کی صورت مسخ کرتے رہے، بالکل میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر میں آپ کے اس دعوے کو تسلیم کرلوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسلام اول اول بُت پرستی کی شکل میں پیدا ہوا تھا اور بعد کو لوگوں نے اُس سے منحرف ہوکر بُت پرستی کی مخالفت شروع کردی۔۔ اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ اسلام نے بُت پرستی کی تعلیم کبھی نہیں دی تو پھر آپ ہی بتائیے کہ انسان کے عہد وحشت میں وہ کس صورت میں پایا جاتا تھا۔ البتہ اگر آپ یہ کہیں کہ اسلام نام ہی اُس مذہب کا ہے جو مختلف زمانوں میں حالات کے لحاظ سے مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا رہا تو بیشک یہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن پھر اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر جاہل و وحشی انسان کے ابتدائی دور میں وہ بت پرستی تھا تو انتہائی دور ارتقاء میں انکار خدا کی حد تک پہونچ سکتا ہے، اگر عقول انسانی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔

۳۔۔ آپ کا یہ دعویٰ کہ زمانۂ حال کے مولویوں کا بتایا ہوا مذہب عین اسلام ہے اور اس سے ہٹنا غلطی و گمراہی، بہت کچھ بحث و تنقید چاہتا ہے لیکن میں گفتگو کو مختصر کرنے کے لئے آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ زمانۂ حال کے مولوی کا بتایا ہوا مذہب کونسا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جو سنیوں کے مولویوں نے بتایا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جسے شیعہ جماعت کے مجتہدوں نے ظاہر کیا ہے؟ کیا یہ مذہب وہ ہے جسکی تبلیغ وہابی مولوی کیا کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں آپ اپنے ہی مسلک کے مولوی کی نشاندہی کردیں گے، درانحالیکہ آپ کا وہی مولوی دوسرے مسلک والوں کے نزدیک جو یقیناً خود بھی مسلمان ہیں بالکل گمراہ ہے۔۔ پھر بتائیے کہ وہ شخص جو واقعتاً یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس صورت میں کیا کرے گا۔ وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے مذہبی لٹریچر کو دیکھے گا اور جب اسے معلوم ہوگا کہ ہر مسلک دوسرے مسلک کو بُرا کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور رکھتا ہے، تو لامحالہ وہ سب سے متنفر ہو جائے گا اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ تمام مسالک لغو ہیں۔

اس وقت آپ اسلام کا کوئی مفہوم ایسا متعین نہیں کر سکتے جس پر تمام جماعت اسلامی کو اتفاق ہو اور اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور کس مولوی کا بتایا ہوا اسلام قابل اعتبار ہے۔

— اتنی گفتگو کے بعد آپ کا چوتھا دعوے از خود باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ جب تک تمام دنیا کسی ایک مذہب کی پابند نہ ہو جائے یہ کہنا کہ دنیا کو مذہب کا ساتھ دینا ضروری ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بیشمار مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اگر حسنِ بھی لیا جائے تو بیکار ہے کیونکہ نوع انسانی کا اختلاف دیگر مذاہب کی وجہ سے بہر حال باقی رہیگا اور اس صورت میں مذہب کی پابندی بجائے مُفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہوگی اور جنگ کا دروازہ ہر وقت ہر جماعت کے لئے کھُلا رہیگا۔

علاوہ اس کے یوں بھی دنیا کو مذہب کا ساتھ دینے پر مجبور سمجھنا بالکل خلافِ حقیقت اور فطرت کے منافی ہے۔ کیونکہ مذہب خود ہمیشہ انسانی دماغ کے رجحانات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور اگر وہ انسان کی ترقی تمدن و معاشرت کا ساتھ دینے کا اہل نہیں ہے، تو اس کا عدم و وجود برابر ہے۔

اسلام میں اگر کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے تو صرف یہی کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور اسی لئے اس کو دینِ فطرت کہہ سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں آپ اُس کو کسی ایک سطح پر قائم نہیں کر سکتے نہ کوئی خاص مفہوم اس کا متعین کر سکتے ہیں۔ وہ زمانہ کے ساتھ بدلتا رہیگا، انسانی عقول کے ساتھ خود بھی ترقی کرتا رہیگا، اور جس طرح اسوقت وہ اسلاف کی کتابوں میں ڈھونڈھنے سے کہیں نہیں ملسکتا، بالکل اسی طرح وہ مستقبل میں حال کے لٹریچر سے غائب ہو جائے گا۔ کیونکہ اسلام نام ہے محض نوع انسانی کی ترقی و استعلاء کا، عروج و ارتقاء کا، اور ہر اس سانچہ میں ڈھل جانے کا جو زمانہ کا اقتضا رہے — اور اگر مولوی واقعی کوئی مفہوم اسلام کا اتنا وسیع پیش کر سکتا ہے تو آپ کیا سارا زمانہ اسکے ماننے کے لئے طیار ہے، ورنہ یوں محض ذکر حور و قصور کی ترغیب اور ہاویہ جہنم کی تخویف سے تو اب یہ "کارگاہ مینائی" چلتا ہوا نظر آتا نہیں، ایک مذہب کا صحیح فریضہ روحِ عمل پیدا کرنا ہے، لیکن روحِ عمل سے مراد عبادت نہیں کہ یہاں نمازیں پڑھو اور وہاں حوریں لو، بلکہ ایک عزم مردانہ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہونا مراد ہے، زمین کے سینہ کو چیر کر اسکے اندر چھپی ہوئی سعادت و برکت حاصل کر لینا اور فکر و تدبر سے کائنات پر چھا کر عناصر عالم پر حکمرانی کرنا مقصود ہے — یہیں اسی دنیا میں، اسی زندگی میں، اسی سرزمین پر — اور اسی وقت — پھر اگر اسلام کا واقعی یہی مفہوم ہے اور "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کی تعلیم سے یہی مقصود ہے تو آیندہ کبھی اسکا خیال بھی دل میں نہ لائیے کہ مذہب زمانہ کا ساتھ دینے پر مجبور نہیں اور مولویوں کا بتایا ہوا اسلام صحیح ہے — لیکن اگر اسلام کا مفہوم یہ نہیں ہے اور "انتم الاعلون" سے یہاں کی ذلت و نکبت اور وہاں کی "اعلیٰ علیین" مراد ہے تو آپ کو آپ کا اسلام مبارک ہو، تنہا جنت میں جا کر مزے اُڑائیے اور ہمیں دوزخ ہی میں رہنے دیجئے کہ فردوس کی جامد زندگی سے جہنم کی پُر اضطراب زندگی بدرجہا بہتر ہے۔ ([illegible])

مطبوعات موصولہ

ایک افسانہ اور چار خاکے اس کتاب میں ایک فلم ایکٹرس کی زندگی کے اُن جزئیات سے بحث کی گئی ہے جن کا علم دنیا کو بہت کم ہوتا ہے۔ اس فسانہ کے مصنف ہمارے عزیز دوست ادیب جلیل اختر شیرانی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایک فلم اسٹار کا حال لکھنے کے لئے اختر سے زیادہ موزوں کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس موضوع کے لئے دل و دماغ میں جس گرمی کی ضرورت ہے وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور مجھے یہ دیکھکر واقعی مسرت ہوئی کہ انھوں نے جزئیات تنقید کے سلسلہ میں اپنی اُن حسرتوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی، جن کے بغیر ایک افسانہ نگار کا فسانہ کوئی رنگ پیدا کر ہی نہیں سکتا۔

غالب نے تو صرف ایک شعر میں اس تمنا کا اظہار کرکے بات کو ضرورت سے زیادہ مختصر کردیا، لیکن ایک نوجوان فسانہ نگار سے پوچھئے کہ جب وہ دوران تحریر میں اس منزل سے گزرتا ہے کہ:-

خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

تو اس کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے۔۔۔ ہر چند اختر شیرانی نے بظاہر "یہ بھی کہوں" کے ساتھ "وہ بھی" سے گفتگو نہیں کی، لیکن معنًا جہاں کہیں وہ اس کا اظہار کر گئے ہیں، وہاں وہ بیدل کی زبان میں یکسر "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" نظر آتے ہیں۔

کتاب چھوٹے سائز کے ۹۰ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور قیمت ایک روپیہ (فسانہ کی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تجارتی نقطۂ نظر سے) زاید ہے۔ دفتر فلمستان ٹمپل روڈ لاہور سے خط و کتابت کی جائے۔

دردِ زندگی مجموعہ ہے جناب احسان بن دانش کی نظموں کا جو رہنے والے تو کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ہیں لیکن بہ سلسلۂ کسب معاش کچھ زمانہ سے لاہور میں مقیم ہیں۔۔ آدمی نوجوان ہیں، ذہین ہیں، رنگین طبع ہیں اور ان کی نظم سے ان کی شاعری کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ میں نے مستقبل کا ذکر اس لئے کیا کہ بہ حالت موجودہ ان کی شاعری عدم توازن تعبیر ناقص، اور زبان و محاورہ کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔۔ اور مجھے افسوس ہوگا اگر جناب احسان کے احباب نے تنقید صحیح سے کام لیکر اُن کو اس بیراہ روی سے باز نہ رکھا جس کے آثار اُن کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں میں یہاں بعض اشعار پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ جناب دانش کے کلام میں کس قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ان کا ایک قطعہ ہے:-

دوپہر ہونے کو ہے سنّا گیا جنگل تمام ‌ ‌ ‌ اک کرن شاخوں سے چھنکر آرہی ہے پھول پر

جس طرح اک گاؤں کی دوشیزۂ معصوم پر شہر کے بے غیرت و بے مہر انساں کی نظر

اول تو سنّانا کوئی لفظ نہیں ہے۔ سناٹا سے سنّانا فعل بنایا گیا ہے جو بالکل خلاف محاورہ ہے۔ دوسرے جو تشبیہ استعمال کی گئی ہے وہ بے محل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان ادنیٰ سی وجہ شبہ بھی فن کے لحاظ سے کافی سمجھی جاتی ہے لیکن مرکب اور متحرک تشبیہوں میں بہت زیادہ تماثل کی ضرورت ہے۔

شاخوں سے جھنکر کرن کا پھول پر پڑنا حجاب انفعال اور جھجھک کو ظاہر کرتا ہے اور شہر کے بے غیرت انسان کی نظر گاؤں کی معصوم دوشیزہ پر بیباک و بیحجاب پڑتی ہے اس لئے تشبیہ کی تعبیر ناقص ہے۔

بعض جگہ انھوں نے لفظ حسین کو فارسی لفظ سمجھکر اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً "ذکر حسین" - حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

کہیں کہیں پنجاب کے زیر اثر انھوں نے ایسے ایسے مصرعے بھی کہ ڈالے ہیں

تصور نے دنیا بسائی ہوئی ہے

تجلی نے گردن جھکائی ہوئی ہے

ایک جگہ انھوں نے "خورشید کی خمیدہ شعاعیں" بھی نظم کر دی ہیں، ممکن ہے کہ انیشٹین انحناء زمان (Curvature of time) کی طرح کسی وقت انحناء شعاع کا بھی قایل ہو جائے، لیکن ابھی تک تو شعاعوں کی خمیدگی کا نظریہ کسی سائنس داں نے بھی پیش نہیں کیا، شاعر کا کیا ذکر ہے۔ ایک شعر ہے۔

سوئے زمیں تھے دیدۂ میگوں جھکے ہوئے سیال میکدے تھے فضا میں رُکے ہوئے

اس میں بھی وہ تعبیر و تشبیہ کا نقص ہے "دیدۂ میگوں" اس آنکھ کو کہتے ہیں جس میں شراب کا سا ہلکا رنگ پایا جائے، اس لئے اسکو سیال میکدہ" کہنا بالکل بے معنی بات ہے اگر "دیدۂ بادہ ریز" کہا جاتا تو خیر ایک حد تک درست بھی ہو سکتا تھا۔

اسی طرح میں کے جگہ پر، سے کی جگہ کی وغیرہ کا استعمال اکثر شعروں میں غلط کیا گیا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام خامیوں کے جناب دانش کے کلام میں ندرت و تازگی، جوش و سرمستی، پاکیزگی و رنگینی کی بھی کمی نہیں ہے اور کتنا اچھا ہوتا اگر ان کا کلام نقایص سے پاک ہوتا۔

ممکن ہے جناب دانش یا اُن کے احباب کو میری یہ تنقید ناگوار ہو لیکن اگر انھوں نے کسی وقت ٹھنڈے دل سے غور کیا تو غالباً انھیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ یکسر خلوص و صداقت پر مبنی ہے۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۰۳ صفحات کو محیط ہے اور ذیشان بکڈپو منٹگ لاہور سے ۱۲ میں ملسکتا ہے۔

غالب شکن یہ ایک خط ہے جو یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ام۔ اے کو لکھا تھا۔ اس خط میں بھی انھوں نے اسی سوقیانہ زبان وخیال سے کام لیا ہے جس نے عرصہ سے غالبؔ کے باب میں اُن کی "تنگی چشم حسود" کی ہمیشہ آئینہ داری کی اور کرتی رہیگی کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے "نتواں دست جزبرگ از دست" فیصلہ پہلے ہی ہوچکا ہے۔

یاسؔ و یگانہ بحیثیت شاعر ہونے کے کیا حیثیت رکھتے ہیں، یہ بحث اسوقت موضوع سے بالکل علحدہ ہے، لیکن اسمیں کلام نہیں کہ غالبؔ کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی جس فطرت کو اسوقت تک پیش کیا ہے وہ اس درجہ دنی و پست ہے کہ شاید ہی دنیائے شاعری میں کوئی دوسری نظیر اس کی مل سکے۔ حال ہی میں جو رباعیات غالب کے متعلق ان کی شائع ہوئی ہیں اُن کی سخیف زبان، اور ان کا بازاری لب ولہجہ ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سنجیدہ انسان ان کا ذکر بھی کرے اور اسی لئے میں نے نگار میں اس پر ریویو بھی نہیں کیا کیونکہ اس بدطینتی پر روشنی ڈالنے کے لئے جو غالبؔ کے باب میں یاسؔ نے ظاہر کی ہے، صرف انھیں الفاظ کے استعمال کی ضرورت ہے جو خود انھوں نے استعمال کئے ہیں، لیکن یہ مرتبۂ بلند جس کو ملنا تھا ملگیا، کوئی دوسرا کیونکر جرأت کرسکتا ہے۔

عہد بنی امیہ میں جب جناب امیر پر علی الاعلان مساجد میں تبرا بازی کیجاتی تھی تو امیر وقت نے ایک مشہور عالم کو بلاکر کہا کہ مسجد جامع میں جاکر علیؑ پر لعن کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کرسکتے تھے کیونکہ خوف جان کا تھا اس لئے وہ مسجد میں گئے اور لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ "امیر المومنین فرماتے ہیں کہ میں علی پر لعنت بھیجوں اس لئے میں اُس پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

اسی طرح یاسؔ کی ہفوات نگاری کا اگر کسی سنجیدہ انسان سے کوئی جواب ہوسکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اسی طرح کہ یاسؔ کی ان تمام گالیوں میں ضمیر کا مرجع خود انھیں کو قرار دیدے، لیکن میں تو کہتا ہوں کہ اتنی توجہ کرنا بھی یاسؔ ایسے معمولی انسان کو بہت کچھ اہمیت دیدینا ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کیوں میں نے اپنا اتنا وقت اس شخص کے اوپر ضایع کیا۔

حیرت تو مجھے ان پبلشروں پر ہے جو اس مزخرف کتابوں کو شایع کردیتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ ریویو کے بھی متمنی ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کے اخیر میں بھی چند رباعیوں میں گالیوں کی نقل کی گئی ہے جن کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر تناسخ واقعی کوئی چیز ہے تو یاسؔ اگلے جنم میں بھی اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو تالیاں بجا بجاکر گالیاں دینے میں شہرت رکھتا ہے اور آیندہ بھی ان کو اسی جماعت میں جنم لینا ہے۔

اس رسالہ اور نیز مجموعۂ رباعیات کی اشاعت کا فخر اُردو بک اسٹال لاہور کو حاصل ہوا ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو وہاں سے طلب کرلیں۔

طلوع

مجموعہ ہے ضیا صاحب فتح آبادی کے بعض اشعار کا جنھیں قطعات کے نام سے جناب ساغر نظامی نے ساغر بک ڈپو ادبی مرکز میرٹھ سے شایع کیا ہے۔ یہ قطعات صرف چار چار مصرعوں کے ہیں اور رباعیات کی طرح ان کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے قوافی رکھتے ہیں گو وزن رباعی کا نہیں ہے ضیا صاحب اور ان کی شاعری سے میں اسوقت تک بدقسمتی سے ناواقف رہا حالانکہ ساغر صاحب کے نزدیک "وہ قطعی الہامی شاعر ہیں اور اس لئے پیغمبروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں"

افسوس ہے کہ میں اُن کی نسل کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن جس حد تک ان کی شاعری کا تعلق ہے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے اس میں کسی ایک جگہ بھی الہام کی جھلک نظر نہیں آئی۔ ساغر صاحب نے جن الفاظ میں ضیا صاحب کا تعارف کرایا ہے وہ اس درجہ مرعوب کن ہیں کہ اگر پہلے کوئی شخص ان کو پڑھ لے تو پھر احترام کلام کی صورت سوائے اس کے اور کوئی باقی نہیں رہتی کہ اس کو تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا جائے یا چینی کی قاب پر زعفران سے لکھ لکھ کر تپ دق کے مریضوں کو پلایا جائے، لیکن وہ تو کہئے خیریت یہ ہوئی کہ تفسیر سے پہلے میں نے کلام دیکھ لیا اور اس عذاب سے بچ گیا۔

ساغر صاحب اگر کبھی ملے تو پوچھوں گا کہ ضیا صاحب کو کیوں آشنا بنایا گیا ہے اور اگر یہ واقعی دوست نوازی ہے تو اللہ انکی دوستی سے محفوظ رکھے۔

بارش اور قرآن

اس وقت ایک جدید تعلیم یافتہ جماعت جو اپنے آپ کو مذہب سے بھی علحدہ نہیں کر سکتی، ایسی پیدا ہوگئی ہے جو علوم و فنون کے تمام نظریوں کو کلام مجید سے ثابت کرنے پر مُصر ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ "ولا رطب ولا یابس الا فی القرآن المبین" کو پیش کرتی ہے۔ اس جماعت کے ایک فرد کوئی صاحب شاکر جبل پوری ہیں، اور انھوں نے اس رسالہ میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ بارش کے متعلق جو جدید تحقیق یورپ نے پیش کی ہے اسکا ذکر اب سے بہت پہلے قرآن مجید میں ہو چکا ہے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ انسان اگر تاویل پر آجائے تو وہ خالق باری اور دستور الصبیاں کو بھی تمام علوم و فنون کا مخزن ثابت کر سکتا ہے، چہ جائیکہ کلام پاک جو واقعی مواعظ حکمیہ کا مجموعہ ہے۔

میں نے اس نوع کی کوشش کو کبھی نگاہ استحسان سے نہیں دیکھا، کیونکہ قرآن پاک خالص اخلاقی درس ہدایت پیش کرنیوالی چیز ہے اور اس میں علوم و فنون کی جستجو کرنا اس کی توہین ہے۔ علاوہ اس کے علمی نظرئے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اگر کلام مجید کو انھیں کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کی گئی تو کل جب وہ نظرئے بدل جائیں گے تو دوسرے طریقہ کھینچ تان کے اختیار کرنے پڑیں گے اور اس طرح قرآن پاک بالکل بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔ ممکن ہے اس کے مصنف و پبلشر اس کو اسلامی خدمت سمجھیں، لیکن میری رائے میں یہ اسلام کی تخریب ہے اور کسی طرح اہل علم کے حلقہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں

دیکھی جا سکتی۔ اس رسالہ کی قیمت ۴ر ہے اور مطبع نادری جبل پور سے مل سکتا ہے۔

سمن پوش اور دوسرے افسانے مجنوں گورکھپوری کے اُن چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل رسالۂ جنؔ اور نگار میں شایع ہو چکے ہیں اور جنھیں وہ روحانیات سے نہ صرف متعلق سمجھتے ہیں بلکہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

جناب مجنوؔں اُردو کے مشہور فسانہ نگاروں میں سے ہیں اور ہر چند اُن کے فسانوں میں تشاؤم کی یکسانیت کی وجہ سے کوئی تنوع نہیں پایا جاتا، لیکن میرؔ کی شاعری کی طرح عشق کی ہمت چھین لینے میں وہ ضرور ایک حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اگر ان افسانوں کا تعلق روحانیات سے ظاہر نہ کیا جاتا تو بہتر ہوتا، کیونکہ اس صورت میں ایک شخص کو اس امر پر غور کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا "روحانیت" اسی قسم کے مقالوں سے ثابت کی جا سکتی ہے نیز یہ کہ جس چیز کو "روحانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ صرف واہمہ پرستی تو نہیں۔ یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۷۶ صفحات کو محیط ہے اور ایک روپیہ میں دفتر ایوان اشاعت گورکھپور سے مل سکتا ہے۔

اُردو کا پہلا ناول نگار مسٹر اویس احمد بی۔ اے نے اس عنوان سے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے سالانہ جلسہ میں ایک مضمون پڑھا تھا جو انعام کا مستحق سمجھا گیا اور بعد کو مصنف نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس میں اُردو کا پہلا ناول نگار مولوی نذیر احمد صاحب کو قرار دیا گیا ہے اور ان کی اس حیثیت کو اُن کی تصانیف سے نمایاں کرکے پورا حق تنقید ادا کیا گیا ہے۔ مسٹر اویس احمد آجکل کے نوجوان ادیبوں میں بہت پاکیزہ ذوق تنقید رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں نہایت صاف و سلیس زبان میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب ۸ر میں ماڈرن بک ڈپو ہیوٹ روڈ سے مل سکتی ہے۔

جامع اللغات اُردو پاکٹ سایز اُردو لغت ہے جس میں بیس ہزار سے زیادہ الفاظ اور اُن کے مرکبات کے نہ صرف معنی بتائے گئے ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک لفظ کس زبان کا ہے، مونث ہے یا مذکر واحد ہے یا جمع، لازم ہے یا متعدی۔

میں نے جستہ جستہ اس کو دیکھا اور جس جگہ نگاہ پڑی کوئی غلطی مجھے نظر نہیں آئی۔ البتہ کہیں کہیں فارسی و عربی کے ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو عام طور پر اُردو میں مستعمل نہیں ہوتے۔ مثلاً نغول۔ نجیک۔ غراب البین وغیرہ۔ بہتر ہوتا اگر ان کے بجائے دوسرے کثیر الاستعمال الفاظ تلاش کرکے درج کئے جاتے۔

کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور کتابت و طباعت بھی بُری نہیں ہے۔ مولوی محمد رفیع صاحب نے اس کی ترتیب میں کافی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور رائے صاحب رام دیال اگروالا الہ آباد نے اس کی اشاعت کرکے زبان اُردو کی قابل قدر

خدمت انجام دی ہے۔ قیمت بھی نہایت مناسب یعنی صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے تاکہ ہر اُردو داں شخص آسانی سے اسے حاصل کر سکے۔

یوسف ہندی قید فرنگ میں غالب کے واقعات زندگی میں ایک خاص واقعہ اُن کے مقید ہو جانے کا بھی ہے۔ جس کا ذکر خود انھوں نے بھی کیا ہے۔ جناب محسن بن شبیر حیدر آبادی نے اسی واقعہ کی تفتیش و جستجو کر کے جتنی تفصیل مل سکی مختصر سی کتاب کی صورت میں پیش کر دی ہے۔ کتاب مجلد شایع کی گئی ہے اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ نہ قیمت درج ہے نہ ملنے کا پتہ، لیکن غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے مل سکے۔

تنقیدات عبدالحق مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو کتابوں کا مقدمہ لکھنے اور ادبی کتابوں پر تنقید کرنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ محمد تراب علی خاں باز حیدر آبادی نے اُن کی بعض تنقیدیں جو ۲۳ مختلف کتابوں پر رسالۂ اُردو میں شائع ہو چکی ہے علٰحدہ کتابی صورت میں چھاپ دی ہیں، جو طلبۂ ادب کے لئے یقیناً فائدہ سے خالی نہیں، کتابت و طباعت پاکیزہ ہے اور ۱۲ میں کاشانۂ باز بازار گھانسی حیدر آباد دکن سے یہ مجموعہ مل سکتا ہے۔

سید الانبیاء کارلایل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" نہایت مشہور کتاب ہے۔ اس میں اسنے آنحضرت کے حالات اور اسلامی تعلیمات پر تنقید کی ہے۔

محمد اعظم خاں صاحب ام۔ اے نے اس کے دوسرے لکچر کا ترجمہ (جو اس موضوع سے متعلق ہے) اُردو میں پیش کیا ہے اور پورے حُسن کے ساتھ، اس کی قیمت ۲ ہے اور غالباً مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے ملسکتا ہے۔

باز کے سو شعر تراب علی خاں باز دکن کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے سو شعر کا انتخاب نہایت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ اس نام سے شایع کیا ہے۔ اور ۴ میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔

خواب پریشاں "مڈ سمرس نائٹ ڈریم" شیکسپیر کا نہایت مشہور ڈرامہ ہے۔ اب سے ۳۵ سال قبل (غالباً سب سے پہلے) مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کاکوروی نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو ادوھ پنچ میں بالاقساط شائع ہوا۔ اب اس کو علٰحدہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ اُردو بہت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اگر کسی شخص نے شیکسپیر کے لٹریچر کی روح کو سمجھ لیا تو وہ اسمیں کامیاب ہو گیا اور جس نے صرف الفاظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی وہ ناکام رہا۔

میں نے اس ترجمہ کو جستہ جستہ دیکھا اور غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ ایسا صاف وشگفتہ، اور اصل زبان کے جذبات کا حامل ترجمہ اس وقت تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔

ہمارے ملک کے نوجوان ادیبوں کو جو انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کرنے کے شایق ہیں اس کا مطالعہ ضروری ہے — یہ کتاب امیر محل کاکوری (لکھنؤ) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

بچوں کا تحفہ اس کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں میں بچوں کے لئے آسان، مفید و دلکش نظمیں درج کی گئی ہیں ان نظموں کے مصنف محمد شفیع الدین صاحب نیر ہیں جو ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی میں مدرس ہیں۔ جن عنوانات پر نظمیں لکھی گئی ہیں وہ واقعی دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی۔ زبان نہایت سلیس وسادہ ہے اور طرز بیان بہت سلجھا ہوا۔ جابجا تصویریں بھی نہایت پاکیزہ دی گئی ہیں اور طباعت وکتابت بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ ہر حصہ کی قیمت آٹھ آنے ہے اور مصنف سے مل سکتے ہیں۔

مصلحان تعلیم اس کتاب میں مغرب کے دس مصلحین تعلیم مثلاً روسو، لاک، اسپنسر، مانٹی سوری وغیرہ کے حالات اور اُن کے نظریات تعلیم سے گفتگو کی گئی ہے۔ اسوقت جبکہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں موضوع بحث بنا ہوا ہے، اس کتاب کی اشاعت بہت برمحل ہے اور ضرورت ہے کہ اس مسئلہ سے دلچسپی لینے والے اس کا مطالعہ کریں یہ کتاب ۱۹۶ صفحات پر مجلد شایع ہوئی ہے اور جناب عمر یافعی صاحب۔ سن برج۔ حیدرآباد دکن سے عہر میں مل سکتی ہے۔ اس کے مولف ابوالمکارم فیض محمد صدیقی بی۔ اے ہیں۔

روح سیاست ابراہیم لنکن، امریکہ کا بہت مشہور پریسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس ڈرامہ میں اس کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پنجاب کے دو مشہور ڈرامہ نگار نور الہی ومحمد عمر صاحبان اس کے مصنف ہیں اور ۸ر میں اُردو بک اسٹال لاہور سے ملسکتا ہے۔

حضرت امجد کی شاعری یہ کتاب حضرت امجد کا کلیات نہیں بلکہ اُن کی شاعری پر تنقید ہے جسے جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی نے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ جناب امجد حیدرآباد کے بہت مشہور شعراء میں سے ہیں اور اُس اسکول کی یادگار ہیں جس کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوئی اور پھر حالی و اسماعیل میرٹھی نے جس کو ترقی دی۔ جناب امجد اخلاقی نظمیں لکھنے میں ید طولی رکھتے ہیں اور گل وبلبل یا حسن وعشق ان کا موضوع کبھی نہیں رہا۔ وہ نہایت سہل وآسان زبان میں واقعات کی تصویر پیش کرتے ہیں اور جزئیات کے استقصاء کی پوری سعی فرماتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے امجد صاحب کے تمام اصناف شاعری پر بہت قابلانہ تبصرہ کیا ہے اور اس کا مطالعہ

یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مکتبۂ ابراہیمیہ سے ملسکتی ہے۔

وفاکی دیوی ڈراما ہے جسے ہمارے عزیز دوست مولانا کیفی چریاکوٹی نے الف لیلہ کے فسانۂ نورالدین و مریم سے اخذ کرکے بہت کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ ڈراما کی تاریخ پر لکھا گیا ہے جو اسقدر دلچسپ و مفید ہے کہ اگر کتاب میں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا تو بھی اس کی افادیت ظاہر تھی۔ نفس ڈرامہ چونکہ اسٹیج کے لئے لکھا گیا ہے اور اسٹیج بھی اب سے پچاس سال قبل کا جب ہمارے وطن کے مشہور فرد عبداللہ فتحپوری نے ہندوستان میں اول اول تھیٹر قائم کرکے خود ہی چند ڈرامہ مقفی عبارت میں لکھے تھے۔

اس ڈرامہ میں مذاقیہ حصہ بھی کافی ہے اور اس کی شان بھی وہی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اگر مولانا نے اس کو صرف یہ ثابت کرنے کے لئے نہیں لکھا کہ وہ ایسا بھی لکھ سکتے ہیں، تو پھر کیوں انھوں نے یہ زحمت اختیار کی۔

یہ ڈرامہ مجلد شائع ہوا ہے اور ایک روپیہ میں رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ الہ آباد سے ملسکتا ہے۔

غدودوں کے جوہر ہندوستان کے مشہور ماہر تجدید شباب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق کا یہ گیارھواں رسالہ ہے جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ غدود کے جوہر سے کن امراض میں کس طرح فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ایک جانور کے مختلف اعضا کے کھانے سے کن کن بیماریوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں دو آپریشن دہلی میں کئے ہیں، سال گزشتہ لکھنؤ میں ایک آپریشن کیا تھا جس کا ذکر نگار میں ہوچکا ہے۔ یہ رسالہ ۸ میں مصنف موصوف سے قلعۂ گولکنڈہ حیدر آباد دکن کے پتہ پر ملسکتا ہے۔

Parsism یہ کتاب پروفیسر محمد طاہر رضوی ام۔ اے کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ایران کے پیمبر قدیم زرد شت اور اس کے مذہب کے متعلق اتنی صحیح معلومات یکجا کردی ہیں کہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتیں۔ اسکا ترجمہ فارسی میں بھی ہوچکا ہے اور ہمارے ایک کرمفرما مولوی وجاہت حسین صاحب ام۔ اے اُردو میں بھی کر رہے ہیں جو نگار میں فروری سے شائع ہونا شروع ہوگا۔ یہ کتاب تین روپیہ میں تاراپوروالا اینڈ سنس ہارن بی روڈ بمبئی سے ملسکتی ہے۔

قائد کی پہچان

مرے سینے میں اے مسلم ہیں اسرار نہاں کیا کیا
بتاتا ہوں تجھے قائد کے ہوتے ہیں نشاں کیا کیا

ابھی دم بھر میں ہر مشکل تری آسان ہو جائے
اگر دنیا میں قائد کی تجھے پہچان ہو جائے

کسے کہتے ہیں قائد رہنمائی کون کرتا ہے
غلام اقوام کی عقدہ کشائی کون کرتا ہے

وہ شیر حریت سینے میں لیکر عزم کامل کو
جب اٹھتا ہے الٹ دیتا ہے اک ٹھوکر سے باطل کو

مقابل اس کے دریا ہو تو اس میں کود جاتا ہے
تمناؤں میں رستہ زور بازو سے بناتا ہے

وہ شیدائے شہادت آگ کو گلشن سمجھتا ہے
کنارِ تیغ کو جبریل کا دامن سمجھتا ہے

زمیں پہ رہ کے دم لیتا ہے جنت کی فضاؤں میں
پیامِ حق سنا دیتا ہے تلواروں کی چھاؤں میں

خلافِ مقصدِ عالی عمل کوئی نہیں کرتا
فریبِ مصلحت سے ترکِ حق کوئی نہیں کرتا

رہِ حق سے ہٹا سکتے نہیں فرزند و زن اس کو
صداقت سے پھرا سکتے نہیں دار و رسن اس کو

ہے اسکی معدلت سے مطمئن اسود بھی احمر بھی
سزا دیتا ہے وہ چوری کرے گر اس کی دختر بھی

حکومت پھانس لے تو جیل جانے سے نہیں ڈرتا
رعایت کے لئے حکام کی منت نہیں کرتا

نہیں ہوتا حوادث کے تلاطم میں ہراس اسکو
نہیں کہتا کہ زنداں میں عطا ہو اے کلاس اسکو

رہا کرتی ہے تنویرِ قناعت سے جبیں روشن
صداقت کی حمایت کرکے پھیلاتا نہیں دامن

طلا و سیم کے تاروں کو وہ نیزے سمجھتا ہے
عقیق و لعل و گوہر کو خذف ریزے سمجھتا ہے

اگرچہ تابعِ فرماں ہیں چین و ہند و روس اسکے
نہیں کہتا کہ نکلیں شان و شوکت سے جلوس اسکے

سفر کرتا ہے پیدل قوم سے پیسہ نہیں لیتا
اگر ملجائے گنجِ خسروی تو کھا نہیں لیتا

کسی کو اسکے افلاس و غنا پر شک نہیں ہوتا
دمِ رحلت مکاں میں اسکے روغن تک نہیں ہوتا

کہیں رہتی ہے صدیوں تک دلِ ملت میں یاد اسکی
نہیں ہوتی ہے بعدِ مرگ کوئی جائیداد اس کی

مخالف بھی کہا کرتے ہیں صادق اور امین اسکو
عدو بھی جانتے ہیں رحمت للعالمین اس کو

کسی کو دیکھ کر تکلیف میں بے چین ہوتا ہے
فلاحِ ابن آدم کیلئے راتوں کو روتا ہے

جلائے روح کا سامان کرتا ہے عبادت سے
دل اپنا صاف کرتا ہے ہوا و حرص و نخوت سے

عبادت کو کبھی سمجھا نہیں روزی رساں اس نے
امامت کو کبھی جانا نہیں گنج گراں اُس نے

سیادت کیلئے اقوام کو لڑوا نہیں دیتا
کبھی بھائی کی گردن بھائی سے کٹوا نہیں دیتا

کسی کی آنکھ کے شہتیر سے مطلب نہیں رکھتا
نظر آتا ہے جب تک اُسکو اپنی آنکھ کا تنکا

وہ دوش باد پر اڑنے سے پہلے پر بناتا ہے
زباں سے بعد میں کہتا ہے پہلے کر دکھاتا ہے

جو ان اوصاف کا حامل ہے بیشک رہنما ہے وہ
وگرنہ راہزن ہے بندۂ حرص و ہوا ہے وہ

اصغر حسین خان نظیر (لدھیانہ)

"طور"

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں دیکھے تھے سب سے پہلے انداز حیا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
خفائے رازکی پر لطف باہم کوششیں ہوتیں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اسکو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوت معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عیش رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

محی الدین مخدوم (عثمانیہ)

حسنِ فطرت

بہارِ شعر و ترنم ہے زندگی میری
تخیلات میں سیرۃ نمائے فطرت ہوں
میں اپنی نظم کا جب کردگار بنتا ہوں
کبھی ہوں حسن سراپا، کبھی ہوں عشق تمام
چمن، چمن، مجھے اذنِ خرام دیتا ہے
مری نظر میں سحر روز مسکراتی ہے

تمام رات میں تنہائیوں کے عالم میں
میں چھیڑتا ہوں کبھی نیم خواب کلیوں کو
کبھی میں لطف اٹھاتا ہوں جوئباروں سے
ہزار جان سے صدقے بہار ہے مجھ پر
ہر ایک گل مجھے جھک کر سلام کرتا ہے
میں ڈوب جاتا ہوں جب شعریت کے طوفاں میں
گلوں کو چوم کے پڑھتا ہوں شعر مستی میں
مرے خیال کی پرواز اے معاذ اللہ
گلے لگاتا ہوں اُس حسنِ مستتر کو میں
مرے نیاز نے پابند کر دیا ہے اُسے
چمن بدوش ہے وہ، اور چمن میں شامل ہو
ہے اُسکا آئینہ ہر جزوِ مظہرِ فطرت
میں دیکھتا ہوں اُسے بحر کی روانی میں
وہ جلوہ ریز ہے ہر سو، ہوا کی موجوں میں
نہ منتظر کوئی میرا، نہ انتظار مجھے
حسین جلوؤں کا ہر وقت مجھ پہ سایا ہے

نثارِ برق و تبسم ہے زندگی میری
تصورات میں صورت کشِ حقیقت ہوں
جمالِ حسن کا آئینہ دار بنتا ہوں
کبھی ہوں صبحِ مسرت، کبھی ہوں غم کی شام
شجر شجر مرے دل کو پیام دیتا ہے
ہوائے صبح مجھے آکے گدگداتی ہے

تلاش کرتا ہوں حسنِ بہار شبنم میں
میں چومتا ہوں، کبھی پرشباب کلیوں کو
کبھی میں کھیلتا ہوں جاکے آبشاروں سے
ہر ایک منظرِ فطرت نثار ہے مجھ پر
غرض تمام چمن احترام کرتا ہے
دکھائی دیتا ہوں اک محویت کے طوفاں میں
میں جھوم جھوم کے پڑھتا ہوں شعر مستی میں
مری نگاہ کا اعجاز اے معاذ اللہ
جگاتا رہتا ہوں جادوئے بے خبر کو میں
مری نگاہ نے مخصوص کر لیا ہے اسے
وہ کائنات کی محفل میں، شمعِ محفل ہے
ہر اک کرشمہ ہے اُسکا کرشمۂ قدرت
حسین غنچوں کی مدہوش نوجوانی میں
وہ برق کی ہے روش، بادلوں کی فوجوں میں
ہے اُس سے ملنے کا ہر وقت افتخار مجھے
مرے خیال پہ ابرِ نشاط چھایا ہے

نظر، نظر میں ہے میری اسی کا کیف و سرور
ادا، ادا میں ہے اسکی مری نظر کا غرور

فطرت واسطی

حسنِ عمل

میں اس بیگانگیِ ہوش کے عالم کو کیا سمجھوں
رہینِ جہل و نادانی ہے یہ ذوقِ ہمہ دانی

سکوں کی جستجو اور صومعہ کی تیرہ خلوت میں
جہاں مجروح پائے جاتے ہیں جذباتِ انسانی

صدا ناقوس کی گر حاملِ رازِ سکوں ہوتی
کبھی قابو نہ پا سکتے تھے اندازِ مسلمانی

تماشہ مدتوں دیکھا ہے موجوں کی حقیقت کا
تلاطم خیز دریا بھی ہے اک جز و پریشانی

خدا جانے کہاں کی خاک اڑتی ہے بیاباں میں
کہیں وحشت بھی ہو سکتی ہے اک تمہید لافانی

پیامِ امن کا باعث چمن کی تازگی کیوں ہو
خزاں کے سایۂ ظلمت میں ہے نظمِ گلستانی

دعا سے فائدہ کچھ بھی نہیں رونے سے کیا حاصل
چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

حدودِ زیست سے باہر نکل کر جھولیاں بھر لے
کہ ہے اس وسعتِ عالم میں جلووں کی فراوانی

بھری گرمی میں خورشید قیامت جب چمکتا ہے
کنوئیں کی تہ میں جب ڈھونڈھے سے بھی ملتا نہیں پانی

ردائے آتشیں سطحِ زمیں پر پھیل جاتی ہے
فضا کی لرزشیں! وہ لو کی لپٹیں! اشعلہ افشانی

تڑپتی دھوپ، جلتی ریت وہ تپتے ہوئے میداں
ہوا کی شعلہ سامانی — بگولوں کی پریشانی

اسی عالم میں اک مزدور دہقاں ہل چلاتا ہے
وہ اپنی لے میں وحدت کے نرالے گیت گاتا ہے

قدم رکھتا ہوا چلتا ہے اک شانِ مسرت سے
کبھی اپنے سرودِ زندگی سے جھوم جاتا ہے

بہار آتے ہی جسدم اُس کی کھیتی لہلہاتی ہے
وہ اپنی کامیابی پر خوشی سے مسکراتا ہے

حقیقت ہے کہ وہ "سازِ عمل" کو چھیڑ کر اپنے
نوائے روح کا پیغام دُنیا کو سناتا ہے

"عمل" سے دل کو ہوتا ہے سرورِ دائمی حاصل
"عمل" ہی سازِ فطرت کا ہر اک پردہ بجاتا ہے

"عمل" سے ہوگئی معراج انسانی تمدن کو
یہ کیا کم ہے "عمل" انسان کو انساں بناتا ہے

نظامِ بزم قایم ہے "عمل" کی رہنمائی میں
"عمل" کی حکمرانی ہے غرض ساری خدائی میں

شمیم

رُباعیات اثر لکھنوی

ہے شام کا وقت دم بخود ہے ساحل — کہسار پہ چھایا ہے سکوت کامل
فطرت کی خموشیوں میں گویائی ہے — محفل کو ہے انتظار میر محفل

فطرت نے لباس تازہ پھر بدلا ہے — پھر ابر بہار جھوم کر آیا ہے
پھر ہاتھ گریباں کی طرف کھنچتا ہے — پھر میں ہوں، وہی سر ہے، وہی سودا ہے

کڑھنا اور زار زار رونا اچھا — ہاں عشق کا اعتبار کھونا اچھا
لیکن کسی کافر کی نگہ سے اے دل — اب تو نہ کبھی دوچار ہونا، اچھا!

کہتے ہیں کسے عشق، مجھے کیا معلوم — اک درد ہے دلنشیں، دوا نامعلوم
نسبت اگر آغاز سے انجام کو ہے — جز تشنہ لبی، شرح تمنا معلوم

دل کو صرف عذاب رہنے تو دو — جولانگہ انقلاب رہنے تو دو
یہ ٹھوکریں کھا کے راہ پر آئے گا — کچھ دن یونہیں خراب رہنے تو دو

مذہب سے اختلاف کرتے رہئے — قبلے سے انحراف کرتے رہئے
شاید گم گشتہ مدعا مل جائے — اپنے دل کا طواف کرتے رہئے

کیفِ شبستاں

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

اور کیا چاہئے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا ہی بہ اندازِ دگر آج کی رات

عارضِ یار پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بہ کنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات

نور ہی نور ہے کس سمت اُٹھاؤں آنکھیں
حُسن ہی حُسن ہے تاحدِ نظر آج کی رات

نغمۂ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہئے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

مذہبِ عشق میں جائز ہے۔ یقیناً جائز!
چوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات

تیرے الطاف کا اتنا ہی فسوں کافی ہے
کم ہے اے دوست مرا دردِ جگر آج کی رات

اسرار الحق مجاز (مسلم یونیورسٹی)

جذباتِ تپش

ہے نمکداں سے دل لگی مقصود
خندۂ زخم بھی ہے شور آلود

دیر کی فکر کعبہ میں بے سود
نہ سہی بُت خدا تو ہے موجود

کبھی روشن ہے دل کبھی تاریک
کبھی غائب ہو تم، کبھی موجود

مُنھ چھپا کر نقاب میں تم نے
نظرِ شوق کو کیا محدود

کیوں ہے عالم سیاہ نظروں میں
آتشِ عشق تھی اگر بے دود

خواب پر ہے گمانِ بیداری
غیب کو ہم سمجھ رہے ہیں شہود

کچھ نہیں ہے بجز فریبِ نظر
عالمِ نیست میں ہماری بود

کون سُنتا ہے میری عرضِ وفا
نغمہ ساز ہوں مگر مردود

سوز و سازِ تپش فضول عبث
نیست سے ہے ہستیِ عمل کا وجود

عبدالعلا تپش

غزلیات

(۱)

ہم اپنے نالۂ سوزاں سے پھونک دیتے قفس
مگر قفس کی محبت سے ہو گئے بے بس

ہمارے سر سے کبھی کا گزر گیا پانی،
برس، بہار کی سرشار رات! خوب برس

اندھیری رات کے پردے میں کون ہے جو مرے
ربابِ روح کے تاروں کو کر رہا ہے مَس

چمن میں گا رہی ہیں پھول والیاں مل کر
ٹپک رہا ہے رسیلی جوانیوں کا رَس

جہاں میں بوالہوسی کے یہ کارنامے ہیں
بنا ہے وامق و فرہاد ہر کس و ناکس

مری خرابیوں کی انتہا یہ ہے اختر
خود اپنے حال پہ آنے لگا ہے مجھ کو ترس

(۲)

خواہشِ عیش نہیں دردِ نہانی کی قسم!
بوالہوس کھایا کریں عشرتِ فانی کی قسم

اک غم انگیز حقیقت ہے ہماری ہستی
قصہ خواں! تیری غم انگیز کہانی کی قسم

قلبِ ناشاد میں چھریاں سی چلا کیں شب بھر
کسی قتال کے خنجر کی روانی کی قسم

دل کی گہرائیوں میں آگ دبی رکھتا ہوں
چشمِ گریاں سے برستے ہوئے پانی کی قسم

باغِ دنیا کی فضاؤں سے ٹپکتا ہے شباب
گلِ نوخیز کی بھرپور جوانی کی قسم

کبھی مغلوب نہ ہوگی غمِ محرومی سے
مری اُلفت ہے جواں، اپنی جوانی کی قسم

جب سے آئی ہے خدا رکھے جوانی اختر
ہم ہر اک بات پہ کھاتے ہیں جوانی کی قسم

اختر انصاری دہلوی
بی۔ اے (آنرز)

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔